دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دارالعلوم
مدیر
حبیب الرحمن قاسمی

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبد الستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس اختر سفیر دار العلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ کمیل گاؤں [illegible] کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

۱۸۵۷ء کی تیز و تند سیاسی آندھی نے جب ہندوستان میں صدیوں سے روشن اسلامی سلطنت کے چراغ کو گل کر دیا اور سرزمین ہند پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہوگیا تو اس عہد کے اہل دل علماء نے اپنی بصیرت سے مستقبل کے اس عظیم الحادی فتنہ کو دیکھ لیا جو اس سیاسی اور مادی انحطاط کے پس پردہ برق رفتاری کے ساتھ ملت اسلامیہ کیجانب بڑھتا چلا آرہا تھا، وہ اپنی فراست ایمانی سے یہ سمجھ رہے تھے کہ اس سیلاب بلا خیز کے آگے بند نہیں باندھا گیا اور اس کے رُخ کو پھیرنے کی کوشش نہیں کی گئی تو اسلامی عقائد و افکار اور دینی اخلاق و کردار اس طوفان کی موجوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے اور وہ مسلم معاشرہ جو صدیوں کی سعیٔ پیہم اور انتھک کوششوں کے بعد وجود میں آیا ہے تشتت و انتشار کی نذر ہو جائے گا۔

ان حضرات نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا کہ اس ایمان سوز فتنہ کا مقابلہ جو ایک زبردست اور مستحکم سلطنت کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا ہے طاقت و قوت سے نہیں کیا جا سکتا اس لئے ان اللہ کے بندوں نے تحفظ دین اور بقائے ملت کی اس جنگ میں آہنی اور آتشیں اسلحہ کے بجائے علم و للہیت کے ہتھیاروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا چنانچہ اسباب و وسائل سے یکسر محرومی کے عالم میں اللہ کے اعتماد اور بھروسہ پر الحاد و زندقہ کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے بالمقابل قصبہ دیوبند میں علم و عرفان کا ایک چراغ روشن کیا جو ہندوستان

میں تحفظ دین کی اسی اولین کوشش کا مظہر تھیں۔ دارالعلوم دیوبند ہے جس کا آغاز انتہائی ناسازگار حالات میں محض اللہ کے اعتماد پر ہوا تھا، پھر اس کی قندیل علم اور چراغ تقویٰ سے مسلسل چراغ روشن ہوتے گئے یہاں تک کہ علم و نور کا یہ سلسلہ پھیلتے پھیلتے پورے برصغیر پر چھا گیا اور اس کی ضیا پاش کرنوں نے مسیحی مشنری کی برپا کی ہوئی ظلمتوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور اسلامیان ہند کو ایک ایسے مہیب اور خطرناک فتنے سے بچا لیا جس سے اس کا تشخص و امتیاز ہی نہیں وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم دیوبند ایک تحریک بن کر نمودار نہ ہوا ہوتا تو شاید برصغیر میں اسلام کی صورت یا تو مسخ و محرف ہو چکی ہوتی یا اس کا نام و نشان مٹ گیا ہوتا۔

دارالعلوم کا یہی ایک کارنامہ نہیں ہے کہ اس نے برٹش امپائر میں برپا الحاد و اسلام کے معرکہ میں قیادت کا کردار ادا کیا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و اقدار اور اسلام کی مقدس شخصیتوں کے خلاف برصغیر میں جتنی تحریکیں بھی وجود میں آئی ہیں خواہ وہ مسیحیت کے نام سے آئی ہوں یا شدھی و سنگھٹن کے عنوان سے، چاہے وہ قادیانیت و بہائیت کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آئی ہوں، یا رافضیت و رضاخانیت اور مودودیت کے لباس میں اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے کے درپے ہوئی ہوں، دارالعلوم دیوبند نے ایسی ہر باطل اور گمراہ تحریکوں کا آگے بڑھ کر مقابلہ کیا ہے اور اسلام کی صحیح ترجمانی کا حق ادا کر کے دین کے تحفظ کی اہم ترین خدمت انجام دی ہے۔

ان دفاعی جد و جہد کے ساتھ دارالعلوم دیوبند نے اپنی ایک سو تیس سالہ زندگی میں ہزاروں ایسے افراد پیدا کیے جنھوں نے تعلیم دین، تزکیۂ اخلاق، تصنیف، افتاء، صحافت، خطابت، تذکیر، تبلیغ، مناظرہ، حکمت، طب وغیرہ فنون علم میں بیش بہا خدمات انجام دیں، پھر ان خدمات کا دائرہ کسی خاص خطہ میں محدود نہیں ہے بلکہ برصغیر کے ہر ہر گوشہ اور دیگر بلاد بعیدہ کے ہر ہر حصہ میں پہونچ کر انھوں نے دین خالص کا پیغام پہونچایا، خلق خدا کو جہل کی تاریکی سے نکال کر نور علم کی دولت سے سرفراز کیا اور تحفظ دین کی تحریک کو آگے بڑھایا اور دینی و علمی تصنیفات پر لٹریچر کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ تیار کر دیا کہ بغداد و قرطبہ کی علمی سرگرمیوں کی یاد تازہ ہو گئی

چند مشاہیر کی آراء لکھتے ہیں:

یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی ہندو اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس میں ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام و بقا و استحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلا شبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔ (پیام ندوہ)

دارالعلوم دیوبند کا یہ امتیاز بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عوامی چندہ سے تعلیمی نظام چلانے کا طریقہ اسی کا ایجاد کردہ ہے، دارالعلوم کے قیام سے پہلے برصغیر میں جتنے دینی مدرسے تھے ان کا وجود و بقا حکومت یا امراء و رؤسا کی داد و دہش کا مرہون منت ہوتا تھا، ان مدارس کا عوام سے براہ راست کوئی ربط نہیں ہوا کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ختم ہوتے ہی جونپور، لکھنؤ دہلی وغیرہ کی علمی انجمنیں اجڑ گئیں، علماء و طلبہ نان شبینہ کے محتاج ہو کر کسب معاش کے لئے ادھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ اس کے برخلاف دارالعلوم نے کبھی کسی حکومت یا ریاست کے در پر جبہ سائی کو پسند نہیں کیا بلکہ اس نے اپنا سرمایۂ حیات توکل علی اللہ اور خدا کے صالح بندوں کے مخیرانہ جذبات کو قرار دیا اور آج تک وہ اپنے اس امتیاز و کردار پر پامردی اور مضبوطی کے ساتھ قائم ہے اور ایک نہیں متعدد بار حکومت وقت کے عظیم عطیات کو شکریہ کے ساتھ رد کر چکا ہے

برصغیر کو غلامی کی لعنت سے نجات دلانے میں بھی دارالعلوم کا بنیادی کردار رہا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ برادرانِ وطن کے دلوں میں آزادی کامل کا جذبہ پیدا کرنے والے اکابر دارالعلوم اور اس کے فضلاء ہی ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ الہند، اور ان کے تلامذہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا منصور انصاری، حضرت مولانا عزیر گل، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی وغیرہ کی جدوجہد اور مساعی جمیلہ سے کون انکار کر سکتا ہے

غرضیکہ دارالعلوم دیوبند نے کتاب و سنت کی اشاعت اسلامی تہذیب و ثقافت کے

بقاء و تحفظ اور مذہبی و سیاسی فتنوں سے ملت اسلامیہ کو خبردار رکھنے میں جو ہمہ گیر و حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے وہ مدارس اسلامیہ کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے،

دارالعلوم دیوبند کی انھیں مساعی جمیلہ کا یہ اثر ہے کہ آج برصغیر میں اسلام کا قدم دیگر بلادِ اسلامیہ کے مقابلہ زیادہ مستحکم ہے، مسجدیں آباد ہیں، اسلامی علوم و فنون کے چرچے ہیں اور دینی مدارس کا پورے ملک میں اس طرح جال پھیلا ہوا ہے کہ عالم اسلام کے علماء انھیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ دارالعلوم اپنی ان تمام خصوصیات کے ساتھ آج بھی کتاب و سنت اور تحفظ دین کی کوششوں میں مصروف ہے، چنانچہ بعض طالع آزما سیاسی بازیگروں کے درپردہ اشارے پر جب قادیانیت کے مردہ لاشے میں پھر سے جان ڈالنے اور ایک سوئے ہوئے فتنہ کو جگا کر مسلمانوں میں بے دینی و انتشار برپا کرنے کی سازش رچی گئی تو دارالعلوم نے بر وقت اس فتنہ کے سر کچلنے کے لئے اپنی فوج میدان میں اتاردی، ایرانی انقلاب کے زیر سایہ رافضیت نے جب اپنا دام تزویر بچھایا تو دارالعلوم نے آگے بڑھ کر امت مسلمہ کی رہنمائی کی، بابری مسجد کی تاریخی و شرعی حیثیت سے قوم کو باخبر کرنے میں بھی دارالعلوم نے قابل قدر کردار ادا کیا، بابری مسجد کی شہادت کے بعد امت کی صحیح رہنمائی کے لئے بھی دارالعلوم نے کامیاب جدوجہد کی، غرضیکہ دارالعلوم اپنی بساط اور حدود میں رہ کر ملت کی علمی فکری اور تعمیری خدمت میں مصروفِ عمل ہے، لیکن اگر کسی کو دارالعلوم کی یہ خدمات نظر نہیں آتیں تو اس میں دارالعلوم کا نہیں خود اس کی بصارت و بصیرت کا قصور ہے۔

از:- حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب، دارالعلوم دیوبند
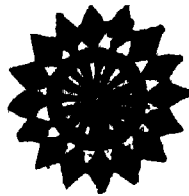
اقوامِ عالم کی پریشانیوں کا سبب اور اس کا علاج

اوّلاً ایک حدیث سنئے پھر جواب مدعا ملاحظہ فرمایئے

عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ یقول: انا اللہ لا الٰہ الا انا مالک الملوک وملک الملوک وقلوب الملوک فی یدی، ان العباد اذا اطاعونی حولت قلوب ملوکھم علیھم بالرحمۃ والرأفۃ وان العباد اذا عصونی حولت قلوبھم بالسخطۃ والنقمۃ فساموھم سوء العذاب فلا تشغلوا انفسکم بالدعاء علی الملوک ولکن اشغلوا انفسکم بالذکر والتضرع کی اکفیکم (رواہ ابو نعیم فی الحلیۃ)

(مشکوٰۃ شریف ص ۳۲۳)

حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں بلاشبہ تنہا معبود ہوں (میرے سوا کوئی معبود نہیں) میں تمام بادشاہوں کا مالک اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہوں اور تمام بادشاہوں کے قلوب میرے قبضہ و قدرت میں ہیں بیشک جب بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے قلوب کو ان بندوں پر رحمت و رافت سے بدل دیتا ہوں (پھر وہ نرمی اور محبت کا معاملہ کرتے ہیں) اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان بادشاہوں کے قلوب کو سختی و گرفت کے ساتھ پھیر دیتا ہوں تو وہ ان بندوں کو بہترین عذاب چکھاتے ہیں، لہٰذا (ایسے حالات میں) تم ان پر بددعا میں اپنے کو مشغول نہ کرو بلکہ اپنے نفوس کو میری یاد اور میری اطاعت میں اور تضرع میں مشغول کرو تاکہ میں تمہاری کفایت کرلوں۔

یہ حدیث قدسی ہے، حدیث قدسی حدیث مرفوع سے بھی اونچی ہوتی ہے، اور اگرچہ یہ صحاح ستہ میں مروی نہیں ہے لیکن یہ صحیح ہے واجب الاعتقاد والعمل ہے یعنی جو شخص اللہ پر اور اللہ کے رسول پر اور اللہ کے کلام (قرآن پاک) پر اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام (احادیث) پر ایمان رکھتا ہے اور ان کو حق و برحق سمجھتا ہے اس پر اس حدیث کو بھی حق سمجھنا اور اس پر ایمان لانا اور اس کی حقانیت کا اعتقاد رکھنا بھی لازم اور ضروری ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں قرآن کو مانتا ہوں مگر حدیث کو حجت نہیں مانتا تو یہ بڑا خطرناک جملہ ہوگا اسلئے کہ خود قرآن پاک میں تصریح ہے کہ

ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا (الآیۃ)

جو کچھ حکم تم کو رسول دیں اس کو مان لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔

اور رسول علیہ السلام کا یہ حکم ماننا وغیرہ سب یا تو صحابۂ کرام کے ذریعہ معلوم ہوگا یا آپ کی احادیث سے معلوم ہوگا، اس کے علاوہ اس کے جاننے ماننے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے، اسی طرح ایک آیت کریمہ میں ہے۔

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ (الآیۃ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دین و مذہب میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے بلکہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ صرف وحی سے کہتے ہیں۔

لہٰذا آپ کے کلام میں ذرا سا شک کرنا بھی کفر کی بات ہوگی، نیز ایک اور آیت کریمہ ہے

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الآیۃ)

اے لوگو! تم سب کے لئے رسول اللہ میں بہترین اسوہ (نمونہ) ہے۔

یعنی ان کے قول و فعل، طور و طریق سب کی اتباع کرو اسی سے آپ کا اسوہ حسنہ تم کو حاصل ہوگا اور اس اسوہ کا علم بھی یا تو صحابۂ کرام سے ہوگا یا احادیث کے ذریعہ ہوگا۔ نیز اس مضمون و مفہوم کی اور بھی بہت سی آیات و روایات ہیں مثلاً ارشاد خداوندی ہے وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ (ترجمہ) اور بے شک میرا یہ راستہ بالکل سیدھا راستہ ہے لہٰذا اسی کی اتباع کرو اور کسی دوسرے راستہ کی اتباع نہ کرو ورنہ تم اللہ

کے راستہ سے ہٹ جاؤ گے (یہ اللہ کے کلام کا ترجمہ ہے)

ان سب باتوں کا بھی علم یا تو صحابۂ کرام کے ذریعہ سے یا احادیث پاک کے ذریعہ ہی ہوگا، اس لئے قرآن کو ماننے اور اس پر ایمان رکھنے کے لئے لازم ہے کہ صحابۂ کرام کو اور احادیث شریفہ کو معتمد و معتبر مان لیں اور حدیثوں پر اعتقاد و ایمان رکھیں، پس ان آیات و روایات سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث پاک کے مطابق پوری پوری اتباع کرنا بھی فرض ہے، اور اس میں ذرا بھی فرق کرنا خطرناک خیانت اور کفر کی بات ہوگی۔

اب اس حدیث قدسی کے الفاظ کو دیکھئے کس قدر بلند اور دل کو دہلا دینے والے ہیں نبی آخر الزماں علیہ السلام فرماتے ہیں ان اللہ تعالیٰ یقول انا اللہ لا الٰہ الا انا مالک الملوک وملک الملوک وقلوب الملوک فی یدی، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں ہی تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہوں اور تمام بادشاہوں کا مالک ہوں، تمام بادشاہوں کے قلوب میرے ہی قبضۂ قدرت میں ہیں، یعنی میرے اشارے وحکم کے خلاف کوئی کچھ نہیں کرسکتا، ان الفاظ کی سطوت وقوت کا جس کو استحضار ہوجائے اس کا قلب دہل جائے۔

پھر فرماتے ہیں و ان العباد اذا اطاعونی حولت قلوب ملوکھم علیھم بالرحمۃ والرأفۃ۔ یعنی بیشک جب میرے بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے قلوب ان پر رحمت و رأفت کے ساتھ پھیر دیتا ہوں کہ وہ ان پر رحم وکرم و شفقت کا معاملہ کرنے لگتے ہیں (طرح طرح کا) آرام پہونچانے لگتے ہیں، اور "حولت قلوب ملوکھم" عام مطلق ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ بادشاہ خواہ وہ بادشاہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو، شخصی حکومت کا بادشاہ و سربراہ ہو یا جمہوری حکومت کا سربراہ اور بمنزلۂ بادشاہ ہو سب کے قلوب کو رحمت و رافت سے بدل دیتا ہوں۔

اسی طرح "ان العباد اذا اطاعونی" میں بھی تعمیم ہے جس ملک کے بھی رہنے والے ہوں جب میری اطاعت کرتے ہیں یعنی میرے کلام (قرآن پاک) کے مطابق اور میرے رسول علیہ السلام کے کلام اور ان کے اسوہ و مزاج کے مطابق محض مجھے راضی کرنے کے لئے میری مرضی کے مطابق

بغیر کسی خودروی اور رائی کے اور صرف کتاب وسنت کے مطابق عمل کرنے لگتے ہیں تو میں اس ملک کے سربراہوں، بادشاہوں کا ایسا حال کر دیتا ہوں کہ وہ سب پر نرم معاملہ کرنے لگتے ہیں۔

اور اسی طرح جب میرے بندے میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں یعنی میرے اور میرے نبی کے حکم واسوہ کے مطابق عمل نہیں کرتے بلکہ خودروی یا خودرائی کرنے لگتے ہیں جو میری نافرمانی کے مترادف ہوتی ہے تو ان کے بادشاہوں کے قلوب کو اسی مذکورہ بالا تشریح وتفسیر کے ساتھ ان کے اوپر سخت تر کر دیتا ہوں وہ ان کو (طرح طرح کا) بدترین عذاب چکھانے لگتے ہیں چنانچہ آج کل کا مسلمان اپنے ملک میں ہو یا کسی غیر ملک میں ہو، خواہ وہاں مستقل قیام ہو یا عارضی قیام ہو، عام طور سے ان مذکورہ بالا تفاصیل کے مطابق عمل درست نہیں ہوتا اس لئے اس کے نتائج بھی سامنے ہیں کہ نہ تو کہیں کے مسلمان مطمئن نظر آتے ہیں اور نہ کہیں کی حکومت مطمئن نظر آتی ہے اور نہ سکھ اور چین کہیں بھی نظر آتا ہے بلکہ سب کے سب حکومت وعوام طرح طرح کے مصائب وتکالیف وخطرات کے ہردم شکار رہتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

شبہ یہ ہے کہ دنیا میں مسلمان اربوں کی تعداد سے بھی زیادہ بستے ہیں تو کیا ان میں کچھ لوگ بھی ایسے نہیں ہیں جو حدیث قدسی پر پورے اتر آئیں؟

جواب شبہ:۔ مسلمان تو ماشاء اللہ بہت ہیں مگر اس حدیث قدسی کے معیار پر اترنے والے شاید لاکھ میں دو ایک ہی ہوں گے، اور قاعدہ یہ ہے کہ مثلاً جب کسی کے پاس حرام وحلال دونوں کمائی خلط ملط ہو جاتے، یا حلال کمائی حرام مال میں خلط ملط ہو جائے تو شرعاً اکثر کا اعتبار ہوتا ہے یعنی اکثر مال واکثر کمائی حرام کی ہو تو کھانے پینے کے معاملے میں بھی استعمال کی اور نفع اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے اور جب اکثر کمائی واکثر مال حلال ہوتا ہے، تو اگرچہ تقویٰ اس صورت میں بھی احتیاط کا ہے مگر اس کے استعمال وانتفاع کی گنجائش ہوتی ہے۔

پس اسی طرح بالقیاس یہاں بھی سمجھئے کہ جس آبادی یا گروہ میں مسلم وغیر مسلم مخلوط طریقے سے رہتے ہیں تو اس آبادی یا گروہ میں اکثر مسلمانوں کا حال تقویٰ ودیانت میں اس حدیث قدسی کے مطابق صحیح اترے گا تو وہ آبادی وگروہ انھی انعامات وفضائل کے مستحق

ہوں گے ورنہ شق ثانی کے وبال میں ابتلا رہے گا، اور حسب حدیث مسلم شریف کے مطابق کہ جب تک ایک کامل الاخلاص والایمان شخص زمین پر اللہ اللہ کرتا رہے گا اور اس کی وجہ سے سارے اہل زمین کے ساتھ رحمت ورأفت کا معاملہ ایسا ہوگا کہ قیامت برپا نہ ہوگی۔ تو جب کسی آبادی کی اکثریت اسلام میں مطیع وفرمانبردار ہو جائے تو یہ چیز کیوں نہ باعث رحمت ورأفت ہوگی بلکہ سب آبادی مسلمانوں ہی کی ہو لیکن اس میں فاسق و غیر فاسق سب مخلوط طریقے سے رہتے ہوں، لیکن اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہو جو تقویٰ و دیانت میں اس حدیث قدسی کے مطابق اخلاص کامل کے ساتھ پورے پورے اترتے ہوں قرآن کا بھی یہی حال و حکم ہوگا۔ جو ابھی مذکور ہوا خلاصہ یہ کہ اکثر مسلمان بھی اوپر لکھے ہوئے ضابطہ کے مطابق پورے اتر جائیں جب بھی سب کو یہ انعام حاصل ہوگا

ایک بات اور بھی ایسی ہے جس کا خیال رکھنا ضروری رہے گا اور وہ یہ ہے کہ اس اخلاص کامل کے ساتھ پورے کھلے دل سے تمام احکامات شرعیہ پر بلا خوف لومۃ لائم عمل مستمر رکھا جائے۔ کما اشار الیہ قولہ تعالیٰ فلا وربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ ترجمہ:۔ لوگ پورے مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمام معاملات (عبادات معاملات لین دین ہر ایک چیز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے فیصلہ نہ لیں اور حکم خدا و رسول) آپ ہی سے نہ مانگیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیں چاہے وہ اپنی طبیعت کے خلاف پڑے مگر اس میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں مثلاً دل میں تو تردد یا شک یا تنگی وغیرہ ہو اور نفس زبان سے انقیاد واتباع ظاہر کریں، کیونکہ یہ حالت تو کھلے نفاق کی ہوگی اور اس کا علاج بتلایا گیا ہے کہ نہایت انشراح کے ساتھ تسلیم کر کے اس پر عمل درآمد شروع کریں پس جو لوگ اپنی رائے وغیرہ کو دخل دیتے ہیں بلکہ کسی قسم کا شک وشبہ بھی کرتے ہیں ان کو اپنے ایمان کی خیر منانا چاہئے اسی چیز کو سعدی بابا اس طرح ادا فرما رہے ہیں۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید ٭ کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اب ایک دعا بتا کر کہ اس کو ہر طالب حق ہر نماز کے بعد تین بار پڑھ کر پوری امت محمدیہ کیلئے دعا کیا کرے اور مضمون دعا کو بس کرتا ہوں اور وہ دعا یہ ہے اللھم ارحم امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللھم اصلح امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللھم اغفر لامۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر اس کی پابندی کر کے دیکھئے اس گفتگو کو آرسی کیا ہے۔

★

تاریخیات

مولانا اختر امام عادل قاسمی

جو ماضی کی اندھیریوں میں گم ہوگئی

(ایک ایسی جماعت جس کے تصور ہی سے ماضی بعید کا انسان کانپ جاتا تھا، جس نے تاریخ کے ایک لمبے دور تک اونچے اونچے ایوانوں میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی بڑے سے بڑے حکمراں کے کان میں جب یہ آواز پڑ جاتی کہ حشیشین تمھارے تعاقب میں ہیں تو وہ سناٹے میں آجاتا تھا، اس کے بدن پر کپکپی طاری ہوجاتی اور اس کی مسرتوں کے شاداب چمن میں ویرانی کی دھول اڑنے لگتی، ایک ایسا گروہ جس نے نہ معلوم امت کے کیسے کیسے سپوتوں کو موت کی آغوش میں سلادیا اور کتنے بادشاہوں کا غرور خاک میں ملادیا۔

مگر کس قدر عبرت انگیز بات ہے کہ ماضی کا اس قدر طاقتور اور ہوشیار گروہ آج افسانۂ ماضی بن چکا ہے۔ تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی، وہ تاریخ جس کا سینہ کل اس گروہ کے خوف سے دہل رہا تھا آج وہ اس قدر نڈر ہوچکی ہے کہ اس گروہ کے ایک ایک راز کو اس طرح واشگاف کر رہی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر کسی لاش کا پوسٹ مارٹم کرتا ہے۔

آیئے آج اسی گروہ کی دلچسپ داستان چھیڑیں، اور اس کے آغاز و شباب کے نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے تاریخ کے ان اسرار کا سراغ معلوم کریں جن کی بدولت وہ بڑی تیزی کے ساتھ ابھرا مگر اتنی ہی تیزی کے ساتھ ڈرامائی طور پر شاید ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا۔)

تحریک کا آغاز

حشیشین دراصل اسماعیلی فاطمی نزاری جماعت کا نام ہے اس کا شجرہ نسب فاطمیوں سے ملتا ہے، اس کی دعوت کا آغاز نزار ابن المستنصر باللہ کے مسئلہ امامت سے ہوا، یہ جماعت نزار ابن المستنصر کو امام المسلین مانتی تھی، اور اسی کی امامت و خلافت کے لئے ایک مذہبی و سیاسی جماعت کے طور پر یہ ابھری تھی، اس کا بانی "حسن ابن الصباح" تھا جس کا مرکزی مقام "قلعۂ الموت" تھا، جہاں وہ اپنی دعوت اور حکومت کی توسیع و اشاعت کے لئے افراد کی تربیت کرتا تھا، اس کی شہرت کا سب سے نمایاں پہلو وہ ہے جو تاریخ میں سیاسی یا مذہبی مقاصد کے لئے بیشہ ورانہ قتل، اغوا، اور دہشت گردی کے نام سے ملتا ہے۔

حشیشین کی داستان اور ان کے افکار و نظریات سمجھنے کے لئے ان افراد کا تعارف ضروری ہے جو اس جماعت کے قائدین کی حیثیت رکھتے ہیں، بلکہ کہنا یہ چاہیئے کہ حشیشین ان افراد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔

اساسی قائدین

حسن ابن الصباح

حسن ابن الصباح اس جماعت کے لیڈروں میں سرفہرست ہے وہی اس جماعت کا اصل بانی بھی ہے اور اسی کی تگ و دو سے اس جماعت کو وہ عالمگیر شہرت حاصل ہوئی جو کسی غیر قانونی جماعت کو بہت کم حاصل ہو سکی، وہ ۴۳۰ھ کو فارس کے مشہور شہر "رے" میں پیدا ہوا، خالص شیعی انداز میں اس کی تربیت ہوئی، مگر بعد میں کچھ وجوہات کی بنا پر اس نے اسماعیلیہ فاطمیہ گروپ کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کر لیا، اس وقت اس کی عمر صرف سترہ سال تھی، اس نے اپنی نوجوانی کی بہترین طاقتیں فاطمیہ مسلک کے نشر و اشاعت میں صرف کیں، ۴۷۱ھ مطابق ۱۰۷۸ء کو وہ حج کرنے کے عنوان سے حجاز روانہ ہوا مگر اس کا مقصد اصل میں اپنے امام الطریقہ مستنصر باللہ سے خفیہ ملاقات کرنا تھا امام الطریق سے ملاقات کے بعد جب واپس آیا تو اس کا سینہ اس عزم سے لبریز تھا کہ وہ اپنی دعوت جنگل کی آگ کے مانند پورے فارس میں پھیلا دے گا، اس کی خاطر اسے کتنی جنگیں لڑنی پڑیں، آخر کار دو سال کی مسلسل محنت کے بعد کئی قلعوں پر اس کا پرچم لہرانے لگا، ان میں سب

اہم قلعۂ الموت تھا جس کو اس کے دار السلطنت کی حیثیت حاصل تھی۔

حسن ابن الصباح ابھی اپنی دعوت میں مکمل طور پر کامیاب بھی نہ ہو سکا تھا کہ اسماعیلیہ فاطمیہ کے امام الطریق مستنصر باللہ کا ۴۸۷ھ مطابق ۱۰۹۴ء میں انتقال ہوگیا، اس کے انتقال کے بعد اس جماعت میں وہ تاریخی بھونچال آیا جو شاید اس کے آغاز سے لے کر موت تک سب سے زبردست طوفان تھا، وہ یہ کہ۔

مستنصر باللہ نے اپنی زندگی میں اپنا ولی عہد اپنے بڑے بیٹے نزار کو بنا دیا تھا، مگر مستنصر کا وزیر اعظم بدر الجمالی نزار کو پسند نہیں کرتا تھا، اس کا رجحان مستنصر کے چھوٹے بیٹے المستعلی کی طرف تھا اس لئے کہ المستعلی بدر الجمالی کا بھانجا تھا جو مستنصر کی دوسری بیوی (جو بدر کی بہن تھی) اس سے پیدا ہوا تھا، چنانچہ مستنصر کی موت کے بعد ہی بدر الجمالی نے ولی عہد نزار کو بھی موت کی آغوش میں سلا دیا تاکہ امامت کے منصب پر وہ مستعلی کو لا سکے۔ یہیں سے اسماعیلیہ فاطمیہ دو گروپ میں تقسیم ہوگئے، ایک گروہ کا نام نزاریہ مشرقیہ اور دوسرے کا مستعلیہ مغربیہ تھا۔

اس موقعہ پر حسن ابن الصباح کو ابھرنے کا خوب موقع ملا، اس نے دعویٰ کیا کہ مستعلی کی امامت باطل ہے، امامت کا حقدار نزار ہی تھا، جس کو بدر الجمالی نے شہید کرا دیا ہے، اس لئے اب امامت کا حقدار نزار کا پوتا ہے، نزار کے پوتے کا نام معلوم نہ ہو سکا، البتہ اتنا معلوم ہے کہ حسن ابن الصباح نزار کے جس پوتے کی امامت کا داعی تھا اس کو خفیہ طور پر قلعہ الموت میں پہنچا دیا گیا تھا اور حسن کی تحریک کے وقت، وہ اسی قلعہ میں موجود تھا، تاریخ کے مطابق نزار کا پوتا بہت بہادر اور بیباک تھا، اس کی حوصلہ مندی، گھوڑ سواری اور شجاعت کی شہرت مصر سے فارس تک پھیل گئی تھی۔

ایک روایت یہ ملتی ہے کہ حسن بن الصباح نے نزار کے پوتے کے بجائے اس کی بیوی کو وہ مخفی طور پر قلعہ الموت میں منگوا لیا تھا، نزار کی بیوی اس وقت حاملہ تھی، جب اس کی ولادت ہوئی تو وہ لڑکا پیدا ہوا جس کی امامت کا حسن ابن الصباح نے دعویٰ کیا، اس روایت کے مطابق حسن ابن الصباح نے نزار کے پوتے کے بجائے اس کے بیٹے کی امامت کا دعویٰ کیا تھا۔

حقیقت جو بھی ہو اتنا طے ہے کہ لوگوں نے اس نئے امام کو کبھی نہ دیکھا اور نہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکا کہ وہ امام کہاں موجود ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ حسن ابن الصباح ہمیشہ ہی

کہتا رہا کہ وہ امام ابھی روپوش ہیں جب وقت آئے گا تو وہ خود ہی نکل کر تمہارے سامنے ظاہر ہوجائینگے مگر چشم فلک اس امام کے ظہور کا منظر نہ دیکھ سکی یہاں تک کر ۵۱۸ھ مطابق ۱۱۲۴ء میں موت نے حسن ابن الصباح ہی کا خاتمہ کر دیا، اور وہ اپنے امام کو اپنے ذہن و ضمیر کے نہاں خانے میں لئے ہمیشہ کے لئے دنیا کی نگاہ سے اوجھل ہوگیا، اس نے اپنے پیچھے اپنا کوئی ثبوت بھی نہ چھوڑا جو اس کے امام اور کام کو زندہ رکھتا، خدا نے اسے دو ہونہار بیٹے دیتے بھی تھے تو نہ معلوم کس بنا پر اس نے اپنی زندگی ہی میں ان دونوں کا خاتمہ کر کے اپنے مستقبل کا چراغ اس نے خود گل کر دیا۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

۲:- کیا بزرگ آمید حسن صباح کے مرنے کے بعد کیا بزرگ آمید کا انتخاب کیا گیا اس کا دور حکومت ۵۱۸ھ مطابق ۱۱۲۴ء سے شروع ہوتا ہے اور ۵۳۲ھ مطابق ۱۱۳۸ء پر ختم ہوجاتا ہے، اس سے پہلے یہ قلعۂ لاماسار میں بیس سال تک قلعہ دار کی حیثیت سے رہ چکا تھا، اس نے بڑی سی حکومت سلجوقیوں کے ساتھ کئی معرکوں میں شرکت کی مگر کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکا، اس کے بارے میں تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ سیاسی شعور اس کا کافی بیدار تھا مگر اسی قدر یہ بزدل بھی تھا۔

۳:- محمد ۵۳۲ھ میں کیا بزرگ آمید کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا محمد منصب حکومت پر فائز ہوا، اس نے اپنے دور میں نہایت سرگرمی کے ساتھ دعوت امامت کا آغاز کیا، اس کی سیاسی بصیرت اور دلیری بھی اپنے والد سے بہتر تھی، اسلام کے ظاہری احکام اور فرائض و واجبات کا خود بھی پابند تھا اور اپنی رعایا کو بھی ان کا پابند رکھتا تھا۔ یہ امامت کو ایک ہی خاندان کا خاصہ قرار دیتا، وہ یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا کہ امامت کے لئے نزار کے خاندان کے سوا کوئی دوسرا خاندان بھی متحمل ہوسکتا ہے، اس کی شدت کی انتہا یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے خود اس کے بیٹے حسن ثانی کے بارے میں امامت کی بات کی اور اس کی تبلیغ شروع کی کہ اب یہ امامت نزار کے خاندان سے منتقل ہو کر کیا بزرگ کے خاندان میں آچکی ہے، اور خود حاکم قلعہ الموت صاحبزادے کو اشتغال امامت کے منصب سے نوازتے ہے ـــــ جب اس تحریک کی اطلاع محمد حاکم قلعہ الموت کو ملی تو وہ سخت ناراض

تھا، اسماعیلیوں نے اس تحریک کے رہنماؤں کو چن چن کر قتل کر دیا، اور باقی دوسرے لوگوں کو جو اس نظریے کے قائل تو تھے مگر پیش پیش نہ تھے ان کو مناسب سزائیں دیں ۔۔۔ اس واقعہ سے اس کی فکری شدت و پختگی کا اندازہ ہوتا ہے، جس کو اس کی خاندانی غیرت و محبت بھی نہ توڑ سکی، اس کا شاندار اور پر وقار عہد حکومت ۵۵۷ھ مطابق ۱۱۶۲ء میں ختم ہوگیا اور مسلسل چوبیس سال حکومت کرنے کے بعد وہ تاریخ کی امانت بن گیا۔

۴:- حسن ثانی

۵۵۷ھ مطابق ۱۱۶۲ء میں محمد کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے حسن ثانی نے منصب اقتدار سنبھالا، یہ وہی حسن ثانی ہے جس کی امامت کی تحریک اس کے والد کے زمانے میں چلی تھی مگر دب گئی تھی، جب خود حسن ثانی کو امامت کی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع ملا تو یہ تحریک بڑی تیزی کے ساتھ ابھری، خود حسن ثانی کو بھی یہ خبط سوار ہوگیا تھا کہ واقعۃً وہی امام الطریق ہے، جب اس کے ذہن پر یہ مالیخولیائی خبط سوار ہوا تو اس نے اپنے کو ایک امام کی حیثیت سے استعمال کرنا شروع کیا، پھر اس نے وہ تمام ڈرامائی رول ادا کئے جو شیعوں کے امام ادا کر سکتے تھے، شیعوں کے نظریے کے مطابق امام کو حلال و حرام، احکام شریعت اور تمام امور میں تصرف کا اختیار حاصل ہے چنانچہ حسن ثانی نے حکومت پر آتے ہی سب سے پہلا یہ اعلان کیا کہ ۵۵۹ھ کو رمضان کے مہینے میں قیامت قائم ہوجائے گی، پھر اس نے شریعت کے وہ تمام احکام جو اس کے والد کے دور میں بڑی سختی کے ساتھ جاری تھے یکلخت اس نے منسوخ کر دیئے، تمام تکلیفات شرعیہ اٹھالی گئیں، رمضان میں روزے کی فرضیت بھی ساقط کر دی گئی۔

لوگوں کو دینی معاملات میں اس قدر آزادی ملنے کے بعد اس گھڑی کا انتظار رہا جس میں قیام قیامت کا اعلان کیا گیا تھا، مگر ۵۵۹ھ آیا اور چلا بھی گیا مگر قیامت نہ آئی اور نہ آنی تھی، اس وقت ان لوگوں کو سنہرا موقع ہاتھ آیا جو اس کے والد کے دور سے اس کی امامت کے دل سے قائل نہ تھے بلکہ امامت کے لئے خاندان نزار کو لازمی شرط قرار دیتے تھے، ان حضرات نے حسن ثانی کی امامت کے بارے میں شبہات پھیلانے شروع کئے، اور اس کے کذب و فریب اور فسق و فجور کے ایک ایک راز کا افشا شروع کیا جو اس نے امامت کے پردے میں چھپا رکھا تھا، ان کی ایک ہی آواز تھی جو الموت کے بام و در سے بار بار ٹکراتی تھی۔

حسن ثانی مردہ باد! جھوٹا امام مردہ باد! حسن ثانی جھوٹا ہے مکار ہے، جھوٹے امام کی پہچان یہ ہے کہ قیامت کی خبر دے مگر قیامت نہ آسکے، سچا امام صرف نزار کے خاندان میں پیدا ہوسکتا ہے اور حسن ثانی نزار کے خاندان کا نہیں بلکہ بزرگ کے خاندان کا فرد ہے۔

اس تحریک اور لوگوں کے ذہنوں پر اس سے پڑنے والے منفی اثرات سے حسن ثانی بے خبر نہیں تھا مگر اس کی سمجھ سے یہ بالاتر بات تھی کہ وہ اپنے خلاف اس فتنے کو کیسے دبائے؟ جو ایک روایتی صداقت اور فکری جمود پر مبنی تھا، جب کسی فتنے کا آغاز فکری بنیادوں سے ہوتا ہے تو اس کو تلوار کی طاقت سے دبانا بڑا مشکل ہوجاتا ہے، تلوار تحریک کے رجال کار کا خاتمہ کرسکتی ہے مگر فکری قوت کو پھیلنے پر وہ قادر نہیں، تاریخ کے مطالعہ سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فکری اور نظریاتی تحریک اس قدر طوفانی تھی کہ قوم کی اکثریت متزلزل ہوگئی، اس وقت ظاہر ہے کہ تلوار کے زور سے دبانا سیاسی پالیسی کے قطعاً خلاف ہوتا، ورنہ اگر طاقت وقوت کے ذریعہ سے اس تحریک کو دبانا ممکن ہوتا تو وہ سیاسی اعتبار سے اس قدر بے شعور نہ تھا اور نہ اتنا بزدل کہ اپنے ملک کے باغیوں سے مقابلہ نہ کرسکتا، اس کے پاس سیاسی شعور اور فوجی طاقت کے ماسوا منصبی تقدس بھی تھا جس کی بدولت باغی گروپ کے بڑے سے بڑے سورماؤں کو وہ مات کرسکتا تھا۔

مگر اس کی سیاسی کونسل نے جو اس کی حلقۂ ارادت بھی تھی فیصلہ کیا کہ اس کا جواب طاقت کے بجائے عقل واستدلال سے دیا جائے، اور کوئی ایسی راہ نکالی جائے جس سے آسانی کے ساتھ یہ فتنہ خاموش ہوسکے، کافی غور وخوض کے بعد کونسل جس نتیجہ پر پہنچی اس کا اعلان صبح میں شہر کے ہر چوراہے پر کیا جارہا تھا، کونسل کے فیصلے کے بنیادی اجزاء یہ تھے

امام زماں حضرت حسن ثانی علیہ السلام بلاشبہ امام برحق ہیں، جن حضرات کو اعتراض ہے کہ امام صرف نزار کے خاندان میں پیدا ہوسکتا ہے ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت امام حسن اگرچہ ظاہری اعتبار سے کیا بزرگ کے پوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ خاندان نزاری کے ایک فرد ہیں، دنیا ظاہری تناسل انسانی کی بناء پر ان کو محمد بن کیا بزرگ سمجھ رہی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ باطنی طور پر وہ اس نزاری امام روپوش کے

فرزند ہیں جن کو دنیا نے نہیں دیکھا، اور نہ خدا کو یہ منظور ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہوں، خدا نے یہ چاہا کہ اس امام روپوش کو امام حسن ثانی کے روپ میں ظاہر کیا جائے مگر نزار کے خاندان سے نہیں، اس لئے کہ نزار ایک راز الٰہی بن چکا ہے، اس کا دوبارہ ظاہر ہونا اسکے مرتبے کے منافی ہے اسی لئے خدا نے حضرت امام موصوف علیہ السلام کو محمد ابن کیا بزرگ کی صُلب سے پیدا کیا۔

عقلی تحریک کا یہ استدلالی جواب تھا جو حسن ثانی کے زعم میں سب سے کامیاب اور آخری ہتھیار تھا مگر بہت جلد اسے معلوم ہوگیا اس کا استدلالی رخ اس کے لئے مزید خطرناک ثابت ہوا اسکے کذب وفریب کے ثبوت کے لئے باغیوں کے پاس ایک اور دلیل ہاتھ آگئی، اور فتنے کی شدت تھمنے کے بجائے اور بڑھ گئی، پھر یہ طوفانی سیلاب آہستہ آہستہ ملک کے اطراف سے سمٹ کر ایوان شاہی کی دیواروں سے ٹکرانے لگا، اس کے بعد اچانک اس میں ایک ہولناک تلاطم پیدا ہوا اور ۵۶۱ھ مطابق ۱۱۶۶ء میں حسن ثانی اس طوفان کی نذر ہوگیا، امامت ومسند حکومت پر بیٹھے ہوئے ابھی صرف چار سال ہوئے تھے کہ وہ اس مسند سے ہمیشہ کیلئے اتار دیا گیا۔ ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار۔

۵۔ محمد ثانی ابن حسن ثانی

حسن ثانی کے انتقال پر مسند حکومت اس کے بیٹے محمد ثانی کو ملی، اس کا دور حکومت کافی طویل ہے، اس نے مسلسل چھیالیس سال تک حکومت کی، اس نے آبائی نہج پر نظریۂ قیامت کی توسیع واشاعت میں بہتر رول ادا کیا، اس کے زمانہ میں سلجوقی حکومت کمزور ہو چکی تھی اور ترکوں کے فتوحات آسمان کو چھونے لگے تھے، ان عالمی تبدیلیوں نے اسے اپنی سلطنت کے استحکام کا خوب موقع دیا جس سے اس نے بروقت فائدہ اٹھایا اور اسی کی بنا پر وہ اس قدر طویل حکومت کرنے پر قادر بھی ہوسکا۔ ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۰ء میں اس چھیالیس سالہ زبردست حکمراں کی لاش ایوان شاہی سے باہر نکلی اور لوگوں نے اپنے حکمراں کو آخری سفر کے لئے نمناک آنکھوں کے ساتھ الوداع کہا

۶۔ جلال الدین حسن ثالث

محمد ثانی کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین حسن ثالث تخت نشین ہوا، اس نے صرف گیارہ سال تک حکومت

کی، مگر اس قلیل مدت میں اس نے وہ اصلاحات کیں جو اس کی زیرکی وفراست ہمت وشجاعت اور سیاسی بصیرت اور نیک نیتی کا ثبوت تھیں اس نے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب ونظریات کو چھوڑ کر خالص اسلامی نظریات اور عقائد صحیحہ کو اختیار کیا، اس نے خود اپنے پیش روآباواجداد پر لعنت وکفر کے فتوے صادر کئے، فاطمی نزاری مذہب کی تمام کتابیں جلا ڈالیں، اور اس نے اپنے اسلام کا برملا اعلان کیا۔

اسلام کا اعلان کرنے کے بعد اس نے اسلامی ممالک سے تعلقات استوار کئے، عباسی خلیفہ الناصرالدین اللہ اور سلطان سلجوقی خوارزم شاہ سے سفارتی روابط قائم کئے اور ان کو اپنے صدق واخلاص کا اطمینان دلایا ـــــ یہ ممالک اسلامیہ کیلئے غیر معمولی مسرت کا مقام تھا، اس لئے کہ اس گروہ کی دہشت وبربریت نے ایک عجیب ہیجان پیدا کر رکھا تھا، اس ناگہانی انقلاب کو ممالک اسلامیہ نے نصرت غیبی سمجھا، اور الموت کے نومسلموں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ان کے لئے وہی رعائتیں اور سہولتیں فراہم کی گئیں جو اسلامی ممالک کے مسلمانوں کو میسر تھیں۔

۶۱۸ھ مطابق ۱۲۲۱ء کو اس انقلابی مسلم حکمراں نے اپنی قوم کو آخری سلام کیا اور محشر میں ملاقات کا وعدہ کرکے وہ ان سے رخصت ہو گیا، پھر حشیشین کی تاریخ میں ایسا انقلابی حکمراں پیدا نہ ہوا، حشیشین ماؤں کی گودیں ایسے سپوت کے لئے ہمیشہ کے لئے ترس گئیں، قابل مبارکباد ہے وہ ماں جس نے جلال الدین جیسا سپوت دنیا کو دیا۔

۷: محمد ثالث ابن حسن ثالث

بعض تاریخی روایات کے مطابق محمد ثالث کا نام علاء الدین محمود تھا ۱۲۲۱ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد حکمراں بنایا گیا، مگر اس وقت اس کی عمر صرف نو سال تھی، ظاہر ہے کہ نو سال کا نابالغ بچہ حکمرانی کی اہلیت نہیں رکھتا تھا چنانچہ اتالیق کے طور پر اسکے والد کے وزیر نے انتظامات سنبھالے، دستخط اس نابالغ حکمراں کے ہوتے تھے اور فیصلے وزیراعظم کے، جب حکمراں خود اپنے اندر فیصلہ اور تنفیذ کی قوت نہ رکھے تو قانون ملکی ایک کھلونا اور مذاق بن جاتا ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اسکے دور میں وہ تمام جرائم اور فکری الحاد عود کر آئے جو اس کے بلند باپ نے بند کروا دیے تھے۔ ایک نابالغ بچہ حکمرانی کے منصب پر جب فائز ہوا تو اس کا دماغ آسمان

کو چھونے لگا مگر اس کا کمزور ذہن و دماغ اس بلندی کا متحمل نہ ہو سکا، چنانچہ تاریخ کے مطابق صرف پانچ یا چھ سال حکومت کرنے کے بعد اس کے دماغ میں خلل آگیا اور وہ جنون کا شکار ہوگیا، اب تک الموت کا حاکم ایک نابالغ بچہ تھا مگر اب اس کا حکمراں ایک مجنون شخص ہوگیا، بچہ گیا تھا، چوری ڈاکہ زنی اور ظلم وستم کی وارداتیں عام ہوگئیں، قوانین کاغذات میں موجود تھے مگر ان کو نافذ کرنے والا حکمراں موجود نہ تھا۔

حکمرانی کی تاریخ میں محمد ثالث وہ پہلا اور آخری انسان ہے جس نے چند برس نابالغی میں، اور چند سال جنون کی حالت میں حکومت کی، جبکہ اسلامی شرع کی روشنی میں نابالغ اور مجنون دونوں کو خود اپنے اوپر بھی ولایت واختیار حاصل نہیں ہوتا چہ جائیکہ ایک ملک وقوم کا حکمراں بن جائے فیاللاسف مگر اس قوم پر کتنی بار ماتم کی جائے جس نے اپنے اوپر ایک نابالغ اور مجنون کو مسلط کیا محض اس بنا پر کہ وہ سابق حکمراں کا بیٹا ہے، گویا حکومت واقتدار ان کے نزدیک ایک خاندانی وراثت تھی جو چار و ناچار اس کے صلبی بیٹے ہی کو ملے گی۔

محمد ثالث کا وجود انسانی تاریخ پر ایک بدنما داغ تھا جو ۱۲۲۵ھ میں دھل گیا اس جنونی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور محمد ثالث اپنے باپ کی روح کو حساب چکانے کے لئے روانہ ہوگیا۔

۸:- رکن الدین خورشاہ

۱۲۲۵ء میں محمد ثالث کے مرنے کے بعد مسئلہ کھڑا ہوا کہ اب کسے حکمراں بنایا جائے اسلئے کہ محمد ثالث نے کوئی فرزند نہیں چھوڑا تھا، کافی تلاش وجستجو کے بعد بدنصیب رکن الدین خورشاہ کو اقتدار کی کرسی سونپ دی، میں اس کو بدنصیب اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ وہ دور تھا جب ترک کی سیاہ آندھی صحرائے گوبی سے اٹھ کر پوری دنیا پر پھیل رہی تھی، چنگیز خاں اپنے مظالم وخونریزیوں کی داستان سمیٹ کر دنیا سے جا چکا تھا مگر اس کا پوتا ہلاکو خاں اس داستان رنج والم کو مزید رنگین کرنے کی فکر میں تھا، خوارزم اور اس جیسے بہت سارے اسلامی ممالک تباہ ہو چکے تھے آخر کار ۱۲۵۶ء میں اس نے اسماعیلیہ کے قلعوں پر بھی کامیاب حملے کئے اور بڑھتے بڑھتے قلعہ الموت کے دروازہ تک پہونچ گیا، اب رکن الدین کے لئے قلعہ حوالے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ اس نے ۶۵۴ھ میں الموت بھی اس کے حوالے کر دیا، ہلاکو خاں نے

الموت سمیت چالیس فلک بوس قلعوں کو پیوند خاک کر دیا، رکن الدین خورشاہ کی اس وقت تو جان بخشی کر دی گئی بلکہ ظاہری اعزاز کے ساتھ اس کو رہنے کا موقعہ دیا گیا مگر ۱۲۵۸ء میں اچانک اسے قتل کر کے حشیشین کے سیاسی دور کا خاتمہ کر دیا گیا، پھر فارس کی سرزمین سے حشیشین کا سیاسی چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔

۹:- شمس الدین محمد اسماعیلی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قلعہ پر ہلاکو کے قبضہ سے پہلے ہی رکن الدین نے اپنے اکلوتے بیٹے شمس الدین محمد کو کہیں چھپا دیا تھا جو ہلاکو کی گرفت سے بھاگ کر قوقاز کے جنوب میں کسی علاقے میں چلا گیا تھا، کچھ دنوں بعد اس نے انجودانام کی ایک بستی جو اصفہان اور ہمدان کے راستے پر واقع تھی اس میں اس نے قیام کیا، اور زندگی کی آخری سانس تک وہیں رہا، چونکہ یہ گمنامی کی موت مرا اس لئے اس کی صحیح تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی، البتہ اس قدر معلوم ہے کہ آٹھویں صدی ہجری کے نصف اول میں اس کا انتقال ہوا۔

شمس الدین محمد ہی کی نسل سے انیسویں عیسوی میں ائمہ حشیشین کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں نے اپنی امامت کے دعوے کئے جس کو حشیشین کے یہاں شرف قبول بھی حاصل ہوا، — آغا خاں کا شجرۂ نسب بھی شمس الدین ہی سے ملتا ہے۔

شمس الدین کے مرنے کے بعد حشیشین دو گروپ میں تقسیم ہو گئے

۱ — ایک گروپ نے محمد شاہ کی امامت کا نظریہ قائم کیا بلکہ امامت کو اس کی نسل کے ساتھ مخصوص ہونے کا دعویٰ کیا چنانچہ محمد شاہ کی نسل میں سے کچھ لوگوں کو اس گروپ نے امامت کے منصب پر فائز بھی کیا مگر امامت کا یہ سلسلہ بہت جلد دسویں صدی ہجری کے نصف تک ختم ہو گیا اس سلسلے کا آخری امام طاہر شاہ ثالث تھا جو دکنی کے لقب سے مشہور تھا، اس نے ہندوستان کا رخ کیا اور ہندوستان ہی میں قریب ۹۵۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اسکے بعد اس گروپ کا باقاعدہ وجود تاریخ کی نگاہ میں نہ آیا، اگر اس کے کچھ لوگ کہیں کہیں موجود بھی ہوں تو وہ اس قدر گمنام ہیں کہ تاریخ کی دوربین سے بھی ان کو دیکھنا مشکل ہے۔

۲ — دوسرے گروپ نے قاسم شاہ کی امامت کا عقیدہ اختیار کیا، اس گروہ نے کافی اکثریت حاصل کی مگر یہ بھی فارس سے ہجرت کر کے نہر جیحون کے بالائی علاقوں میں آباد ہو گئے (باقی آئندہ)

از: مولانا شمس تبریز خاں ــــــــــــ استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

مَقالہ نگاری کے رَہنما اصُول

خصوصاً طلبۂ مدارسِ عربیہ کیلئے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو صلاحیتیں عطا کی ہیں ان میں خیر و شر دونوں کے امکانات ہیں اور ان کا طریقۂ استعمال انھیں برا یا بھلا بناتا ہے ہمارے سامنے ابتدائے کائنات سے خیر و شر کا معرکہ برپا ہے جس میں چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی ستیزہ کار اور جنگ آزما ہے، اسلئے انسان کی سعادت یہ ہے کہ وہ اس معرکے میں خیر کا سپاہی اور رحمانی بنے اور شر و فساد کی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کرے۔ اسلام میں اس فیصلہ کن معرکے کا نام 'جہاد' ہے، جو شمشیر و سناں کے ساتھ قلم و زباں سے بھی انجام دیا جاتا ہے، اور زندہ قومیں آج بھی ان سے کام لے رہی ہیں، یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ ہم اس معرکے میں دفاعی پوزیشن میں بلکہ اس سے بھی بدتر حالت میں ہیں، اور ہماری صفیں ابتر ہیں، ہمارے اسلحے ناکارہ اور طریقۂ کار فرسودہ ہوچکا ہے مگر اس تاریکی میں امید کی کرن یہ ہے کہ دنیا اپنی نظریاتی کشمکش سے عاجز ہوکر ایک بہتر نظام حیات کی تلاش میں ہے اور سرد و گرم جنگوں کے عذاب میں مبتلا ہوکر امن و انسانیت کے فطری اقدار کی طرف راغب ہے، دنیا کے اس فکری و سیاسی خلاء کو دین فطرت، اسلام ہی پُر کرسکتا ہے، اور اسے دین و دنیا کی نجات یا سعادت دارین عطا کرسکتا ہے۔

تاریخ انسانی نے اپنے طویل سفر کے بعد جن مہذب اقدار کو اپنایا ہے ان میں جنگ و جدال کی جگہ مکالمات و مذاکرات اور تقریر و تحریر کے ذریعہ نفرت اور باہمی کشیدگی اور اختلافات کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش بھی ہے جس کے لئے سفارتی ذرائع، صحافت و نشریات بین المذاہب مکالمات کے طریقے اپنائے جاتے ہیں جو سے بڑی حد تک بین الاقوامی عظمت

اور اس عالم کی راہ ہموار ہوئی ہے۔

ان تمام ذرائع ابلاغ میں آج تحریر کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور جائز و ناجائز ہر مقصد کے لئے اس سے بڑے پیمانے پر کام لیا جاتا ہے، دنیا کی بڑی طاقتیں اور زندہ قومیں تحریری اسلحہ سے بھی پوری طرح کام لے رہی ہیں اور ان کی تحریروں نے ایک طوفان وسیلاب کی شکل اختیار کرلی ہے، جن سے مرعوب ہوکر کچھ لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ہم اپنی تحریروں سے اس سیلاب پر بند نہیں باندھ سکتے کہ مغرب کا یہ سیلاب روز بہ روز بڑھتا جاتا ہے۔

مگر سیلاب کا مقابلہ کرنے کیلئے ہم اس پر پشتہ نہیں تیار کرسکتے تو محفوظ جزیرے تو قائم کرسکتے ہیں یا اس کو عبور کرنے کیلئے کوئی پل تو تعمیر کرسکتے ہیں، یا کم ازکم کشتیاں اور سفینۂ نجات LIFE.BOOT تو بنا سکتے ہیں؟

عصر حاضر میں تحریر کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہم مذکورہ تمثیل سے کرسکتے ہیں کہ آدمی کو سیلاب سے بچنے کے لئے کم ازکم ہاتھ پاؤں مارنا ہی پڑتا ہے۔

قف دون رأيك في الحياة مجاهدا ÷ ان الحياة عقيدة وجهاد

۱۔ صحت فکر و نظر

کوئی بھی تحریر لفظ و معنی کا مجموعہ ہوتی ہے جن کے حسن سے اس کا حسن نکھرتا ہے اور اس کی اہمیت اور قدر و قیمت متعین ہوتی ہے اس لئے ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ ہم جو خیال پیش کریں وہ صحیح و صحت مند مثبت و مفید اور نتیجہ خیز ہو، اور زندگی کو نئی معنویت، افادیت اور ترقی و توانائی عطا کرتا ہو، یا کسی غلط فہمی، غلط رجحانات وخیالات اور باطل افکار و نظریات کی تردید کرتا ہو جو انسانی زندگی کے لئے خطرناک اور تباہ کن ہیں۔

اس لحاظ سے ہماری پہلی فکر و کوشش صحت فکر و نظر کی ہونی چاہئے جس کی ضمانت اسلامی تصورات اور کتاب وسنت کی تعلیمات میں بدرجۂ اتم موجود ہے، ہمیں زیادہ سے زیادہ اس مثالی نمونہ اور ابدی معیار سے قریب رہنا چاہئے اور انھیں اپنے فکر و عمل کی میزان بنانا چاہئے

دوسری طرف مذاہب عالم، تاریخ عالم (خصوصا تاریخ یورپ) مغربی تحریکات، مغربی ادب وفلسفہ، علوم جدیدہ اور اپنے معاصر فلسفہ و مذاہب اور حالات حاضرہ سے گہری واقفیت اور تنقیدی مطالعے سے اسلامی اقدار و افکار کو تقویت دینی چاہئے اور اسلام کو انسانی دنیا کے غالب فکری

بجائے اور وقت کے موزوں ترین ناگزیر اور نجات دہندہ فلسفہ حیات کے طور پر پیش کرنا چاہئے
جو آیت کریمہ ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ کا تقاضا ہے۔

۲۔ زبان وبیان موثر وطاقتور تحریر کے لئے زبان وبیان کی عمدگی اور شائستگی پختگی وبرگزیدگی لازمی شرط ہے، اس لئے زبان کی اصلاح وترقی کے لئے نظم ونثر کے عمدہ اور معیاری ادبی نمونوں اور مشاہیر شعر وادب کی تصانیف کا مطالعہ ضروری ہے اور ان میں بھی اسلامی الفکر یا صحت مند فکر رکھنے والے شعراء وادباء کو پیش نظر رکھنا چاہئے جن کا ادبی سرمایہ کمیت وکیفیت میں اتنا اور ایسا ہے جسے ادب کے مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ادب کا مطالعہ ہی ذخیرۂ الفاظ فراہم کرتا ہے جس سے آپ مناسب وموثر اظہار خیال کے لئے کام لے سکتے ہیں، برصغیر میں اسلامی فکر کے خادموں کو اردو، عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی اور ہندی سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔

یہاں میں ادب کو اسکے وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں صرف ادب کے روایتی مضامین و اصناف نہیں بلکہ اس میں تاریخ وجغرافیہ، فلسفہ وسائنس، سیر وسوانح، اور مذہبی تحریریں بھی شامل ہیں جو ادبی زبان اور علمی اسلوب میں لکھی گئی ہوں کہ ادب کو میں زندگی ہی کی طرح ہمہ جہت ہمہ صفت اور ہمہ گیر سمجھتا ہوں، اور ذہنی وعملی دونوں سطحوں پر تحفظات وتعصبات کو غلط سمجھتا ہوں، اور اقبال پسندی کے اقبالی مجرم ہونے کے ناتے قصۂ قدیم وجدید، کو دلیل کم نظری مانتا ہوں اور اس کا قائل ہوں کہ

مشرق سے نہ پرہیز نہ مغرب سے حذر کر ❊ فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

۳۔ اسلوب اسلوب وطرز نگارش کے سلسلے میں یہ بنیادی بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہر مصنف اپنا اسلوب اسی طرح خود لے کر آتا ہے جس طرح وہ اپنی ممتاز ومنفرد شخصیت اور شکل وصورت لے کر آتا ہے، اس لئے نقالی وتقلید کے بجائے اپنی توجہ اپنی شخصی انفرادیت، اور اپنی ذاتی صلاحیت کی پہچان، تعمیر خودی اور عرفان ذات پر مبذول کرنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیت کی قدر کرتے ہوئے اسے پروان چڑھانا چاہئے، اس نکتے کی طرف مجھے سب سے پہلے بزرگ ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے متوجہ کیا تھا جسے میں نے بالکل صحیح پایا۔ اس لئے اسلوب کے سلسلے میں کوئی غیر فطری ومصنوعی طریقہ اپنانے کے بجائے

اپنے فکری وشعوری تقاضوں کے تحت لکھتے رہنا چاہئے کہ اس طرح خود بخود ایک فطری اسلوب پیدا ہو جائے گا جو طاقتور اور موثر ہوگا اور اپنی انفرادیت کا نقش بھی قائم کردے گا۔

۴۔ عملی طریقہ کسی موضوع پر لکھنے کے لئے اس کے متعلق موافق ومخالف مواد کا پورا احاطہ کرنا چاہئے کہ کوئی بات دائرہ تحقیق سے باہر نہ رہ جائے، مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ قول نقل کیا کہ اتنا پڑھو اتنا پڑھو کہ علم اُبلنے لگے اور قلم لکھنے پر مجبور ہو جائے، یعنی وسعت مطالعہ ومعلومات جب معیار مطلوب تک پہنچ جاتے ہیں تو انھیں احاطہ تحریر میں لانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

لکھتے وقت اپنی تحریر کا ایسا جامع عنوان رکھنا چاہئے جو پورے مضمون ومواد کا غماز اور اشارہ ہو۔ پھر تمہید میں موضوع کا اجمالی تعارف اور اسکی اہمیت واضح کرنی چاہئے اور سورۃ الفاتحہ کا مثالی نمونہ سامنے رکھنا چاہئے جس کے بارے میں اہل نظر جانتے ہیں کہ وہ قرآن مجید کا سر عنوان اور اشاریہ ہے پھر ترتیب وتسلسل کے ساتھ نفس موضوع کے مثبت ومنفی پہلوؤں کا ذکر کرنا چاہئے اور آخر میں مرتبہ ومطلوبہ نتائج کا خلاصہ پیش کرنا چاہئے، اور سابقہ روایت کی توسیع وتجدید کے ساتھ اپنی دریافت اور اپنے نتائج فکر بھی سامنے لانے چاہئیں جس سے علم وذوق میں اضافہ ہو۔

۵۔ مواد مواد کے لئے حتی الامکان اولین مآخذ (First hand Sources) اور بدرجۂ مجبوری معتبر ثانوی مآخذ سے کام لینا چاہئے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم نے حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ متاخرین کے حوالے سے اس طرح پرہیز کرتے تھے گویا بعد کی صدیاں ان کے لئے آئی ہی نہ تھیں، کتابوں کے بجائے اخباری حوالے اور انسائیکلوپیڈیا ئی حوالے دوسرے درجہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں اس لئے ان سے بقدر ضرورت ہی استفادہ کرنا چاہئے

ہر بات کتاب، مصنف، جلد، صفحہ، مقام اشاعت، سنہ اشاعت اور اگر ماہوار ہے تو ماہ اور اگر روزانہ ہے تو تاریخ اشاعت کے حوالے سے کہنی چاہئے اور مقالہ وکتاب دونوں میں اس کا التزام کرنا چاہئے، مقالہ ومضمون کی حد زیادہ سے زیادہ سو صفحات ہیں اگر مواد اس سے زیادہ کا ہے تو اسے کتابی شکل دینی چاہئے، مقالے میں اجمال اور اختصار کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہئے اور عربی اصطلاح کے مطابق ایجاز مخل (مخل انداز ایجاز) اور اطناب ممل (اکتا دینے والے اطناب وطوالت) سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہئے
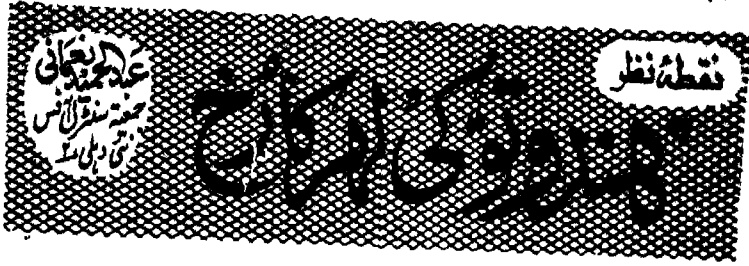
ہندو سماج اپنی شناخت کی تلاش میں پوری شدّت سے سرگرداں ہے، اگرچہ یہ اپنی پہچان کی تلاش کا سفر شنکر اچاریہ، خصوصاً آریہ سماج کے دور تک پھیلا ہوا ہے تاہم ۱۹۲۴/۲۵ء میں ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس کے قیام کے بعد اپنی تلاش کے سفر میں شدت کے ساتھ جارحیت بھی آگئی جس کا نقطۂ عروج رام جانکی یاترا ۱۹۸۴ء، رام جنم بھومی مکتی تحریک اور شہادت بابری مسجد (۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء) کو کہا جاسکتا ہے، لیکن ان تمام جارحانہ کوششوں کے باوجود ہندو سماج کی شناخت اور فکری اتحاد کا معاملہ جوں کا توں معرض خطر میں پڑا ہوا ہے۔ اخبارات و رسائل اور کتابوں میں یہ سوال اٹھایا جارہا ہے کہ ہندوتو کیا ہے؟ لیکن اس سوال کا براہ راست واضح جواب دینے کی بجائے بحث و گفتگو کا رخ غیر متعلق سوالوں اور باتوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے، اس سلسلے میں رام سروپ ارون شوری، کے آر ملکانی کی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں، ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد گیری لال جین، اڈوانی، شیشادری، مرلی منوہر جوشی، دویا نواس مصرا، بھانو پرتاپ شکلا، وی پی بھاٹیہ، (اڈیٹر آرگنائزر) سری کانت بالی، شلیش مٹیانی، نریندر موہن، ایسے ہندو دانشوروں کی تحریرات و مضامین انگریزی، ہندی اخبارات، انڈین اکسپریس، ٹائمز آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز، نوبھارت ٹائمز، ہندوستان دینک جاگرن، راشٹریہ سہارا، آرگنائزر، پانچ جنیہ وغیرہ میں اشاعت پذیر ہوچکے ہیں، اور اب بھی ہورہے ہیں۔

لیکن اصل سوال اب بھی جواب طلب ہے، ہندو سماج ذہنی و فکری لحاظ سے انتہائی کش مکش اور بے سمتی کا شکار ہے اور یہ اس کی پرانی بیماری ہے، ذات پات، طبقاتی اونچ نیچ ہندو سماج ——— کا لازمی حصہ بن چکا ہے، اگرچہ اسلامی تصورِ مساوات اور مغرب کی سائنسی ترقی سے روشنی لے کر بہت سے ہندو دانشوروں نے سماج سے چھوت چھات اور سماج سے

اونچ نیچ اور ذات پات کو ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن انھیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں مل پائی گاندھی جی برابری کی تحریک چلاتے ہوئے ایک جنونی ہندو فرقہ پرست ناتھو رام گوڈسے کے ہاتھوں مارے گئے۔ بابا بھیم راؤ امبیڈکر نے ہریجنوں اور سماج کے پسماندہ طبقے کو سماجی انصاف دلانے کے لئے ہندو دھرم چھوڑ کر بدھ دھرم کو اپنایا لیکن آج بھی ہریجنوں کو سماجی انصاف و مساوات سے بڑی ہوشیاری سے دور رکھا گیا ہے، آج بھی ان کی باراتوں پر بڑی ذات کے ہندوؤں کے حملے ہو رہے ہیں، ان کی ماؤں بیٹیوں کی عصمت انفرادی واجتماعی طور پر دن دھاڑے اور رات کی تاریکی میں لوٹی جارہی ہے۔

ہندو سماج کا سب سے بڑا مسئلہ بلکہ کہئے کہ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسی متحدہ بنیاد نہیں ہے جس پر سماجی عمارت کھڑی کی جاسکے نتیجے میں پورا معاشرتی ڈھانچہ چرمرا کر رہ گیا ہے اس ذہنی شکستگی اور فکری بحران کا علاج کچھ لوگوں نے اقلیتوں خصوصاً مسلم دشمنی میں تلاش کر لیا ہے۔ اس کے سوا ہندو سماج کے پاس کوئی ایسی زمین ہی نہیں ہے جس پر بکھرے ہندو سماج کو متحد اور استادہ کیا جاسکے، لیکن ظاہر ہے کہ اس منفیانہ اور جارحانہ جدوجہد سے کوئی پرامن، تعمیری اور پرسکون با اعتماد راشٹر وجود میں نہیں آسکتا ہے، جب بھی ملک و سماج سے فرقہ ورانہ تناؤ، کشیدگی کم ہوگی "ہندوتو" کو اپنے داخلی بحران کا سامنا کرنا پڑیگا۔

یہ بات ۱۹۸۱ء کی ہے، جب میناکشی پورم میں برہمن واد کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے سبب چند سو ہریجنوں نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کرلیا، یہ ہندوتو کے علمبرداروں اور مفروضہ سنہرے ہندو سنسکرتی کا گیت گانے والوں کے لئے ایک زبردست دھکا ثابت ہوا ہونا تو یہ چاہئے کہ ہندو سماج سے اونچ نیچ اور ذات پات کی پرانی بیماری اور بڑی ذات کے ہندوؤں کی طرف سے چھوٹی ذات کے ہندوؤں خصوصاً ہریجنوں پر ہونے والے ظلم وزیادتی اور بے انصافی کو ختم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی جاتی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا، البتہ حسب سابق ہندو مسلم تفریق، فرقہ پرستانہ منافرت اور مسلم دشمنی کا جانا مانا راستہ اپنایا گیا، اور تیر بہدف [illegible] کو ہندو مسلم خانوں میں بانٹنے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کردی گئی، [illegible] تحفظ گائے جیسا کہ ابھی حالیہ ضمنی الیکشن نومبر ۱۹۹۳ء میں بھی گاؤ

رکھنا کا نعرہ دیا گیا، حالانکہ جن لوگوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ خصوصاً ویدوں منوسمرتی والمیکی رامائن کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے وہ ہماری اس بات کی تائید کریں گے کہ گائے کو مذہبی لحاظ سے تقدس قطعاً حاصل نہیں تھا، اقتصادی نقطۂ نظر سے تحفظ گائے کا مسئلہ امر دیگر ہے لیکن جب دیکھا گیا کہ اس سے بھی کام نہیں چل رہا ہے تو مفروضہ اور جھوٹی زمین پر "مندر مکتی" کی پُرجارحیت تحریک شروع کی گئی، ابتداءً اکثریت کے مذہبی جذبات کو ابھارنے کے لئے بقول جارج فرنانڈیز آنجہانی وزیراعظم ہند اندرا گاندھی کے اشارے پر بہار کے سیتا مڑھی سے رام جانکی رتھ یاترا نکالی گئی جو چند سالوں سے جاری رام جنم بھومی تحریک کیلئے تمہید کی حیثیت رکھتی ہے، ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء اس قاتل انسانیت وانصاف تحریک کا نقطۂ عروج تھا، اس تحریک نے سماج کو دیا تو کچھ نہیں سوائے انسانی جانوں کا ضیاع، املاک وجائداد کی تباہی، بربادی اور فرقہ وارانہ نفرت، لیکن یہ ضرور ہوا کہ ایک بار پھر ہندو سماج کا ذہن اصل بیماری اور مسائل سے ہٹ گیا، اسے ہندو فرقہ پرست لیڈران اور صحافی ومصنفین ہندو جاگرتی (ہندو بیداری) اور اتحاد کا نام دے رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ میناکشی پورم میں ہریجنوں کے اجتماعی قبول اسلام کا مناسب ومعقول جواب نہیں ہے، بلکہ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ ہندو سماج کو وقار، فخر، فکری ذہنی زمین اور پراچین سبھیتا (تہذیب) دینے کی تحریک چلا رہے ہیں ان کے پاس ایسی کوئی دعوت ہے ہی نہیں جس میں انسانیت کا بھلا ہو۔

اوپر ہم نے جو کچھ ہندو سماج کے فکری انتشار، واقعہ میناکشی پورم اور رام جنم بھومی تحریک کے تعلق سے کہا ہے اس کا ہندو لیڈران بھی اعتراف کرتے ہیں مثلاً وشو ہندو پریشد (جس کی قیادت ورہنمائی میں رام جنم بھومی کی مفروضہ جارح تحریک چلائی گئی اور شہادت بابری مسجد کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے) کے جنرل سکریٹری جناب اشوک سنگھل نے آر ایس ایس کے ہفت روزہ ترجمان پانچ جنیہ کے "شری رام جنم بھومی نمبر" میں واضح طور پر کہا ہے کہ "یہ بات تو سچ ہے کہ ہندو سماج پر جو حملہ ہو رہا ہے، جو بے انصافی ہو رہی ہے ان سب کے سلسلے میں ہندو سماج میں فکر وتشویش رہی ہے یہ سلسلہ سیکڑوں سال سے جاری ہے..... ابھی تک ویسی صورت حال ہے، ظلم چپ چاپ برداشت کیا جاتا تھا، کن وجوہات سے یہ فکر و

تشویش اور اداسی ختم ہوئی؟ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اچانک میناکشی پورم کا جو واقعہ (قبول اسلام کا) پیش آیا اس نے ہندو سماج کو ایک جھٹکا دیا، اسی وقت سے یہ بیداری کا کام جاری ہے، وشو ہندو پریشد نے بھی اس میں تعاون دیا ہے پہلے تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہندو کے نام پر سماج کھڑا ہو جائے گا مگر یہ آج ممکن ہو گیا ہے جو ایک بہت بڑی کامیابی ہے"

(شری رام جنم بھومی نمبر ۱۰ بابت ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۸۹ء)

یہی بات وشو ہندو پریشد کے فیض آباد اکائی کے ایک اہم لیڈر کہتے ہیں، ہفت روزہ دن ان ٹائمس کی ایک اشاعت میں اعتراف کیا ہے "کہ ہم تو خاموش بیٹھے تھے لیکن میناکشی پورم کے قبول اسلام کے واقعے نے ہندو سماج کو جھنجوڑ دیا کہ ہندو سماج کے اس بحران پر کیسے قابو پایا جائے"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ رام مندر کی تعمیر اور ہندو سماج کو متحد کرنے کی تحریک کسی مثبت اور نیک بنیاد پر نہیں چل رہی ہے، بلکہ ہندو سماج کو داخلی بحران، ذہنی فکری انتشار سے بچانے کا ایک غلط اور منفیانہ طریقہ اور جارحانہ کوشش ہے، رام جنم بھومی یگیہ سمیتی کے صدر مہنت اویدیہ ناتھ اپنی نجی گفتگوؤں میں کہتے ہیں رام مندر نہیں بن سکے گا (البتہ تاریخی بابری مسجد اور قدیم مندر تو توڑ دیئے) میں یہ جانتا ہوں لیکن سماج کو متحد رکھنے کیلئے اس مسئلے کو اچھالتے رہنے کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں ہے" (دیکھئے ہفت روزہ سنڈے میل ۲۱ ر اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۲)

مہنت اویدیہ ناتھ نے ہندو سماج کی جس "متحدہ بنیاد" کی نشاندہی کی ہے وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ ہندو سماج کو متحد کرنے اور رکھنے کے لئے ذات پات کے نظام کے سوا کوئی بھی ایسا طاقتور نظریہ نہیں ہے جو ہندو سماج کو متحد رکھ سکے جیسا کہ ہندوستان کے ذاتی نسلی نظام کے محقق و مورخ جناب ایم این سری نواس نے اپنی کتاب (جدید ہندوستان میں ذات پات ص ۸۵) میں لکھا ہے "اسلام مغربیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے بہتر طور پر لیس ہے کیونکہ اس کی تنظیم بڑی مضبوط ہے جب کہ ہندو دھرم میں ذات پات کے سوا کوئی اور تنظیم نہیں ہے اگر ذات پات کا خاتمہ ہو جائے تو ہندومت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا"

یہی وجہ ہے کہ ہندو فرقہ پرست تنظیمیں اور مصنفین، صحافی مثلاً آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد کے ایم ایس گولوالکر، رام سروپ، ارون شوری، بھانو پرتاپ وغیرہ ہندو سماج خصوصاً بڑی ذات کے ہندوؤں

کو اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں اور اسلام کے خلاف "ہندوتو" کے نام پر اکسا اور ابھار رہے ہیں، ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ۱۹ر نومبر ۱۹۸۳ء میں وشو ہندو پریشد دہلی اکائی کے سکریٹری جناب بیکنٹھ لال شرما نے کہا تھا "ہندو قریب المرگ سانڈ کی طرح ہیں جسے ہم دم پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ دوبارہ زندگی حاصل کرے۔ (ہفت روزہ سنڈے ۱۱ر تا ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۳ء)

Hindus are like a dying bull which we are trying to yank up by its tail and bring back to life again.

اب سوال یہ ہے کہ قریب المرگ سماج کو کیسے اٹھایا جائے، بیدار کیسے کیا جائے، اس کیلئے آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بی جے پی نے اعلا ہندو دماغوں کے تعاون سے تین طریقے اپنائے ہیں ۱۔ ایک تو یہ کہ ہندو سماج اور دھرم پر فرضی خطرات و خدشات کا شور مچا کر اکثریتی فرقے کو مذہبی جذبات کی بنیاد پر متحد کیا جائے، ۲۔ دوسرے یہ کہ اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے مذہبی تشخصات و امتیازات کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ان تمام اہم علامات و نشانات کو مٹا دیا جائے جو اسلامی شعائر اور مسلم تہذیب و تمدن کی عظمت و رفعت اور تقدس کا احساس دلاتے ہیں، ۳۔ تیسرے یہ کہ مسلم نوازی، اقلیت پرستی، خصوصی مراعات، سہولیات اور ہندوؤں کے ساتھ بے انصافی اور بے اعتنائی کا ہوا کھڑا کر کے ان میں احساس ضیاع کے ساتھ ماضی میں بہت کچھ کھونے کی سوچ پیدا کی جائے، تاکہ حال میں اسے پانے کے لئے ہندو سماج مرنے اور مارنے پر آمادہ ہو جائے اور آپ دیکھ لیجئے یہی کچھ کیا اور ہو رہا ہے کہ نہیں؟۔

آر ایس ایس، بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے لوگ مذکورہ تینوں باتوں کو وطنیت بنام اقلیت، مانوتا (انسانیت) بنام مسلم نوازی اور سچی وطن دوستی بنام سیکولرزم کا عنوان دیتے ہیں (بی جے پی کے صدر جناب ایڈوانی نے مشہور جریدہ انڈیا ٹوڈے کو دیئے گئے ایک خصوصی انٹرویو میں مذکورہ تینوں باتوں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے) جب کہ یہ سارے دعوے خلاف واقعہ دھونس دھاندلی اور فریب پر مبنی ہیں، آر ایس ایس کی زہریلی سوچ اور مخصوص جارحانہ نظریے کی اشاعت کی راہ میں موجودہ سیکولرزم کسی حد تک باندھ اور دیوار کا کام انجام

دیتا ہے اس لئے اسے ہندو فرقہ پرست نقلی سیکولرزم کا نام دیتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ ہندو فرقہ پرست تنظیموں، مصنفین اور پارٹیوں کو ہندوستانی آئین وقانون پر کبھی اعتماد و یقین ہی نہیں رہا ہے، اس کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ سے "غدارانہ" فریب کارانہ اور منافقانہ رہا ہے، اس کا اعلا ترین نمونہ ۲۴ ، ۲۵ جنوری ۱۹۹۳ء کو الہٰ آباد میں ہونے والے دو روزہ سنت سمیلن ہے، جس میں رام جنم بھومی مکتی آندولن کے کرتا دھرتا جناب مکتانند نے اپنے ۲۳ صفحے کے کتابچے میں آئین ہند، اشوک چکر، اقلیتوں کی پوزیشن، ہندوؤں کے پس ماندہ طبقوں اور قبیلوں کے سلسلے میں بہت ہی باغیانہ جارحانہ اور تباہ کن نقطۂ نظر پیش کیا ہے، انھوں نے آئین ہند کو غلامی کا دستاویز قرار دیتے ہوئے اسے ختم کرکے ہندو شاستروں مثلاً منوسمرتی پر مبنی آئین ہند بنانے کا گستاخانہ اعلان کیا، اور ـــ کتابچے میں لکھا ہے کہ اقلیتوں کو دیئے گئے قانونی مراعات وتحفظات پس کی گانٹھ، اور فساد کی جڑ ہیں، لہٰذا تمام مراعات پر خط تنسیخ پھیر دیا جائے جب کہ اس سے قبل بی جے پی کے صدر لال کرشن اڈوانی رتھ یاترا (۲۵ ستمبر تا ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء) کے دوران بڑے فخر سے یہ کہتے پھر رہے تھے کہ "ہماری رتھ یاترا کا مقصد رام مندر کی تعمیر اور نقلی ادھورے سیکولرزم کو ختم کرنا ہے (سنڈے مزدور، ۷ اکتوبر ۱۹۹۰ء)

ہندو راشٹر کا قیام ـــ مندر تحریک کی منزل

رام جنم بھومی مندر کی تعمیر کی تحریک کا مقصد جہاں ہندو سماج کو "ہندوتو" کی منفی بنیاد پر متحد کرنا، داخلی بحران سے بچاؤ، اور سماج میں اونچ نیچ غیر برابری کے نتیجے میں اٹھے طوفان کو دبانا ہے وہیں نتیجے کے طور پر اصل اور اہم مقصد جمہوری سیکولر ہندوستان کو ہندو راشٹر میں تبدیل کرنا بھی ہے جیسا کہ ہندو مہاسبھا کے صدر رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمیتی کے کرتا دھرتا مہنت اویدیہ ناتھ کا کہنا ہے: انھوں نے آر ایس ایس کے ہفت روزہ ہندی ترجمان پانچ جنیہ (بابت ۲۴ دسمبر ۱۹۸۹ء) کو دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں واضح طور پر اس مقصد کا اظہار کیا ہے: اصل سوال مندر کی تعمیر کا نہیں بلکہ ہندو راشٹر کے مستقبل کا ہے ماضی میں ہندو فرقہ پرست تنظیموں کی طرف سے چلائی جانے والی تحریکوں خصوصاً ۱۹۴۸ء سے جاری

سرگرمیوں کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ان کی ساری دوڑ دھوپ کا مقصد گائے کی رکھشا اور مندر کی تعمیر نہیں بلکہ اس کے حوالے سے آر ایس ایس کے خوابوں کے ہندوستان آریہ ورت ہندو راشٹر کی تشکیل و قیام ہی ہے۔

جن لوگوں نے آر ایس ایس کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے قیام کا مقصد اصلی ہندو راشٹر کا قیام ہے، باقی چیزیں توضمنی ہیں جیسا کہ آر ایس ایس کے بانی ڈاکٹر کیشو بلی ہیڈگوار نے کہا ہے " آر ایس ایس کو یہ سچ ثابت کر دکھانا ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے، ہندوستان ملک ہندوؤں ہی کا ہے جیسے کہ دیگر ممالک میں وہاں کے " راشٹریک" رہتے ہیں، یہ راشٹر ہندو لوگوں کا ہے، اس راشٹر میں ہندو کہتے ہی اس طرف ذہن منعطف ہوجانا چاہیے کہ سنگھ اس سچائی کو پہچانتا ہے، آر ایس ایس کے بارے میں باقی باتیں جاننے کی ضرورت نہیں"(پانچ جنیہ کا امرت نمبر بابت ۹ راپریل ۱۹۸۲ء ص۱۳)

آر ایس ایس کا ہندی ترجمان پانچ جنیہ ہندوستانی عوام خصوصًا ہندو عوام کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی برسوں سے کوشش کررہا ہے کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے اس لئے وہ ہندوستان کی بجائے " ہندوستھان" کا لفظ استعمال کرتا ہے، حتیٰ کہ جو لوگ آر ایس ایس کے ہندو راشٹر کے نظریے سے متفق نہیں ہیں ان کی تحریروں کو بھی "ہندوتو" کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے، مثلاً ماہنامہ "الرسالہ" دہلی کے ایڈیٹر جناب مولانا وحیدالدین خاں کی تحریروں میں موجود لفظ ہندستان کو " ہندوستھان " میں بدل دیا جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ خاں صاحب کی گول مول خوشامد آمیز باتوں سے " ہندو راشٹر" کے نظریہ کو تقویت ملتی رہتی ہے، لیکن شاید انھیں اس کا کماحقہ احساس نہیں ہے۔

گذشتہ ۱۹۸۹ء کا عام الیکشن اور نومبر ۱۹۹۳ء کے الیکشن میں رام مندر کی تعمیر کے لئے مقررہ تاریخوں اور بیانات و تقاریر سے آر ایس ایس اور بی جے پی کے فرقہ پرست لیڈروں کی سوچ کی واضح نشاندہی ہوتی ہے، مہنت اویدیہ ناتھ نے اپنے ایک انٹرویو (ہفت روزہ بلٹز ۲۶ رجنوری ۱۹۹۱ء ص۱۵) میں کہا کہ "ملک میں ہندو راشٹر قائم ہوتے ہی ملک کے سارے مسائل حل ہوجائیں گے" ۲۵ رستمبر ۱۹۹۰ء کو از سومناتھ تا اجودھیا شروع

ہونے والی اڈوانی رتھ یاترا کو آر ایس ایس کے اہم ترین رکن ایچ وی شیشادری نے ہندو راشٹر کے قیام کی سمت پیش رفت بتایا اور کہا کہ یہ کسی سیاست داں کی رتھ یاترا نہیں ہے بلکہ اس یاترا کا مقصد ہندو راشٹر کا قیام ہے، آر ایس ایس ہندو راشٹر کے قیام کے لئے قائم ہوئی تھی، اور اس مقصد کو خواب نہیں رہنے دیا جائے گا (روزنامہ ٹائمز آف انڈیا دہلی بابت ۳ اکتوبر ۱۹۹۰ء)

ہندو فرقہ پرستوں کا برہمنی فکر پر مبنی ہندو راشٹر کے قیام کا مقصد اتنا واضح ہے کہ اس پر کسی طرح پردہ نہیں ڈالا جاسکتا، نہ وہ خود ڈالنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، لیکن اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اتنا ضرور کرنا پڑے گا کہ ملک کے آئین و دستور کی جمہوری سیکولر حیثیت کو ختم کردے، اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی دینی مذہبی ملی اور معاشرتی شناخت ختم کردے اور ان کے خلاف پورے ہندو سماج کو آمادہ پیکار کردے جو ابھی تک خدا کے فضل و کرم سے نہیں ہوپایا ہے، تاہم رام جنم بھومی کے مسئلہ کو علامتی طور پر پوری جارحیت کے ساتھ استعمال کیا جارہا ہے، گرچہ ۴۶۵ سالہ قدیم بابری مسجد شہید کی جاچکی ہے لیکن یہ ہندو فرقہ پرستوں کی مکمل کامیابی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے اصل مقصد کی سمت میں ابتدائی قدم ہے، اگر وہ خدانخواستہ سیکولر طاقتوں/پارٹیوں کے مشکوک و متزلزل رویے اور وحیدالدین خاں و دیگر مسلم جدید یے دانشوروں کی بے دانشی کی وجہ سے بابری مسجد کے سلسلے میں جنگ جیت گئے تو یہ ملک کے لئے سیاہ ترین دن ہوگا، اور ہندوستان ہندوستان نہیں رہ جائے گا بلکہ وہ آر ایس ایس کے خوابوں کے مطابق "ہندوستھان" ہوجائے گا، لہٰذا آر ایس ایس اور بی جے پی کے ہر کام کو کام چلاؤ انداز میں لینے کی بجائے سنجیدگی سے لینا پڑے گا، خصوصاً دین پسند مسلمانوں بالخصوص علماء اسلام کے طبقے کو۔ گرچہ ہندو سماج کے پسماندہ طبقات و قبائل بھی برہمنی فکر و تہذیب کی زد میں یقیناً آئیں گے، تاہم دینی، مذہبی، ملی اور معاشرتی لحاظ سے مسلمانوں کا معاملہ ان سے بڑی حد تک مختلف اور سنگین ہے، جبکہ مذکورہ طبقات و قبائل کے مسائل و مشکلات کی نوعیت بڑی حد تک صرف سماجی ہے۔

مسئلہ تراویح میں اختلاف

بریلوی علماء کا سعودی عرب کے ائمہ ومشائخ پر یہ الزام کہ وہ لوگ بیس رکعت تراویح کو بدعت کہتے ہیں اور آٹھ پڑھتے ہیں قطعاً غلط الزام ہے۔

اگر بریلوی مولوی قمرالدین اعظمی کو کبھی رمضان المبارک میں حرمین شریفین کی حاضری کی سعادت نہ مل سکی ہو تو اسے کم از کم دوسرے بریلوی علماء سے تو پوچھنا چاہئے تھا کہ ائمہ حرمین تراویح کی نماز کے بارے میں کیا موقف رکھتے ہیں؟ ہر وہ مسلمان جسے رمضان میں حرمین شریفین کی حاضری کی سعادت نصیب ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ رمضان المبارک میں حرمین شریفین میں بیس رکعت تراویح ہوتی ہیں۔ اور خود ائمہ حرمین بیس رکعات نماز تراویح پڑھاتے ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ رمضان المبارک میں تراویح اور تہجد کی دو الگ الگ جماعتیں ہوتی ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ائمہ حرمین کے نزدیک نماز تراویح بیس رکعات سنت ہیں، اور نماز تراویح اور تہجد دو الگ الگ عبادتیں ہیں۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ بریلوی مولوی قمرالدین نے سعودی عرب کے ائمہ ومشائخ کے مسلک ومذہب کو برطانیہ میں مقیم غیر مقلد علماء سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، انھیں خود کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی ہوگی کہ حقائق کو خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں

سعودی عرب کے ائمہ ومشائخ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مقلد ہیں اور تراویح کے بارے میں اسی موقف پر ہیں جو صحابہ کرام، تابعین اور ائمہ مجتہدین کا ہے، حضرت امام مالکؒ موطا میں دونوں روایتیں لاتے ہیں، لیکن آپ اس روایت پر عمل کرتے ہیں جس میں بیس رکعات تراویح کا ذکر ہے

حضرت امام شافعیؒ نے جب سے شعور پایا آپ نے دیکھا کہ حرمین شریفین میں بیس رکعات تراویح پڑھی جارہی ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک عمل سنت نہ ہو اور اسے حرمین شریفین میں سنت کے طور پر اس تسلسل سے ادا کیا جارہا ہو، حضرات صحابہ کرام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء کی خلاف ورزی کی اور آٹھ کو بیس بنادیا انتہائی خطرناک عقیدہ ہے، شیعہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ حضور کے خلاف چلے ہیں، حضرت امام احمد کا مذہب تراویح کے باب میں کیا ہے اسے دیکھیں۔

والمختار عند ابی عبد اللہ رحمہ اللہ فیھا عشرون رکعۃ وما کان علیہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولی واحق ان یتبع (المغنی لابن قدامہ جلد ۲ ص ۱۶۷)

امام احمدؒ کے نزدیک تراویح میں بیس رکعات مختار ہیں ۔ جس چیز پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ عمل کرتے رہے وہی حق کے قریب اور اتباع کے زیادہ لائق ہے۔

حنبلی مسلک کے ممتاز محدث اور فقیہ حافظ ابن قدامہ (۶۲۰ھ) لکھتے ہیں ۔

ولنا ان عمر رضی اللہ عنہ لما جمع الناس علی ابی بن کعب کان یصلی لھم عشرین رکعۃ

(ترجمہ) ہمارے لئے دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب لوگوں کو ابی بن کعب پر جمع کیا تو وہ ان کو بیس رکعات پڑھاتے تھے۔

اور پھر روایات اور سیدنا حضرت علی المرتضیٰ کا اثر ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں ۔

وھذا کالاجماع اور یہ بمنزلہ اجماع صحابہ کے ہے۔ (المغنی لابن قدامہ جلد ۲ ص ۱۶۸)

فقہ حنبلی کی ایک اور مشہور کتاب مقنع میں ہے۔

ثم التراویح وھی عشرون رکعۃ یقوم بھا فی رمضان فی جماعۃ ..... (مقنع ص ۱۸۱)

فقہ حنبلی کی ایک اور معروف کتاب نیل المآرب کی یہ تصریح دیکھیں

التراویح سنۃ مؤکدۃ عشرون رکعۃ برمضان والاصل فی مسنونیتھا الاجماع

(نیل المآرب فی الفقۃ الحنبلی)

رمضان میں بیس رکعت تراویح سنت مؤکدہ ہے اور اس کی مسنونیت اجماع سے ثابت ہے۔

دسویں صدی کے مشہور حنبلی عالم شیخ منصور بن یونس حنبلی (۱۰۴۲ھ) لکھتے ہیں ؛

وھی عشرون رکعۃ لما روی مالک عن یزید بن رومان قال کان الناس یقومون فی

زمن عمر فی رمضان بثلاث وعشرین رکعة ...... وھذا فی مظنة الشھرة بحضرة الصحابة فکان اجماعًا (کشف القناع عن متن الاقناع جلد ۱ صفحہ ۳۹۲)

تراویح بیس رکعات ہیں، چنانچہ امام مالکؒ نے یزید بن رومان سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں تئیس رکعات پڑھا کرتے تھے ..... اور حضرت عمرؓ کا صحابہ کی موجودگی میں بیس کا حکم دینا عام شہرت کا موقع تھا اس لئے یہ اجماع ہوا۔

مسجد نبوی میں مجمع عام کا عمل ایسی شہرت اور استفاضہ رکھتا ہے کہ اس کے آگے نقل کرنے میں اتصال زمانی ضروری نہیں، یزید بن رومان رحمہ اللہ اس دور میں ہوئے کہ انھوں نے اس شہرت اور استفاضہ کو پایا ہے۔

سعودی عرب کے مشہور عالم اور مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰة والتسلیم) کے مدرس اور مدینہ منورہ کے قاضی شیخ عطیہ سالم نے مسجد نبوی میں نماز تراویح کی چودہ سوسالہ تاریخ پر عربی میں "التراویح" کے نام سے ایک نہایت مفید کتاب تحریر فرمائی ہے، سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسجد نبوی میں بعض لوگ آٹھ تراویح پڑھ کر چلے جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ آٹھ تراویح پڑھنا ہی بہتر ہے اور اس سے زیادہ جائز نہیں، یہ روش بہت افسوسناک ہے، اس لئے یہ کتاب لکھی جارہی ہے تاکہ لوگوں کے شکوک وشبہات دور ہوجائیں، شیخ عطیہ سالم نے اس کی پوری تفصیل (صدی وار) بیان فرمائی، آخر میں سعودی حکومت کے دور کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ثم جاء العھد السعودی فتوحدت فیه الجماعة فی المسجد النبوی وفی المسجد الحرام للصلوات الخمس وللتراویح وعادت حالة الامامة الی اصلھا موحدة منتظمة اما عدد الرکعات وکیفیة الصلوٰة فکانت عشرین رکعة بعد العشاء وثلاث وتر ودُعاء طیلة الشھر ...... وعلیه فتکون التراویح قد استقر علی عشرین رکعة بعد العشاء علی مایدل علیه العمل فی جمیع البلاد (التراویح من الف عام فی مسجد النبی صفحہ مطبعة المدنی سنہ ۱۳۹۱ھ)

یعنی سعودی حکومت میں حرم مکی اور مسجد نبوی میں پانچوں نمازوں اور تراویح کو منظم کردیا گیا ہے اب پورے رمضان میں عشاء کے بعد بیس تراویح اور تین وتر پڑھے جاتے ہیں، پس تراویح کا بیس رکعات

پڑھنا بالکل پختہ قرار پاچکا ہے اور دوسرے تمام علاقوں میں بھی یہی عمل ہے۔

سعودی عرب کے مشہور عالم اور ریاض یونیورسٹی کے استاذ شیخ عبدالعزیز المحمد السلمان بھی لکھتے ہیں : فالقیام بعشرین هوالافضل وهوالذی یعمل به اکثرالمسلمین۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس کا بھی یہی مسلک ہے، ونقل عن ابن عباس انها عشرون رکعة فی جماعة ونقل ذلك عن مالك ایضا ومال الی ذلك ابن عبدالبر۔

(دیکھئے اتحاف المسلمین جلد ۲ ص۲۵۱، ص۲۵۲)

خود غیر مقلد عالم مولانا عبداللہ روپڑی صاحب لکھتے ہیں کہ بیس رکعات تراویح پر جمہور کا عمل واتفاق ہے، آپ لکھتے ہیں، جمہور کا عمل بیس پر ہے (فتاوی اہل حدیث جلد ۱ ص۶۶۴)

اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ سعودی عرب کے ائمہ اور مشائخ بالخصوص ائمہ حرمین بیس رکعات تراویح کے قائل ہیں اور سیدنا حضرت عمرؓ اور صحابۂ کرام کے اجماع سے انحراف نہیں کرتے، نہ وہ آپ کو معاذ اللہ بدعتی اور تراویح کی بیس رکعات کو بدعت کہتے ہیں بلکہ اسے سنت سمجھ کر ہی پڑھتے ہیں، اگر وہ حضرات اسے سنت نہ سمجھتے تو ضرور آٹھ رکعات پر آجاتے مگر افسوس کہ غیر مقلد علماء کے نزدیک ائمہ حرمین کا یہ عمل سراسر خلاف سنت ہے، حتی کہ ہند و پاک میں برسر عام بیس رکعات پڑھنے والوں کے ساتھ مناظرہ کا چیلنج بھی دیتے ہیں۔

غیر مقلد علماء کا تراویح کے بارے میں کیا موقف ہے اسے بھی دیکھئے، مولانا عبداللہ صاحب روپڑی لکھتے ہیں : "تراویح اصل میں آٹھ ہی ہیں" (فتاوی اہل حدیث جلد ۱ ص۶۴۳)

جو لوگ تراویح کو بیس رکعات سنت سمجھ کر پڑھتے ہیں ان کے بارے میں غیر مقلد علماء کا فتوی ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ کس طرح بیس رکعات تراویح پڑھنے والوں کو (جن میں سعودی عرب کے علماء و مشائخ بھی آجاتے ہیں) برا کہنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

• جو سنت سمجھ کر پڑھے وہ غلطی پر ہے اس کو کوئی برا کہے تو اس کو برا نہیں کہا جاسکتا (ایضاً ص۶۴۳)

یعنی بیس رکعات تراویح کو سنت سمجھ کر ادا کرنے والے کو اگر کوئی لعن وطعن کرے تو ایسا شخص برا نہیں ہے۔ بلکہ غیر مقلد علماء ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جو بیس رکعات تراویح سنت سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

ہم بیزار ان سے ہوں گے جو بیس کو سنت سمجھ کر پڑھتے ہیں (ایضاً ص۲۸۲)
اب آپ ہی سوچیں کہ یہ غیر مقلد علماء ائمہ حرمین اور ان کو مقرر کرنے والی مملکت سعودیہ سے قلباً بیزار ہیں کہ نہیں؟

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری لکھتے ہیں،

" اہل حدیث کا مذہب ہے کہ رمضان کے مہینے میں آٹھ رکعت مع وتر گیارہ رکعت تراویح سنت ہیں " (اہل حدیث کا مذہب ص۵۰)

آپ یہ بھی لکھتے ہیں ،

" اگر کسی صحیح روایت سے ثابت ہو جائے کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں نماز تراویح باجماعت آٹھ رکعت سے زیادہ پڑھی جاتی تھی تو ہمیں اس پر عمل کرنے سے انکار نہیں ہے "
(فتاوی ثنائیہ جلد ۱ ص۵۴۲)

لیجئے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ حضرت عمر فاروق رضؓ کے دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

فلما جمعهم عمر على ابى بن كعب كان يصلى بهم وعشرين ركعة ثم يوتر بثلاث .- (الفتاوى المصرية جلد ۲ ص۱۰۳)

جب حضرت عمر فاروق رضؓ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعب کی امامت میں جمع کیا تو وہ بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

فلما كان عمر رضى الله عنه جمعهم على امام واحد وهو ابى ابن كعب الذى جمع الناس عليه بامر عمر بن الخطاب وعمر هو من خلفاء الراشدين حيث يقول صلى الله عليه وسلم عليكم بسنتى وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدى عضوا عليها بالنواجذ يعنى الاضراس لانها اعظم فى القوة وهذا الذى فعله هو سنة (فتاوى ابن تيميه جلد ۲۲ ص۲۳۴)

جب حضرت عمر رضؓ نے سب صحابہ کو حضرت ابی بن کعب کی امامت میں جمع کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلفاء راشدین میں سے ہیں جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فر

میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرو اور اسی کو ڈاڑھوں کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو، ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھوں کا اس لئے ذکر فرمایا کہ ڈاڑھوں کی گرفت مضبوط ہوتی ہے، سو حضرت عمرؓ کا یہ فعل عین سنت ہے۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ نے حکم دیا تھا کہ حضرت ابی ابن کعبؓ نماز تراویح بیس رکعت پڑھائیں، اور آپ کا یہ حکم اور یہ فعل عین سنت ہے، اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مقابلے پر نہیں بلکہ آپؐ ہی کے منشار کے مطابق ہے، اور یہ فعل "خلافت راشدہ" کے دور سے ثابت ہے، اسی لئے سعودی علمار ومشائخ بیس رکعت سنت سمجھ کر ہی ادا کرتے ہیں جبکہ غیر مقلدوں کے نزدیک یہ بدعت ہے، ہندوستان میں سب سے پہلے غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بٹالوی نے فتویٰ جاری کیا تھا کہ آٹھ رکعت ہی سنت ہیں اور بیس رکعات بدعت ہیں، حالانکہ اس وقت بیس رکعات ہی پڑھی جارہی تھیں، مولانا بٹالوی کے اس فتوے کے جواب میں مشہور غیر مقلد عالم مولانا غلام رسول صاحب (قلعہ میاں سنگھ) نے "رسالہ تراویح" لکھا، اس میں آپ مولانا بٹالوی کے فتوے کا ذکر کرتے ہیں۔

فعل صحابہ وتابعین وائمہ اربعہ وفعل سواد اعظم مسلمین شرقاً وغرباً از عہد عمر فاروق تا ایں وقت ہمہ بیست وسہ می خوانند بخلاف ایں مفتی غالی کہ بدعت ومخالف سنت می گوید وراہ افراد می پوید (رسالہ تراویح ص۲۸)۔

حضرات صحابہ کرام وائمہ اربعہ اور مسلمانوں کی عظیم جماعت کا یہ عمل ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے دور سے لے کر اس وقت تک مشرق ومغرب میں ۲۳ رکعت ہی پڑھتے ہیں، بخلاف اس غالی مفتی کے کہ وہ اس کو بدعت اور مخالف سنت کہتا ہے اور افراط کی راہ پر چلتا ہے۔

آپ یہ بھی لکھتے ہیں :۔

وایں مفتی بسینہ زوری اعمال متبعان سنت را بدعت می گوید وسواد اعظم را از صحابہ وتابعین وائمہ مجتہدین وعلمار شرق وغرب از عہد عمر بن الخطاب تا امروز مخالف سنت قرار می دہد۔ (ایضاً)

اور یہ مفتی (مولانا محمد حسین بٹالوی) نہایت سینہ زوری کے ساتھ سنت کی پیروی کرنے والے

کے عمل کو بدعت کہتا ہے اور حضرت عمرؓ کے دور سے لے کر آج تک حضرات صحابہؓ و تابعین وائمہ کرام کی عظیم جماعت اور مشرق و مغرب کے علماء کے عمل کو مخالف سنت قرار دیتا ہے۔

اس وقت ہمارا موضوع "مسئلہ تراویح" نہیں، بتلانا صرف یہ ہے کہ غیر مقلدوں کے نزدیک جو لوگ بیس رکعات تراویح کی نماز ادا کرتے ہیں وہ بدعت کے مرتکب ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مخالف ہیں وہ مکۃ المکرمہ میں ہوں یا مدینۃ المنورہ میں۔

اور سعودی علماء و مشائخ کے نزدیک بیس رکعات تراویح چودہ سو صدی کا متفقہ عمل ہے، اور حرمین شریفین میں اس کے مطابق ہی نماز تراویح ادا کی جا رہی ہیں، اور سنت سمجھ کر ہی پڑھی جاتی ہیں، سعودی عرب کے علماء بدعت سے سخت نفرت کرتے ہیں انھیں بدعتی اور مخالفِ سنت کہنا ہرگز صحیح نہیں، جو غیر مقلد انھیں بدعتی کہتے ہیں وہ خود بدعتی ہیں

مندرجہ بالا شواہد و دلائل کی روشنی میں یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ سعودی عرب کے علماء و مشائخ سے غیر مقلد علماء کا شدید اختلاف ہے، وہ حضرات تقلید کے قائل اور اس پر عامل ہیں، جب کہ غیر مقلد تقلید کو گناہ سمجھتے ہیں اور اس کی مذمت میں کتابیں اور رسالے شائع کرتے ہیں۔

سعودی عرب کے علماء فاتحہ خلف الامام کو واجب نہیں سمجھتے اور غیر مقلد علماء قرأت فاتحہ خلف الامام کو فرض جانتے ہیں اور جو نہ پڑھے اس کی نماز کو باطل کہتے ہیں۔

سعودی علماء بیک وقت تین طلاق کو تین قرار دیتے ہیں اور اسی پر عدالتوں میں فیصلہ کرتے ہیں جب کہ غیر مقلد علماء تین طلاقوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔

سعودی علماء بیس رکعت تراویح کے قائل اور اس پر عامل ہیں، اسے سنت سمجھتے ہیں جب کہ غیر مقلد علماء آٹھ رکعت کو سنت کہتے ہیں اور بیس رکعت پڑھنے والوں کو بدعتی اور مخالف سنت کہتے ہیں۔

اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ کیا سعودی علماء اور غیر مقلد علماء کے نظریات ایک ہیں؟ اور کیا یہ دونوں ایک ہو سکتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی — ہم غیر مقلدوں کے پیشوا جناب نواب صدیق حسن خان صاحب کے اس ارشاد پر اس بحث

قرآن مجید
کے ساتھ عشق وشغف کی داستانیں

مولانا حافظ نور محمد مہری، سندھ، پاکستان

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم - امابعد :- عنوان بالا کے تحت صحابہ رضی و تابعین، ائمہ علماء راسخین اور بلند پایہ مشائخ اور اہل قلوب کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں، جن سے ان کے قرآن مجید کے ساتھ عشق و شغف اس کے آداب و عظمت اس کی تلاوت میں محویت استغراق اور لذت و کیفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس سلسلہ کی ابتدار خود اس ذات قدسی سے کی جاتی ہے جس پر قرآن پاک نازل ہوا۔

● حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ، میں نے کہا: آپ ہی پر نازل ہوا ہے اور آپ ہی کو سناؤں؟ فرمایا کہ ہاں میں دوسروں سے سننا چاہتا ہوں، میں نے سورۂ نساء پڑھنا شروع کی جب اس آیت پر پہونچا جس کا ترجمہ یہ ہے: سو اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ حاضر کریں گے اور لوگوں پر آپ کو بطور گواہ کے پیش کریں گے۔ میں نے سر اٹھایا تو دیکھتا ہوں کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

● آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۸ جس کا ترجمہ ہے: تو اگر ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر انھیں بخش دے تو بھی تو زبردست حکمت والا ہے، کو بار بار پڑھتے رہے یہاں تک کہ پوری رات گذر گئی۔ اور صبح ہو گئی۔

حضرت عائشہ رضی سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی بڑے رقیق القلب تھے قرآن پڑھتے وقت آنکھوں پر قابو نہ رکھ سکتے تھے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

● ابورافع کہتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت عمرؓ کے پیچھے فجر کی نماز پڑھ رہا تھا میں مردوں کی اس آخری صف میں تھا جس کے بعد عورتوں ہی کی صف ہوتی ہے، آپؓ سورۂ یوسف پڑھ رہے تھے، جب سورۂ یوسف کی اس آیت پر پہونچے جس کا مفہوم ہے کہ "حضرت یعقوبؑ نے کہا میں تو اپنے رنج وغم کی شکایت بس اپنے اللہ ہی سے کر رہا ہوں" حضرت عمرؓ بلند آواز سے قرآن شریف پڑھتے تھے، آپ پر ایسا گریہ طاری ہوا کہ ان کی ہچکیوں کی آواز تین صفوں کے پیچھے سنی۔

● حضرت حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے رات کے ورد میں کبھی کبھی کوئی آیت پڑھتے تو اتنا روتے کہ گرجاتے اور کثرت گریہ کی وجہ سے طبیعت نڈھال ہوجاتی اور آپ کو گھر میں ٹھہرنا پڑتا اور لوگ عیادت کے لئے آتے۔

● محمد ابن سیرین کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ پوری رات ایک رکعت میں گذار دیتے تھے جس میں پورا قرآن پڑھ لیتے تھے۔

● امام احمد اور ابن عساکر کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ کہتے تھے کہ تمھارے دل پاک ہوجائیں تو تم کو کبھی کلام اللہ سے سیری نہ ہو، میں نہیں چاہتا کہ میری عمر میں کوئی دن ایسا گذرے جس میں مجھے قرآن مجید دیکھ کر پڑھنے کی نوبت نہ آئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی تو جس مصحف میں وہ پڑھا کرتے تھے وہ ان کی تلاوت کی کثرت سے جا بجا شکستہ ہوگیا تھا

● حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ مجھے سورۂ یوسف حضرت عثمانؓ کے پیچھے پڑھنے سے یاد ہوگئی کیونکہ وہ کثرت سے فجر کی نماز میں سورۂ یوسف پڑھتے تھے۔

● حضرت علی المرتضیٰؓ کو وفات نبوی ؐ کے بعد قرآن شریف کے حفظ میں اتنا انہماک ہوا کہ کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔

● زرارہ ابن عوفی کے متعلق تو یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ وہ جامع مسجد میں نماز پڑھا رہے تھے جب سورۂ مدثر کی اس آیت پر پہونچے جس کا مفہوم ہے کہ "پھر جس دن صور پھونکا جائے سو وہ دن کافروں پر سخت ہوگا نہ کہ آسان" تو ان کی روح پرواز کرگئی اور وہ گر گئے۔

● خلیدؒ نماز پڑھ رہے تھے، ایک آیت کو بار بار دہراتے رہے، کسی نے گھر کے ایک گوشہ

سے آواز دی" کہاں تک اس آیت کو دہراتے رہو گے نہ معلوم کتنوں کے جگر شق ہو گئے۔

● حضرت اسماءؓ بنت ابوبکرؓ کے خادم حمزہ کہتے ہیں کہ حضرت اسماءؓ نے مجھے بازار بھیجا، اس وقت وہ سورۂ طور کی ایک آیت تلاوت کر رہی تھیں، میں بازار گیا بھی اور واپس بھی آگیا اور وہ ابھی تک وہی آیت تلاوت کر رہی تھیں۔

● حضرت تمیم داریؓ مقام ابراہیم پر آئے اور سورۂ جاثیہ کی یہ آیت پڑھنا شروع کی۔ "کیا جو لوگ برے کام کر رہے ہیں اس خیال میں ہیں کہ انھیں ان جیسا رکھیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کی زندگی اور ان کی موت یکساں ہے۔ سو کیا برا حکم یہ لوگ لگاتے ہیں" تو اس کو برابر دہراتے رہے اور روتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

● حضرت سعید ابن جبیر رمضان المبارک میں امامت کر رہے تھے جب وہ آیت "جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، ان کو گھسیٹتے ہوئے کھولتے ہوئے پانی میں لے جایا جائے گا اور پھر یہ آگ میں جھونک دیئے جائیں گے" پر آئے تو بار بار اس کو دہراتے رہے، ایک رات تہجد میں یہ آیت پڑھی "اور اس دن سے ڈرتے رہو جس میں تم رب اللہ کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے" تو اس کو تقریباً بیس مرتبہ دہرایا اور اتنا روئے تھے کہ کثرت گریہ کی وجہ سے آنکھوں میں تکلیف ہو گئی۔

● حضرت امام ابو حنیفہؒ نے ایک مرتبہ تہجد میں یہ آیت پڑھی "لیکن اس کا اصل وعدہ تو قیامت کے دن کا ہے، اور قیامت بڑی سخت اور ناگوار چیز ہے" اور وہ اس آیت کو صبح تک پڑھتے رہے۔

● مشہور مصنف و محدث، مورخ و ناقد علامہ ابن جوزی ہر ہفتہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے۔

● سلطان صلاح الدین ایوبیؒ فاتح بیت المقدس کو قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا کبھی کبھی برج میں پہرہ داروں سے دو دو تین تین پارے سن لیا کرتے تھے بڑے خاشع و خاضع اور رقیق القلب انسان تھے۔ قرآن مجید سن کر اکثر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

● شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ ۶ شعبان ۷۲۶ھ کو نظر بند کئے گئے جہاں انھوں نے

۲۲ ذی القعدہ ۷۲۸ھ کو سفر آخرت اختیار کیا، اس فرصت میں ان کا سب سے بڑا شغل تلاوت قرآن پاک تھا، وہ جیل میں تقریبًا دو سال چار ماہ رہے اس مختصر مدت میں انھوں نے اپنے بھائی شیخ زین الدین ابن تیمیہؒ کے ساتھ قرآن مجید کے اسّی دور ختم کرنے کے بعد جب نیا دور شروع کیا اور سورۂ قمر کی اس آیت پر پہونچے۔ جو پرہیزگار ہیں ان باغوں اور نہروں کے درمیان ہوں گے ایک اعلیٰ مقام پر قدرت والے بادشاہ کے نزدیک۔ تو بجائے اپنے بھائی زین الدین کے عبداللہ ابن محب اور عبداللہ الزرعی کے ساتھ دور شروع کیا، یہ دونوں نہایت صالح شخص تھے اور آپس میں حقیقی بھائی تھے، امام ابن تیمیہ کو ان کی قرات بہت پسند تھی، یہ دور ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ زندگی کے دن پورے ہو گئے۔

● آٹھویں صدی کے مشہور بزرگ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتوفی ۷۲۵ھ) کو قرآن مجید کا خصوصی ذوق تھا، اس کے حفظ کے اہتمام و تلاوت کی کثرت کی تاکید فرماتے تھے۔ امیر حسن علاء جب حضرت خواجہ سے متعلق ہوئے تو وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور شعر و شاعری زندگی بھر کا مشغلہ تھا، حضرت خواجہ نے ان کو ہدایت کی کہ قرآنی ذوق کو شعر و شاعری کے ذوق پر غالب کریں، امیر فوائد الفواد میں لکھتے ہیں کہ "بارہا ان مخدوم کی زبان مبارک سے میں نے یہ لفظ سنے ہیں کہ چاہئے کہ قرآن مجید کا پڑھنا شعر کہنے پر غالب آجائے"۔

● حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (م ۱۰۳۴ھ) کے حالات میں آتا ہے کہ تلاوت کے وقت چہرۂ مبارک اور پڑھنے کے انداز سے سامعین کو ایسا محسوس ہوتا کہ اسرار قرآنی و برکات آیات کا فیضان ہو رہا ہے، نماز اور بیرون نماز میں خوف کی آیات پڑھتے یا جن آیات میں تعجب و استفہام آتا ہے اس کا اندازہ و لہجہ پیدا ہو جاتا، رمضان میں تین قرآن سے کم ختم نہ کرتے، خود حافظ قرآن تھے۔

● حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمتوفی ۱۳۱۳ھ) ایک روز تلاوت قرآن کریم کر رہے تھے کہ آپ پر کیفیت طاری ہوئی، مولوی سید تجمل حسین صاحب سے فرمایا کہ "جو لذت ہم کو قرآن میں آتی ہے اگر تم کو وہ لذت ذرہ بھر آجائے تو ہماری طرح بیٹھ نہ سکو، کپڑے

پھاڑ کر جنگل کو نکل جاؤ: آپ نے آہ کی اور حجرے میں تشریف لے گئے، کئی روز تک بیمار رہے۔

● حضرت مولانا سید محمد علی نے فرمایا کہ میں نے ابتدا میں، حضرت سے عرض کیا کہ مجھ کو جو مزہ شعر میں آتا ہے قرآن مجید میں نہیں آتا، آپ نے فرمایا کہ ابھی بُعد ہے، قرب میں جو مزہ قرآن شریف میں ہے کسی میں نہیں۔

● مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں کہ مجھ سے فرمایا کہ قرآن شریف اور حدیث پڑھا کر کہ اللہ میاں دل میں آکر بیٹھ جاتے ہیں (یعنی ان کی یاد اس طرح قلب میں راسخ ہو جاتی ہے گویا خود مذکور قلب میں اتر گیا ہے۔)

● مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں کہ ایک بار مولانا محمد علی وغیرہ کا مجمع تھا، قرآن شریف کا ترجمہ ہوا، رکوع یہ تھا۔ اور آپ اس کتاب میں ابراہیمؑ کا ذکر کیجئے وہ بڑے راستی والے نبی تھے" اس کا ترجمہ فرمایا اور بعد اس کے وہ آیت پڑھی گئی جو حضرت اسمٰعیل کے بیان میں ہے" وہ اپنے رب کے پاس پسندیدہ تھے۔ ترجمہ فرمایا کہ تھا اپنے رب کا پیارا، یہ فرما کر چیخ ماری اور آپ پر گویا کیفیت مدہوشی کی طاری رہی اس واقعہ کے بعد دو مہینے سخت علیل رہے۔

یہ تھے ان حضرات کے واقعات جن کا عشق و شغف قرآن مجید کے ساتھ بے انتہا تھا، آج کل ہماری حالت یہ ہے کہ ہمیں ہر چیز سے شغف و تعلق ہے اگر نہیں ہے تو کلام خداوندی سے ہم قرآن مجید سے غافل ہو گئے اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم دنیا میں ہر جگہ رسوا ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن پاک سے لگاؤ اور محبت نصیب فرمائے آمین۔

وما علینا الا البلاغ ۔

از ——— محمد عمران قاسمی بگیانوی، عربی لیکچرر جامعہ طبیہ دیوبند

آغاز تدریس

رمضان ۱۳۲۶ھ میں سفر کلکتہ سے آپ نہایت شاندار کامیابی کے ساتھ واپس آئے تو حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے فرمایا کہ "مولانا مبارک ہو" آپ یہ سمجھے کہ شاید مقصدِ سفر کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دی جارہی ہے، آپ نے عرض کیا "حضرت یہ سب آپ حضرات اور دارالعلوم کی برکت ہے، حضرت حافظ صاحب نے فرمایا، مولانا میری مراد نہیں ہے بلکہ یہ کہ مدرسہ فتحپوری دہلی کی دوم مدرسی کے لئے حضرت صدرالمدرسین (شیخ الہندؒ) نے تمہارا انتخاب فرمایا ہے" مدرس اول علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور سوم مدرسی کیلئے مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کو منتخب کیا جاچکا تھا۔

اس وقت فتحپوری کے مدرس دوم مشہور معقولی مولانا عبدالعزیز ولایتی (تلمیذ مولانا عبدالحق خیرآبادی) تھے، علامہؒ ان کی تدریسی تجربے، فنی مہارت کی بنیاد پر وہاں کے ماحول پر چھوڑے ہوئے اثرات اور ان کی علمی شہرت وعظمت کے پیش نظر ہچکچائے اور اپنے اس خلجان کو مولانا محمد سہول صاحب (مدرس دارالعلوم دیوبند) کے سامنے پیش کیا مگر مولانا نے محبت آمیز فہمائش کی اور وہاں جانے کا حکم دیا، جو گویا ایک طرح سے علامہ کی صلاحیت پر اعتماد اور ان کی حوصلہ افزائی تھی مگر علامہؒ کی یہ ہچکچاہٹ دور نہیں ہوئی اور بالآخر آپ نے حضرت شیخ الہندؒ سے معذرت کرنے کا فیصلہ کرلیا[1]

ایک روز حضرت شیخ الہندؒ جب سبق پڑھاکر درس گاہ سے نکلے تو علامہؒ ان کے ساتھ ہولئے

---

[1] اس مقام پر شاید آپ کو حضرت تھانویؒ کا وہ تردد وجھجک یاد آجائے جو آغاز تدریس کے وقت انہیں پیش آئی خواجہ عزیزالحسن صاحبؒ نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے جیسا کہ حضرت والا کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی مدرسہ فیض عام میں بڑی بڑی کتابیں پڑھانے کو ملیں .... بہت گھبرائے کہ یا اللہ تعالیٰ ان کتابوں کو کیونکر پڑھاسکوں گا - (اشرف السوانح ج ۱ ص ۴۵)

اور نہایت رقت آمیز لہجہ میں اپنا یہ تردد ظاہر کرنے کے بعد عرض کیا کہ۔ حضرت میری وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ الہند نے یہ سنکر نہایت پرجوش اور ہمت افزا لہجے میں فرمایا۔ تم خود نہیں جا رہے ہو میں تمھیں بھیج رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اب تعمیل حکم کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا، اس طرح آپ بغرض تدریس مدرسہ فتحپوری تشریف لے گئے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت یا تصرف:۔

علامہؒ فتحپوری (دہلی) پہونچے تو ہدایہ آخرین، میر زاہد، ملا جلال، اور دیوان حماسہ پڑھانے کے لئے اسباق مقرر ہوئے، مطالعہ کرنے بیٹھے تو ہدایہ، میر زاہد اور ملا جلال کے مطالعہ سے تو جلد ہی فارغ ہو گئے لیکن ادب سے مناسبت کی کمی کے سبب دیوان حماسہ کے صرف تین اشعار میں دو گھنٹہ صرف ہو گئے[1] جبکہ مقررہ قاعدہ کے مطابق ایک سبق کیلئے ۲۱ راشعار پڑھانا ضروری تھے ایسی صورتِ حال میں آپ کا فکرمند ہونا ایک فطری امر تھا، تشویش و تکان کی اسی حالت میں آپ کی آنکھ لگ گئی، خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند تشریف لائے اور آپ کے سر کو ہلا کر فرما رہے ہیں۔ اٹھ کر کتاب دیکھو۔ فوراً ہی آنکھ کھل گئی، خواب کا اثر اتنا قوی تھا کہ حقیقت کا گمان ہوا، آپ حضرت شیخ الہندؒ کو دیکھنے کے لئے مسجد اور حوض کی طرف دوڑے لیکن وہ تو لطیفہ غیبی اور تصرف شیخ تھا۔ اب جو کتاب (دیوان حماسہ) کا مطالعہ کرنے بیٹھے تو کتاب کے مضامین پانی ہو چکے تھے[2]

اس واقعہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ علامہ کے حال پر حضرت شیخ الہندؒ کی نظرِ کرم ابتداء سے ہی خصوصی تھی[3] نیز حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے اس قول "تم خود نہیں جا رہے ہو میں تمھیں بھیج رہا ہوں" کو عملی طور پر مصدق بھی فرما دیا۔

---

[1] شروع میں عربی ادب سے مناسبت کم تھی بعد میں علامہ کے قلم سے ضیاء النجوم (شرح سلم) اور شرح ترمذی وغیرہا جیسی وقیع کتب عربی زبان میں نکلیں۔

[2] حضرت شیخ الہندؒ کی اپنے خدام پر اس قسم کی توجہ بکثرت رہتی تھی علامہ عثمانی۔ کو بھی صادی کا بدیہۂ امتحان اور مولانا محمد سہول کو مسلم شریف کا مقدمہ خواب میں پڑھا دیا تھا (مولانا محمد نعیم صاحب مارچ ۱۹۶۰ء دارالعلوم)

[3] اس کا ظہور علامہ کو بیعت کرنے کے واقعہ میں بھی ہو چکا ہے (۔ ۔ ۔ ۔)

دستارِ فضیلت :-

اگلے سال (۱۳۲۸ھ میں) دارالعلوم دیوبند میں عظیم الشان جلسہ دستاربندی منعقد ہوا جس میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مدنی، علامہ شبیر احمد عثمانی وغیرہم فارغ التحصیل حضرات کے ساتھ علامہ (محمد ابراہیم بلیاویؒ) بھی دستارِ فضیلت سے مشرف ہوئے۔

اعزازِ اجازت :-

فتح پوری میں قیام کے دوران حضرت شیخ الہندؒ نے جناب حکیم عبداللطیف صاحب دیوبندیؒ کے ذریعہ آپ کو باطنی اجازت (خلافت) سے ان الفاظ کے ساتھ سرفراز فرمایا کہ "اب تمھارا کام پورا ہوگیا"[1] اس طرح آپ سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ میں سے تھے لیکن غلبہ ہمیشہ درس وتدریس کا رہا، سلسلۂ طریقت کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوئے، اخفارِ حال کا ہمیشہ غلبہ رہا اور عمومی طور پر بیعت وتلقین سے ہمیشہ احتراز فراتے رہے[2] اخیر عمر میں حضرت شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ سے تعلق خاطر قائم فرمایا تو انھوں نے اس معمول کی تبدیلی پر نہایت زور دیا، علامہؒ نے جو انھیں مکتوب ارسال فرمایا اس کی یہ سطور پیش ہیں فرماتے ہیں کہ "ہاں چند ایسے لوگوں کو جو بڑے اخفار سے کام لیتے ہیں تعلیم وتلقین کا سلسلہ حضرت شیخ الہندؒ کی اجازت سے جاری رکھتا ہوں مگر عموم جو حضرت کی خواہش ہے اس کے لئے دعار کی ضرورت ہے کہ طبیعت جو اجتماع سے متوحش ہوئی ہے اس کی خو کر ہوجائے اور حکم فرمودہ پر عام طو۔ سے کام کرنے لگوں[3]

ان سطور سے یہ صاف واضح ہے کہ علامہؒ نہ صرف شیخ الہند کے مجاز تھے بلکہ سلف کے طریقہ پر اس کو جاری بھی رکھتے تھے طبیعت میں توحش کا باعث غیروں اور اجنبیوں کے ہمراہ طویل مجالست

---

[1] از مولانا محمد نعیم صاحب، دارالعلوم فروری ۱۹۶۲ء

[2] لیکن افسوس کہ آج یہ خصوصیات اٹھتی جارہی ہیں بس اب ایسا ہوتا ہیا۔ کرنے والے رہ گئے ... ان چیزوں کو ... کیا کریں گے (مولانا عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری دارالعلوم مارچ ۱۹۶۹ء)

[3] معرفت حق (الٰہ آباد) فروری ۱۹۶۲ء ص ۳۲-۳۳

ہوتا تھا دگر نہ تقریباً ۲۵ برس تک علامہ کے دولت کدہ (علامہ منزل محلہ عبدالحق دیوبند) پر مجلس بعد العصر کا معمول رہا جس میں دارالعلوم کے اکابرین اور اجل علماء نیز طلبہ کے ساتھ ساتھ مقامی عوام و خواص کا مجمع رہتا تھا، شاہ وصی اللہ الہ آبادی نے علامہ کے اس حال (توحش از غیر) کو محمود قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ "یہ توحش کچھ برا بھی نہیں بلکہ حال محمود ہے اور آپ کا مذاق اس باب میں الحمدللہ حضرت حاجی (امداد اللہ مہاجر مکی) صاحبؒ کے مذاق سے متحد ہے، امداد المشتاق میں ہے کہ فرمایا جب تک کہ اپنے جنس کے لوگ رہتے ہیں طبیعت منبسط اور خوش رہتی ہے اور جب کوئی غیر آجاتا ہے منقبض اور سُست ہو جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ جلد اس کو رخصت کیجئے[۱]

یہاں اس قابل افسوس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حضرت شیخ الہند کے سیرت نگار حضرات نے علامہ کو ان کے خلفاء میں شمار نہیں کیا خاص طور پر مولانا عزیزالرحمٰن صاحب بجنوری کا علامہ کو دونوں حیثیات (تلمذ و خلافت) سے نظر انداز کرنا تو "تغافل عارفانہ" ہے چونکہ فروری ۱۹۶۲ء کے 'دارالعلوم' میں علامہ کے حالات پر مشتمل مولانا محمد نعیم صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا علامہ کی وفات کے بعد اسی مضمون کو بنیاد بنا کر مولانا موصوف نے ایک مضمون سپرد قلم فرمایا ہے جو ماہنامہ دارالعلوم (مارچ ۱۹۶۸ء) میں شائع ہوا جس کے اندر آنجناب نے علامہ کا شیخ الہندؒ سے شرف تلمذ کے ساتھ ساتھ بیعت و خلافت کا پورا واقعہ بھی نقل کیا ہے اور مزید اضافات بھی گویا علامہ کے حالاتِ زندگی کا ایک اہم حصہ مولانا موصوف کی نظر سے ۱۹۶۲ء میں گذر چکا تھا مگر اپنی تصنیف (تذکرہ شیخ الہند" جو ان کی ۱۹۶۵ء کی کاوش ہے) میں علامہ کی شیخ الہندؒ سے بیعت خلافت کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

عمری (مراد آباد) میں

۱۳۲۹ھ میں آپ کو موتمر الانصار (منعقدہ مراد آباد) کی ایک تجویز کے مطابق قصبہ عمری ضلع مراد آباد تدریس کے لئے بھیجا گیا[۲] تقریباً دو سال آپ نے وہاں تدریسی خدمات انجام

---

[۱] معرفت حق مارچ ۱۹۶۲ء ص ۲۵۔

[۲] جمعیۃ الانصار کا قیام اگرچہ ۱۳۲۹ھ میں حضرت شیخ الہند کے ایما (بحوالہ ثمرۃ التربیت کے نام سے) ہو چکا تھا بانی افغانستان

دیں اس کے بعد دارالعلوم دیوبند بغرض تدریس طلب کر لیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس :-

یکم محرم الحرام ۱۳۳۲ھ کو آپ دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس تشریف لائے اور اس سال آپ کو سلم العلوم، ملا حسن، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال اور حمد اللہ کتابیں سپرد ہوئیں[1] آپ اپنے آغاز تدریس ہی سے اساطین درس کی فہرست میں شمار ہوتے تھے، چنانچہ انھیں (علامہ کو) ابتداہی سے ہر فن کی اونچی کتابیں سپرد ہوتی رہیں جنھیں انھوں (آپ) نے آغاز کار ہی سے اعلیٰ سطح پر پڑھایا ابتدائی تدریسی دور ہی میں (جبکہ دارالعلوم کے قافلۂ علم میں حضرت شیخ الہندؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہم جیسے علم وکمال کے سمندر و پہاڑ اور یگانہ روزگار شخصیات شامل تھیں) ۲۹ برس کے ایک جواں سال مدرس کی علمی استعداد اور فضل وکمال کا اعتراف "روداد دارالعلوم"

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) مگر اس کی نشاۃ ثانیہ مولانا عبید اللہ سندھی اور دیگر جدید فارغ التحصیل حضرات کے اصرار و درخواست پر، ۳ رمضان ۱۳۲۷ھ کو ہوئی اس تنظیم کا ملکی معاملات سے (بظاہر) کوئی تعلق نہ تھا اس کے پانچ شعبے تھے، آخری شعبے کا نام موتمر الانصار (جلسۂ علمیہ) تھا جس کا مقصد اصلاح عقائد و اخلاق و اعمال کے متعلق مضامین کا بیان، قرآن و حدیث کے اسرار و مطالب کا بیان نیز مسلمانوں کے مذہبی علوم کی حفاظت و اشاعت کے وسائل کا عموماً اور مدارس کی اصلاح و عمارات کا خصوصاً بحث و مشورہ شامل تھا، اس تنظیم کا پہلا اجلاس عام ۱۵ ر ۱۶ ر ۱۷ ر اپریل ۱۹۱۱ء کو منعقد ہوا اس اجتماع میں جن مشاہیر علماء نے حصہ لیا ان میں مولانا احمد حسن امروہی ؒ (تلمیذ خاص مولانا نانوتویؒ) مولانا جمیل الدین صاحب، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ، مولانا سراج احمد صاحبؒ، مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ واعظ دہلوی، مولانا شائق احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الرحمن سیوہارویؒ، مولانا ہادی حسن صاحبؒ، حکیم اظہر الدین صاحبؒ، قاری عبد الوحید خاں صاحبؒ اور مولانا عبد السمیع صاحبؒ قابل ذکر ہیں، اس تنظیم کا ایک مقصد مذہبی تعلیم کے احیاء و اجراء کے لئے متعدد مقامات پر لائق معلموں کا تقرر اور خصوصاً عصری تعلیم یافتہ حضرات کو مذہبی تعلیم سے روشناس کرانا بھی تھا، غالباً اسی تحریک کے پیش نظر علامہ کو عمری روانہ کیا گیا (ملخصاً از ماہنامہ القاسم ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ)

[1] رجسٹر مدرسین (از ریکارڈ دفتر تعلیمات دارالعلوم دیوبند)

[2] قاری محمد طیب صاحبؒ، تاریخ دارالعلوم ۱۹۶۸ء۔

کے اندر ان الفاظ میں موجود ہے۔

مولوی محمد ابراہیم صاحب تمام علوم میں کامل الاستعداد ہیں، معقول و فلسفہ کی تمام کتابیں نہایت خوبی سے پڑھاتے ہیں فلسفہ و منطق اور کلام کے انتہائی اسباق صدرا شمس بازغہ، قاضی مبارک، حمد اللہ امور عامہ کے علاوہ شرح مطالع، شرح اشارات وغیرہ پڑھاتے ہیں طلبہ کا بہت زیادہ میلان ان کی طرف رہتا ہے، نہایت خوش تقریر ہیں، غرض یہ کہ نہایت قابل قدر اور شہرت و وقعت حاصل کرنے والے مدرس ہیں۔

روداد سالانہ ۱۳۳۲ھ ص ۲۱۔

تحریک استخلاص وطن اور اسارت شیخ الہندؒ

۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں تحریک استخلاص وطن زوروں پر تھی حضرت شیخ الہندؒ نہ صرف اس میں شامل بلکہ ایک اہم قائد کی حیثیت رکھتے تھے، مضمون کی طوالت کے خوف اور صفحات کی قلت کے سبب زیادہ لکھنے سے قاصر ہوں، تاریخ کا دامن تفصیلات سے بھرا پڑا ہے مغز و خلاصہ کے طور پر اتنا عرض ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ ۲۹ رشوال ۱۳۳۳ھ کو دیوبند سے بغرض زیارت حرمین شریفین (بعض اقوال کے مطابق بغرض ہجرت اور بقول بعض ترکی حکومت کی امداد کیلئے) روانہ ہوئے ۱۳۳۴ھ آپ نے حجاز میں گذارا اور بالآخر ۲۲ر صفر ۱۳۳۵ھ کو آپ حجاز ہی میں قید کر لئے گئے اور تقریباً ساڑھے تین سال کی اسارت و مشقت کے بعد ۲۰ر رمضان ۱۳۳۸ھ کو آپ رہا ہوئے، اس پیرانہ سالی میں شیخ الہندؒ پر یہ مصیبت! آپ کے خدام (جن میں علامہ بھی شامل تھے) خون کے آنسو

---

[1] بعد میں علامہ کے فضل و کمال، مرجع العلماء اور شخصیت کی بے مثال آفاقی شہرت گویا اکابر دار العلوم کی ان توقعات نے واقعات کی شکل اختیار کر لی۔ برسوں برصغیر میں آپ کے علم و کمال کا طوطی بولتا اور ذہانت کی مثال دی جاتی رہی (اور آج بھی دی جاتی ہے) حلقہ دیوبند میں آپ کی ایک خاص شان اور انفرادی عظمت کے مالک تھے جس کی کچھ جھلکیاں ہم آئندہ پیش کریں گے (ان شاء اللہ) فی الحال مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی اس روایت پر اکتفا کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ "دیوبند کے حلقہ میں ہمیں نہیں معلوم کہ ان (حضرت) کے سوا کسی اور کو بھی "علامہ" کے لقب سے عام طور پر پکارا یا یاد کیا گیا ہو"

(برہان دہلی جنوری ۱۹۴۶ء ص ۔)

بدن کے اور جگر کا لہو پیتے ہوں گے، ان کے جذبات کیا تھے، ان کا مشن کیا تھا یہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور محض تحریری و تقریری جہاد اور بیان بازی کرنے والوں کے لئے ایک عملی جہاد کی روشن مثال ہے[1]

قاری محمد نعمان صاحب کی پیدائش اور حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی و وفات

۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو حضرت شیخ الہندؒ کو اسارت فرنگی سے رہائی ملی اور آپ دہلی و بمبئی قیام فرماتے ہوئے ۲۶ رمضان ۱۳۳۸ھ کو دیوبند تشریف لائے اسی عرصہ میں قاری محمد نعمان صاحب (صاحبزادہ علامہ محمد ابراہیم صاحب) کی پیدائش ہوئی، خوش نصیبی یہ کہ قاری صاحب کو جو سب سے پہلا کپڑا پہنایا گیا وہ حضرت شیخ الہندؒ کے جسم مبارک سے شرف مس رکھتا تھا، مزید برآں یہ کہ تیسرے روز حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی گود بابرکت میں لے کر شہد چٹایا (اس واقعہ سے بھی علامہ کے ساتھ حضرت شیخ الہند کا جو تعلق خاص ظاہر ہوتا ہے وہ عیاں ہے) اور پھر علم و عمل کا یہ سمندر، فکر قاسمی کا امین اور ہندوستان میں اسلامی عظمت رفتہ کی ایسی کا خواہشمند اور اس دور کا مجاہد جلیل ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ (مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء) کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دار العلوم مئو میں

غالباً ۱۳۴۰ھ میں مولانا عبد الوہاب صاحب صدر مدرس مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کی بسلسلۂ تحریک خلافت گرفتاری عمل میں آئی، ادھر علامہ بھی بعض وجوہ کی بنا پر سخت مالی مشکلات کا شکار تھے (جیسا کہ روداد دار العلوم ۱۳۴۰ھ میں درج ہے) آپ نے دار العلوم سے ایک سال کی رخصت لی، اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ تشریف لے گئے اور وہاں کی صدارت تدریس کو رونق بخشی، روداد میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح ہے "مولوی محمد ابراہیم صاحب بلیاوی دار العلوم کے قدیم اور لائق مدرس ہیں معقول و فلسفہ وغیرہ فنون کے انتہائی اسباق آپ سے متعلق رہتے تھے، مولوی صاحب موصوف اپنی خاص مجبوریوں کی بنا پر ایک سال کی رخصت حاصل کر کے شوال ۱۳۴۰ھ سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تحریک شیخ الہند اسیران مالٹا، حیات شیخ الہند، نقش حیات، اسیر ادروی دار العلوم دیوبند وغیرہ کتب۔

مدرس اول ہوکر تشریف لے گئے (روداد سالانہ ۱۳۳۱ھ ص ۳)

رمضان ۱۳۳۲ھ کی تعطیل میں آپ اپنے وطن (بلیا) تشریف لے گئے تو مولوی عبدالمجید صاحب کی تحریک وکوشش سے مدرسہ دارالعلوم مئو ضلع اعظم گڈھ کی صدارت تدریس کے لئے بااصرار روک لیا گیا اس طرح تقریباً ایک سال وہاں رہ کر صدر مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے[1]۔

دوسری مرتبہ دارالعلوم میں

غالباً یکم صفر ۱۳۳۳ھ سے آپ دوبارہ دارالعلوم میں بسلسلۂ تدریس بلائے گئے (چونکہ دارالعلوم کا مالی سال محرم تا ذی الحجہ ہوتا تھا اسی لحاظ سے رودادوں کی اشاعت ہوتی تھی اور ۱۳۳۳ھ کی روداد میں درج ہے کہ علامہ بلیاوی کو ۱۳۳۳ھ میں ۱۱ ماہ کی تنخواہ دی گئی، ملخصاً از ص ۲۱)

علامہ کشمیری سے ایک علمی گفتگو

ایک مرتبہ صاحب ہدایہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب فرما رہے تھے کہ میں ہر کتاب کے مخصوص طرز پر کچھ نہ کچھ لکھ سکتا ہوں بجز ہدایہ، گلستاں، اور بخاری کے، اس پر علامہ بلیاوی نے اپنے مذاق کے لحاظ سے صاحب ہدایہ کی ایک خصوصیت کی طرف حضرت شاہ صاحب کی توجہ مبذول کرائی کہ "صغریٰ یا کبریٰ میں سے معین طور پر کسی ایک مقدمہ سے نتیجہ کا خصوصی تعلق ہونا علم الحقائق کی معرفت تامہ کے بغیر ممکن نہیں، صاحب ہدایہ کا کمال یہ ہے کہ فی الواقع نتیجہ کا خصوصی تعلق صغریٰ یا کبریٰ میں سے جس کے ساتھ ہوتا ہے وہ اس کو ذکر کر جاتے ہیں، حضرت شاہ صاحب نے اس خصوصیت کو بہت پسند کیا اور علامہ کی تصویب کی[2]

---

[1] مولانا محمد نعیم صاحب کے مضمون (مشتمل برحالات علامہ، مطبوعہ دارالعلوم فروری ۱۹۶۲ء ومارچ ۱۹۶۲ء) سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ نے ۱۳۳۲ھ سے قبل (دارالعلوم شیخ الہند کے دور میں) دارالعلوم مئو میں قیام فرمایا جبکہ یہ درست نہیں، دارالعلوم کی رودادوں اور تعلیمات کے ریکارڈ کے مطابق محرم ۱۳۳۱ھ سے لیکر شعبان ۱۳۳۲ھ تک مسلسل دارالعلوم میں مدرس رہے، مولانا عزیز الرحمن نے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ۱۳۳۱ھ میں لکھا ہے جو غلط ہے۔

[2] از مولانا محمد نعیم صاحب دارالعلوم فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۲۔

تحریک پاکستان، دارالعلوم سے علیٰحدگی اور جامعہ ڈابھیل کی مدرسی

۱۳۶۲ھ میں "اصلاحی تحریک" کے نام سے ایک انقلاب آیا اس کی حقیقت جاننے کے لئے آیئے محمد اکبر شاہ بخاری (ناظم جامعہ عثمانیہ جامپور۔ پاکستان) کے رقم فرمودہ مضمون کے اس اقتباس پر نظر ڈالتے چلیں جس سے ایک گونہ اس تحریک اور علاّمہ وغیرہ حضرات کے دارالعلوم سے علیٰحدہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ رقم طراز ہیں، "تحریک پاکستان کے زمانے میں دارالعُلوم دیوبند دو حصوں میں تقسیم ہوچکا تھا دارالعُلوم کا ایک حصہ کانگریس کے ساتھ شریک عمل تھا اور دوسرا گروپ جو دارالعُلوم کے بڑے بڑے عہدیداروں یعنی سرپرست حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ صدر مہتمم علاّمہ شبیر احمد عثمانی، مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی اور صدر مفتی مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے حامیوں پر مشتمل تھا جو کانگریس کا سخت مخالف تھا، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے جب یہ محسوس کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں رہ کر اگر اختلافات بڑھ گئے تو یہ دارالعُلوم کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا چنانچہ حضرت تھانوی کے مشورہ سے ربیع الاول ۱۳۶۳ھ میں شیخ الاسلام علاّمہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، مولانا ظہور احمد دیوبندی اور مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ اور دیگر علماء دارالعُلوم دیوبند سے مستعفی ہوکر الگ ہوگئے اور ان سب علماء نے خود کو تحریک پاکستان کے لئے وقف کردیا۔[1]

بہرحال علاّمہ ۱۳۶۲ھ میں دارالعُلوم سے علیٰحدہ ہوکر علاّمہ عثمانی کے ساتھ ڈابھیل تشریف لے گئے[2] جہاں آپ نے تقریباً آٹھ ماہ درس حدیث دیا۔[3]

---

[1] البلاغ کراچی، شعبان ۱۳۹۹ھ ص۹۲۰ (مفتی محمد شفیع نمبر)

[2] رجسٹر مدرسین تعلقات دارالعلوم میں درج ہے کہ علامہ ۱۳۶۱ھ میں دارالعلوم سے چلے گئے جو مبنی بر سہو ہے۔

[3] تاریخ دارالعلوم میں ہے، ۱۳۶۲ھ میں پھر دارالعلوم سے علیٰحدگی اختیار کی اوّلاً جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مسند صدارت کو رونق بخشی، ج ۲، ص ۱۰۴۔ اور مولانا نعیم صاحب کے مضمون میں علامہ عثمانیؒ کے بعد علامہ کو وہاں کا صدر بتایا گیا ہے جبکہ علامہ دوبارہ ڈابھیل نہیں گئے علاوہ وہاں مدرس کی حیثیت سے رہے تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل ص ...

مدرسہ عالیہ فتحپوری اور ہاٹ ہزاری میں صدارت، آسام سے صدارت کی پیش کش

بعد ازاں آپ نے مدرسہ عالیہ فتحپوری کی مسند صدارت کو رونق بخشی، کچھ عرصے بعد آپ ہاٹ ہزاری (چاٹ گام) تشریف لے گئے اور وہاں صدارت تدریس کے فرائض انجام دیے، یہاں آپ نے صحاح ستہ اور خصوصًا دورۂ حدیث کا درس دیا، یہیں قیام کے دوران علامہؒ نے صحاح ستہ میں کئی کتب کی عربی شروحات تالیف فرمائیں مگر افسوس کہ علم وحکمت کا یہ سمندر بلیہ کے اس زبردست سیلاب کی نذر ہو گیا جو ایک طرح سے سمندر ہی کی مانند تھا، صرف ترمذی کی عربی شرح بچی جس کا سہرا ان کے حفید جناب محمد عمران اختر صاحب مدظلہٗ کے سر جاتا ہے جنھوں نے اس متاع گراں کی حفاظت کی۔

چاٹگام میں قیام کے دوران شیلانگ (آسام) سے چھ سو روپے ماہانہ مشاہرہ پر صدارت کی پیش کش ہوئی (یہ غالبًا کسی عصری درسگاہ کی جانب سے تھا) جو بائے استغنا سے ٹھکرا دی گئی[1] خیال رہے کہ یہ آج سے تقریبًا ۴۵ برس قبل کی بات ہے، نیز اس کے اگلے سال (۱۳۶۶ھ میں) آپ نے اس کے مقابلے میں کہیں کم مشاہرہ پر دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینا قبول فرمایا۔

---

[1] دارالعلوم مارچ ۱۹۶۸ء ص۱۶۔

بقیہ ص۴۰ ائمہ ومشائخ عرب سے شدید اختلاف

کو ختم کرتے ہیں کہ دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"اور سچ تو یہ ہے کہ وہابی ہونا عبارت ہے مقلد مذاہب خاص ہونے سے۔ کیونکہ پیشوا وہابیوں کا ابن عبدالوہاب مقلد مذہب حنبلی تھا اور تابعین حدیث کسی مذہب کے مذاہب مقلدین میں سے مقلد نہیں پس وہابیہ اور اہل حدیث میں زمین وآسمان کا فرق ہے (ترجمان وہابیہ ص۴)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مسجد جدید دارالعلوم دیوبند

جو اپنی تکمیل کیلئے اہل خیر حضرات کی توجہات کی منتظر ہے

دارالعلوم دیوبند کے ہمدردان و معاونین حضرات کو جیسا کہ معلوم ہے کہ تقریباً چار سال ہوئے طلبہ کی کثرت تعداد کی بنا پر دارالعلوم میں ایک بڑی جدید مسجد کا کام اللہ تعالیٰ کے فضل پر توکل کرتے ہوئے دارالعلوم سے متصل ایک آراضی خرید کر شروع کر دیا تھا۔

الحمد للہ مسجد کا تعمیری کام بہت آگے بڑھ گیا ہے اور اس وقت فضل خداوندی اور اہل خیر حضرات کی توجہ سے تیسری منزل پر تعمیری کام جاری ہے، اس مسجد سے طلبۂ دارالعلوم اور دیگر مسلمانوں کے لئے ایک وقت میں مسقف (چھت والے) حصہ میں جہاں چار ہزار نمازیوں کے لئے جگہ ہو جائے گی وہیں، اس کار خیر میں حصہ لینے والوں کی طرف سے ایک صدقۂ جاریہ ہوگا اور وہ انشاء اللہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد تعمیر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر عطا فرمائیں گے۔

تعمیری کام جاری رکھنے کیلئے اس وقت سرمایہ کی شدید ضرورت ہے

اس لئے تمام اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ دارالعلوم کی اس مسجد کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں تاکہ یہ مسجد دارالعلوم کے شایان شان جلد تعمیر ہو سکے۔

پتہ

ڈرافٹ وچیک کیلئے } دارالعلوم دیوبند اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کیلئے } (حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ پن کوڈ نمبر ۲۴۷۵۵۴

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

Phone: 2425
Code: 01336

Pin: 247554

ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۴ء

شمارہ نمبر ۲

جلد نمبر ۷۹

فی شمارہ ۶/=

سالانہ ۶۰/=

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۳۰۰/- روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/- "
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/- "

یہاں اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند سہارنپور یوپی

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لئے وی۔ پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤ دوالابراہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

منیجر

ذمہ داران مدارس عربیہ سے درخواست

حامداً ومصلیاً: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طلبۂ عزیز کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت فرمائی ہے، آپ کا ارشاد گرامی ہے۔

إِنَّ رِجَالًا يَأْتُونَكُمْ مِنْ أَقْطَارِ الْأَرْضِ يَتَفَقَّهُونَ فِي الدِّينِ فَإِذَا أَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوا بِهِمْ خَيْرًا۔

(رواہ الترمذی)

بیشک بہت سے لوگ زمین کے گوشہ گوشہ سے علم دین میں تفقہ حاصل کرنے کیلئے تمہارے پاس آئیں گے، جب وہ آئیں تو تم ان کے بارے میں خیر خواہی کی وصیت قبول کرو

اس لئے طلبۂ عزیز کے ساتھ خیر خواہی تمام مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کا فرض اولین ہے، طلبۂ عزیز کے لئے بہتر تعلیم، عمدہ تربیت، اچھا انتظام، اور حسب استطاعت راحت رسانی خیر خواہی کے ضمن میں آتی ہے، اور الحمد للہ مدارس عربیہ کے ذمہ دار اس وصیت پر عمل پیرا ہیں،

ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کی ترقی، علم وفن کی ترقی، دین و دیانت کی ترقی اور مسلمانان عالم کی ترقی ہے، انھی چیزوں کے پیش نظر ذمہ داران مدارس کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا رہا ہے کہ وہ طلبہ کی استعداد سازی پر سب سے زیادہ توجہ فرمائیں اور دارالعلوم میں جس جماعت میں داخلہ کا ارادہ ہے، وہاں تک قابل اعتماد استعداد کا پیدا ہوجانا دارالعلوم میں حاضری سے پہلے ضروری سمجھیں، اور اسی لئے چند سالوں سے ماہ رجب المرجب ہی میں ضروری اصول وضوابط کا اعلان کردیا جاتا ہے۔

آپ حضرات سے مخلصانہ درخواست ہے کہ ان چیزوں پر عمل درآمد کے سلسلہ میں خدام دارالعلوم کا تعاون فرمائیں۔

عربی درجات میں جدید داخلے کے قواعد

① دارالعلوم دیوبند کے تمام تعلیمی شعبوں کے طلبہ کی تعداد ڈھائی ہزار ہوگی جن میں دارالافتاء تکمیلات کتابت، دارالصنائع کے شعبۂ قدیم طلبہ کیلئے ہیں بقیہ شعبوں میں قدیم طلبہ کے بعد جو عدد باقی بچے گا اس کو جدید طلبہ سے مقابلہ کے امتحان کے ذریعہ پُر کرلیا جائے گا یعنی ہر جماعت کی مقررہ تعداد کو اونچے نمبرات سے شروع کرکے پورا کیا جائے گا۔

② آنیوالے طلبۂ جدید سب سے پہلے فارم برائے شرکتِ امتحانِ داخلہ پُر کریں گے، یہ فارم انھیں دفتر تعلیمات سے ۸؍ شوال کی شام تک دیا جائیگا۔

③ سال اوّل سال دوم کا امتحان داخلہ تقریری ہوگا۔

④ سال سوم کے امیدوار طلبۂ جدید کا نفحۃ الادب اور ہدایت النحو کا تحریری امتحان ہوگا بقیہ تمام کتابوں کا تقریری امتحان لیا جائے گا۔

⑤ سال چہارم، سال پنجم، سال ششم، سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے امیدواروں کا امتحان داخلہ تحریری ہوگا، امتحان ۱۱؍۱۲؍۱۳؍۱۴؍ شوال ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۴؍۲۵؍۲۶؍۲۷؍ مارچ ۱۹۹۶ء بروز جمعرات، جمعہ، بار، اتوار میں لیے جائیں گے

⑥ سال اول عربی کیلئے پرائمری درجۂ پنجم کی سند یا اس کے مضامین کی صلاحیت اور فارسی و

اردو، املاء رسم الخط اور نحو صرف کی اصطلاحات کی جانچ ہوگی۔

- سال چہارم، سال پنجم، سال ششم، سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے لئے پچھلے درجات کی تمام کتابوں کا امتحان تحریری ہوگا۔
- سال چہارم کے لئے قدوری، ترجمۃ القرآن، شرح تہذیب، نفحۃ العرب اور کافیہ یا شرح جامی کا تحریری امتحان ہوگا۔
- سال پنجم کے لئے کنز، شرح وقایہ، اصول الشاشی، تلخیص المفتاح، ترجمۃ القرآن، سلم العلوم کا تحریری امتحان ہوگا
- سال ششم کے لئے ہدایہ اولین، نور الانوار، مختصر المعانی، مقامات حریری کا تحریری امتحان ہوگا۔
- سال ہفتم کیلئے جلالین، حسامی، میبذی، دیوان المتنبی کا تحریری امتحان ہوگا
- دورۂ حدیث کے لئے ہدایہ اخیرین، مشکوٰۃ شریف، بیضاوی شریف، شرح عقائد نسفی نخبۃ الفکر اور سراجی کا تحریری امتحان ہوگا نیز پارۂ عم صحیح مخارج کیساتھ حفظ ہونا ضروری ہوگا۔

(نوٹ) اپنی سابقہ تعلیم کی کوئی بھی سند اگر کسی کے پاس ہو تو فارم داخلہ کے ساتھ منسلک کریں

(۷) سال اول و دوم میں نابالغ بیرونی بچوں کا داخلہ نہ ہوگا نہ ہی ان درجات میں امداد ہوگی۔

(۸) جو طالب علم اپنے ساتھ صغیر السن بچوں کو لائیگا ان کا داخلہ ختم کر دیا جائیگا

(۹) جن امیدواروں کی وضع قطع طالب علمانہ نہ ہوگی مثلاً غیر شرعی بال، ریش تراشیدہ ہونا، ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہونا یا دارالعلوم کی روایات کے خلاف کوئی بھی وضع ہو ان کو شریک امتحان نہ کیا جائیگا۔

اور اس سلسلے میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

(۱۰) سرحدی صوبوں نیز آسام اور بنگال کے امیدواروں کو تصدیق نامہ وطنیت پیش کرنا ضروری ہوگا، تصدیق نامہ کی اصل کاپی پیش کرنا ضروری ہے، فوٹو اسٹیٹ کاپی قبول نہیں کی جائے گی، اور یہ تصدیق نامہ وطنیت کسی بھی وقت واپس نہ ہوگا۔

(۱۱) جدید امیدواروں کیلئے لازم ہوگا کہ وہ دارالعلوم میں آتے وقت تاریخ پیدائش کا سارٹیفکٹ لے کر آئیں، یہ سرٹیفکٹ کارپوریشن، میونسپل بورڈ، ٹاؤن ایریا یا گرام پنچایت کا ہونا چاہئے

(۱۲) جدید امیدواروں کے لئے سابقہ مدرسہ کا تعلیمی و اخلاقی تصدیق نامہ اور مارک شیٹ (نمبرات

کتب) پیش کرنا ضروری ہوگا۔

(۱۳) نجی تصدیقات یا سماعت وغیرہ کا اعتبار نہ ہوگا

(۱۴) بنگلہ دیشی امیدوار حسب ذیل علماء کرام کی تصدیق لے کر آئیں

(۱) مولانا شمس الدین صاحب قاسمی جامعہ حسینیہ ارض آباد میرپور ڈھاکہ (۲) مولانا فرید الدین صاحب مسعود ڈھاکہ (۳) مولانا معتصم باللہ صاحب مالی باغ بازار ڈھاکہ (۴) مولانا حافظ عبدالکریم صاحب محلہ چوکی دیکھی سلہٹ۔ بنگلہ دیش۔

(۱۵) کیرالہ کے امیدوار مندرجہ ذیل علماء کی تصدیق لے کر آئیں

(۱) مولانا نوح صاحب (۲) مولانا حسین مظاہری (۳) محمد کویا قاسمی۔

تنبیہ:۔ طلبہ کو خاص طور پر یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ امتحان کی کاپیاں کوڈ نمبر ڈال کر ممتحن کو دی جاتی ہیں اس لئے امیدوار صرف انھیں درجات کا امتحان دیں جن کی تیاری وہ کرچکے ہیں بوقت داخلہ فارم پر جو بیتہ لکھا جائے گا اس میں کسی طرح کی ترمیم نہ ہوگی

قدیم طلبہ کیلئے

(۱) تمام قدیم طلبہ کیلئے ۲۰ رشوال تک حاضر ہونا ضروری ہے۔

(۲) جو طلبہ تمام کتابوں میں کامیاب ہوں گے ان کو ترقی دی جائے گی، جو طلبہ دو کتابوں میں ناکام ہوں گے ان کا ضمنی امتحان داخلہ امتحان کے ساتھ لیا جائے گا، بصورت کامیابی ترقی دی جائے گی ورنہ بلا امداد سال کا اعادہ کردیا جائیگا، اعادہ سال کی رعایت صرف ایک سال کیلئے ہوگی اگر دوسرے سال بھی اعادہ کی نوبت آئی تو داخلہ نہیں ہوسکے گا۔

(۳) تجوید، کتابت، اختبار شفاہی کے نمبرات بسلسلہ ترقی درجہ اوسط میں شمار نہ ہوں گے البتہ فوائد مکیہ، صف عربی کے نمبرات، ترقی اور اجراء امداد کے سلسلے میں شمار کئے جائیں گے۔

(۴) حسب تجویز مجلس تعلیمی وظیفہ تیل کی بقا کے لئے اوسط کامیابی ۳۱ ہونا شرط ہے اس سے کم پر وظیفہ تیل بند کردیا جائے گا۔

(۵) تکمیل ادب میں صرف ان فضلاء کا داخلہ ہوسکے گا جن کا دورہ حدیث کے سالانہ امتحان

میں اوسط کامیابی ۴۴ ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہوں، نیز ان امیدواروں کا نحو وصرف اور بلاغت وانشار کا مستقل امتحان لیا جائے گا، نحو وصرف کیلئے کافیہ اور علم الصیغہ اور بلاغت کے لئے البلاغۃ الواضحہ کے متن سے سوالات مرتب کئے جائیں گے اور انشار کیلئے اردو سے عربی میں ترجمہ کے سوالات دیئے جائیں گے۔ اس جماعت کیلئے کل تین پرچے ہوں گے، باقی تکمیلات کیلئے ۴۰ را وسط شرط ہے

(۶) امیدواروں کے زیادہ ہونے کی صورت میں نمبرات اور انٹرویو کو وجہ ترجیح بنایا جائے گا۔

(۷) ایک تکمیل کے بعد دوسری تکمیل میں داخلہ کے لئے ضروری ہوگا کہ امیدوار نے سابقہ تکمیل میں کم از کم ۴۶ ۔ اوسط حاصل کیا ہو، اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ رہا ہو،

(۸) ایک تکمیل کی درخواست دینے والے دوسری تکمیل کے امیدوار نہ ہوسکیں گے، الّا یہ کہ ان کے مطلوبہ درجہ تکمیل میں تعداد پوری ہونے کے سبب ان کا داخلہ نہ ہوسکا ہو۔

(۹) دارالافتار کے فضلار کا کسی شعبہ میں داخلہ نہ ہوگا۔

(۱۰) جس کی کوئی بھی شکایت دارالاقامہ، تعلیمات یا اہتمام میں کسی بھی وقت درج ہوئی ہے اس کو دورۂ حدیث کے بعد کسی بھی شعبہ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

(۱۱) کسی بھی شعبہ میں داخلہ لینے والے قدیم فضلار کو فراغت کے بعد ہی سند فضیلت دی جائیگی

(۱۲) کسی بھی تکمیل میں علاوہ افتار کے داخلہ کی تعداد ۲۰ رسے زائد نہ ہوگی اور وہ تعداد مقابلہ کے نمبرات کے ذریعہ پوری کی جائے گی۔

دیگر شعبوں کے بارے میں

(۱) دارالعلوم دیوبند کا بنیادی کام اگرچہ عربی دینیات کی تعلیم ہے لیکن حضرات اکابر نے مختلف دینی اور دنیوی فوائد اور مصالح کے پیش نظر متعدد شعبے قائم فرمائے، شعبۂ تجوید اردو عربی شعبہ خوش نویسی دارالصنائع وغیرہ، ان شعبوں میں داخلے کے لئے درج ذیل قواعد پر عمل ہوگا۔

دارالافتار

(۱) دارالافتار میں داخلہ کے امیدواروں کے لئے وضع قطع کی درستگی کی اہمیت سب سے زیادہ ہوگی

اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

(۲) دورۂ حدیث سے دارالافتاء کیلئے صرف وہ طلبہ امیدوار ہوں گے جن کا اوسط کامیابی ۷۵% ہوگا۔

(۳) کسی بھی تکمیل سے دارالافتاء میں داخلے کے امیدوار کیلئے سابقہ تکمیل میں ۶۰% اوسط حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

(۴) ان تمام امیدواروں کا الگ سے ہدایہ اولین وہدایہ اخیرین کا امتحان لیا جائے گا جس کے دو پرچے ہوں گے اور خط واملاء کو خاص طور پر دیکھا جائے گا

(۵) دارالافتاء میں داخلہ کی تعداد ۲۵ سے زائد نہ ہوگی، اور کوشش کی جائیگی کہ معیار مذکور کو پورا کرنے والے ہر صوبہ کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے، لیکن اگر کسی صوبہ سے کوئی امیدوار مندرجہ بالا شرائط کا حامل نہ پایا گیا تو دوسرے صوبوں سے یہ تعداد پوری کرلی جائے گی، ان ۲۵ طلبہ کی امداد جاری ہوسکے گی۔

(۶) دارالافتاء میں ممتاز نمبرات سے کامیاب ہونے والے دو طلبہ کا انتخاب تدریب فی الافتاء کے لئے کیا جائے گا، یہ انتخاب دو سال کے لئے ہوگا اور ان کا وظیفہ ۳۰۰/- روپے ماہوار ہوگا۔

شعبۂ دینیات اردو، فارسی، شعبۂ حفظ قرآن

(۱) شعبۂ دینیات اردو، فارسی اور شعبۂ حفظ میں مقامی بچوں کو داخلہ دیا جائے گا

(۲) سال اول دینیات اردو اور شعبۂ حفظ میں داخلہ ہر وقت ممکن ہوگا۔

(۳) بقیہ درجات میں داخلہ ذی الحجہ کی تعطیل تک لیا جائے گا۔

شعبۂ تجوید، حفص اردو، عربی

(۱) حفص اردو میں وہ طلبہ داخل ہوسکیں گے جو حافظ ہوں، قرآن کریم ان کو یاد ہو اور وہ اردو کی اچھی استعداد بھی رکھتے ہوں، نیز ان کی عمر اٹھارہ سال سے کم نہ ہو، ان طلبہ میں ۹۰ کی امداد جاری ہوسکے گی۔

(۲) شعبۂ حفص عربی میں ان طلبہ کو داخل کیا جائے گا جنھیں قرآن کریم یاد ہو اور وہ عربی میں شرح جامی یا سال سوم کی تعلیم حاصل کرچکے ہوں، ان طلبہ میں دس کی امداد جاری ہوسکے گی

(۳) ان طلبہ کی اوقات مدرسہ میں حاضری ضروری ہوگی۔

قراءت سبعہ عشرہ

① اس درجہ میں داخلہ کے لئے حافظ ہونا ضروری ہے اور یہ کہ وہ عربی کی سال چہارم
کی جید استعداد رکھتے ہوں۔

② اس درجہ میں داخل طلبہ کے لئے حفص عربی سے فارغ ہونا ضروری ہوگا اور ان کی تعداد
دس سے زائد نہ ہوگی اور ان دس کی امداد بھی جاری ہوسکے گی۔

شعبۂ خوشنویسی

① اس درجہ میں داخل طلبہ کی تعداد تیس ہوگی، اور ان کی امداد جاری ہوسکے گی۔

② داخلہ کے امیدواروں میں فضلاء دارالعلوم کو ترجیح دی جائے گی۔

③ شعبہ میں مکمل داخلہ کے امیدواروں کو امتحان داخلہ دینا ضروری ہوگا، اور صرف اس فن کی ضروری
صلاحیت رکھنے والوں کو داخل کیا جائے گا ④ قدیم طلبہ اگر فن کی تکمیل نہیں کرسکے ہیں تو ناظم شعبہ
کی تصدیق اور سفارش پر ان کا مزید ایک سال کیلئے غیر امدادی داخلہ کیا جاسکے گا بشرطیکہ ان کی کوئی شکایت
نہ ہو ⑤ جو طلبہ مکمل امدادی یا غیر امدادی داخلہ لیں گے، ان کو اوقات مدرسہ میں پورے چھ گھنٹے درسگاہ
میں بیٹھ کر مشق کرنا ضروری ہوگا ⑥ جو طلبہ عربی تعلیم کے ساتھ کتابت کی مشق کرچکے ہوں اور ناظم شعبہ
ان کی صلاحیت کی تصدیق کریں تو دورۂ حدیث کے بعد مکمل داخلہ اور امداد میں ان کو ترجیح دی جائیگی۔

⑦ تمام طلبہ کیلئے طالب علمانہ وضع اختیار کرنا ضروری ہے ⑧ پہلے نصف سال میں مقررہ تمرینات کی تکمیل
نہ کی گئی تو داخلہ ختم کردیا جائے گا۔

دارالصنائع

① طالب علمانہ وضع قطع کے بغیر داخلہ نہیں لیا جائیگا ② معلم دارالصنائع جن کی صلاحیت کی تصدیق
کریں گے ان کو داخل کیا جائے گا ③ پہلے تین ماہ میں کام کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کردیا جائیگا ④ اس
شعبہ میں داخلہ دس سے زائد کا نہیں ہوگا اور ان سب کی صرف امداد طعام جاری ہوسکے گی ⑤ اوقات
مدرسہ میں پورے وقت حاضر رہ کر کام کرنا ضروری ہوگا۔

جاری کردہ دفتر تعلیمات دارالعلوم دیوبند

طبِّ نبوی

اور

سائنسی تحقیقات

از قلم مولانا محمد جنید بانگری چاٹگامی
خادم حدیث نبوی جامعہ اسلامیہ بانگر چاٹگام بنگلہ دیش
فاضل شعبۂ تخصص فی الحدیث جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی

عصرِ حاضر میں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و تعلیمات پر خالص سائنسی اور طبی نقطۂ نظر سے بہت کچھ بحث و تحقیق اور غور و فکر کے کام ہو رہے ہیں اس سلسلے میں بڑے بڑے سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کا کھلا اعتراف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بے مثال طبیب حاذق تھے، اور یہ کہ آپ نے بیماریوں سے بچاؤ کا ایسا مکمل اور قابلِ عمل نظام مرحمت فرمایا ہے جو موجودہ میڈیکل سائنس کے دور میں (جب کہ آئے دن نئے نئے طبی انکشافات اکتشافات اور مشاہدات ہو رہے ہیں) نہ صرف صحیح ثابت ہوا ہے بلکہ فن طب میں مشعلِ راہ اور رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ جرمن کے ایک ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ "مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات طبیہ پر اس قدر کامل وثوق ہے کہ میں صرف انہی کی تحقیق کرتا ہوں اور اعلیٰ طبی نتائج تک پہونچتا ہوں۔" (ماہنامہ دار العلوم رمضان و شوال ۱۴۰۹ھ)

اور ڈاکٹر خالد غزنوی صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیائے طب کو "اثمد" سے لے کر "ورس" تک چالیس ایسی ادویہ مرحمت فرمائیں کہ اگر کسی نے ان سے طب کا علم سیکھ لیا تو اس کو کسی بھی علاج میں کبھی ناکامی نہ ہوگی۔ (طب نبوی اور جدید سائنس ص ۲/۱۶)

ذیل میں اس سلسلے کے چند حوالے ہدیۂ ناظرین ہیں۔

(۱) ـــــ کلونجی

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

فی الحبۃ السوداء شفاء من کل داءٍ ، الا السام۔ کلونجی میں موت کے سوا ہر بیماری سے شفا ہے۔

(بخاری شریف ص۸۴۸ ج۲)

بخاری شریف کی اس حدیث میں کلونجی کو ہر بیماری میں شفا قرار دیا گیا ہے، اور بقول ڈاکٹر خالد غزنوی صاحب طب جدید کی تحقیقات کے مطابق اسی اصول کو سامنے رکھ کر اگر ذیابیطس کے مریضوں کو تین حصہ کلونجی اور ایک حصہ کاسنی کے بیج ملا کر ناشتہ کے بعد ایک چھوٹا چمچ دیا جائے تو ایک ہفتہ میں خون میں گلوکوز کی مقدار کم ہونے لگے گی، اور پیشاب میں شکر ختم ہو جائے گی، اب تک دوسو مریضوں پر یہ علاج نہایت اچھے نتائج کے ساتھ استعمال کیا جا چکا ہے، اور بھارتی ماہرین نے کلونجی کو دردِ شکم، قولنج، استسقاء، ضعف دماغ، ضعف اعصاب، نسیان، فالج، اور رعشہ میں مفید قرار دیا ہے، نیز بچوں کو قرآن مجید حفظ کراتے وقت قوت یادداشت کو بہتر بنانے کیلئے نہار منہ کلونجی کے چند دانے کھلائے جائیں تو بہت مفید ہے۔

(طب نبوی اور جدید سائنس ص۲۴۴ و ص۲۳۶ ج۱)

۲ شہد

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں:

" ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ اس کے بھائی کو اسہال ہو رہے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے "شہد" پلاؤ، وہ پھر آکر کہنے لگا، کہ شہد پینے سے اسہال میں اضافہ ہوا، آپ نے پھر فرمایا کہ "شہد" پلاؤ۔ اسی طرح وہ حال بیان کرتا تین مرتبہ آچکا تو چوتھی مرتبہ ارشاد ہوا کہ اُسے "شہد" پلاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے اور تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹ کہتا ہے، اس نے پھر شہد پلایا تو مریض تندرست ہو گیا۔

(بخاری شریف ص۸۴۹ ج۲)

یہ حدیث علم العلاج اور ماہیت مرض کے بارے میں ایک روشن راہ ہے کیونکہ اسہال کا سبب آنتوں میں سوزش ہے، جو کہ جراثیم یا ان کی زہروں سے ہو سکتی ہے، اگر ایسے مریض کی آنتوں میں حرکات کو فوری طور پر بند کر دیا جائے تو سوزش برقرار رہے گی، یا زہریں وہیں رہ جائیں گی۔ اس لئے علاج کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے آنتوں کو صاف کیا جائے، پھر جراثیم مارے جائیں،

شہد میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ دونوں کام کر سکتا تھا، علاوہ ازیں اسہال کے جدید علاج میں آجکل یہ کوشش ہو رہی ہے کہ بار بار کی اجابتوں سے مریض کے جسم سے نمکیات نکل جاتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی موت بھی ہو سکتی ہے اور پانی کی کمی سے گردے بیکار ہو سکتے ہیں، اس کا حل یہ تلاش کیا گیا ہے کہ مریض کو نمک اور گلوکوز کا ایک مرکب پانی میں گھول کر بار بار پلاتے ہیں، پاکستان میں یہ ORS کے نام سے مشہور ہے اور شہد میں یہ تمام چیزیں موجود ہیں (طب نبوی اور جدید سائنس ص۱۸۱)

۳ کھجور

ترمذی شریف کی ایک حدیث حسن میں ہے

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یفطر قبل ان یصلی علی رطبات فان لم تکن رطبات فتمرات
(ترمذی شریف ص۵۵ ج۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز مغرب سے پہلے چند تازہ کھجوروں سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے، اگر وہ نہ ہوتیں تو خشک کھجوروں سے افطار فرماتے۔

اس میں طبی تحقیق بقول ڈاکٹر خالد غزنوی یہ ہے کہ جسمانی کمزوری کیلئے خاص طور پر جب کسی کو کچھ عرصہ کھانے کو نہ ملے تو وہ اپنی توانائی کی جلد بحالی کیلئے کھجور استعمال کر سکتا ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف نے مزید لکھا ہے کہ اسی اصول کے مطابق (شریعت میں) روزہ افطار کرنے کیلئے کھجور کھانے کی ہدایت کی گئی۔ (طب نبوی ص۲۶۹ ج۱)

۴ تربوز

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یأکل البطیخ بالرطب ویقول یکسر حر ھذا ببرد ھذا وبرد ھذا بحر ھذا
مشکوٰۃ شریف ص۳۶۷ ج۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تربوز تازہ کھجوروں کے ساتھ کھاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اس (کھجور) کی گرمی اس (تربوز) کی سردی سے توڑی جاتی ہے اور اس (تربوز) کی سردی اس (کھجور) کی گرمی سے توڑی جاتی ہے۔

یعنی مذکورہ بالا دونوں چیزوں کو ملا کر کھانے میں طبی حکمت یہ ہے کہ ایک سرد ہے [illegible]

لہذا دونوں کو ملانے سے معتدل غذا ہو جاتی ہے اور طبی تحقیق اس سلسلے میں یہ ہے کہ بھارتی ماہرین امراض جنسی اور جسمانی کمزوری کیلئے اور جب اعتدال سے زیادہ دُبلا ہو تو کھجور کے ہمراہ ککڑی تربوز اور کھیرے کو تجویز کرتے ہیں۔ (طب نبوی اور جدید سائنس ص۱۹۹ ج۱)

⑤ ــــــــ کدو

حضرت انس رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک درزی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت کی، میں ان کے ساتھ گیا، اس نے سالن میں کدو پیش کیا، میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تعالی کے اطراف سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کر کے کھاتے تھے، اس دن کے بعد سے مجھے کدو سے محبت ہوگئی۔ (بخاری شریف ص۸۱۰ ج۲ مختصراً)

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے۔

جس کسی نے مسور کی دال کے ساتھ کدو پکا کر کھایا اس کا دل مضبوط ہوا اور قوتِ مردمی میں اضافہ ہوا۔ (طب نبوی ص۲۸۱ ج۲)

اور جدید تحقیقات اس سلسلے میں یہ ہیں کہ بھارتی ماہرین نے کدو کو پیٹ سے کیڑا نکالنے والا اور مُدِرُّ البول قرار دیا ہے، نیز کدو کے مغز دو بڑے چمچے شہد کے ساتھ دینے سے پیشاب کی جلن ختم ہو جاتی ہے۔ (طب نبوی اور جدید سائنس ص۱۸۵ ج۲)

⑥ ــــــــ دائیں ہاتھ سے کھانا اور بائیں ہاتھ سے استنجاء کرنا

بقول ڈاکٹر خالد غزنوی، جب کسی شخص کے پیٹ میں کیڑے ہوں، یا وہ تپ محرقہ کا پرانا مریض ہو تو بیت الخلاء سے واپسی پر اس کے ہاتھوں کو یہ کیڑے اور جراثیم چپک جاتے ہیں، جب وہ اپنا ہاتھ اپنی یا لوگوں کی کھانے پینے کی چیزوں کو لگاتا ہے تو وہ بیماری کے پھیلاؤ کا باعث بنتا ہے اسے علم طب میں CARRIER کہتے ہیں، حال ہی میں نیویارک میں پرانے تپ محرقہ کے ایک مریض کی دکان سے آئس کریم کھانے والے ۳۹ بچے اس بیماری میں مبتلا ہوئے (طب نبوی اور جدید سائنس ص۱۰ ج۱)

دیکھئے آج سے چودہ سو سال پہلے محسن نوع بشر، رحمت عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس مہلک مرض سے بچاؤ کی کیسی سہل اور مفید صورت بتائی ہے آپؐ نے طہارت کے سلسلے میں یہ ہدایت دی کہ استنجاء میں دایاں ہاتھ ہرگز استعمال نہ ہو چنانچہ ارشاد فرمایا ہے

اذا شرب احدکم فلا یتنفس فی الاناء واذا اتی الخلاء فلا یمس ذکرہ بیمینہ ولا یتمسح بیمینہ" (بخاری شریف صلہ ج ۱)

جب تم میں سے کوئی پانی پئے تو برتن میں سانس نہ لے اور جب پاخانہ میں جائے تو اپنی شرمگاہ کو داہنے ہاتھ سے نہ چھوئے اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجاء کرے۔

اور یہ ہدایت بھی دی ہے کہ کھانے میں بایاں ہاتھ استعمال میں نہ آئے، حدیث میں آتا ہے

قال علیہ السلام لایا کلن احدکم بشمالہ ولایشربن بھا۔ (مسلم ص۱۷۲ ج۲)

حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ہرگز تمہارا کوئی بائیں ہاتھ سے نہ کھائے اور نہ پئے۔

(۷) حلت و حرمت کا مسئلہ

جناب افتخار احمد صاحب (پرنسپل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور) لکھتے ہیں: نفسیات کے مغربی ماہرین کو اسلام میں حلال و حرام کے مسئلہ پر سخت اعتراض ہے، جب کوئی مسلمان سور کا گوشت کھانے سے انکار کرتا ہے تو وہ اس عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ بات علمی نقطۂ نظر سے غلط ہے، قرآن مجید نے، مردار، خون اور سور کے گوشت سے منع کیا ہے اور ان جانوروں کے گوشت سے بھی منع کیا ہے جو لاٹھی یا پتھر وغیرہ سے مارے گئے ہوں یا جن کو درندوں نے پھاڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ والنطیحۃ وما اکل السبع الا ما ذکیتم۔ (المائدہ/۳)

تم پر حرام کئے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کہ غیر اللہ کے نام سے نامزد کردیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرجاوے اور جو کسی ضرب سے مرجاوے اور جو اونچے سے گر کر مرجاوے اور جو کسی کی ٹکر سے مرجاوے اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے لیکن جس کو ذبح کر ڈالو

اور طبی تحقیقات کے مطابق یہ تمام گوشت انسانی صحت کیلئے بہت مضر ہیں، سور کو وہ تمام بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں جو انسانوں کو ہوتی ہیں، اسے دل کے دورہ سے ہیضہ تک ہوتا ہے، اس لئے یہ دوسروں میں بیماریاں پھیلانے اور اپنے کھانے والوں کو بیمار کرنے کی استعداد دوسرے جانوروں سے زیادہ رکھتا ہے، اس کا گوشت کھانے والے خون کی نالیوں اور جوڑوں کی بیماریوں میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔" (طب نبوی اور جدید سائنس ص ۸۰ ج ۱)

(۸) ——— خمر (شراب) کی حرمت

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

کل مسکر خمر وکل خمر حرام (ابن ماجہ) ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے۔

ابن ماجہ کی ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو الدرداءؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "خمر مت پینا کیونکہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے۔"

جس روز شراب کے حرام ہونے کا اعلان ہوا لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے، جام پھینک دیئے خمخانے برباد کر دیئے اور مدینہ کی گلی کوچوں میں شراب پانی کی طرح بہنے لگی۔

(تنظیم الاشتات، از حضرت مولانا ابو الحسن صاحب چاٹگامی ص ۸۴ ج ۲)

ڈاکٹروں کی تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ شراب کے ہر گلاس سے دماغ کے اعصاب ختم ہوتے ہیں، جو اعصاب ضائع ہوتے ہیں وہ دوبارہ پیدا نہیں ہوتے، یہ ایک ایسا نقص ہے جس کی نہ تو تلافی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی علاج سے کوئی فائدہ ہو گا، اس انحطاط سے یادداشت، قوت فیصلہ اور اعصابی نظام روز بروز کمزور پڑنے لگتے ہیں، اور کچھ عرصہ کے بعد ایک پڑھے لکھے معزز آدمی کا بقایا بیکار ہو جاتا ہے۔

انگلستان کے بادشاہ جارج ششم کے پھیپھڑوں سے سرطان نکالنے والے عظیم برطانوی سرجن "سر" کا خطاب پانے کے بعد کثرت شراب نوشی کے بعد اپنے گھر کے دروازہ پر بے ہوش پائے گئے، چوروں نے جب دروازہ کھلا پایا اور مالک کو بے ہوش دیکھا تو سارا گھر لے گئے، کچھ عرصہ کے بعد یہ دماغی عوارض میں مبتلا ہو کر پاگل خانے بھیج دیئے گئے اور وہیں وفات پائی۔

۱۹۳۶ء میں برلن میں دنیا بھر کے ماہرین طب کی بین الاقوامی کانفرنس ہوئی، جب یہ علماء فن شراب پی کر باہر نکلے تو ان کے استقبال کیلئے اچکے، جیب تراش اور طوائفیں موجود تھیں، اگلی صبح نہ کسی کے پاس گھڑی تھی نہ بٹوا، کانفرنس کے منتظمین کو ان تمام معززین کیلئے واپسی کا کرایہ ادا کرنا پڑا، یہ حضرات کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ کئی دنوں تک سفر کے قابل نہ رہے اور ہسپتالوں کی زینت بنے رہے۔ ؎

جو پی کے تھانے نہ گئے وہ بادہ خوار نہیں۔

پرانے ڈاکٹر نمونیہ، زکام اور سردی لگنے میں بچوں کو برانڈی (BRANDY) دیتے تھے، لیکن بعد میں امریکہ کے ماہرین علم الامراض نے یہ ثابت کیا ہے کہ برانڈی کی موجودگی میں جسم کا دفاعی نظام مفلوج ہوجاتا ہے خاص طور پر پھیپھڑوں کی سوزش میں خون کے سفید دانے غیر متحرک ہوجاتے ہیں اور اس طرح بیماری کی تخریبی کارروائی بھرپور نقصان کا باعث ہوجاتی ہے، الحمدللہ آج کے مشاہدات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا ثبوت ہیں کہ "ذلک داء ولیس بشفاء (طحاوی) یعنی یہ شراب دوا نہیں بلکہ بذات خود بیماری ہے (طب نبوی اور جدید سائنس ص۱۴۶ وص۱۴۷ ج۲)

⑨ ـــــــ برتن میں کتا منہ ڈالے تو تین یا سات مرتبہ دھویا جائے۔

جرمن کا ایک ڈاکٹر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کے بارے میں لکھتا ہے کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات طیبہ پر اس قدر کامل وثوق ہے کہ میں صرف انہی کی تحقیق کرتا ہوں، اور اعلیٰ طبی نتائج تک پہونچتا ہوں، اور جب کبھی میرا تجربہ کسی حدیث صحیح کے خلاف ہوتا ہے تو اُسے میں تجربہ کا نقص سمجھتا ہوں، اور اس فرمودۂ نبی م کو کبھی بھولے سے بھی غلط تصوّر نہیں کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ کتے کے برتن میں منہ ڈالنے اور اس کے پاک کرنے والی ترکیب جو کہ حدیث میں آئی ہے کہ "تین یا سات مرتبہ دھویا جائے اور آخری بار مٹی سے دھویا جائے" کے متعلق لکھتا ہے کہ مٹی کے تجزیہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس میں اجزائے نوشادریہ اور اسی قبیل کے ایسے نمکیات موجود ہیں جو کتے کے زہر کو بے اثر کردیتے ہیں (ماہنامہ دارالعلوم، رمضان وشوال ۱۳۹۹ھ)

⑩ ـــــــ مسواک کی افادیت اور اہمیت

دانت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہیں، جسم انسانی کا ضروری حصہ ہیں اور چہرے کے حسن کے عناصر

ہیں، دانت خوراک کو پیس کر باریک کردیتے ہیں، پھر یہ خوراک لعاب دہن میں مل کر معدہ میں چلی جاتی ہے اور آسانی سے ہضم ہوجاتی ہے، لیکن عدم صفائی کی وجہ سے دانتوں اور مسوڑوں میں طرح طرح کی بیماریاں ہوتی ہیں، بلکہ بقول اطباء اس سے معدے خراب ہوجاتے ہیں اور غذا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتی اس طرح جسم کمزور ہونے لگتا ہے، اور آدمی مختلف بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں دانتوں کا سائنس عروج پر ہے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے ادارے ڈینٹل کی تعلیم دینے میں معروف ہیں، دانتوں اور مسوڑوں کی حفاظت، صفائی اور سرجری وغیرہ پر کروڑوں روپے خرچ ہورہے ہیں، چنانچہ برطانیہ کی وزارت صحت کی ایک رپورٹ کے مطابق گذشتہ سنہ ۱۹۵۷ء میں دانتوں اور مسوڑوں کے علاج پر اٹھاون کروڑ پچاس لاکھ پاؤنڈ صرف ہوئے ہیں، اور ۱۹ اگست سنہ ۱۹۶۰ء کی ایک خبر میں کہا گیا ہے کہ عرب ممالک میں طالب علموں میں مفت ٹوتھ برش اور منجن کی تقسیم پر اٹھائیس ہزار ڈالر بجٹ مقرر کیے گئے ہیں۔ (اسلامی اصول صحت از فضل الکریم فارانی ص۲۲۴)

مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "مسواک کی تعلیم" سے دانتوں کی صفائی اور حفاظت کا جو آسان اور سادہ طریقہ بتایا تھا وہ آج بھی اس طرح مؤثر ہے جیسے پہلے تھا، ایک حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ میری امت پر مشقت پڑجائے گی تو ہر نماز کے وقت مسواک کرنا ان پر لازم کردیتا" (مسلم شریف ص۱۲۸ ج۱)

ایک اور حدیث شریف میں مسواک کے بہت سے فائدے آئے ہیں، مثلاً مسواک کرنے سے منہ صاف ہوتا ہے، مسوڑا مضبوط ہوتا ہے، بینائی تیز ہوتی ہے، بلغم دور ہوتا ہے، معدہ درست رہتا ہے، فرشتے خوش ہوتے ہیں، اللہ راضی ہوتا ہے اور نیکیاں بڑھتی ہیں (کنز العمال ص۳۴ ج۹)

لیکن آج کل بہت سے لوگ مسواک کے بجائے ٹوتھ برش (TOOTH BRUSH) استعمال کرتے ہیں، حالانکہ طبی حیثیت سے اس کا استعمال مضر ہے، ایک برش بار بار استعمال کرنے سے اس میں جراثیم پیدا ہوتے ہیں کیونکہ وہ گھستا نہیں ہے، بخلاف مسواک کے کہ وہ جوں جوں استعمال ہوتا ہے گھستا رہتا ہے، نیز چونکہ برش کا رُواں کچھ سخت ہوتا ہے لہٰذا بار بار ان کے استعمال سے زبان تالو اور مسوڑھوں میں زخم پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے، اور یہ خطرہ مسواک میں نہیں ہے کیونکہ اس کے ریشے نرم اور ملائم ہوتے ہیں، اور یہ بھی ہوتا ہے کہ مسواک کے ریشے نہایت باریک اور برش کے ریشے کسی قدر موٹے ہوتے ہیں، لہٰذا مسواک سے جس قدر آسانی کے ساتھ دانتوں کے درمیان

کے میل کچیل صاف ہوں گے، برش سے نہیں ہوں گے۔ (ماہنامہ مدینہ، ڈھاکہ، مئی ۱۹۹۲ء)

(۱۱) ــــــ ڈاڑھی کے طبی فوائد

معتبر دلائل سے ثابت ہے کہ ڈاڑھی رکھنا تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت اور طریقہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

عشر من الفطرة قص الشارب واعفاء اللحية۔ (مسلم شریف ص۱۲۹ ج۱)	دس چیزیں فطرت (یعنی سنن انبیاء) میں سے ہیں، جن میں مونچھوں کا کٹوانا اور ڈاڑھی کا بڑھانا بھی ہے

نیز احادیث میں ڈاڑھی رکھنے کی بڑی تاکید آئی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

خالفوا المشركين دفروا اللحى واحفوا الشوارب (صحیح بخاری، کتاب اللباس ص۸۷۵ ج۲)	مشرکین کی مخالفت کرو، ڈاڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کترواؤ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اور یہ بھی فرمایا:

عشر خصال عملتها قوم لوط بها اهلكوا منها اتيان الرجال بعضهم بعضا وضرب الدفوف وشرب الخمور وقص اللحية وطول الشارب (درمنثور ص۳۲۲ ج۳)	دس خصلتیں ایسی ہیں جو قوم لوط میں تھیں جن کی وجہ سے وہ ہلاک ہوئی، ان دس چیزوں میں لواطت، دف بجانا، شراب پینا، ڈاڑھی کا کٹوانا اور مونچھیں بڑھانا بھی شامل ہے

اور ڈاڑھی رکھنا جہاں شرعی دلائل سے ثابت ہے وہاں اس کی بہت سی طبی مصالح اور فوائد بھی ہیں. چند فوائد درج ذیل ہیں۔

(۱) بدن انسانی میں تین عضو ایسے ہیں جو اطباء کے نزدیک متفقہ طور پر اعضاء رئیسہ و شریفہ کہلاتے ہیں، چنانچہ علامہ علاؤ الدین قرشی رقم طراز ہیں

ضروری قوتوں کا منبع وہ تین عضو ہیں، جن کو اعضاء رئیسہ کہا جاتا ہے، ایک قلب، دوسرے دماغ، تیسرے جگر، (موجز القانون ص۱۱) بقاء جسم کا دارومدار انھی پر موقوف ہے یہی وجہ ہے کہ ان تینوں میں سے اگر کوئی مبتلائے مرض ہو جاتا ہے تو جسم انسانی کا سارا نظام بگڑ جاتا ہے اس لئے اطباء کے نزدیک ان کی حفاظت وصیانت بہت ضروری ہے، ان تینوں اعضاء میں تادی

سے قریب دماغ ہے، اگر ڈاڑھی کا حلق کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، یہی وجہ ہے کہ فی زمانہ دماغی قویٰ، اگلے لوگوں کی نسبت بہت کمزور ہیں اور جب دماغ متاثر ہوگا تو اس کا اثر پورے جسم پر پڑیگا۔ (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، رمضان وشوال ۱۴۰۹ھ)

(ب) جناب حکیم شمیم احمد صاحب رقم طراز ہیں۔

• ڈاڑھی سے قربت رکھنے والا ایک عضو آنکھ بھی ہے، جو اعضاء ضروریہ میں سے ہے، ڈاڑھی منڈانے سے آنکھ ضرور متأثر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں ضعف بصارت کا مرض کثیر الوقوع ہو چکا ہے: (حوالہ بالا) ایک اور ڈاکٹر لکھتا ہے کہ "ڈاڑھی پر بار بار استرہ چلانے سے آنکھوں کی رگوں پر اثر پڑتا ہے، اور ان کی بینائی کمزور ہوتی جاتی ہے۔"

(ڈاڑھی کا وجوب، از شیخ الحدیث مولانا زکریا رہ ص۲۷)

(ج) بدن میں کچھ دُخانیت کے سمّی اثرات ہوتے ہیں، قدرت نے ڈاڑھی وغیرہ کے بالوں کو اندر سے مجوّف اور نالی دار بنا دیا ہے تاکہ یہ اثرات اس نالی کے ذریعہ خارج ہوتے رہیں اور بدن میں جذب نہ ہونے پائیں، اب اگر ڈاڑھی کے بالوں کو مونڈ دیا جائے گا تو اس نالی کا دہانہ جس سے دُخانیت خارج ہوتی تھی، بالکل جلد کے محاذ میں آجائے گا، جس کی وجہ سے وہ سمّی اثرات بدن سے خارج ہونے کے بجائے جلد کی سطح پر پھیل جائیں گے، اور اس سے چہرے کا چمڑا ضرور متاثر ہوگا، یہی وجہ ہے کہ ڈاڑھی مونڈنے والے لوگوں کے چہروں پر کیل، مہاسے رونما ہوتے رہتے ہیں، یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ اگر یہی بات ہے تو پھر سر کے بالوں کو منڈانا مُضر ہوگا، کیونکہ دونوں میں فرق ہے، ڈاڑھی کے بالوں کا رخ جانب زیریں کو ہے، جبکہ سر کے بالوں کا رخ جانبِ بالا کو ہے، ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں (ماہنامہ دارالعلوم، رمضان وشوال ۱۴۰۹ھ ملخصاً)

(د) جناب حکیم رضوان احمد صاحب لکھتے ہیں۔

ڈاڑھی اور اُنثیین میں اندرونی طور پر ایک مخصوص تعلق ہے، مثلاً اگر کسی شخص کے پیدائشی خصیے نہ ہوں تو اس کی ڈاڑھی بھی نہیں نکلتی، گویا کہ خصیوں کا طبعی انداز پر ہونا ڈاڑھی کا سبب پیدائش ہے، غرضیکہ اور اس جیسے بہت سے شواہد اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ ڈاڑھی اور خصیے کے مابین ایک ایسا مخفی تعلق ہے جس سے انکار ناممکن ہے، اب اگر ڈاڑھی کو منڈایا جائیگا

تو اس مخفی تعلق کی بنا پر یہ مونڈنا ضعف انثیین اور ضعف باہ کا سبب بن سکتا ہے۔"
(منافع الاعضاء، از حکیم رضوان احمد ص۸۹)

(۵) امریکن ڈاکٹر چارلس ہومر عیسائی رقم طراز ہیں
"مجھے سمجھ میں نہیں آتا آخر ڈاڑھی کے نام پر لوگوں کو لرزہ کیوں چڑھتا ہے، لوگ جب اپنے سروں پر بال رکھتے ہیں تو پھر چہرے پر ان کے رکھنے میں کیا عیب ہے، کسی کے سر پر سے اگر کسی جگہ کے بال اڑ جائیں تو اُسے گنج کے اظہار سے شرم آتی ہے، لیکن یہ عجب تماشا ہے کہ اپنے پورے چہرے کو خوشی سے گنجا کر لیتے ہیں، اور اپنے کو ڈاڑھی سے محروم کرتے ذرا بھی نہیں شرماتے جو کہ مرد ہونے کی سب سے زیادہ واضح علامت ہے، لمبی اور گھنی ڈاڑھی گلے کو سردی کے اثرات سے بچائے رکھتی ہے، ڈاڑھی والا انسان اپنی ڈاڑھی کی ہمیشہ لاج رکھتا ہے اس میں ایک آن ہوتی ہے جو مرد کی شان کے شایان ہے، آخر ایک پورے نوجوان مرد کی یہ تمنا کیوں ہو کہ اس کا چہرہ بچوں کا سا نظر آئے، جو لوگ ڈاڑھی کا مذاق اڑاتے ہیں وہ حضرت یسوع مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مذاق اڑاتے ہیں اس لئے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ڈاڑھی رکھتے تھے:
(ماخوذ از ڈاڑھی کا وجوب ص۲۸، ۲۹)

الغرض ڈاڑھی کا مسئلہ صرف شریعت کا نہیں، فطرت سلیمہ کا بھی مسئلہ ہے، اس میں بہت سی عقلی مصالح اور طبی فوائد ہیں، لہٰذا اس کی خلاف ورزی صرف شریعت سے منہ موڑنا نہیں بلکہ فطرت انسانی اور عقل انسانی سے رشتہ توڑنے کے بھی مترادف ہے، یہی وجہ ہے کہ اگلے زمانوں کے بڑے بڑے حکیموں طبیبوں اور فلسفیوں، مثلاً افلاطون، سقراط، بقراط اور ارخمیدس وغیرہم کی تصویروں میں لمبی لمبی ڈاڑھیاں نظر آتی ہیں، صرف یہ نہیں بلکہ انیسویں صدی تک یورپ میں بھی ڈاڑھی عوام اور شرفاء کا شعار سمجھی جاتی تھی، روم کے آخری دور کے بادشاہ کے پاس جب ایک بے ریش شخص بطور سفیر پہونچا تو اس نے خفگی کا اظہار کیا اور پوچھا کہ تمھارے بادشاہ کو ڈاڑھی والا کوئی شخص نہ ملا۔ (الصدیق ملتان، اپریل ۱۹۵۲ء)

لاہور ہائی کورٹ کے کچھ سابق بارِیش چیف ججوں کے فوٹو اب بھی چیف جسٹس ہال میں آویزاں ہیں (ڈاڑھی کی اسلامی حیثیت ص۳۶)

(۱۲) ——— تمباکو نوشی اور ہماری صحت

کتب فقہ مثلاً فتاویٰ عزیزی اور مجموعہ فتاویٰ میں سگریٹ نوشی اور حقہ نوشی کو از روئے شرع مکروہ کہا گیا ہے اور طبی حیثیت سے اگر جائزہ لیا جائے تو اس کی جسمانی تباہیاں بالکل واضح ہیں، ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق ماحول میں تمباکو کے دھوئیں سے دو قسم کے اثرات رونما ہوتے ہیں، ایک تو فوری، دوسرے طویل مدتی، فوری اثرات میں سوزش اور جھنجلاہٹ شامل ہے ، سوزش کے اثرات ناک اور آنکھوں کی لعاب دار جھلی پر دیکھے جا سکتے ہیں، مثال کے طور پر عام حالات میں تمباکو کا دھواں لگنے کے دوران ایک منٹ میں آنکھ جھپکنے کی شرح کی نگرانی کر کے داخلی اور واقعی طور سے سوزش کے اثرات کا اندازہ لگایا جاتا ہے، جھنجلاہٹ کا تعلق تمباکو کے دھوئیں کے گیس والے حصہ سے پیدا ہونے والی بدبو کے احساس سے ہے، ماحول میں تمباکو کا دھواں موجود ہونے سے بچپن ہی میں سانس کی شدید بیماریاں، دائمی کھانسی، بلغم، کان بہنے، پھیپھڑوں کے فعل میں کمی وغیرہ کی شکایات ہو جاتی ہیں۔ ماحول میں تمباکو کے دھوئیں سے کافی حد تک متاثر ہونے کے سبب جو طویل مدتی اثرات رونما ہوتے ہیں ان میں پھیپھڑوں کا کینسر، اور دل کی بیماریاں شامل ہیں ، اس شعبہ میں کی گئی حالیہ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ سگریٹ کے دھوئیں سے پھیپھڑوں کے خلیہ میں ایک مادہ CYPIAI چلا جاتا ہے، جو بعد میں کینسر کا سبب بنتا ہے، پھیپھڑوں کے کینسر سے ہونے والی نوے فیصد اموات ، ہر طرح کے کینسر سے ہونے والی تیس فیصد اموات، سانس کی نالی میں ورم سے ہونے والی اسّی فیصد اموات اور دل کی بیماریوں کے سبب ہونے والی بیس فیصد سے لے کر پچیس فیصد تک اموات ماحول میں موجود تمباکو کے دھوئیں کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں۔

(شائع کردہ ۱۹۹۱ء پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ انڈیا)

امریکہ کے دس اسپیشلسٹ بحث و جانچ کے بعد اس پر متفق ہوئے کہ جو لوگ تمباکو نوشی کے مرتکب ہیں ان میں منہ ہونٹ یا حلق کے مرض سے مرنے کی تعداد ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہے جو تمباکو نوشی نہیں کرتے۔

پھیپھڑوں کا سرطان، ناک گلے اور سانس کی نالی میں التہاب اور ان جگہوں کا پھول جانا، گلے کا سرطان، معدے کے امراض اور دل پر چربی وغیرہ کے امراض دغیرہ (ترجیہ الاولاد، ازعبدالحکیم ناصح ص۱۲۶ ج ۱)

ڈاکٹر چارس لکھتے ہیں کہ تمباکو کا کھانا اور پینا مرگی اور سکتہ کے بڑے اسباب میں سے ہے

ڈاکٹر گورگاس رقم طراز ہیں کہ تمباکو کا استعمال انسان کے اعضاء اور قویٰ کے نشوونما کے لئے سخت مہلک ہے، دل کو سخت صدمہ پہونچتا ہے، جسمانی طاقت کو کم کردیتا ہے، دل کی قوت گھٹا دیتا ہے، اس کے استعمال سے دردسر لاحق ہوجاتا ہے، نگاہ خراب ہوجاتی ہے، بدہضمی پیدا ہوجاتی ہے اور بدن کی بالیدگی کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

نیز تمباکو کی سمیت قوت باہ پر اثر انداز ہوتی ہے، چنانچہ ٹرکی کے سلطان نے ۱۶۳۵ء میں رعیت کو یہ حکم دیا تھا کہ تمباکو نوشی جرم ہے اور جو شخص تمباکو نوشی کے جرم میں پکڑا گیا تو اس کی سزا صرف یہ ہوگی کہ اسے تختہ دار پر لٹکایا جائے گا، کیونکہ اسے خوف تھا کہ اسکے استعمال سے کہیں تمام لوگ نامرد نہ ہوجائیں

(ماخوذ از رسالہ الحکیم ۲۹ء / ماہنامہ دارالعلوم، رمضان وشوال ۱۴۱۲ھ)

بنگلہ دیش کے ماہر امراض پروفیسر نورالاسلام رقم طراز ہیں کہ تمباکو نوش حاملہ عورت اپنے پیٹ میں ہی بچہ کو زہر دینا شروع کردیتی ہے، جس کے نتیجے میں نومولود بچوں کا جسمانی وزن کم ہونے لگتا ہے، حتی کہ ولادت کے بعد کچھ ہی دنوں میں ان بچوں کی اموات زیادہ واقع ہوتی ہیں۔

دیکھئے اگر محسن انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وتعلیمات پر عمل ہو تو جہاں یہ فلاح آخرت کا ضامن ہے وہاں اس میں بہت سے دنیوی اور طبی وسائنسی فوائد بھی ہیں لندن کا مشہور اخبار "نیرایسٹ" لکھتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وارشاد کی قدر وقیمت اور عظمت وفضیلت کو اگر ہم تسلیم نہ کریں تو ہم فی الحقیقت عقل ودانش سے بیگانہ ہیں"

(اسلام اور سائنس ص۱۳۴)

اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں اپنی زندگی کی ترقی، سکون اور فلاح وبہبود کا سراغ لگانے کی توفیق بخشے آمین

فقر [illegible]

از جناب محمد بدیع الزماں صاحب
ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اردو نگر
فرسٹ سیکٹر پھلواری شریف پٹنہ ۸۰۱۵۰۵

فقر کا لفظ اردو شاعری کیا۔ اردو ادب میں پہلے پہل اقبالیات سے آیا، گرچہ اردو شاعری میں فقر کی ماہیت پر لاتعداد اشعار ملتے ہیں، مگر کسی نے اسے بطور اصطلاح استعمال نہیں کیا۔

چونکہ اقبال کی روح قرآنی تھی، اس لئے اقبال نے "عشق" اور "خودی" کی اصطلاحوں کو مربوط کرنے کے لئے ایک تیسری اصطلاح "فقر" وضع کی اس لئے کہ اس کی بھی روح قرآنی ہے: "ضرب کلیم" کی نظم "سلطانی" میں کہتے ہیں ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے۔
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی

فقر کی اسی قرآنی روح کی بنا پر اقبال نے اسے اپنے اردو کلام میں ۱۳۱ اشعار میں بطور اصطلاح استعمال کیا ہے، جس میں "بال جبریل" میں ۱۶ اشعار ہیں، "ضرب کلیم" میں ۱۱۲ اشعار ہیں، اور "ارمغان حجاز" میں ۱۳ اشعار ہیں، ان ہی کچھ اشعار پر مشتمل ایک غزل اور تین نظمیں ہیں، یعنی "بال جبریل" کی غزل ۵۹ اور نظموں میں "بال جبریل" کی نظم "فقر" اور "ضرب کلیم" کی نظمیں "فقر و ملوکیت" اور "فقر و راہبی"۔

فقر طریقت کی ایک اصطلاح ہے جسے اقبال نے قطعی الگ معنوں میں استعمال کیا ہے کیونکہ وہ خود صوفیانہ طریقۂ کار کے من وعن قائل نہ تھے، اقبال کے مطابق شریعت کو پرکھنے اور بہ نظر عمیق اس پر عمل کرنے کا نام ہی طریقت ہے، اقبال کے فکری نظام میں فقر بنیادی اہمیت کا حامل ہے جس کے ڈانڈے عشق سے جا ملتے ہیں اور جہاں عشق اور خودی کے تصورات باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں۔

فقر کو اردو میں عام طور پر مسکینی و مجبوری کے مترادف سمجھا جاتا ہے لیکن اقبال فقر و استغنا سے وہ بے نیازی مراد لیتے ہیں جسے مادی وسائل کی موجودگی اور غیر موجودگی کا خیال تک نہ ہو، اقبال کا ایسا فقیر مادی وسائل حاصل کرنے یا ان کی حفاظت کے لئے اعلیٰ قدروں کو قربان نہیں کرتا، فقر ان کے نزدیک روح اسلام کے مترادف ہے، اس کا تعلق مادیت سے نہیں بلکہ

روحانیت سے ہے، یہ قلب ونگاہ اور روح کی ایک مستانہ ادا ہے جس کے جلو میں صدق و اخلاص ونیاز وسوز و درد ہے۔

ایسے تو اقبال نے "فقر" کی اصطلاح پر کہے گئے سارے اشعار میں روشنی ڈالی ہے مگر اس کی ماہیت پر انھوں نے بھرپور روشنی "بال جبریل" کی غزل ۵۹ کے درج ذیل اشعار میں ڈالی ہے ؎

فقر کے ہیں معجزات تاج وسریر وسپاہ ؛ فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد ؛ فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ وحکیم، فقر مسیح وکلیم ؛ علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر ؛ فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
علم کا موجود اور، فقر کا موجود اور ؛ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی ؛ ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

دل اگر اس خاک میں زندہ وبیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ

اس غزل کا کلیدی شعر اس کا پانچواں شعر ہے جس میں فقر کا "موجود" کلمۂ شہادت کو بتایا گیا ہے، حالانکہ عالم (متکلم) اور فقیر (صوفی) دونوں توحیدِ الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں مگر اول الذکر اللہ کو تو موجود کہتا ہے مگر وہ خدا کے علاوہ کائنات کا بھی حقیقی وجود تسلیم کرتا ہے جب کہ برعکس اس کے مؤخر الذکر صرف اللہ کو موجود ہی نہیں کہتا بلکہ اس کے علاوہ کسی شئی کو حقیقی معنی میں موجود نہیں سمجھتا اور کائنات کے وجود اس کی صفات کا پرتو یعنی ظل قرار دیتا ہے، اس طرح وہ ذاتِ باری پر بعینہٖ محیط کائنات یقین رکھتا ہے، اسے صرف اس کلمہ کے الفاظ ہی پر یقین نہیں بلکہ اس کی شہادت پر بھی یقین ہے جو شہادت کہ خود خدائے تعالیٰ نے سورہ آل عمران ۳ کی درج ذیل آیت ۱۸ میں دی ہے کہ

"اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے (شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ) اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔"

اقبال کے نزدیک فقر سے مراد دل اور نظر کی عفت وطہارت ہے جو جسمانی اور مادی زندگیوں کی تحریکات اور ترغیبات کو ترک کر کے انفس و آفاق پر غلبہ اور تفوق حاصل کرنے کی طرف رہنمائی کرتا ہے، یا یوں کہا جائے کہ یہ نفس روحانی زندگی کی ایک تنزیہی کیفیت کے حصول کے مترادف ہے، یہ فقر ایک انقلابی قوت ہے جو حق و باطل کی جنگ میں حق کی قوت بن کر ملوکیت کے مقابل آتا ہے اس لئے اقبال فقیری میں حضرت علیؓ کی بوئے اسد اللٰہی دیکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ یہی جذبہ اپنے کو الوہی صفات سے متصف کرنے کے لئے دل میں اگر جگہ پیدا کر لیتا ہے تو انسان سعی کا منتہا سے مقصود بن جاتا ہے،

چنانچہ "بال جبریل" کی غزل ۲۴ کے درج ذیل شعر میں اقبال اسی نکتہ کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

چونکہ فقر کی روح در پردہ قرآنی ہے اس لئے یہ فقر توحید کا رازدار اور متاعِ مصطفوی کا امین ہے، اقبال کے "فقیر اولیٰ" کے فقر کے عناصر ترکیبی میں صدق و اخلاص، ذوق و شوق اور تسلیم اور تسخیر شش جہات کے عناصر شامل ہیں، اس کا مزاج اسوۂ حسنہ کی پیروی اور شریعت محمدیؐ سے بنتا ہے اور اسی مزاج کو ہم "فقر" کا بھی نام دے سکتے ہیں، یہ کہ فقر مترادف ہے اتباع رسول سے اس پر ایک روایت ہے کہ۔

"ایک صحابی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "یارسول اللہ، مجھے آپ سے محبت ہے" حضورؐ نے فرمایا، دیکھو کیا کہتا ہے، انھوں نے پھر یہی عرض کیا کہ، مجھے آپ سے محبت ہے، حضورؐ نے پھر یہی ارشاد فرمایا، جب تین مرتبہ سوال و جواب ہوا تو حضورؐ نے فرمایا کہ- اچھا، اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو فقر کو اوڑھنے بچھانے کیلئے تیار ہو جاؤ، اس لئے کہ مجھ سے محبت رکھنے والوں کی طرف فقر ایسے زور سے دوڑتا ہے جیسے کہ پانی اونچان سے دوڑتا ہے ۔"

(فضائل اعمال: حکایت صحابہؓ)

فقر عفتِ قلب و نگاہ کے ساتھ مسیحائی اور کلیمی کے خواص پیدا کر کے ایک مرد مومن اسرار خودی

کا انکشاف بھی کرتا ہے، اس کی مثال خود رسول مقبولؐ کی ذات بابرکات اور آپ کا یہ ارشاد ہے کہ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ (فقر پر مجھے فخر ہے) اقبال نے اس فقر فخری کی شان اور اس کا سماں آپ اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حوالوں سے "بانگ درا" کی نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" کے ان اشعار میں اس طرح باندھا ہے۔

سماں اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ کا رہا شان امارت میں ؛ بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے ؛ کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے ؛ جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ کی میراث صحابۂ کرام رضؓ کو عشق رسولؐ سے ملی، فقر اور شاہی یہ دو موتی ہیں جو سرکار دو عالمؐ نے توحید کے سمندر سے حاصل کئے تھے، فقر کی موتی آنحضرتؐ کی نگاہ بن گئی اور شاہی کی موتی آپ کے دستِ مبارک میں شمشیر بن گئی، اسی نکتہ پر اقبال کا یہ شعر ہے ؎

خسروی شمشیر، درویشی نگہ
ہر دو گوہر از محیط لَا اِلٰہ۔!

اس کے بعد ان دونوں صفات یعنی خسروی اور درویشی کی تجلی صحابۂ کرام رضؓ کے قلوب پر عکس فگن ہوگئی اور ہر صحابی نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس نعمت خداداد سے اپنا اپنا دامن بھرا،

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰؐ است
ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفیٰؐ است

اقبال اس لئے جس فقر کی دعوت دیتے ہیں اس کی اصل وہ حجازی بتاتے ہیں یعنی جس کی روح قرآنی ہو، چنانچہ اپنے لڑکے جاوید اقبال (جو اس وقت جسٹس جاوید اقبال، ریٹائرڈ چیف جسٹس پاکستان سپریم کورٹ کہلاتے ہیں) کو جو اس وقت لندن میں زیر تعلیم تھے۔ "ضرب کلیم" کی نظم "جاوید سے" کے تیسرے بند میں مشورہ دیتے ہیں۔

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر ؛ جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا ؛ اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لئے موت ؛ ہے اس کا مقام شاہبازی

روشن اس سے خرد کی آنکھیں ؛ ہے سرمۂ بو علی و رازی
حاصل اس کا شکوہِ محمود ؛ فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تری دنیا کا یہ سرافیل ؛ رکھتا نہیں ذوقِ نے نوازی
ہے اس کی نگاہ عالم آشوب ؛ در پردہ تمام کارسازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا ؛ بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

فقر کی شان صرف بے نیازی تک محدود نہیں بلکہ باطل کے خلاف بے باکی و بے تابی سے بے ساز ویراق جنگاہ میں مجاہد فی سبیل اللہ بن کر دشمنوں کو شکست دینا بھی ہے جسے اقبال نے "ضربِ کلیم" کی نظم "فقر و ملوکیت" کے درج ذیل اشعار میں ذہن نشین کرایا ہے۔

فقر جنگاہ میں بے ساز ویراق آتا ہے ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بیتابی سے تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم
اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم
عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پہ حرام
کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم

فقر کی دیگر صفات کے متعلق اقبال نے "ضربِ کلیم" کی نظم "فقر و راہبی" میں بھی روشنی ڈالی ہے اس نظم میں انھوں نے فقر و راہبی کے بیچ فرق کو ہی صرف واضح نہیں کیا بلکہ فقر کو روح اسلام قرار دیتے ہوئے اس اصطلاح کے متعلق لوگوں کی غلط فہمیوں کو بھی دور کیا ہے، کہتے ہیں:

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح و بدن کی ہے وانمود اس کو کہ ہے نہایت مومن خودی کی عریانی
وجود صیرفیٔ کائنات ہے اس کا اسے خبر ہے یہ باقی ہے، اور وہ فانی
اسی سے پوچھ کہ پیش نگاہ ہے جو کچھ جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بوئے طولانی

یہ فقرِ مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

اقبال کے نزدیک فقر دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ "ذکر" اور "فکر" کہتے ہیں ؎

فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر ٭ فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

اسی موضوع پر "ضربِ کلیم" میں ایک خصوصی نظم "ذکر و فکر" ہے جس میں وہ اس کی مزید وضاحت یہ کرتے ہیں ؎

مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکان
مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

انھی باتوں کو اقبال نے "ضربِ کلیم" ہی کی نظم "مدنیتِ اسلام" میں اس طرح بھی ذہن نشین کرایا ہے ؎

بتاؤں تجھ سے مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

اقبال جب فقر کو "ذکر" اور "فکر" کا مجموعہ بتاتے ہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ مومن اللہ سے محبت کرتا ہے اور بوجہ محبت اس کی اطاعت کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی عقل خداداد سے کام لے کر کائنات میں غور و فکر کرتا ہے اور تحقیق سے کام لے کر عناصر پر حکمرانی کرتا ہے۔ اقبال جب کہتے ہیں کہ: "فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر" تو "ذکر" بمعنی "سبحان ربی الاعلیٰ" اور "کمالِ جنوں" اور "فکر" بمعنی پیمائشِ زمان و مکان" اور "نہایتِ اندیشہ" کو سورہ آلِ عمران ۳ کی درج ذیل آیت ۱۹۱ کی روشنی میں سمجھیئے تو فقر کے "ذکر" و "فکر" کا مجموعہ ہونے کی بات صاف سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے، پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے۔"

فقر کی خصوصیات پر مزید روشنی اقبال نے "بالِ جبریل" کی درج ذیل نظم "شاہیں" میں

ڈالی ہے مگر قبل اس نظم کے مطالعے کے شاہین میں اسلامی فقر کی کون کون سی خصوصیات پائی جاتی ہیں اسے پہلے اقبال ہی سے اس خط میں سن لیجیے جو انھوں نے ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو مولوی ظفر احمد صدیقی کو لکھا کہ۔

"شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں، اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں (۱) خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔"

اس علامتی پیکر کی شبیہ میں مومن کی فقیرانہ شان کی غمازی اب نظم میں ملاحظہ کیجیے۔

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا ۔۔۔ جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو ۔۔۔ ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل ۔۔۔ نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم ۔۔۔ ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری ۔۔۔ جوانمرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں ۔۔۔ کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا ۔۔۔ لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب، یہ پچھم چکوروں کی دنیا ۔۔۔ مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اقبال کے نزدیک "فقری" ایک علم کی حیثیت رکھتی ہے، "ضربِ کلیم" کی نظم "مومن" کے پندرہویں بند میں کہتے ہیں ۔ آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاہد

مشکل نہیں اے سالکِ رہ علمِ فقیری

علم فقیری کی شہادت ہر انسان کے خمیر میں اس لئے ملتی ہے چونکہ خدا خود فرماتا ہے "اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا"

(سورۃ البقرہ ۲، آیت ۲۸۶۔) (باقی برصفحہ)

از ـــــــــــــ مولانا یعقوب اسماعیل قاسمی

مسائل رویت ہلال پر ایک نظر

اللہ جل شانہ نے دین اسلام کو بلا قید زمان ومکان قیامت تک سارے جہانوں کے لئے ہدایت بناکر اتارا ہے، قرآن کریم اور احادیث نبویہ دو چراغ ہیں جو بشریت کیلئے صراط مستقیم کو روشن کرتے ہیں، قرآن کریم یقیناً کتاب ہدایت اور دلوں کے لئے شفا ہے یہ طب، فلکیات، ریاضی، فزکس اور کیمسٹری کی کتاب نہیں نہ ہی قرآن کریم ان علوم کی تفاصیل بیان کرنے کیلئے نازل کیا گیا ہے۔

قرآن مجید تمام علوم کا سرچشمہ ہے جو تحقیق کائنات کی راہیں روشن کرتا ہے اور اپنے مطیع بندوں کو تسخیر کائنات کا مژدہ سناتا ہے، جب انسان قرآن کریم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے کائنات کی کھلی نشانیوں میں غور وفکر کرتا ہے تو اس کی فطرت اسے خالق کائنات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

ذرہ ذرہ میں نور ہے رب کا ÷ کوئی مالک ضرور ہے سب کا

انسان کیلئے اس دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی آنکھوں سے حق سبحانہ وتقدس کا مشاہدہ کرسکے، البتہ اہل ایمان اپنے نور بصیرت سے اس کی تجلیات وانوار کا مشاہدہ کرکے اپنے ایمان و یقین میں اضافہ کرتے ہیں قرآن کریم غیر مومن کو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور اس کی عجیب وغریب مصنوعات اور آیات باہرہ وظاہرہ کا مشاہدہ کرکے ایمان باللہ تک پہونچنے کی دعوت دیتا ہے۔

سنریهم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق (سورہ حم سجدہ)
ترجمہ: اب ہم دکھلائیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے ان پر کہ یہ ٹھیک ہے۔

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس کے الفاظ ہر زمانہ میں اپنے مخاطبین کی یکساں رہبری کرتے ہیں چاہے وہ پرانا بدویانہ زمانہ ہو یا برق وبھاپ کا موجودہ ترقی یافتہ دور ہو یہاں تک کہ کائنات

کا آخری دن۔

حق سبحانہ وتقدس کی نشانیوں میں سے چاند وسورج ہے اللہ تعالیٰ نے انسانی حیات وبقا کے لئے ان کو بنایا اور دونوں کو اپنے اپنے مدار میں ایک محکم نظام کے تحت چلا کر اپنے شب وروز اور ماہ وسال کو وجود بخشا۔

وجعلنا الليل والنهار آيتين فمحونا آية الليل وجعلنا آية النهار مبصرة لتبتغوا فضلا من ربكم ولتعلموا عدد السنين والحساب (سورۂ اسراء آیت ۱۲)

یہ اور اس نوعیت کی آیات علوم ریاضی وطبعیات وفلکی سیکھنے کی ترغیب کیلئے کافی ہیں قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب مسطور ہے تو کائنات حق تعالیٰ شانہ کی کتاب منشور (پھیلی ہوئی کتاب) ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ نصوص قرآنیہ اور کائنات کے قوانین ثابتہ میں تعارض وتخالف ہو۔

شریعت مطہرہ کے احکام میں سے بعض کا تعلق آفتاب سے ہے مثلاً اوقات نماز کا تعلق آفتاب کے طلوع وغروب وزوال سے ہے تو کاشت کی پیداوار پر عشر کا حساب بھی شمسی فصل سے متعلق ہے اور روزہ کی ابتداء صبح صادق سے اور اختتام غروب آفتاب پر، اسی طرح وقوف عرفہ کو مناسک حج کی ادائیگی بھی دن پر موقوف ہے جس کا تعلق آفتاب کے طلوع وغروب پر ہے، ان کے علاوہ بہت سے احکامات قمری مہینوں سے متعلق ہیں، مثلاً ماہ رمضان کی ابتداء وانتہاء، عیدالاضحیٰ قربانی اور ایام حج کا تعین قمری مہینوں پر ہے، نیز سونے چاندی اور نقدی زکوٰۃ کیلئے حولان حول کا تعلق بھی قمری مہینوں پر ہے، اسی طرح عدت، ایلاء ظہار، سن رشد وبلوغ وغیرہ کا تعلق بھی قمری حساب پر ہے۔

اسلامی قمری ماہ کی ابتداء وانتہاء کا مدار چاند کی رویت پر ہے، ہر زمانہ میں قمری ماہ کے تعین کے لئے یہی آسان اور فطری طریقہ ہے کیونکہ ہر انسان کے لئے اس کا مشاہدہ ممکن ہے چاہے وہ خطہ ارض کے کسی شہر میں آباد ہو یا صحرا میں رہتا ہو۔

قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے اس لئے قمری مہینے پورے شمسی سال میں گھومتے ہوئے ہر موسم میں چکر لگاتے رہتے ہیں، چنانچہ رمضان وعیدین وحج وغیرہ موسم سرما وصیف میں سال بسال آتے رہتے ہیں، قمری مہینوں کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اس پر سونے چاندی اور نقدی

کی زکوٰۃ ادا کرنے میں ۳۳ سال میں ایک سال کی زکوٰۃ شمسی سال کی نسبت زیادہ ہوگی جو فقراء مسلمین کے حق میں بڑا نفع ہے۔

اسلام اور سائنس

اسلام اور سائنس خاص طور پر علم ہیئت و فلک (ASTRONOMY) کے مسلمہ اصولوں میں کوئی تضاد نہیں بلکہ سائنس تو اسلام کی خادمہ ہے جس کی وجہ سے اسلام کے بہت سے حقائق اور راز سربستہ آشکارا ہوئے۔

مغرب کے جن کارناموں سے آج دنیا مرعوب و متاثر ہے ان کے اصولوں کو مرتب و منضبط کرنے اور ان کی بنیادی تحقیق اور دریافت کا سہرا ان مسلم فلسفیوں، سائنس دانوں اور ماہرین کیمیا کے سر ہے جنھوں نے خداداد ذہانت اور تحقیق و تجسس سے کام لے کر زندگی کے مختلف میدانوں اور علم کے مختلف شعبوں میں ترقی کی راہیں نکالیں، ہم یورپ کی موجودہ سائنسی ترقی کے اعتراف کے باوجود اپنی میراث سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں

سفینہ چاہئے اس بحر بے کراں کے لئے۔

بڑے دکھ و افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک بڑا طبقہ یورپ سے مرعوبیت اور اپنی تاریخی روایت سے جہالت و محرومی کی بنا پر ذہنی و فکری افلاس میں مبتلا ہے ؎

تھی زمانے میں روشنی جس کی ہائے اس گھر میں اب چراغ نہیں

ابو اسحاق ابراہیم بن جندب تاریخ میں پہلا مسلمان ہے جس نے دوربین (TELESCOPE) کو ایجاد کیا آٹھویں صدی کے محمد بن احمد البیرونی ماہر فلکیات و ہیئت نے پہلی مرتبہ زمین کا محیط معلوم کیا اور آج کمپیوٹر کے دور میں جب زمین کی پیمائش کی گئی تو بیرونی کی پیمائش اور اس میں صرف تین فیصد کا فرق ہوا، قدیم و جدید آلات پیمائش کے تحت یہ کوئی بہت بڑا فرق نہیں کہا جا سکتا۔

رمضان و عیدین موجودہ دور میں

بہت سے ملک بالخصوص خلیج کی عرب ریاستیں۔ دبئ، ابوظبی، قطر، مسقط، عمان، کویت، بحرین

لبنان اور مملکت اردن وغیرہ رمضان وعیدین کے تعین میں اپنی مقامی رویت سے صرفِ نظر کرکے سعودیہ کے سرکاری اعلان رویت پر عمل کرتے ہیں، اس بنا پر مشرق وسطیٰ میں رویت دینی ومذہبی سے زیادہ سیاسی مسئلہ بن گئی ہے، ہند وپاک وبنگلہ دیش اور مراکش وغیرہ کے علماء کرام فقہی بنیادوں پر سعودی عرب کے اعلان سے صرف نظر کرکے مقامی رویت کا اہتمام کرتے ہیں اور اب تک رویت پر اعتماد کرتے چلے آرہے ہیں۔

گذشتہ ۲۶ر سالوں کے تجربہ کی روشنی میں عملاً صورت حال یہ ہے کہ سعودی عرب میں رمضان وعیدین کی تاریخیں دنیا کے دوسرے علاقوں میں رویت کی مصدقہ تاریخوں سے ہمیشہ ایک یا دو دن اور کبھی تین دن مقدم ہوتی ہیں اور اچھے خاصے پڑھے لکھے افراد بشمول علماء کرام حرمین شریفین سے اپنے جذباتی لگاؤ کی بنا پر اسے ایک حقیقت تسلیم کرنے لگے ہیں کہ وہاں بقیہ دنیا سے ایک یا دو دن قبل رویت نہ صرف عین ممکن ہے بلکہ کلیتہً درست بھی حالانکہ محقق رویت سے مشرق وسطیٰ سے ہونے والے رویت کے اعلانات کا دور کا بھی واسطہ نہیں، بلکہ یہ ایک غیر ممکن ومحال کو ممکن تسلیم کرلینے والی بات ہے، ذیل میں اسی کی قدرے وضاحت کرنا مقصود ہے

اسلامی ماہ

اسلامی قمری ماہ غروب آفتاب پر ہلال کی رویت سے شروع ہوتا ہے اور اگلے مہینہ کی اولین رویت تک ۲۹ر یا ۳۰ر دن کے بعد ہوگی شمار ہوتا ہے، علامہ ابن رشد نے اپنی معروف کتاب بدایۃ المجتہد ج۱ ص۲۷۴ پر علماء کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اسلامی ماہ ۲۹ یا ۳۰ دن کا ہوتا ہے اور اس کی ابتداء وانتہاء کا مدار چاند کی عینی رویت پر ہے اور رویت سے مراد ہلال کا سیاہی کے بعد کا ظہور ہے یعنی ہر ماہ کے آخر میں آفتاب سے قرب کی وجہ سے چاند دو دن مستور رہتا ہے، ایک دن اجتماع سے پہلے اور ایک دن بعد، بالفاظ دیگر اسلامی ماہ ۲۸ر یا ۳۱ر دن کا نہیں ہوتا، نیز شریعت مطہرہ میں اسلامی ماہ کی ابتداء وانتہاء کے لئے چاند کی بصری رویت کا اعتبار ہے، جو اسلامی ماہ کی ۲۹ تاریخ کو اس وقت ہوگی جب محاق (NEW MOON) کے بعد چاند آفتاب کی شعاعوں سے نکل کر اتنے فاصلے پر پہونچ گیا ہو کہ آنکھوں سے دیکھا جاسکے، اس لئے یہ بھی

واضح ہوگیا کہ محاق کے فوراً بعد یا اس سے پہلے چاند ہلالی شکل میں نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی رویت ممکن ہے اس قسم کی رویت کا دعویٰ یا شہادت یا تو مبنی بر وہم ہے یا کذب :

NEW.MOON محاق

علم ہیئت و فلک میں نئے چاند سے مراد چاند کی وہ حالت ہے جب زمین آفتاب اور چاند تینوں ایک لائن میں آجاتے ہیں (محاق) نئے چاند کے وقت چاند کا پورا تاریک حصہ زمین کی جانب ہونے کی وجہ سے اس کی رویت کسی طرح بھی ممکن نہیں، والسماء ذات البروج کی تفسیر کے تحت مفسرین نے آسمان میں بارہ برجوں کا تذکرہ کیا ہے اور چاند و سورج ۲۴ گھنٹہ ان بارہ برجوں میں گردش کرتے رہتے ہیں، سورج اپنی گردش آہستہ ہونے کی وجہ سے سال بھر میں بارہ برج طے کرتا ہے (ہر ماہ ایک برج میں رہتا ہے، اور چاند کی گردش تیز ہونے کی وجہ سے وہ ایک ماہ میں بارہ برج طے کر لیتا ہے، سورج کی مثال گھڑی کی چھوٹی سوئی کے مانند ہے جو گھنٹہ بتاتی ہے، اور چاند کی مثال بڑی سوئی کے مانند ہے جس سے منٹ کا حساب لگایا جاتا ہے
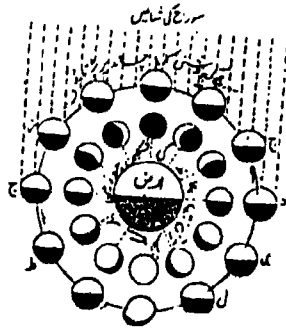
چاند ہر ماہ ہلال بننے کے بعد زمین کے گرد چکر لگا کر سورج کے مقابل آجاتا ہے مگر گردش کے دوران چاند کا زمین کے سامنے والا رخ کبھی انتہائی شمال میں الاسکا اور جاپان تک پہونچ جاتا ہے اور کبھی جنوب میں نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کے مقابل آجاتا ہے، ہلال سورج کی طرح شمالاً و جنوباً نہیں ایک بیضوی دائرہ میں دکھائی دینا شروع کرتا ہے ۲۴ گھنٹوں میں رویت کا یہ دائرہ تقریباً ساری دنیا پر محیط ہوجاتا ہے۔

یہ دائرہ ہر ماہ بدلتا ہوا کرۂ ارض کے مختلف علاقوں پر سے گذرتا ہے۔ بیضوی دائرہ میں داخل علاقہ میں جہاں بھی رویت ہوگی اس سے مغرب میں دائرہ کے اندر واقع علاقے میں یقیناً اسی دن رویت ہوگی، دائرہ سے خارج شمال وجنوب اور مقام رویت سے مشرق میں واقع علاقے میں دوسرے دن رویت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا رویت ہلال کے بارے میں یہ تکوینی وطبعی قاعدہ ہے۔
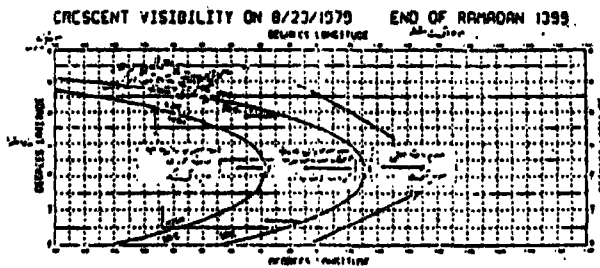
اگر عالم اسلام میں واقعی محقق رویت پر رمضان وعیدین کا تعین کیا جائے تو اکثر ممالک میں رمضان وعیدین ایک ہی دن ہو سکتے ہیں اور مشرق ومغرب کے محل وقوع کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ ایک قمری دن کا فرق ہوگا نہ کہ شمسی، شمسی دن کے حساب سے سعودی عرب اور دوسرے مشرق وسطیٰ کے ممالک کی غیر محقق رویت کی وجہ سے رمضان وعیدین کے مواقع پر عالم اسلام میں دو دن بلکہ کبھی کبھی تین کا فرق شمس وقمر کی گردش کے طبعی اصولوں کے خلاف ہے۔

قمری دن / تاریخ

اسلامی دن / تاریخ کا شمار دنیا کے ہر مقام پر عموماً غروب آفتاب کے بعد شروع ہوتا ہے اور اگلے دن غروب آفتاب تک (۲۴ گھنٹہ) رہتا ہے، اس عموم سے مستثنیات میں یوم عرفہ اور یوم النحر ہیں اور وہ بھی صرف مکہ مکرمہ میں موجود حجاج کرام کے لئے جو یوم عرفہ کی ابتدا نویں ذی الحجہ کی صبح صادق سے کرتے ہیں اور دسویں کی فجر تک وقوف عرفہ کر سکتے ہیں اسی طرح یوم النحر کی ابتداء دسویں ذی الحجہ کو طلوع آفتاب سے ہوتی ہے۔

اصطلاحی دن / تاریخ

قمری دن کے برخلاف اصطلاحی (شمسی) دن رات کے ۱۲ بجے سے شروع ہوتا ہے اور

اگلی رات ۱۲ بجے تک رہتا ہے
اصطلاحی دن دنیا کے ۲۴ ٹائم زونوں (حصوں) میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک ٹائم زون میں واقع تمام مقامات پر (رات ۱۲ بجے) ایک ہی وقت ہوتا ہے جبکہ اس سے چند گز دور مغرب میں دوسرے ٹائم زون میں واقع مقام پر رات کے ۱۱ بجے ہوں گے اور مشرق میں واقع ٹائم زون میں رات کے ایک بجے ہوں گے۔ اصطلاحی و قمری دن کا فرق یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

قمری دن/تاریخ ،غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک + پورا دن

اصطلاحی دن/تاریخ ۱۲ بجے رات سے طلوع آفتاب تک + پورا دن + اگلی رات غروب سے ۱۲ بجے تک ، گویا اسلامی قمری دن/تاریخ ہمیشہ عیسوی (شمسی) تاریخوں کے درمیان دائر ہوتا ہے

اسلامی قمری تقویم کا پس منظر

اسلام سے پہلے عرب میں کوئی اسٹینڈرڈ قمری کلینڈر نہ تھا، ہر قبیلے علاقے کا اپنا اپنا علاحدہ طریقہ تھا، البتہ عرب کے سارے قمری کیلنڈروں میں "نسی" کی کوئی نہ کوئی شکل ضرور موجود تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں آباد یہودی قبائل سے واسطہ پڑا جو اپنا اسٹنڈرڈ "ہیرو" (HEBREW) قمری/شمسی کلینڈر استعمال کرتے تھے یہ کلینڈر عربوں میں مستعمل کلنڈروں سے کئی پہلو سے مختلف تھا، چوتھی صدی عیسوی میں یہودی رہنما ہلیل (HILLEL) نے اگلے ہزاروں سالوں کا کلنڈر حساب سے مرتب کرکے ساری دنیا کے یہودیوں کو اس کا پابند کردیا تھا، آج بھی دنیا کے ہر کونے میں یہودی یہی کلنڈر استعمال کرتے ہیں۔

یہودی کیلنڈر قمری/شمسی ہے یعنی مشرکین کے مانند "نسی" کی بنیاد پر ہر تیسرے سال ایک مہینہ بڑھا کر موسم کی مطابقت کیلئے اسے شمسی تقویم کے برابر کرلیا جاتا ہے، یہودی تقویم میں قمری مہینے کی ابتدا، (محاق) نئے غیر مرئی چاند سے کی جاتی ہے، اس لئے مسلمان اور عربوں کے برخلاف جو مرئی چاند سے قمری مہینہ شروع کرتے تھے ان کی پہلی تاریخ ایک اور کبھی کبھی دو دن پہلے ہو جاتی تھی۔

حدیث نحن امۃ امیۃ

(۱) یہودی قمری مہینے کی ابتدا (جیسا کہ اوپر ذکر ہوا) محاق یعنی نئے غیرمرئی چاند سے کرتے تھے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نیومون دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں کسی بھی وقت ہوسکتا ہے جس کی بنا پر مہینہ ۲۹½ دن یا پونے تیس دن یا کم و بیش کا ہوسکتا ہے۔

(۲) مسلمانوں کا مستقل کیلنڈر نہ ہونے کی وجہ سے یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت و مخالفت میں جہاں دوسرے حربے استعمال کرتے وہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) ان پڑھ اور مسلمانوں کو جاہل گردانتے اور اس وجہ سے نبوت اور دنیا کی امامت و قیادت کے لئے نااہل ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔

(۳) ماحول کے اس پس منظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کہ "نحن امۃ امیۃ" کو دیکھا اور سوچا جائے تو آپ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو تمہیں یہودیوں کے کیلنڈر پر اعتماد کرنا ہے اور نہ ہی مہینہ ۲۹½ یا پونے تیس دن کا بنانا ہے بلکہ اسلامی ماہ کے تعین میں پوری امت مسلمہ کیلئے وہ خطۂ ارض پر جہاں بھی آباد ہو آسان و فطری طریقہ یہ ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو (ماہ شروع کرو) اور چاند دیکھ کر روزہ ختم کرو، نظر نہ آنے کی صورت میں ۳۰ دن مکمل کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مقام مدح میں ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ امت مسلمہ حساب و کتاب اور علوم طبعیات سے ہمیشہ ناواقف رہے قرآنی فرمان "وعلم الانسان ما لم یعلم" کے خلاف ہے۔

(۴) بعد کے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ رویت ہلال کے بارے میں حساب فلکی کی رعایت اور اس کا علم نہ صرف غلط ہے بلکہ دین میں ایک قسم کی تحریف بھی، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے مقصد مسلمانوں کو یہودیوں پر تکیہ کرنے سے بچانا تھا۔

(۵) قدیم و جدید مسلم و غیر مسلم سارے ماہرین ہیئت و فلک ہی نہیں مفسرین امت اسلامیہ بھی اس پر متفق ہیں کہ ہر مہینے کے آخر میں محاق کے چند دن ہوتے ہیں، غیرمرئی نیومون ایک حقیقت ہے اور یہ بھی تسلیم شدہ ہے کہ اس وقت دنیا کے کسی بھی خطہ میں چاند کی عینی رویت ممکن نہیں، اسی بات پر

ہیئت دانوں میں کسی دور میں اختلاف نہیں رہا، آج بھی سعودیہ کے علاوہ دوسرے مقامات سے نیومون سے پہلے اور فوراً بعد چاند دیکھ کر اس کی تصدیق و تکذیب ہو سکتی ہے

جواب طلب اشکال

رمضان ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۹۹۲ء کی ابتدا دعوائے رویت کی بنیاد پر دنیا بھر میں مندرجۂ ذیل ۴ دنوں پر ہوئی۔

محاق، قران شمس و قمر (NEW MOON) ۴ مارچ ۱۹۹۲ء بروز بدھ ایک بجکر ۲۲ منٹ G.M.T

(۱) سعودی عرب میں دعوائے رویت ۳ مارچ ۱۹۹۲ء منگل (محاق سے تقریباً ۲۲ گھنٹے پہلے)
سعودی عرب میں یکم رمضان ۴ مارچ ۱۹۹۲ء بروز بدھ (اس کی اتباع میں امریکا اور یورپ کے بعض مقامات)۔

(۲) مصر میں دعوائے رویت ۴ مارچ ۱۹۹۲ء بروز بدھ (محاق سے ۲ گھنٹے ۴۴ منٹ بعد)
مصر میں یکم رمضان — ۵ مارچ ۱۹۹۲ء بروز جمعرات (بنیاد وجود قمر علی الافق ۲ سے ۵ منٹ)

(۳) مراکش، لندن یورپ، پاکستان، بعض افریقی ممالک۔ رویت ۵ مارچ ۱۹۹۲ء جمعرات (بعد محاق)
یکم رمضان ۶ مارچ ۱۹۹۲ء بروز جمعہ

(۴) ہندوستان، بنگلہ دیش، ری یونین، ماریشش، نیوزی لینڈ۔ رویت ۶ مارچ ۱۹۹۲ء جمعہ
یکم رمضان ۷ مارچ ۱۹۹۲ء بروز ہفتہ۔

مذکورہ بالا تمام ممالک ۴ مختلف دنوں میں رویت کا دعویٰ کرتے ہیں، اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ اس میں سے کس کے دعوائے رویت کی تصدیق یا تکذیب کی جائے سوائے حساب فلکی کے کس شرعی دلیل یا فقہی بنیاد پر کی جائے؟ سب کی تصدیق کی صورت میں یا تو اختلاف مطالع کا اعتبار کرتے ہوئے لکل بلد رؤیۃ پر عمل ہو، یا اختلافِ مطالع کا عدم اعتبار کرتے ہوئے فقہی رائے کے مطابق اسبق رویت پر عمل کیا جائے اور مؤخر رویت والے ایک دو یا تین روزے قضاء کریں۔؟
کیا واقعی یہ ممکن ہے کہ چاند دنیا کے مختلف علاقوں میں ۳، ۴ مختلف دنوں پر دکھائی دے؟ یا ایک جگہ دکھائی دینے کے بعد غائب ہو جائے اور ۲۴ گھنٹے کے بعد پھر ایک مقام پر چند سیکنڈ نظر آئے اور پھر غائب ہو جائے۔ (باقی باقی)

از :- مولانا شمیرالدین قاسمی، برنلے

کتا ایک جانور ہونے کی حیثیت سے قابل رحم ہے کہ جس طرح دیگر جانوروں کو بلا وجہ تکلیف دینا گناہ ہے اسی طرح کتوں کو بھی بلا وجہ مارنا، اس کو قتل کرنا، اس کو پال کر اس کے کھانے پینے میں کوتاہی کرنا گناہ ہے، اگر اس کو پالا ہے تو اس کی ضروریات کی پوری ادائیگی ضروری ہے، لیکن اس کو پالنے کی ہوس خود قابل توجہ بات ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہل عرب کتوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے ایک ایک آدمی کئی کئی کتوں کو رکھتے تھے اور اس کو اولاد کی طرح لاڈ پیار سے پالتے تھے اس پر لوگوں کا کافی سرمایہ خرچ ہوتا تھا، وہ غربا و مساکین اور اہل ضرورت کو نظر انداز کر جاتے لیکن کتوں کی پرورش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، بہت کم لوگ تھے جو شکار، کھیتی اور چوپائے کی حفاظت کے لئے کتا رکھتے تھے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کے سلسلے میں لوگوں کی بڑھتی ہوئی رغبت کا معائنہ کیا اور دیکھا کہ اہل حاجت کے بجائے بے ضرورت جانور پر سرمایہ خرچ ہو رہا ہے اور دن بدن یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکیدی الفاظ میں امت کو اس سے منع فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے۔

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اقتنی کلبا الا کلب ماشیۃ او ضار نقص من عملہ کل یوم قیراطان ۔

(بخاری شریف ص ۸۲۳ مسلم شریف جلد دوم ص ۲۱)

کھیتی کی حفاظت اور شکار کرنے کے علاوہ جو شخص کتوں کو پالے گا تو اس کی سزا یہ ہوگی کہ اس کے نیک اعمال میں سے ہر روز دو قیراط کاٹ لئے جائیں گے (قیراط ایک درہم کے بارہویں حصے کے برابر وزن کو کہتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ وزن کتنا بھاری ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ جن لوگوں کو نہ [illegible] کی ضرورت ہے نہ مویشی کی حفاظت درکار ہے صرف اپنی ہوس کے لئے کتوں کو پالتے ہیں ان کی کتنی کتنی مقبول نیکیاں برباد ہوتی ہیں، جب کہ قیامت میں ایک ایک نیکی کے لئے لوگ بھیک مانگیں گے اور جو خطیر رقم اس پر خرچ ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے، اسی مال کو اگر اہل ضرورت پر صدقہ کر دیں تو دنیا میں کتنی محبت بڑھے گی اور آخرت میں کتنے اعمال کا اضافہ ہوگا۔

دوسری روایت ہے کہ جس گھر میں کتا ہو اس میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے (بخاری)
اب یہ کتنی بڑی خسارے کی چیز ہے کہ آدمی کتا پال کر ہمہ وقت رحمت کے فرشتوں سے محروم رہے اور گھر میں خیر و برکت کے دروازے بند رکھے، پھر کیسے اس کو دنیا و آخرت میں بھلائی نصیب ہوگی۔

مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر وہ لوگ کتوں کو پالتے ہیں جن کا گھر اولاد سے خالی ہے یا عورت شوہر سے اور مرد بیوی سے محروم ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو متمدن پیدا کیا ہے ہر وقت اس کی خواہش ہوتی ہے کہ میری گود میں ننھا منّا بچہ کھیلے اس کی مسکراہٹ سے دل بہل جائے اور اس کی معصوم حرکتوں سے دل باغ باغ ہو جائے، جب مرد کام کر کے گھر آتا ہے تو اس کی طبیعت تھکی ہوئی ہوتی ہے، لیکن جب کوئی معصوم بچہ اس کی گود میں آکر مسکراتا ہے تو اس کی ساری کلفتیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ اپنی تھکن کو بھول جاتا ہے اس کے ساتھ اتنی الفت ہوتی ہے کہ خالی اور زائد وقت سارا کا سارا گذر جاتا ہے، اور بسا اوقات ٹائم پاس ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا، اس عظیم نعمت کا بدل نہ ٹی وی ہے نہ شراب نہ سلطنت ہے نہ دولت نہ رقص ہے نہ سرود، یہ نعمت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس کے بغیر آدمی کی زندگی پھیکی رہتی ہے، پھر اگر گھر بھی آباد نہ ہو اور گھر میں تنہا بسر کرنا پڑتا ہو تو وہ گھر آدمی کو کاٹنے کے لئے دوڑتا ہے۔

یورپ میں مال ومتاع، خورد و نوش کی چیزوں کی بہتات ہے، تفریح کے لئے ہر گھر سنیما گھر بنا ہوا ہے اور آئے دن اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، لیکن اسی تیز رفتاری سے گھر ویران ہوتا چلا جا رہا ہے، بیوی کو شوہر پر اعتماد نہیں، اور شوہر بیوی سے مطمئن نہیں، شوہر کو ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کس وقت یہ عورت میری کمائی

ہوئی دولت کو لے کر بھاگ جائے، اور مجھے بے یارومددگار، تنہا چھوڑ دے، اس لئے اب لوگ شادی سے گریز کرنے لگے ہیں اور گرل فرائینڈ اور بوائے فرائنڈ سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں، ایسی فضا میں ان لوگوں کے پاس نہ کوئی ہمدرد ہوتا ہے نہ غم گسار نہ اولاد ہوتی ہے نہ رشتہ دار، اب اس کا اندرونی تقاضہ ہے کہ کوئی ہمدرد ہو جو ہمہ وقت ساتھ رہے، کھیلتا مسکراتا بچہ جس سے دل بہل جائے، لیکن صورت حال یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس کے پاس موجود نہیں ہے، تو اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ایسے لوگ کتوں کا سہارا لیتے ہیں، اس کو پیار کرتے ہیں، گود میں بٹھاتے ہیں، بازار اور دکانوں میں لے جاتے ہیں تاکہ کچھ سکون ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ مایوس ہیں، کتوں کے ذریعہ اس کو کوئی خاص خوشی حاصل نہیں ہوتی، اس کی نگاہیں ہر وقت خانہ آبادی اور بچوں کی مسکراہٹیں ڈھونڈتی رہتی ہیں بلکہ اس کے لئے اس کا دل ابلتا رہتا ہے، وہ اس کی تلاش میں شراب خانوں اور کلبوں کا چکر لگاتے رہتے ہیں لیکن اس کو کہیں سکون نہیں ملتا اور یورپ میں چونکہ ایسے بدحالوں کی تعداد کثرت سے ہے اس لئے وہ لوگ خسران دنیا و آخرت کے باوجود کتوں کو کثرت سے پالتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مسلمانوں کو اس بلاء سے محفوظ رکھے، اللھم احفظنا منہ۔

بقیہ ص۲۹　فقر کے ہیں معجزات ....

"بال جبریل" کی ایک رباعی میں امیری کا تعلق فقیری سے اور فقیری کا روشن ضمیری سے قائم کرتے ہوئے مسلمانوں کو پھر وہی قلب و نظر عطا کئے جانے کی دعا کرنے کی تلقین کرتے جو ضمیر کو روشن کرکے اُسے امیری کا مستحق بنادے ہے

خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ ۔ نہیں ممکن امیری بے فقیری

پھر اسی امیری کے فقیری سے تعلق پر "بال جبریل" کی غزل ۴۱ کے اس شعر میں کہتے ہیں ہے

آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مال فقیر سلطنت روم و شام

تاریخیات

مولانا اختر امام عادل قاسمی

جو ماضی کی اندھیریوں میں گم ہوگئی

حشیشین شام کی طرف

فارس میں حشیشین کے سیاسی زوال کے بعد شام کے افق پر اس کا ستارہ جگمگانے لگا، کئی حشیشین قائدین نے شام کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا، ان قائدین میں بہرام استرابازی اور اسماعیل فارسی نے زیادہ شہرت حاصل کی، شام میں ان کی تحریک کی کامیابی کا سبب یہ بتلایا جاتا ہے کہ حلب کے حکمراں رضوان ابن تتش کی نظر کرم اور قلبی میلان نے ان قائدین کو بہت فائدہ پہونچایا، رضوان کے تعاون سے اس تحریک کی جڑیں شام کے اطراف میں مضبوط ہوتی چلی گئیں جب فارس کی شکست خوردہ حشیشیوں کو شام میں اپنے برادران طریق کی فتح کی خبر ملی تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، فارسی اسماعیلیہ کا بڑا طبقہ وفود کی شکل میں ہجرت کرکے شام پہونچ گیا، ان فارسیوں کے پہونچنے سے اس تحریک کو مزید قوت حاصل ہوئی اور اس کی ترقی کے امکانات اور روشن ہوگئے۔

تحریک کے اس ارتقائی دور میں شام کے افق پر سب سے زیادہ جس شخص کو ابھرنے کا موقعہ ملا وہ شیخ الجبل سنان ابن سلیمان ابن محمود تھا، اس کا معروف نام رشید الدین تھا اس کی نشو ونما بصرہ کی فضاؤں میں ہوئی تھی اور اس نے مذہبی علوم خاص قلعۂ الموت میں حاصل کئے تھے، ولی عہد حسن ابن محمد ہی نے اپنے دور اقتدار میں اسے شام چلے جانے کا حکم دیا تھا، تاریخ سے تو ایسا ہی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شاید دونوں کے درمیان کچھ باہمی رنجش پیدا ہوگئی تھی اور حسن ابن محمد حاکم الموت کو اس سے نفرت ہوگئی تھی اسی لئے اس نے ملک بدر

کرنے کی نیت سے شام روانہ کردیا۔ مگر اس کا بھی قوی امکان ہے کہ حسن ابن محمد نے اس کے اندرونی جوہر کو پہچان کر اپنے مفید مطلب پایا ہو اور حشیشین تحریک کے فروغ و توسیع کی غرض سے شام کے علاقے میں اس کو بھیجدیا ہو۔

بہرحال جب رشید الدین شام پہونچا تو اس کا مخفی جوہر پوری طرح کھلا، حشیشین طبقہ سے تعلق رکھنے والے جتنے لوگ شام میں پائے جاتے تھے ان سب کو اپنے گرد جمع کرنے، اور اپنا معتقد بنانے میں اسے غیر متوقع کامیابی ملی، پورے اسماعیلی گروہ نے متفقہ طور پر اس کو اپنا امام چن لیا، جس کی بنا پر شامی حکومت میں بھی رشید الدین اور اس کے مقربین دخیل ہوگئے پھر عوامی سطح سے لے کر سیاسی اسٹیج تک ہر جگہ اس تحریک کے لوگ نمایاں نظر آنے لگے۔

مگر یہ صورت حال بہت دنوں تک باقی نہ رہ سکی، رشید الدین کے مرنے کے بعد امامت اس کی نسل میں باقی نہ رہی بلکہ تمام لوگوں نے پھر الموت کے حکمراں ہی کو اپنا روحانی امام تسلیم کرلیا ـــــ البتہ رشید الدین کی شخصیت کی غیر معمولی عظمت دلوں سے رخصت نہ ہوئی، بلکہ شامی حشیشین کے خیال میں رشید الدین کا شمار صف اول کے پیشواؤں میں ہوتا تھا۔

اس کے بعد بھی برسوں تک حشیشین شام میں ایک دہشت گرد جماعت کی شکل میں موجود رہے اور شاید آج بھی موجود ہوں، شام کے کئی قلعوں پر ان کو تسلط بھی حاصل تھا، انھوں نے کئی بار زنگیوں سے بھی مقابلہ کئے، اور بارہا فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھی قتل کی سازش کی، مگر ہر بار ان کی سازش ناکام گئی، اور سلطان ہمیشہ ان کے قاتلانہ حملوں سے محفوظ رہا، مگر پھر آہستہ آہستہ ان کا بچا کھچا زور بھی ختم ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ چراغ سحری ہوگئے، جس کو دوبارہ شام کی تاریک راتوں میں روشن ہونے کا موقعہ نہ ملا۔

کہاں سے کہاں تک ایک سرسری نظر

اب ایک بار سرسری طور پر ان کی دعوت کی ابتدا سے لے کر انتہا تک ان مقامات کا نام سن لیجئے جہاں ان کی تحریک نے کچھ بہتر کارکردگی دکھائی تھی۔

ان کی دعوت کرمان سے چل کر ایران و اصفہان کے قلب تک پہونچ گئی، پھر خوزستان

اور دیلم کی پہاڑیوں میں گشت کرتی ہوئی قلعۂ الموت میں ٹھہر گئی، مشرق میں ان کی دعوت ماژندران کے حدود پار کرکے قزوین تک پہونچی اور رودبار لاماسار اور کوہستانی کئی علاقوں میں پھیل گئی، کئی قلعے اس کی ماتحتی میں آگئے، پھر وہ بڑھتی ہوئی نہر جیحون کے ساحل تک پھیل گئی، تیسری طرف اس دعوت کا اثر سوریا ہوتا ہوا شام کے طویل وعریض علاقے پر چھا گیا اور اہم قلعے بانیاس، مصیاف، القدموس، الکہف، الخوابی اور سلمیہ حشیشین کے قبضے میں آگئے، پھر جب زوال شروع ہوا تو اس کا نقشہ یہ تھا کہ فارس ایران میں ان کو ہلاکو خاں نے تباہی کے آتش فشاں میں جھونکا، تو سوریا میں ظاہر بادشاہ کے ہاتھوں اس کا وجود مسخ کردیا گیا اور شام میں رشیدالدین کی موت نے اس کے تانے بانے بکھیر دیئے، تاریخ کے مطابق اس فرقے کے لوگ اب بھی ایران، سوریا ہندوستان اور روس کے بعض بعض علاقوں میں کچھ کچھ پائے جاتے ہیں، مگر اب یہ پرانی قبر کی خشک گھاس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

افکار و نظریات

آیئے آخر میں اس داستان کہن کے فکری پہلو پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں اس کے بغیر داستان ناقص رہے گی، چند بنیادی نظریات ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ان کے عقائد و نظریات عموماً شیعی اسماعیلیہ فرقے سے ملتے جلتے ہیں، مثلاً جس طرح اسماعیلی فرقے کے نزدیک نبی کے علاوہ امام معصوم بھی ضروری ہے اسی طرح حشیشین بھی امام معصوم کے قائل ہیں اور شیعوں کی طرح ان کی دستوری کتابوں میں اس کی بھی صراحت ہے کہ امامت کسی ایک ہی خاندان میں رہ سکتی ہے اور ہر امام کے بعد اس کا بڑا بیٹا ہی اس کا جانشین ہوگا۔

(۲) حشیشین کی پوری تاریخ میں جن لوگوں کو بھی قیادت وحکومت کا موقع ملا انھوں نے خود امامت کا دعویٰ کرنے کے بجائے ایک امام مستور کے نظریہ کی اشاعت کی اور اپنے کو اس امام روپوش کا قائم مقام قرار دیا۔ صرف دو ہی آدمیوں کا استثنا کیا جاسکتا ہے مثلاً حسن ثانی اور اس کا بیٹا، ان دونوں نے کھل کر یہ اعلان کیا کہ میں باطنی طور پر نزار کی نسل سے

ہوں اور مجھے خدا نے امام بنا کر بھیجا ہے، اسی طرح شام میں رشید الدین نے بھی حکومت کے ساتھ ساتھ امامت کا دعویٰ کیا تھا اور ایک کثیر جماعت نے اس کے دعویٰ کی تصدیق بھی کی تھی، ان چند آدمیوں کے استثناء کے ساتھ حکمرانوں کی پوری تاریخ اکثر ایسے لیڈروں سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے خود کو امام روپوش کا نائب بتایا خود حسن صباح جو اس جماعت کا بانی اعظم ہے اس نے بھی اپنے کو امام مستور کا نائب قرار دیا تھا، اس نے کبھی اپنی امامت کا دعویٰ نہ کیا۔

③ ا۔ شامی امام رشید الدین، سنان ابن سلیمان نے حشیشین کتاب العقائد میں دو نئے نظریات کا اضافہ کیا۔

۱۔ ایک نظریہ تناسخ، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ اسی دنیا میں اپنے سابقہ اعمال کے مطابق کسی شکل میں پیدا ہوتا ہے اگر اچھے اعمال ہوتے ہیں تو دوبارہ انسان ہی کی شکل میں پیدا کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ بدکار ہوتا ہے تو سور، بلی یا کسی اور بدشکل میں پیدا کیا جاتا ہے جو اسکے عمل کے مناسب ہو

۲۔ دوسرے خود اس نے اپنے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ اس کے پاس علم غیب ہے وہ اگلی پچھلی تمام چیزوں کی خبر رکھتا ہے اس کے معتقدین نے بھی اس دعویٰ کی تصدیق کی اور رشید الدین کا علم غیب حشیشین عقائد کا ایک جزو بن گیا۔

④ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ حسن ثانی نے شریعت کے تمام احکام اور تکلیفات شرعیہ منسوخ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

⑤ حج کی ظاہری رسم تو ان کے نزدیک بھی خانۂ کعبہ ہی کے سفر کے ذریعہ ادا کی جاتی تھی مگر حقیقی حج ان کے مذہب میں امام معصوم کے مقام تک سفر کرنے اور اس کے آداب بجالانے کا نام تھا خواہ وہ امام ظاہر ہو یا روپوش۔

⑥ ان کے نزدیک بعض مواقع پر ہر چیز حلال ہو جاتی ہے، اس عموم کا مطلب ظاہر ہے

⑦ الدی کی فکری کتاب کا سب سے اہم باب یہ ہے کہ وہ ایک منظم دہشت گردی اور خونریزی کی ٹریننگ اپنی جماعت کے ہر فرد کیلئے لازم سمجھتے تھے اس کے لئے ان کے یہاں باقاعدہ مکاتب مدارس قائم تھے جس میں چھوٹے بچوں کو اندھی تقلید اور اپنے استاذ کی اطاعت

بغیر سوچے سمجھے ماننے کی تعلیم و مشق کرائی جاتی تھی، جب وہ محسوس کرلیتے تھے کہ ان بچوں کے معصوم اور سادہ ذہنوں پر ان کی تعلیم نقش ہوچکی ہے تو وہ اس ذہنیت کو دستیاب ہتھیاروں خصوصاً خنجروں کے استعمال میں صرف کرتے تھے، یہ بچے جب اپنی جوانی کی عمر میں داخل ہورہے ہوتے تھے اس وقت تک ان کو ہتھیاروں کے استعمال اور خنجر زنی میں زبردست مہارت پیدا ہوچکی ہوتی تھی، ان بچوں کو شروع ہی سے یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ جس مشن پر بھی ان کو لگایا جائے ان کا راز کسی طرح ظاہر نہ ہوپائے، اولاً کسی کو اپنے بارے میں بھنک ہی محسوس ہونے نہ دیں اور اگر وہ خدانخواستہ گرفتار ہوجائیں تو اپنا راز کسی پر ظاہر نہ کریں، اور اگر ان کو یہ اندیشہ ہو کہ ان کا راز جبری طور پر ان سے اگلوالیا جائے گا تو وہ خودکشی کرکے اپنے کو ہلاک کریں مگر وہ راز جو ان کے سینے میں پوری ملت حشیشین کی امانت کے طور پر رکھا گیا ظاہر نہ کریں۔

حشیشین نام کا ایک سفوف بھی ان کے خفیہ محکمہ کے ہر فرد کے پاس ہوتا تھا اس سفوف کی خاصیت یہ تھی کہ کسی بھی مخالف سے مخالف ترین آدمی کو دودھ یا شربت میں ملاکر وہ حشیش پلادی جائے تو اسے محسوس بھی نہ ہو اور چند ہی لمحوں میں وہ مست ہوکر اس خیالی جنت میں پہونچ جائے جہاں کے ہرے بھرے باغات دکھاکر اس سے کوئی بھی اہم سے اہم کام کرایا جاسکتا اس کی کیفیت یہ بھی تھی کہ ان لمحات مسرت میں اس سے جس چیز کا اقرار کروانا چاہیں وہ کرواسکتے تھے، جو تعلیم اس کے دل پر نقش کرنا چاہتے کرسکتے تھے، اور وہ شخص پھر ان کے پاس سے جب باہر نکل کر آتا تو وہ غیر محسوس طور پر بدل چکا ہوتا تھا، پھر وہ ان تمام کاموں کو کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا جن کی اسے تعلیم دی گئی تھی اور بار بار اس خیالی جنت میں پہونچنے کا شوق اسے بے چین رکھتا تھا جس کی سیر وہ ایک بار کرچکا ہوتا تھا۔

یہ وہ بنیادی ہتھیار تھے جن سے انھوں نے اس وقت کی اسلامی دنیا کو سخت دہشت زدہ کر رکھا تھا، کتنے مسلم لیڈروں اور جنرلوں کو انھوں نے اسی تدبیر سے مات کیے بلکہ اپنا زرخرید غلام بنالیا۔

⑧ ان کا ایک خاص نظریہ یہ بھی تھا کہ جہاں بھی رہتے محفوظ قلعوں میں رہتے تھے، یہ

ساری دنیا کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ کھلی سے کھلی جگہ میں بھی جب ان کو قیام کرنا یا آباد ہونے کا موقعہ ملا تو فوراً وہاں مضبوط قلعے تعمیر کر لیتے تھے۔ قلعہ سازی کا اس قدر اہتمام کسی قوم میں نہیں دیکھا گیا اور اسی اہتمام نے قلعہ کو بھی ان کا ایک مخصوص شعار بنا دیا تھا۔

(۹) ان کے افکار و اعمال کا ایک افسوسناک رخ وہ ہے جس کو مورخ کمال الدین ابن العدیم نے بیان کیا ہے۔

کہ ابتداءً یہ بے حیائی و بدکاری میں اس قدر جری نہ تھے مگر ۵۲۶ھ مطابق ۱۱۶۱ء میں ایک ایسا فکری و عملی طوفان آیا جس نے ان کو بے حیائی و بدکاری کے اس سمندر میں پھینک دیا جس سے وہ آخری وقت تک نہ نکل سکے۔ اس طوفان کی ابتداء کوہ سماق سے ہوئی، کوہ سماق کے دامن میں بسنے والے حشیشین کے افکار میں نامعلوم اسباب کی بنا پر ناگہانی تبدیلی آئی۔ فواحش و منکرات کی حرمت و نفرت کا تصور ان سے رخصت ہوتا گیا اور وہ اس کو ایک عام سی چیز سمجھنے لگے مگر اس کے باوجود بھی ان کا نفس ان کو یہی فریب دیتا رہا کہ تم سے زیادہ پاکیزہ قوم ابھی دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ نفس کے اس فریب نے ان کی عقل کو ماؤف کیا، انھوں نے لفظ پاک باقاعدہ اپنے نام کا جزء بنا لیا، اب وہ صرف حشیشین نہیں تھے بلکہ پاک حشیشین بن چکے تھے، اس معکوس فکری ارتقاء نے ان سے وہ بے حیائیاں کرائی ہیں جن پر انسانیت ہمیشہ شرمسار رہے گی، ان کے یہاں بڑے اہتمام کے ساتھ شراب و کباب کی محفلیں ہونے لگیں جن میں خوبصورت لڑکیوں کی شرکت لازمی تھی، اس میں کچھ دیر شراب و رقص کی محفل گرم ہونے کے بعد جب تمام کی عقلوں پر بدمستیوں کے پردے پڑ جاتے تھے تو روشنی گل کر دی جاتی تھی اور پھر جس کے ہاتھ میں جو لڑکی آجاتی تھی اس کو لے کر وہ اپنے خلوت کدے کی طرف چل دیتا اور رات بھر عیش و مستی کی داد دیتا تھا، اندھیرے میں اس کے ہاتھ آنے والی لڑکی خود اس کی اپنی بہن ہو یا بیٹی ہو یا کوئی اور قریبی رشتہ دار ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ـــــ اذنِ عام کی ان محفلوں کو وہ رب کائنات کی جانب سے

(باقی پر ۵۵)
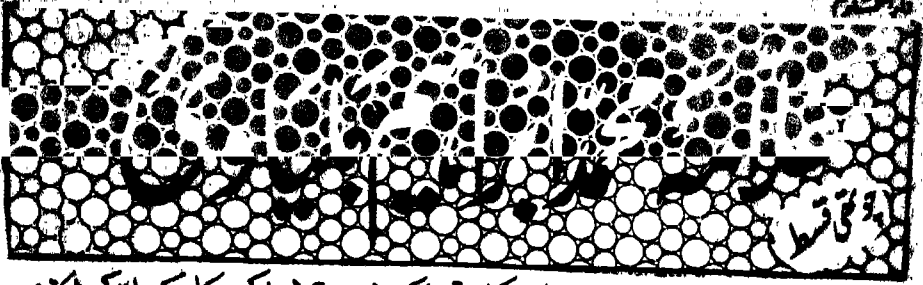
از ــــــــــ محمد عمران قاسمی بگیانوی، عربی لیکچرر جامعہ طبیہ دیوبند

مسئلہ صدارت اور حکیم الاسلام کا رہنما خواب

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے وصال کے بعد دارالعلوم کی صدارت تدریس کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہوگیا، جس کو مولانا محمد نعیم صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "کیونکہ بزم محمودی کے دو پروانے اور بادہ خوار باقی تھے، علامہ بلیاوی رحمہ اللہ اور حضرت الاستاذ مولانا سید فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ[1] دونوں کا استحقاق اور صلاحیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ بالآخر حضرت مہتمم صاحبؒ (مولانا قاری محمد طیب) کی لطافت طبع نے ایک لطیفہ منامی کی روشنی میں رہنمائی فرمائی دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے انعقاد سے پہلے اثنائے سفر بہار میں انھوں نے دیکھا کہ دارالعلوم کی بابرکت عمارت نودرہ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منامی خطوط پر بنائی گئی ہے) کی شمالی درسگاہ میں حضرت شیخ الاسلام (مولانا سید حسین احمد مدنیؒ) جلوہ افروز ہیں اساتذہ اور مدرسین کا مجمع سامنے ہے اور حضرت ہر ایک کو علیحدہ پاس بلا کر کچھ مشورہ فرما رہے ہیں جس کی آواز تو نہیں آتی البتہ اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کی صدارت کے متعلق مشورہ ہے، جب سب کے مشورے سے فارغ ہوئے تو میں (حضرت مہتمم صاحبؒ) تنہا ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا بجائے اس کے مجھے طلب فرماتے خود اٹھ کر میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اس بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ شیخ الحدیث

---

[1] حسن اتفاق کہ یہ دونوں حضرات ہم درس بھی تھے، دونوں کی فراغت ۱۳۲۶ھ میں ہوئی بعدہ علامہ بلیاوی فتحپوری میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مشغول تدریس ہوگئے اور مولانا فخرالدین صاحبؒ نے دوبارہ دورۂ حدیث میں داخلہ لے لیا۔

تو مولانا فخر الدین صاحب کو اور صدرالمدرسین مولانا محمد ابراہیم صاحب کو بنادیا جائے، یہ سنکر کھل گئے اور بشاشت دمسکراہٹ کے ساتھ فرمایا کہ بالکل ٹھیک ہے میرے دل کی بات کہدی ....
دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا فیصلہ دراصل اس خواب کی سچی تعبیر ہے۔ اور اس طرح گویا حضرت مہتمم صاحب کا خواب اصدق الرؤیا اور مبشرات میں سے ثابت ہوا اور علامہ کے استحقاق صدرنشینی کی ایک تائید غیبی

صدارت تدریس اور تاریخ دارالعلوم کا حیرت انگیز باب

بالآخر مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۲ ار رجب ۱۳۷۷ھ نے حسب ذیل عبارت پر مشتمل تجویز کی منظوری کے ذریعہ آپ کو منصب صدارت تدریس پر فائز کیا۔
۔ مجلس شوریٰ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ کے سانحہ ارتحال کے بعد دارالعلوم کے لئے ایسی کامل وعظیم شخصیت کا ملنا نظر نہیں آتا اس لئے مجلس شوریٰ دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے بالاتفاق رائے یہ طے کرتی ہے کہ دارالعلوم کے صدرالمدرسین اور ناظم تعلیمات کے منصب پر حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کو فائز کیا جائے اور علم حدیث کی عظمت وجلالت کی امتیازی شان کے پیش نظر حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب کو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا جائے "
(تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۲۱۳ بحوالہ تجویز ۳ مجلس شوری منعقدہ ۱۲ ار رجب ۱۳۷۷ھ)
چونکہ فخرالمحدثین حضرت مولانا فخرالدین صاحب نوراللہ مرقدہٗ کو درس بخاری کا طویل تجربہ تھا اور برصغیر کے علمی حلقوں میں ان کا درس بخاری بہت مشہور تھا اس لئے مجلس شوریٰ نے ان کی اس خصوصیت کے پیش نظر شیخ الحدیث اور صدارت تدریس کے منصب کو دونوں بزرگوں کا لحاظ کرتے ہوئے تقسیم کردیا ورنہ حضرت علامہ کا پایہ بھی حدیث میں کچھ کم نہیں ہے چنانچہ حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوری نے انوارالباری شرح بخاری جلد دوم کے اندر۔ تذکرہ محدثین کے باب میں علامہ کا تذکرہ اس طور پر فرمایا ہے۔

المحدث الجلیل علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی حنفی دام ظلہم العالی۔

"مشہور و معروف محدث، جامع معقول و منقول، استاذ الاساتذہ، صدر نشین دارالعلوم دیوبند ہیں" ص۲۷۵۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی رقم طراز ہیں، حضرت علامہ جملہ علوم و فنون بالخصوص معقولات میں اپنے وقت کے امام تسلیم کئے جاتے تھے، درس حدیث میں بھی خاص ملکہ تھا۔

(علماء دیوبند اور علم حدیث ص۱۲۳)

نیز درس کا انداز بالکل محدثانہ ہوتا تھا۔ ایضاً ص۱۲۴، اپنے اکابر حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی قطب الارشاد حضرت گنگوہی اور حضرت شیخ الہند کے علوم و تحقیقات پر بڑا عبور تھا۔ ایضاً ص۱۲۴

مولانا عبدالحق پیشکار کا بیان ہے کہ ...... نہایت جامع اور پرمعنی الفاظ استعمال فرماتے تھے، مولانا کو فن پر عبور تھا۔ دارالعلوم فروری ۱۹۷۶ء۔ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب کی شہادت ہے کہ .... اس وقت معقولات میں خصوصاً اور جمیع علوم میں عموماً فرد تسلیم کئے جاتے ہیں ...... درس حدیث میں آپ خاص امتیاز رکھتے ہیں (دارالعلوم دیوبند) احادیث کی مختلف کتابوں کا درس دیتے رہے خصوصیت سے صحیح مسلم آپ کے درس کا شاہکار رہی ہے جس کی مقبولیت طالبان علم حدیث میں عام ہے (ایضاً ص۹۹) دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں دو ہی عبقری عالم نظر آتے ہیں ایک حکیم الامت مولانا تھانوی اور دوسرے علامہ محمد ابراہیم بلیاوی"۔ حکیم عزیز الرحمن صاحب مدظلہ بحوالہ دنیائے اسلام کی چند عظیم شخصیتیں ص۵۔

مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی تحریر فرماتے ہیں۔ حضرت الاستاذ (علامہ بلیاوی) کے درس حدیث کا ایک مخصوص رنگ ہے جو اپنی ایک خاص شان انفرادیت رکھتا ہے اور استاذ عالی قدر کا درس مسلم تو حلقۂ علماء میں خاص طور پر معروف ہے (تفہیم المسلم کا مقدمہ)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی ارقام فرماتے ہیں۔ مولانا رسول خاں صاحب پر فن حاوی تھا اور علامہ مرحوم فن پر حاوی تھے (برہان دہلی جنوری ۱۹۶۸ء ص۲) وسعت اور دقت نظر کا یہ عالم معلوم ہوتا تھا کہ ایک بحر بیکراں علم موجزن ہے" ایضاً ص۲ و ص۳۔ "علوم عقلیہ کی طرح علوم دینیہ میں بھی بنوع و نفوذ کا یہی عالم تھا، چنانچہ حدیث اور فقہ کی انتہائی اور آخری کتابوں کا درس دینا شروع کیا تو اس میں بھی کمال کر دکھایا"۔ ایضاً ص۳۔

حالانکہ یہ روایت پہلے بھی گذر چکی مگر مضمون کی رعایت سے ایک بار پھر تازہ کیجیے انھی مولانا اکبرآبادی کا بیان ہے کہ «دیوبند کے حلقہ میں ہمیں نہیں معلوم کہ ان کے سوا کسی اور کو بھی «علامہ» کے لقب سے عام طور پر پکارا یا یاد کیا گیا ہو»۔ ایضاً ص۳، مولانا تقی عثمانی کا مختصر اظہار حقیقت اس طرح ہے .... علم وفضل، ورع وتقویٰ میں اسلامی قرون کی ایک یادگار۔ البلاغ کراچی ص۲۳ شوال ۱۳۸۶ھ

شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت واجازت

آپ پڑھ چکے ہیں کہ علامہ حضرت شیخ الہند کے مجاز تھے اور کسی درجہ میں اس سلسلہ کو جاری بھی رکھتے تھے تاہم ان کے تعلیمی اور تدریسی رنگ میں تصوف کی یہ جہت ہمیشہ مستور ومخفی رہی، عمر کے اس آخری دور میں آپ نے حضرت رائے پوری سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا تھا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا بیان ہے کہ آخر عمر میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع فرمایا، خود میرے ساتھ کئی بار رائے پور کا سفر فرمایا، حضرت اقدس بھی علامہ کی طرف غیر معمولی توجہ فرماتے تھے بالآخر حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ لیکن علامہ نے اس سلسلہ کو کبھی نمایاں نہ کیا۔

زیارت حرمین شریفین ۱۹۶۰ء مطابق ۱۳۷۹ھ میں حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ اطہر کا شرف حاصل ہوا، اس باسعادت عمل اور مبارک سفر میں آپ کے دیگر رفقاء میں مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا عبدالاحد صاحب، مولانا معراج الحق صاحب، مولانا احمد رضا صاحب بجنوری، مولوی زاہد حسن صاحب اور مولوی محمود احمد گل صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس موقع پر بھی علامہ کی سادگی، قناعت، دنیا بیزاری، اور اسلاف کی حقیقی جانشینی کی وہ انفرادی شان نمایاں رہی، پانی اور کھجوروں کے علاوہ صرف چند یادگاری چیزیں ہی واپسی پر آپ کا اثاثۂ سفر تھا جن میں مصلی، تسبیح وغیرہ شامل تھیں۔

حضرت شاہ وصی اللہؒ سے تعلق واجازت۔ بیعت وارشاد

حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کا حضرت شاہ وصی اللہ صاحب الٰہ آبادیؒ سے

ارتباط و تعلق، نیز علمی و عملی مقتدائیت و عروج، قابل رشک شہرت و مقبولیت کے حصول مرجع العلماء کثیر المصروفیات اور کبیر السن ہونے کے باوجود الٰہ آباد کا سفر کرنا بجائے خود ایک حیرت انگیز اور مثالی قدم ہے میرے نزدیک یہ علامہ کی زندگی کا سب سے اہم باب ہے۔

جو لوگ علامہؒ کے اس قدم کو محض پیری مریدی کے تعلق سے دیکھ کر ہی اِنَّ هٰذَا لَمِنْ اَعَاجِیْبِ الزَّمَنِ پکار اٹھتے ہیں کہ ایک استاذ اور استاذ بھی کوئی معمولی نہیں، استاذ الاساتذہ اور یگانۂ روزگار شخصیت کا اور وہ بھی اپنی عام مقتدائیت کے دور میں اپنے ایک شاگرد سے استرشاد اور مریدی کا تعلق پیدا کرنا، یہ واقعی عجائبات زمانہ سے ہے، میں ان سے بصد احترام درخواست کروں گا کہ اگر وہ اس تعلق کی اصل غایت اور بنیادی وجہ پر غور کریں تو شاید بحر حیرت میں غرق ہی ہو جائیں، احقر نے علامہ اور شاہ صاحب کے درمیان طویل مراسلت (جو سو صفحات سے زائد پر مشتمل ہے) کا جو مطالعہ کیا ہے تو اپنے محدود علم اور ناقص فہم سے اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ یہ صرف پیری مریدی کا تعلق نہ تھا بلکہ اس کے پس منظر میں اتنی طویل داستان، محرکات اسباب و عوامل اور سوز و تڑپ نظر آتی ہے جس کے لئے ایک مستقل رسالے کی ضرورت ہے۔

قارئین شاید آپ میرے اس دعوے کو صرف پہیلیاں بجھانا سمجھ کر اوب رہے ہوں اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طویل مراسلت و مکاتبت کے بعض شہ پارے ہدیۂ ناظرین کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد غالبًا ان گوشوں کی طرف رہنمائی کرنا زیادہ آسان اور قریب الفہم ہو جو یہ ناچیز اس سلسلے میں سمجھا ہے اور شاید آپ بھی زیادہ بہتر طریقہ پر محظوظ و مستفید ہو سکیں، بطور نمونہ چند اقتباسات پیش ہیں۔

علامہؒ کی الٰہ آباد سے واپسی پر شاہ صاحب نے تحریر فرمایا۔ آپ کی تشریف آوری میرے لئے باعث کمال فخر بنی نیز اس سے بہت بہت خیرات و برکات کا ورود و نزول ہوا، من جملہ ان کے ایک بہت بڑا نفع مجھے یہ ہوا کہ میرے قلب کو بہت ہی تقویت پہونچی ورنہ تو ان دنوں خود کو بہت ہی زیادہ ضعیف اور کمزور پاتا تھا" معرفت حق دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۲۶۔

"بڑی خوشی اس امر کی ہوئی کہ آنجناب (علامہ صاحب) نے اصل کام کی طرف توجہ کرنے کو فرمایا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ بزرگوں کا یہی کام تھا — جس کی جانب جناب نے توجہ فرمائی

ہے یوں بعض دوسرے حضرات نے بھی مجھ سے وہاں (دیوبند) کی اصلاح کے متعلق کچھ فرمایا تھا اور اس کا مجھ پر اثر بھی ہوا تھا مگر جس انداز سے آپ نے فرمایا اس طرح کسی نے نہیں کہا، اس لئے آپ کے فرمانے سے میں بہت متأثر ہوا، بہرحال آپ کے پیش نظر اس وقت چونکہ محض دین اور بزرگوں کا طریق ہے چنانچہ اسی لئے آپ نے یہ تکلیف اٹھائی، تو آپ نے تو اخلاص پر قدم رکھ ہی دیا۔" ایضاً ص۲۲۔

علامہ صاحبؒ نے شاہ صاحب سے یہ درخواست کی کہ آپ سال میں چند بار دیوبند میں مواعظ فرمایا کریں تو امید ہے کہ طلبہ و مدرسین نہ صرف استفادہ کر سکیں گے بلکہ اس طرح ان کی اصلاح کا عمل بھی کسی درجہ میں شروع ہو سکے گا مگر شاہ صاحب نے اس طریقہ کو اس درجہ مفید نہیں سمجھا جس کی بقول ان کے دیوبند میں ضرورت تھی، ان کا خیال تھا کہ مقامی اور داخلی طور پر شدید محنت کی ضرورت ہے اور وہ اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہیں مقیم کوئی شخص اس ذمہ داری کو اپنے سر نہ لے لے، علامہ صاحب نے مدرسہ میں اسی عام بگاڑ و فساد کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ایک خط میں تحریر فرمایا۔ "ان حالات میں ہمیں کام کرنا ہے، ہاں طلبہ میں بعض ایسے افراد ابھی موجود ہیں جن میں اسلامی قدروں کی حفاظت کی تڑپ موجود ہے اگر صرف انھیں ہی راہ پر لگا دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ ایک وقت آجائے گا جب کہ اساتذہ و ارا کین بھی اپنے حالات بدلنے پر مجبور ہوں گے۔" (معرفت حق جنوری ۱۹۷۳ء ص۲۸)

اسی درد و تڑپ کا اظہار علامہ نے اس طرح بھی فرمایا کہ "چونکہ ہماری جماعت کے شیوخ میں سے اکثر نے وہ راہ اختیار کر لی ہے جس کے خلاف سنت و طریقت ہونے میں ذرا بھی تأمل نہیں اور عوام کا مزاج خرافی باتوں اور پیروں میں اعتقاد رکھتا ہے اس لئے مسلک دیوبند جسے اکابر نے سنت و طریقت کو اجاگر کرنے کیلئے اختیار کیا تھا خود نام نہاد اختلاف کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔" معرفت حق ۱۹۷۳ء ص۲۶۔

علامہ اس ماحول اور فساد و بگاڑ سے پریشان ضرور تھے مگر اس کے مبدل بہ اصلاح ہو جانے سے مایوس قطعاً نہ تھے، ماہر القادری کی زبان میں۔ اسی لئے ایک خط میں شاہ صاحب کو یہ جملہ بھی لکھ دیا کہ "جناب محترم کی توجہ سے اس ادارہ میں خاطر خواہ اصلاح و تبدیلی ظہور پذیر ہو گی (ایضاً ص۲۲)

حالات کی خرابی کا اظہار ایک جگہ اس طرح فرماتے ہیں: "حالات بہت بگڑ چکے ہیں اس لئے اس میں تدریجی اصلاح ہی سے کام چلے گا۔" ایضاً ص۲۴۔

ایک خط میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ غیر ملکی تمدن نے حریت ادیان کی وبا عام کردی ہے اور دین سے واقف طبقہ بھی اس کی لپیٹ میں بری طرح آگیا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو بچائے" (معرفت حق ص۲۹ مارچ ۱۹۷۳ء۔

علامہ صاحب کا دیوبند اور وہاں کے طلبہ ومدرسین کے حالات کے بارے میں متفکر رہنا مفروضات ومزعومات پر مشتمل نہیں ہے، اس باب میں شاہ صاحب کا یہ ارشاد پڑھنے کے بعد صحیح صورت حال علامہ کی روحانی نسبت، مسلک دیوبند کی حفاظت کی تڑپ کا اندازہ لگائیے، اور محسوس کیجئے کہ کون سا درد تھا جو علامہ کو مضطرب وبے چین کئے رہتا تھا، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ "عرض یہ کرنا ہے کہ مدرسہ بیس پچیس برس سے بزرگوں کی توجہ سے خالی تھا اور گویا کہ ایک طرح بگڑ ہی چکا تھا، اگر آپ کی توجہ عالیہ سے سدھر سنور گیا اور اس کا بگاڑ مبدل بہ بناؤ ہوگیا تو اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ اور دیگر اکابر کی روح آپ سے خوش ہوجائیگی" معرفت حق مئی ۱۹۷۳ء ص۲۵۔

اسی طرح شاہ صاحب نے آپ کو چاروں سلسلوں میں اجازت دینے کے ساتھ ساتھ متعدد خطوط میں اس کا اصرار کیا کہ آپ بیعت وارشاد کے کام پر خصوصی توجہ فرمائیں اور اس اجازت کو بھی حضرت تھانوی رہ کی جانب سے قرار دیا کہ گویا آپ حضرت تھانوی کے مجاز ہیں، چنانچہ ایک خط میں شاہ صاحب نے فرمایا: "دوسری گذارش یہ ہے کہ جناب والا نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی جانب سے بھی اجازت کا جو تذکرہ فرمایا تھا تو اب یہ جی چاہتا ہے کہ حضرت اس اجازت کو اب سب لوگوں پر ظاہر فرما دیں اور اس کے بعد یہ بھی فرمادیں کہ فلاں (شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی) کے واسطے سے گویا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اجازت ہوگئی ہے" الخ معرفت حق اپریل ۱۹۷۳ء ص۳۲

شاہ صاحب نے سب سے اول علامہ ہی کو مجاز بنایا، چنانچہ ایک خط میں ارشاد ہے "میں نے ٹھان لیا تھا کہ نااہل کو اجازت نہ دوں گا، تو اللہ تعالیٰ نے ایک اہل کو بھیجا جس سے میرے کام کی ابتدا ہوئی" ایضاً جنوری ۱۹۷۳ء ص۳۲۔

ایک خط میں شاہ صاحب علامہ اور اپنے متعلق (جو مولانا جامی کے الفاظ میں مجمع البحرین ہے) کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ "میرے پیش نظر تو آپ سے تعلق وہی حیثیت تلمذ ہے اور آپ کو

جو تعلق مجھ سے ہوا اس کو تو بس اللہ تعالیٰ کا فضل اور ان کی مہربانی ہی سمجھتا ہوں: ایضاً اپریل ۱۹۶۳ء
علامہ کے متعلق شاہ صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے یہ توصیفی کلمات بھی ملتے ہیں: اکابر کے طرز کو جناب والا نے جس طرح عقیدۃً و عملاً پکڑا ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے، ایضاً فروری ۱۹۶۳ء۔

نیز: میں نے جس قدر خلوص آپ کے اندر پایا کسی دوسرے کے اندر نہیں پایا، بلکہ خود اپنے اندر بھی ویسا نہیں پایا: ایضاً نومبر ۱۹۶۳ء۔

ناظرین! ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اور حضرت شاہ صاحب کا تعلق ارشاد و تلقین کا نہیں تھا، بلکہ علامہ اپنی خدا داد بصیرت اور نور باطنی سے ایک ایسے فساد کا مشاہدہ کر رہے تھے جو ان کے بقول مسلک دیوبند، سنت و طریقت اور اکابر دارالعلوم کی زندگی و تعلیمات کے بالکل خلاف تھا اسی کی اصلاح کی خواہش و تڑپ تھی جو علامہ کو الٰہ آباد حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں لے گئی۔ (جاری)

بقیہ ص ۴۷ ایک قوم جو ماضی کی . . . . . .

پاک حیثیتیں پر خدا کے خصوصی انعام اور اس جماعت میں شرکت کے صلۂ خیر سے تعبیر کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ جنت کی مسرتیں انھی کو میسر ہوں گی جن کو اس دنیا میں ان مسرتوں کی تمہید حاصل ہو چکی ہو، جو لوگ دنیا کی اس خوشگوار تمہید سے محروم ہیں ان کو جنت کی مسرتیں خاک حاصل ہوں گی"؟
جس قوم کا فکری ڈھانچہ اس قدر بگڑ چکا ہو کہ خیر اس کے نزدیک شر اور شر خیر بن جائے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس قوم کو دنیا میں زندہ رہنے کا حق رہے گا؟
تاریخ کبھی ایسی قوم کو معاف نہیں کرتی، قدرت کی گرفت ایسی منحوس قوم سے کبھی درگذر نہیں کر سکتی، چنانچہ چشم فلک نے دیکھا کہ پھر اس قوم کو اس دنیا میں زندگی کا دوسرا دور نصیب نہ ہو سکا اور ان کو ہمیشہ کے لئے افسانۂ ماضی بنا دیا گیا۔

فجعلناهم سلفاً ومثلاً للآخرين

پھر ہم نے ان کو داستانِ ماضی بنا دیا اور بعد والوں کیلئے نمونۂ عبرت۔

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد و حساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوتے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات مُعاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقربا کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے، آمین۔

پتہ

ڈرافٹ و چیک کیلئے :- "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے :- (حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پن کوڈ نمبر 247554

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ	۳۰۰/=	روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم	۱۰۰/=	"
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم	۸۰/=	"

یہاں پر سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔

ترسیل زر کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، سہارنپور (یوپی)

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہو گا
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

منیجر

حرفِ آغاز

انیا

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

دسویں صدی ہجری کے آخر اور گیارہویں صدی ہجری کے آغاز کا زمانہ ہندوستان میں اسلام اور حامیان اسلام کے لئے انتہائی نازک شمار کیا جاتا ہے جب کہ مغل تاجدار جلال الدین اکبر (۹۶۳/۱۰۱۴ھ) نے شہنشاہیت کی ترنگ اور عقلیت کے نشہ میں عقل و ہوش سے بے نیاز ہوکر "دین اسلام" کے متوازی "دین الٰہیہ" کے نام سے ایک جدید مذہب کی تحریک چلائی۔

دربار اکبری سے منسلک ایک ثقہ عالم اور مستند مورخ۔ ملا عبدالقادر بدایونی "اس جدید مذہب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اکبر کا حال یہ تھا کہ جب اس کے سامنے کسی معاملہ سے متعلق شرعی ثبوت پیش کئے جاتے تو برہم ہوکر یہ کہتا تھا کہ یہ سب ملاؤں کی باتیں ہیں۔ مجھ سے تو عقل و حکمت ہی کی باتیں بیان اور دریافت کی جائیں (منتخب التواریخ ص ۳۰۸) اس عقلیت پرستی کے دور میں عام طور پر یہ بات مشہور کردی گئی تھی کہ دین کا مدار عقل پر ہے نقل پر نہیں" (م ص ۲۱۱) مورخ بدایونی نے اس سے بھی خطرناک روش کی اطلاع دی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ برخود غلط مجتہد اور امام وحی الٰہی کو محال قرار دیتا، غیب اور عالم غیب سے متعلق ارشادات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی برملا تکذیب کرتا، اور فرشتوں، جنات، معجزات، بعث بعد الموت، حساب و کتاب اور ثواب و عذاب کا کھلے لفظوں انکار کرتا تھا (م ص ۲۷۳) اس الحاد و زندقہ میں صرف اکبر ہی نہیں گرفتار تھا بلکہ اس کے اردگرد رہنے والوں میں سے اکثر لوگوں کا حال یہی تھا، معجزات نبوی کے ساتھ استہزاء کی کیفیت کو ملا بدایونی نے یوں بیان کیا ہے کہ "بھرے دربار میں ایک پیر کھڑے ہوکر معراج رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذاق اڑاتا اور کہتا کہ میں جب تک دوسرا پیر اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتا تو راتوں رات

ایک شخص آسمان سے اوپر کیسے پہونچ گیا، پھر خدا سے باتیں بھی کیں اور جب واپس ہوا تو بستر تک گرم تھا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مذاق واستہزاء کا یہی معاملہ شق القمر اور دیگر معجزات کے ساتھ بھی تھا (ص۲۱۶) اکبر کے اس سطحی طریق استدلال سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مدعیان عقل کی عقل وفہم کو کس طرح زائل فرمادیتے ہیں۔

ائمہ دین اور مجتہدین اسلام کی توہین وتحقیر برسرعام کی جاتی تھی اور انھیں فقیہ کور، رجعت پسند، رفتار زمانہ سے ناواقف، خشک ملا اور متعصب جیسے اہانت آمیز الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا، دربار اکبری کا ممتاز محقق، دین الٰہیہ کا مرتب ابوالفضل فقہاء کرام کے فیصلوں کو یہ کہہ کر رد کردیا کرتا تھا کہ ان مٹھائی فروخت کرنے والوں، جوتا گانٹھنے والوں اور چمڑا فروشوں کی بات کیسے مان لوں (ص۲۰۱) (یہ ائمہ فقہ شمس الدین عبدالعزیز بن احمد الحلوائی متوفی ۴۹۸ھ اور شیخ احمد بن عمر خصاف متوفی ۲۶۱ھ کی نسبتوں کی طرف تعریض ہے)

دین اسلام کی بیخ کنی کی ان عملی کوششوں کے ساتھ علمی طور پر اسلامی عقائد واعمال کے اندر شکوک وشبہات پیدا کرنے کی غرض سے آج کل کی اصطلاح میں اسلام کا آزاد سائنٹفک مطالعہ کے لئے قانون ساز کونسلیں قائم کی گئیں، اس کمیٹی میں اسلامی عقائد اور مسلمات کے متعلق عقل کی روشنی میں فیصلے کئے جاتے اور اسلامی معتقدات کا مذاق اڑایا جاتا، اگر کسی ممبر کی ایمانی غیرت بیدار ہوجاتی اور وہ ان فیصلوں پر اختلافی نوٹ لکھنا چاہتا تو اسے روک دیا جاتا تھا (ص۲۱۷)

غرضیکہ ایک عظیم تحریک تھی جو ایک مطلق العنان خودسر بادشاہ کی سرپرستی میں دین اسلام کے خلاف چلائی جارہی تھی اور مظلوم اسلام انتہائی کس مپرسی کے ساتھ اس کی مخالفانہ اور معاندانہ یورشوں کو برداشت کررہا تھا، لیکن وہ اسلام جو دنیا میں سربلندی کیلئے برپا کیا گیا تھا آخر کب تک اس کس مپرسی اور بیچارگی کی حالت میں رہتا، الف ثانی کے اس محرف اعظم کی دین اسلام میں تحریفات دیکھ کر سرہند میں آباد خانوادۂ فاروقی کے ایک فرزند رشید شیخ احمد فاروقی کی رگِ فاروقیت پھڑک اٹھی اور اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود برصغیر کی اس سب سے بڑی طاقت سے ٹکرا گئے ابتداء میں اگرچہ چند بے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن آخر میں دنیا نے دیکھ لیا کہ محرف الف ثانی کے مقابلہ میں فتح وکامرانی مجدد الف ثانی ہی کے حصہ میں آئی اور

جس گھر سے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی تحریک چلی تھی اسی گھر میں اورنگ زیب جیسا اسلام دوست اور شاہی میں فقیری اداؤں کا رمز شناس بادشاہ پیدا ہوا، جس نے اسلامی حمیت کا قابل ستائش مظاہرہ کرتے ہوئے بیانگ دہل اعلان کیا کہ "جدا اکفر بود"

تین چار صدی تک کنج گمنامی پوشیدہ رہنے کے بعد عقلیت پرستی کا یہ فتنہ پھر سر اٹھا رہا ہے اور مختلف ہتھکنڈوں سے امت کے رشتے کو سلف صالحین اور صحابۂ کرام سے کاٹنے کی ناروا کوشش کی جارہی ہے، یہ فتنہ اپنے نام ولباس کے اعتبار سے اگرچہ مختلف ہے لیکن اس کی روح اور آئیڈیل وہی فتنہ اکبری ہے۔

الحاصل شراب وہی پرانی ہے لیکن پیالے بدل بدل کر پیش کی جارہی ہے، فتنہ تو وہی قدیم ہے مگر اسے مختلف رنگ برنگ لباس سے آراستہ وپیراستہ کرکے سامنے لایا جارہا ہے، ارباب بصیرت جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی معرفت کی دولت سے نوازا ہے وہ تو پہلی ہی نظر میں اصل حقیقت کو تاڑ لیتے ہیں اور انھیں دیکھ کر برملا پکار اٹھتے ہیں کہ

بہر رنگے کہ خواہی جامہ پوشی
من انداز قدت را می شناسم

لیکن جنھیں دین کی پوری بصیرت حاصل نہیں ہوتی وہ بسا اوقات ظروف کی جدت اور لباس کی تراش وخراش سے متاثر ہوکر مبتلائے فریب ہوجاتے ہیں، اسلئے حضرات علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس فتنہ کی حقیقت سے عام مسلمانوں کو آگاہ کریں اور جس طرح حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہما نے اس فتنہ کے مرجع ومنشاء یعنی فتنہ اکبری کا مقابلہ ہر خوف وخطر سے بے نیاز ہوکر کیا اور اس سلسلے میں ہر مشقت کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کی، آج اسی غیرت ایمانی کے ساتھ نفع ونقصان کے اندیشہ سے بالاتر ہوکر آج کے روشن خیال تاریک دل تہذیب مغرب کے آلۂ کاروں کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہوجائیں اور ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے سد سکندری بن کر کھڑے ہوجائیں۔

امام ابوحنیفہؒ کا علمی مقام

از مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری نقشبندی

امام صاحبؒ اور فقہ احادیثِ احکام کا جتنا بڑا ذخیرہ امام اعظمؒ کی روایت کردہ احادیث میں ملتا ہے وہ ہمارے نزدیک دوسرے ائمہ ثلاثہ کے یہاں بھی نہیں ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب نے سب سے پہلے تدوین فقہ کا کام کیا اور چالیس محدثین وفقہاء کی مجلس ترتیب دے کر کیا جس میں تقریباً تیرہ لاکھ مسائل مدون کرادیئے تھے، ان میں سے تین چوتھائی مسائل سے بعد کے تینوں ائمہ (امام مالکؒ امام شافعیؒ وامام احمدؒ) اور ان کے متبعین ومقلدین نے مکمل اتفاق کیا اور باقی ایک چوتھائی میں بھی کچھ مسائل کے سوا امام اعظم یا ان کے تلامذہ کے ساتھ ان تینوں اماموں نے اتفاق ہی کیا ہے۔ اسی لئے امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ فقہ میں سارے ائمہ فقہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے عیال ہیں یعنی سب نے ان ہی سے پرورش پائی ہے اور امام شافعیؒ سے ہی یہ بھی منقول ہے کہ امام صاحب علم کلام وعقائد میں سب سے مقدم اور سب کے سردار ہیں۔

امام صاحبؒ اور علم عقائد وکلام امام صاحب نے تدوینِ فقہ سے بھی پہلے علم کلام کی طرف توجہ کی تھی، کیونکہ شیعیت، خارجیت، اعتزال، جبریت قدریت، جہمیت وغیرہ کے فتنے ان کے زمانہ میں سر اٹھا چکے تھے، امام صاحب نے کوفہ سے بصرہ ۲۲/۲۳ سفر اہلِ زیغ سے مناظروں کیلئے کئے اور بڑے بڑوں کو قائل کیا اور نیچا دکھایا کسی بھی مناظرہ میں آپ ناکام نہیں ہوئے، کیونکہ آپ کے اندر جامعیت علوم کے ساتھ وفورِ عقل بھی تھی، اسی لئے امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شخص اپنی عقل وحجت کے زور پر لکڑی کے ستون کو سونے کا ثابت کرسکتا ہے۔

امام صاحبؒ تابعی تھے آپ کا یہ شرف سب سے بڑا تھا، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا تھا وہ شخص نہایت خوش قسمت ہے جس نے مجھ کو دیکھا اور ایمان لایا، یا میرے اصحاب کو دیکھا یا میرے اصحاب کے دیکھنے والوں کو دیکھا (جامع صغیر ص۵۹)

ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ جس نے مجھے دیکھا یا میرے اصحاب کو دیکھا تو وہ نار جہنم سے محفوظ رہے گا۔

امام صاحب کی تابعیت کو تمام اکابر ائمت محققین نے تسلیم کیا ہے، اور ہمارے محترم علامہ محدث مولانا عبداللہ خانصاحب کرتپوری دام فضلہم (تلمیذ خاص حضرت علامہ کشمیریؒ) نے اس بارے میں مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس کو بطور ضمیمہ اس کے بعد شامل کریں گے اس لئے یہاں صرف چند کلمات اکابر پر اکتفا کرتے ہیں۔

حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی نے لکھا: امام ابوحنیفہ رح نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا جو کوفہ میں تھے، لہٰذا وہ تابعین کے طبقہ میں ہیں، اور یہ بات ان کے معاصر ائمہ امصار میں سے کسی کو میسر نہیں ہوئی، جیسے امام اوزاعی شام میں تھے، حماد بن سلمہ اور حماد بن زید بصرہ میں تھے سفیان ثوری کوفہ میں، امام مالک مدینہ منورہ میں، مسلم بن خالد زنجی مکہ معظمہ میں تھے، اور لیث بن سعد مصر میں، ان میں کسی کو بھی یہ مبارک و عظیم القدر نسبت حاصل نہیں ہوئی (فتاویٰ ابن حجر بحوالہ الخیرات الحسان فصل سادس لابن حجر مکی (شارح مشکوٰۃ) نقلہ مولانا عبدالرشید نعمانی در مقدمہ کتاب الآثار امام محمدؒ)

تہذیب میں لکھا کہ امام صاحب نے حضرت انسؓ (صحابی رسولؐ) کو دیکھا ہے، علامہ ذہبیؒ نے کاشف میں تذکرۃ الحفاظ اور مناقب ابی حنیفہ میں لکھا ہے کہ امام صاحب نے حضرت انس رض کو دیکھا ہے، بلکہ ابن سعد کے حوالہ سے خود امام صاحب کا قول بھی نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت انس رض کو کئی بار دیکھا ہے۔

اسی طرح علامہ یافعی رح نے مرآۃ الجنان میں، خطیب نے تاریخ بغداد میں، علامہ ابن حجر مکی شافعیؒ نے الخیرات الحسان میں علامہ سیوطی شافعی رح و ملا علی قاری حنفی نے بھی معتمد قول رویت صحابہ کا نقل کیا ہے، ملا علی قاری نے یہ بھی تنبیہ کی کہ تابعیت امام سے انکار تتبع قاصر یا تعصب فاتر کے سبب سے ہوا ہے۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ نے مقدمہ شرح وقایہ میں لکھا : صحیح و معتمد قول جس کے سوا سب غلط ہے یہی ہے کہ امام صاحبؒ تابعین میں سے ہیں، کیونکہ حضرت انسؓ کو کوفہ میں بار بار دیکھا ہے اور اسی تحقیق کو دار قطنی، خطیب بغدادی، ابن الجوزی، نووی، ذہبی، ابن حجر عسقلانی، ولی عراقی، ابن حجر مکی و سیوطی وغیرہم اجلہ محدثین نے اختیار کیا ہے، اقامۃ الحجہ میں اس کو میں نے مع عبارات کے درج کیا ہے، اور نواب صدیق حسن خاں نے ابجد العلوم میں جو لکھا ہے کہ امام صاحب نے بالاتفاق اہل حدیث کسی صحابی کو نہیں دیکھا، وہ غلط محض ہے، اس کا مکمل رد میں نے ابراز الغی میں کر دیا ہے، جس میں نواب صاحب کی دوسری اغلاط و تسامحات بھی ذکر کی ہیں، نیز امام صاحبؒ کی توثیق فی الروایۃ کا مکمل ثبوت السعی المشکور میں پیش کیا ہے۔

تاریخ کی غلطی اسی کے ساتھ حضرت مولاناؒ نے تاریخ ابن خلدون کی اس مشہور نقل کو بھی مکمل دلائل سے باطل ثابت کیا ہے جس میں امام صاحبؒ سے قلت روایت حدیث کا گمان ہوتا ہے، پھر لکھا کہ جاہلوں کا تو شیوہ ہمیشہ ہی رہا ہے کہ ایسی غلط باتوں کی نقل و تشہیر کریں، تعجب تو ان علماء پر ہے جو ایسے مردود و باطل قول کو بغیر تغلیط و تقبیح کے نقل کر دیتے ہیں، جیسے نواب صدیق حسن خاں نے الحطۃ بذکر الصحاح الستہ میں ذکر کیا اور خاموشی سے گذر گئے پھر ان کے ماننے والوں (غیر مقلدوں) نے اس نقل کو خوب پھیلایا، تاکہ ہندوستان کے حنفیہ کو مطعون کریں، حالانکہ ایک عالم کے لئے حرام ہے کہ وہ ایسی مغالطہ آمیز غلط بات کو بغیر تغلیط و تقبیح کے یوں ہی نقل کر دے (ص ۳۳، ص ۳۴)

امام صاحبؒ اور بشارت نبویہ صحیح بخاری شریف میں حدیث ہے کہ اگر ایمان ثریا کے پاس بھی ہو تو اس کو کچھ لوگ یا ایک شخص فارس کا ضرور حاصل کرے گا۔ (ص ۷۲۷ و مسلم ص ۳۱۲) مسلم شریف کی حدیث میں بجائے ایمان کے دین کا لفظ ہے، اور بعض روایات میں علم کا لفظ ہے، اور یہ ارشاد حضور علیہ السلام نے حضرت سلمان فارسی کے سر پر دست مبارک رکھ کر ارشاد فرمایا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ اس شخص میں اتنی بڑی عقلی و علمی بصیرت ہو گی کہ ایمان یا دین یا علم خواہ اس سے کتنی ہی دوری یا بلندی پر ہو گا کہ وہاں تک پہونچنا یا وہاں سے کوئی چیز حاصل کرلانا

دشوار سے دشوار بھی ہو تو وہ اس کے لئے آسان ہوگا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت امام اعظم رحمہ کے دادا فارس کے تھے اور علامہ سیوطی شافعی رحمہ نے فرمایا کہ بخاری و مسلم کی یہ حدیث ایسی اصل صحیح ہے جس کے سبب امام ابوحنیفہ کی طرف اشارہ پر اعتماد کیا جاتا ہے، اور ان کے تلمیذ علامہ محدث حافظ محمد بن یوسف صالحی شامی شافعی ۹۴۲ھ (صاحب سیرۃ شامیہ) نے فرمایا کہ ہمارے شیخ (علامہ سیوطی رح) کو یقین تھا کہ اس حدیث کا مصداق حضرت امام صاحبؒ ہی ہیں، یہ بات ایسی ظاہر ہے کہ اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ابنائے فارس میں سے کوئی بھی امام صاحب کے علمی مرتبہ و مقام کو نہیں پہونچ سکا ہے، بلکہ حضرت سلمان فارسی بھی اگرچہ امام صاحبؒ سے صحابیت کے لحاظ سے ضرور افضل ہیں مگر باعتبار علم و اجتہاد و نشر دین و تدوین احکام شریعت کے ان جیسے نہیں تھے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مفضول میں فاضل سے کچھ اوصاف کمال زیادہ ہوں۔

سنن ترمذی شریف کی کتاب التفسیر (سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) میں حدیث "لتناوله رجال من فارس" کے تحت العرف الشذی م۵۳۰ میں حضرت علامہ سیوطی رح کا یہ قول بھی نقل ہوا کہ یہ حدیث امام ابوحنیفہ رحمہ کے مناقب میں سب سے زیادہ احسن شمار کی جاتی ہے، جو مرفوعاً مروی ہے اور خاص طور سے اس روایت کے لحاظ سے جس میں بجائے "رجال من فارس" کے "رجل من فارس" ہے۔

علامہ ابن عبدالبر مالکی نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ کی شان میں کوئی بھی برائی کی بات مت کہو اور نہ ایسے کسی آدمی کی تصدیق کرو جو ان کے حق میں بری بات کہے، کیونکہ واللہ میں نے ان سے زیادہ کسی کو افضل، اورع اور افقہ نہیں پایا۔

تحقیق ابن الندیم بقول علامہ محدث و مؤرخ ابن الندیم (م ۳۸۵ھ) امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ کا علم مدون ہو کر شرق سے غرب تک خشکی و تری کے تمام حصوں میں پھیل گیا تھا اور لکھا کہ یہ سب امام صاحبؒ کی دین اور فیض ہے لہذا ملاءِ اعلیٰ کی نظر میں روحانی ترقیات کا زمانہ ڈیڑھ سو سال کے اندر علوم نبوت سے مکمل طور سے فیضیاب ہو گیا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم۔

حدیث خیر القرون یہ حدیث بھی مشہور ہے کہ سب سے بہتر زمانہ میرا ہے، پھر ان لوگوں کا جو اس کے بعد آئیں گے، پھر ان کا جو ان کے بعد ہوں گے، اس کے بعد جھوٹ عام ہو جائے گا، اور جھوٹی شہادت، امانت اور وفاء عہد بھی کم ہوتا جائے گا، چنانچہ زمانۂ صحابہ و تابعین کے بعد جھوٹی حدیثیں گھڑی گئیں اور بڑے بڑوں کے خلاف جھوٹی تہمتیں تک لگنے لگیں۔

امام اعظم چونکہ تابعی تھے اس لئے ان کی مسانید وکتب آثار میں وحدانیات، ثنائیات کے سوا ثلاثیات بھی بکثرت ہیں اور امام مالک کے یہاں بھی ثنائیات و ثلاثیات ہیں، (وحدان نہیں ہیں) جب کہ امام بخاری کے پاس ثلاثیات صرف ۲۲ ہیں وہ بھی بڑی تعداد میں مکی بن ابراہیم حنفیؒ تلمیذ امام اعظمؒ کے واسطے سے ان کو ملی ہیں، باقی رباعیات ہیں، امام مسلم کے پاس ثلاثیات بالکل نہیں ہیں، واضح ہو کہ اصحاب صحاح میں سے کسی ایک کو تبع تابعیت کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا، ان کے شاگردوں کا تو کیا ذکر ہے (مقدمہ ترجمہ اردو موطا مالک مولانا نعمانی) غرض جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صحاح ستہ سے پہلے احادیث کے ذخیرے نہیں تھے یا صحیح بخاری بلحاظ زمانہ سابق کے بھی اصح الکتب ہے وہ غلط ہے، کیونکہ ان سے پہلے تقریباً ایک سو احادیث و آثار صحابہ و تابعین کے مجموعے مدون ہو چکے تھے، اور حسب شہادت علامہ محدث شعرانی شافعیؒ مسانید امام اعظم ابوحنیفہؒ میں سارے رواۃ حدیث خیار تابعین، عدول وثقات خیر القرون کے ہیں (مقدمہ لامع الدراری ص۵۰)

امام صاحب کی کتاب الآثار ومسانید امام مالک سے بھی قبل کی احادیث و آثار ہیں اور حسب شہادت علامہ سیوطی وشعرانی وغیرہ سب سے پہلے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے علم شریعت کو مدون کیا تو ظاہر ہے کہ علم شریعت کی بنیاد تو کتاب وسنت اجماع وقیاس ہی پر تھی تو ان کے سامنے جتنا ذخیرہ احادیث و آثار کا تھا وہ کسی بھی بعد کے مجتہد یا فقیہ ومحدث کے پاس نہ تھا، پھر وہ خود ہی اکیلے نہ تھے انھوں نے چالیس محدثین وفقہاء کی مجلس قائم کر کے تدوین فقہ کا کام کیا تھا، امام سیوطی شافعیؒ نے یہ بھی فرمایا کہ امام ابوحنیفہ سے پہلے یہ کام اور کسی نے نہیں کیا اور فرمایا کہ امام مالکؒ نے بھی جو کام کیا ہے وہ امام صاحب کے اتباع میں کیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ موطا امام مالک کو اصل صحیحین فرماتے ہیں مگر ان کی نظر بھی اس [illegible]

گئی کہ امام صاحب تو امام مالک سے بھی پہلے تھے جن سے خود امام مالکؒ نے ۶۰ ہزار مسائل اخذ کئے تھے اور امام صاحب اور ان کی کتابوں سے غیر معمولی علمی استفادات امام مالکؒ نے کئے ہیں۔

علامہ کوثریؒ نے جہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مدح کے ساتھ ان کی مسامحات کا ذکر کیا ہے ایک بہت ہی اہم نقد یہ بھی کیا ہے کہ ان کی نظر متقدمین کے علوم اور کتابوں پر کم تھی۔

شاہ صاحب نے الانصاف میں لکھا: امام ابوحنیفہؒ سب سے زیادہ ابراہیم نخعی اور ان کے اقران کے مذہب و مسلک کو لازم پکڑتے تھے بلکہ اس سے تجاوز کرتے ہی نہ تھے، الا ماشاء اللہ اور امام صاحب ان کے مذہب کے مطابق تخریج کرنے میں ضرور عظیم الشان وجوہ تخریجات کیلئے بہت دقیق النظر اور فروع پر گہری نظر و توجہ تام والے تھے، اور اگر تم چاہو کہ ہمارے اس بیان کی حقیقت معلوم کرو تو کتاب الآثار امام محمد، جامع عبدالرزاق و مصنف ابن ابی شیبہ سے حضرت ابراہیم کے اقوال نکال کر محاسبہ کر لو کہ امام صاحب نے ان کے طریقہ سے کبھی علیحدگی اختیار نہیں کی بجز چند مواضع کے، پھر وہ ان چند جگہوں میں بھی فقہاء کوفہ کے مذہب سے الگ نہیں ہوتے، گویا وہاں بھی امام صاحب فقہاء کوفہ کے تابع اور خوشہ چیں تھے، حالانکہ کوفہ میں بھی وہ تمام فقہاء کوفہ کے سردار اور سربراہ تھے۔

علامہ محدث مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوری صدر مفتی دار العلوم دیوبند

آپ نے جو کتاب الآثار امام محمدؒ کی بے نظیر محدثانہ شرح لکھی ہے اور شائع شدہ بھی ہے اس کے مقدمہ میں شاہ ولی اللہؒ کے اسی دعوے کا رد کیا ہے اور لکھا کہ حضرت شاہ صاحب ایسے رفیع المقام محقق کے لئے موزوں نہ تھا کہ وہ ایسا بڑا دعویٰ کرتے کہ بجز تخریج و تفریع کے اور کامل اتباع ابراہیم نخعی کے اور کوئی بھی جدید یا اہم کام امام صاحب نے انجام نہیں دیا ہے اور یہ کہ وہ تو صرف ناقل محض تھے ابراہیم و اقران کے اور جہاں ان کے اقوال نہ ملے وہاں دوسرے فقہاء کوفہ کا اتباع کرتے تھے، شاہ صاحب کی اسی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب صرف ایک مقلد محض اور متبع کے درجہ میں تھے حالانکہ امام صاحب کا مقام و مرتبہ اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے، وہ امام الائمہ اور مقتدیٰ اکثر الائمہ تھے، جس کا اعتراف [illegible] کیا ہے۔

اس کے بعد مفتی صاحب نے لکھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ عجیب و غریب دعویٰ پڑھ کر ہم نے ان کے حکم کی تعمیل میں کتاب الآثار وغیرہ میں حضرت ابراہیم نخعی کے اقوال کا تتبع کیا اور ان کا موازنہ بھی امام صاحب کے مذہب سے کیا تو ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ جس طرح ابراہیمؒ اور ان کے اقران نے اجتہاد کیا ہے، امام صاحب نے بھی کیا، پھر بکثرت ایسے مواضع بھی دیکھے کہ جن میں امام صاحب نے ابراہیم کی رائے کو بالکل ترک کر کے خود اپنے اجتہاد سے فیصلے کئے ہیں، اگرچہ امام صاحب کی تفقیہ میں ان کے استاذالاساتذہ کا اثر ضرور ہے، جس طرح امام مالک کے تفقیہ میں حضرت سعید بن المسیبؒ کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور ہم نے ایک مستقل تالیف میں وہ سب مواضع یکجا بھی کر دیئے ہیں کہ جن میں امام صاحبؒ نے ابراہیم نخعی کا خلاف کیا ہے، پھر مفتی صاحب نے ان میں سے سات شواہد کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس بارے میں امام صاحبؒ کی طرف سے بہت ہی اچھا دفاع محقق ابوزہرہ مصری نے اپنی کتاب "امام ابوحنیفہ" میں کیا ہے، اس کا بھی ضرور مطالعہ کیا جائے۔

تبصرہ محقق ابوزہرہ مصری | آپ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ سے عبارت مذکورہ نقل کر کے لکھا کہ شاہ صاحب نے اقوالِ ابراہیم و اقران پر امام صاحب کے قصر و انحصار کے دعوے میں مبالغہ سے کام لیا ہے پھر ابوزہرہ نے تفصیل سے بتلایا کہ امام صاحب نے اپنی فقہی آراء کو کن کن مصادر سے اخذ کیا ہے۔ ص۱۶۷/۱۸۲

علوم امام اعظم کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے مولانا نعمانی دام فضلہم کی "ابن ماجہ اور علم حدیث" ص۳۶ تا ۴۹ بھی دیکھی جائے، نیز حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعض دوسری اہم مسامحات کی اصلاح اور دیگر اہم علمی ابحاث بھی ص۱۸۱ تا ص۲۳۰ دیکھی جائیں اور امام صاحبؒ کے مشائخ حدیث اور تلامذۂ محدثین کا ذکر تفصیل سے مقدمہ کتاب التعلیم اور اس کے حواشی میں بھی قابل مطالعہ ہے (ص۲۰۷ تا ص۲۲۲) البتہ تقلید کے سلسلہ میں یہاں کچھ اور عرض کرنا ہے۔

حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب صدر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند نے اپنی محققانہ محدثانہ شرح کتاب الآثار امام محمد کے مقدمہ ص۲ میں لکھا کہ تقلید کی بنیاد دوسو سال پورے ہونے سے قبل ہی پڑ گئی تھی اگرچہ اس زمانہ میں وہ بطور استحباب کے تھی اور جب ان لوگوں کو کوئی نص شرعی مل جاتی تھی تو وہ

اس شخص کی بات کو ترک کرکے نص شرعی پر عمل کرتے تھے، اور یہی وصیت ائمہ مجتہدین کی تھی کہ ہمارے قول کے خلاف جب نص مل جائے تو ہمارا قول ترک کردو۔

لہٰذا حجۃ اللہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا یہ ارشاد لائق تامل ہے کہ "تقلید چار سو سال کے بعد شروع ہوئی ہے، حضرت مفتی صاحب نے لکھا کہ "اسدیہ" جو "مدونہ کبریٰ" کی اساس ہے اس کو امام اسد بن الفرات قاضی قیروان وفاتح صقلیہ م ۲۱۳ھ نے جمع کیا تھا، وہ امام مالکؒ کی وصیت کے مطابق عراق گئے اور امام ابو یوسف و امام محمد وغیرہ اصحاب امام اعظم سے علم فقہ حاصل کیا، پھر قیروان واپس ہوکر امام اعظم اور امام مالک کا مذہب وہاں پھیلایا، بعد کو صرف امام ابو حنیفہ ہی کے مذہب پر اقتصار کرلیا تھا چنانچہ دیار مغرب میں اندلس تک امام صاحب کے مذہب نے فروغ پایا یہ چوتھی صدی سے بہت پہلے تھے اور امام زفر م ۱۵۸ھ وغیرہ سب دو سو کے اندر ہوئے ہیں جو امام صاحب ہی کے مقلد تھے اور امام صاحب ہی کے مذہب کے مطابق فتوے دیتے تھے، حضرت مفتی صاحب نے یہاں صرف ۱۰، ۱۱ نام ذکر کئے ہیں اور ہم ۱۱ م حضرات ائمہ حدیث و فقہ کے نام لکھتے ہیں جو سب ہی امام صاحب کے مقلد تھے اور ان میں سے بہت سے حضرات امام صاحب کی مجلس تدوین کے رکن بھی تھے اور یہ سب دوسری صدی کے اندر کے تھے۔

امام زفر حنفی م ۱۵۸ھ	امام زہیر بن معاویہ م ۱۷۳ھ	امام ابو یوسف م ۱۸۳ھ
امام مالک بن مغول م ۱۵۹ھ	امام قاسم بن معن مسعودی حنفی م ۱۷۵ھ	امام یحییٰ بن زکریا حنفی م ۱۸۴ھ
امام شعبہ ابن الحجاج م ۱۶۰ھ	امام لیث بن سعد حنفی م ۱۷۵ھ	امام عیسیٰ بن یونس حنفی م ۱۸۷ھ
امام داؤد طائی م ۱۶۰ھ	امام حماد بن امام اعظم م ۱۷۶ھ	امام فضیل بن عیاض م ۱۸۷ھ
امام ابراہیم بن طہمان م ۱۶۳ھ	امام ہیاج بن بسطام م ۱۷۷ھ	امام جریر بن عبدالحمید م ۱۸۸ھ
امام مندل بن علی م ۱۶۸ھ	امام شریک بن عبداللہ کوفی حنفی م ۱۷۸ھ	امام محمد بن الحسن م ۱۸۹ھ
امام نصر بن عبدالکریم م ۱۶۹ھ	امام عافیہ بن یزید ازدی م ۱۸۰ھ	امام یوسف بن خالد م ۱۸۹ھ
امام حبان بن علی م ۱۷۱ھ	امام عبداللہ بن مبارک م ۱۸۱ھ	امام علی بن مسہر م ۱۹۰ھ
امام عمرو بن میمون بلخی م ۱۷۱ھ	امام نوح بن دراج کوفی م ۱۸۲ھ	امام اسد بن عمرو م ۱۹۰ھ
امام نوح بن ابی مریم م ۱۷۳ھ	امام ہشیم بن بشیر م ۱۸۳ھ	امام عبداللہ بن ادریس م ۱۹۲ھ

امام فضل بن موسیٰ	م ۱۹۲ھ	امام وکیع حنفی	م ۱۹۷ھ	امام حفص بن عبدالرحمٰن	م ۱۹۹ھ
امام علی بن ظبیان	م ۱۹۲ھ	امام ہشام بن یوسف	م ۱۹۷ھ	امام ابو مطیع بلخی	م ۱۹۹ھ
امام حفص بن غیاث	م ۱۹۴ھ	امام شعیب بن اسحاق	م ۱۹۸ھ	امام خالد بن سلیمان	م ۱۹۹ھ
امام شقیق بن ابراہیم بلخی	م ۱۹۴ھ	امام یحییٰ القطان۔	م ۱۹۸ھ		

تیسری صدی کے محدثین مقلدین امام اعظم

دوسری صدی کے اکابر ائمہ محدثین وفقہاء کی مختصر فہرست اوپر گذری ہے اور جن کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے وہ ان سے بھی زیادہ ہیں، تذکرۃ الحفاظ، طبقات حنفیہ اور مقدمہ انوار الباری جلد اول میں مطالعہ کئے جائیں، تیسری صدی کے شروع میں امام صاحب کے تلامذۂ حدیث اور پھر امام ابو یوسف وامام محمد وغیرہ اصحاب امام کے تلامذہ کا سلسلہ چلتا ہے، مثلاً امام ابوالحسن علی بن عاصم واسطی م ۲۰۱ھ مشہور تلمیذ الامام فی الحدیث والفقہ کے درس حدیث میں تیس ہزار تلامذہ ایک وقت میں ہوتے تھے اور ان کے صاحبزادے عاصم بن علی بن عاصم م ۲۲۱ھ کے درس حدیث میں ایک لاکھ بیس ہزار تلامذہ ایک وقت میں ہوتے تھے، اور امام حدیث یزید بن ہارون م ۲۰۶ھ تلمیذ حدیث وفقہ امام اعظم کے درس حدیث میں ستر ہزار شاگرد ہوتے تھے، اور خود ان ہی کا بیان ہے کہ امام اعظمؒ کے درس حدیث میں بھی ستر ہزار تلامذہ ایک وقت میں شریک ہوتے تھے (تاریخ الحدیث ص۵۷)۔ پھر خیال کیا جائے کہ امام صاحب نے اپنے استاذ حدیث وفقہ حضرت حماد بن ابی سلیمان م ۱۳۰ھ کی مسند درس پر بیٹھ کر آخری سال وفات ۱۵۰ھ تک درس دیا ہے تو کتنی لاکھوں لاکھ تعداد نے آپ سے علم حدیث وفقہ حاصل کیا ہوگا، پھر بھی امام بخاری فرماتے ہیں کہ امام اعظم سے لوگوں نے حدیث کی روایت نہیں کی، اور ان کی فقہ ورائے کو بھی نظر انداز کیا جبکہ امام عبداللہ بن مبارک م ۱۸۱ھ استاذ الاساتذہ وممدوح اعظم امام بخاریؒ ہی کی شہادت یہ بھی ہے کہ امام صاحب کی رائے مت کہو کیونکہ جو کچھ ان کی رائے تھی وہ سب احادیث نبویہ کے ہی معانی ومطالب تھے اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ امام صاحبؒ نے اپنی سرپرستی میں چالیس محدثین وفقہاء کی مجلس تدوین کے ذریعہ حسب روایت خطیب بغدادی شافعی ۱۲ لاکھ ستر ہزار مسائل فقہ کے مدون ومرتب کرا دیئے تھے اور ان میں تین چوتھائی کو بعد کے سب ائمہ مجتہدین امام مالک، امام شافعی اور امام احمد

اور دوسرے سب ہی محدثین و فقہاء نے تسلیم کرلیا تھا پھر باقی چوتھائی مسائل میں بھی امام صاحب واصحاب امام کی موافقت زیادہ ہے اور بڑا اختلاف بہت تھوڑے مسائل میں ہے۔

اسی طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تین چوتھائی مسائلِ امام میں بعد کے سب ہی لوگوں نے امام صاحب کی تقلید کی ہے، کیونکہ تقلید کا مطلب یہ ہے کہ اپنے سے بڑے علم والے پر اعتماد و بھروسہ کرکے غیر منصوص مسائل میں اس کے علم و اجتہاد کو صحیح مان لیا جائے اور ایسی تقلید میں ہرگز کوئی شرک نہیں ہے، خود دورِ صحابہ میں بھی ایسی تقلید موجود تھی کہ کم علم والے دوسرے فقہاء صحابہ کی رائے پر اعتماد کرکے ان کا اتباع کرتے تھے۔

البتہ ایسی تقلید کو سب ہی اہلِ حق غیر شرعی کہتے ہیں کہ کسی بھی حدیث یا نص شرعی کے مقابلہ میں کسی امام یا فقیہ کی رائے کو ترجیح دی جائے، اور خدا کا شکر ہے کہ ایسی غلط تقلید دورِ صحابہ سے لے کر اب تک جائز نہیں رکھی گئی ہے نہ آئندہ کبھی اس کو اختیار کیا جائے گا۔

فلسطینیوں کی شہادت

مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کا پیغام ہمدردی

دیوبند، ۲۰ رفروری، مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے آج فلسطینیوں کی شہادت اور ۳۰۰ سے زائد نمازیوں کو شدید زخمی کردیئے جانے پر اپنے ایک بیان میں شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اسرائیلی فوج کی سخت مذمت کی ہے، ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اس علاقے میں یہ سب سے زیادہ خونریز اور انتہائی تکلیف دہ واقعہ ہے اس کے نتیجہ میں فسادات میں مزید سات فلسطینیوں کی ہلاکت اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہے بظاہر یہ ایک جنونی امریکی تارک وطن کا فعل ہے لیکن اس کے پیچھے صیہونیت کی اسلام دشمن پالیسی کے صاف ثبوت ملتے ہیں، جو لوگ مسلمانوں پر بنیاد پرست ہونے کا الزام لگاتے ہیں وہ آنکھیں کھول کر اس طرح کے حادثات کی نفسیات کا مطالعہ کریں اس سے عربوں اور یہودیوں کے درمیان منافرت بڑھے گی ایک متبرک مزار کے قریب بحالت نماز میں رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اس طرح سے حملہ کرنا ایک بزدلانہ فعل ہے جس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے — حضرت مہتمم صاحب نے ان شہداء کرام کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کیا ہے اور زخمیوں کے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ان کیلئے دعائے صحت کی ہے۔

از:- ادارہ

جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو شکل وصورت، قد وقامت، عقل وفہم، شجاعت ووجاہت، ذہانت و ذکاوت، تدبر وفراست کے اعتبار سے یکساں نہیں بنایا ویسے ہی رزق سب کو برابر تقسیم نہیں کیا، جس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے سورہ شوریٰ آیت ۲۷ میں یہ بتائی ہے:

"اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کردیتے مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے"

جن لوگوں کو اللہ نے زیادہ رزق اور زیادہ زندگی کا سامان دیا ہے انھیں اس کو خرچ کرنے کے لئے آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہیں اڑائیں بلکہ ان پر بہت ساری پابندیاں عائد کردی ہیں، کچھ چیزوں پر خرچ کرنا ممنوع قرار دیا ہے اور کچھ پر خرچ کرنا واجب یا مستحب ہے، مثلاً شراب اور جوئے پر مال خرچ کرنا حرام ہے اور زکوٰۃ دینا فرض ہے، زکوٰۃ کے علاوہ عام حالت میں حاجت مندوں پر مال صرف کرنا مستحب ہے، اسی طرح مال کمانے پر بھی شرطیں عائد کی گئی ہیں، سود کی کمائی حرام ہے، خرید وفروخت کے کچھ طریقے جائز اور کچھ ناجائز ہیں، قرآن مجید اور احادیث میں ان تمام معاملات کے متعلق تفصیل سے ہدایات دی گئی ہیں۔

سود سورۃ بقرہ کی آیات ۲۷۵، ۲۷۶ اور ۲۷۸ میں سود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے صریح احکام دیئے ہیں۔

"جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی

چیز ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال رکھا ہے اور سود کو حرام، لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لئے وہ سود خواری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو کچھ اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا ٥ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو ونما دیتا ہے، اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل کو پسند نہیں کرتا ٥ اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو، لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو اصل لینے کے تم حقدار ہو نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے جنگ کی توضیح کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رض حسن بصری، ابن سیرین اور ربیع بن انس کہتے ہیں کہ جو شخص دارالاسلام میں سود کھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے اور اگر باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے، دوسرے فقہاء کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے جب تک وہ سود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے اسے نہ چھوڑا جائے۔"

"سود اخوت اور تعاون کی روح کو فنا کر دیتا ہے۔۔۔"

حقائق کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں (بغیر سود کے بھی) تجارت اپنی فطری روش پر چلتی رہی، پھلی اور پھولی اور اسلامی ممالک کی دور دراز حدود تک پھیل گئی، سرمایہ داری کی ساری خرابیوں کی جڑ یہی ہے اور یہ محنت کے اوپر کھلا ہوا ظلم ہے۔

احتکار HOARDING دولت کمانے کا موجودہ زمانہ میں ایک سودمند ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس کو مصنوعی قلت پیدا کر کے قیمتیں بڑھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لوگ اپنی ضروریات زندگی بہر حال خریدنے پر مجبور ہیں ان کی اس مجبوری سے سنگدل تاجر غلط اٹھاتے ہیں اور ایک روپیہ کی چیز سوا اور ڈیڑھ روپے میں بیچنے لگتے ہیں، اس کے حق میں استدلال کیا جاتا ہے کہ جس کا مال ہے اسے اختیار ہے کہ اپنا مال جب چاہے اور جس طرح چاہے بیچے، اسلام احتکار کو ناجائز ٹھہراتا ہے خاص طور پر غلّہ کی ذخیرہ اندوزی کو بہت بُرا سمجھتا ہے کیونکہ غلہ پر لوگوں

کی زندگیوں کا انحصار ہے۔
معمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص غلہ بھر کر رکھے گا یا روکے گا گنہگار ہوگا۔ (مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ)
حقیقت یہ ہے کہ احتکار صنعت وتجارت کی آزادی کا خون ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ احتکار کرنے والا دولت کے ذخیروں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور زائد سامان کو تلف کردیتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح ایک خاص نرخ کو لوگوں پر مسلط کرسکے۔ کسبِ مال کے اس ذریعہ کا سدباب کرنے کو اسلام نے اتنی اہمیت دی کہ احتکار کو دائرہ دین سے خارج کردینے والا جرم قرار دیا (نبی کریمؐ کی حدیث ہے) جس نے چالیس دن تک سامان غذا کو ذخیرہ کئے رکھا اس کو اللہ سے کوئی واسطہ نہیں نہ اللہ کو اس کی پروا۔ (مسند احمدؒ)

خرید و فروخت کے طریقے

کاشتکار اور باغبان جو غلہ اور ترکاریاں پیدا کرتے ہیں اپنے پورے نفع سے عموماً اس لئے محروم رہتے ہیں کہ وہ براہِ راست دکاندار کے ہاتھ اپنی چیزیں نہیں بیچ پاتے بلکہ بازار میں آنے سے پہلے ہی دلاّل وغیرہ خرید لیتے ہیں اور ان پر اپنا نفع لگاکر دکاندار کے ہاتھ بیچتے ہیں، نبی کریمؐ نے اس کی مخالفت کی ہے۔
”حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں حضورؐ نے سامان لانے والوں سے باہر جاکر ملنے اور بازار میں سامان پہنچنے سے پہلے سودا کرنے کی مخالفت فرمائی ہے“ (مسلم، کتاب البیوع)
موجودہ زمانے میں ان چیزوں کی خرید و فروخت کا بڑا کاروبار پھیلا ہوا ہے جو نہ ابھی پیدا ہوئیں اور نہ بیچنے والے کے قبضہ میں آئیں، اسلام اسے ناجائز ٹھہراتا ہے۔
”حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے پھلوں کو اس وقت بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک ان کی پختگی ظاہر نہ ہوجائے اور یہ ممانعت خریدنے والے اور بیچنے والے دونوں کیلئے ہے، ایک اور روایت میں ہے کہ کھجور جب تک سرخ وزرد نہ ہوجائے اور غلہ کی بالیں جب تک سفید نہ ہوجائیں اور آفت سے محفوظ نہ ہوجائیں اسوقت تک ان کو فروخت کیا جائے نہ خریدا جائے“ (مسلم، کتاب البیوع)
ابن عباسؓ کہتے ہیں، حضورؐ نے فرمایا ہے جس نے غلہ خرید کیا ہو جب تک اس پر

قبضہ نہ کرلے دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے، ابن عباس رضکہتے ہیں کہ میرے نزدیک ہر چیز کا کا حکم یہی ہے۔" (مسلم، کتاب البیوع)

چونکہ اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں اخوت و محبت کارفرما ہو اس لئے وہ ایسے کام ممنوع قرار دیتا ہے جو باہمی کدورت و منافرت کا باعث بنیں، یہ بات مندرجہ ذیل حدیث سے واضح ہوگی۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں حضورؐ نے فرمایا کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نہ اپنے بھائی (یعنی مسلمان) کی منگنی پر منگنی کرے (مگر اس وقت کر سکتا ہے) جب اس کو اجازت دے دی جائے۔" (مسلم کتاب البیوع)

خرید و فروخت کی وہ تمام قسمیں ناجائز ہیں جن میں فریقین میں سے کسی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو، بیچنے والے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے مال میں کوئی نقص ہو تو بیچتے وقت خریدار کو بتادے، جو دولت خرید و فروخت کے ممنوع طریقوں سے کمائی جائے گی وہ حرام کی کمائی ٹھہرے گی اسلامی نقطۂ نظر سے آج کل کی تجارت کے بہت سارے طریقے ناجائز ہیں۔

دولت خرچ کرنے پر پابندیاں

جو کام یا چیزیں شریعت کی رو سے حرام ہیں ان پر دولت صرف کرنا حرام ہے، مثلاً شراب، جوا، گھڑ دوڑ اور لاٹری وغیرہ، شراب اور جوئے کے بارے میں سورۂ مائدہ کی آیات ۹۰/۹۱/۹۲ میں اللہ تعالیٰ نے احکام نازل فرمائے ہیں۔

"اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو امید ہے کہ تم فلاح پاسکو گے ● شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے روک دے ● پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے ● اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آجاؤ۔"

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو حضور کی خدمت میں لایا گیا جس نے شراب پی تھی حضورؐ نے درخت کی دو چھڑیاں منگوائیں اور چالیس کے قریب اس کے لگوائیں۔ ایک اور روایت

میں ہے کہ حضورؐ نے شرابی کو پتلی لکڑی اور جوتی سے مارنے کی سزا دی (مسلم کتاب الحدود)

حضرت جابرؓ کہتے ہیں میں نے فتح مکہ کے سال حضورؐ کو یہ فرماتے سنا کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے شراب، مردار، سور اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام کر دیا ہے۔"

شکاری کتوں اور کھیتی اور مویشیوں کی حفاظت کرنے والے کتوں کے علاوہ کتے پالنا ممنوع ہے اہل مغرب کی ریس میں مسلمان بھی گھروں میں کتے رکھتے اور ان پر کافی صرف کرتے ہیں جو جائز نہیں۔

جوئے کی تمام شکلیں لاٹری، گھڑدوڑ، برج، پوکر، فلش، رمی، پانسے کے کھیل، شرط بدنا وغیرہ سب حرام ہیں، جُوا ہی کوروا اور پانڈو میں مہا بھارت کی جنگ کی بنا تھا، کتنے گھڑ دوڑ میں روپیہ لگا لگا کر مفلس ہو جاتے ہیں، کتنے لوگ خودکشی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

تصویروں، مورتیوں اور موسیقی پر روپیہ صرف کرنا جائز نہیں، ان چیزوں کے حرام ہونے کے بارے میں نبی کریمؐ کی متعدد حدیثیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں ان کو قیامت کے دن عذاب دیا جائیگا، ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اسے زندہ کرو۔" (بخاری کتاب اللباس)

حضرت جابرؓ کی بیان کی ہوئی حدیث پہلے درج کی جا چکی ہے جس میں شراب کے سوا اور مُورتیوں (بتوں) کی خرید و فروخت کو حرام بتایا گیا ہے، سورۂ لقمان کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب (لَهْوَ الْحَدِيثِ) خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے، اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے ایسے لوگوں کیلئے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔"

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے لہو الحدیث کا مطلب گانا بتایا ہے، تصویروں، مورتیوں اور موسیقی کے بارے میں اور احادیث بھی ہیں یہاں اختصار کی غرض سے اور حدیثیں درج نہیں کی گئیں۔

رشوت دینے پر روپیہ خرچ کرنا بھی جائز نہیں، سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۸ میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

"اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے

آگے ان کو اس غرض کیلئے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے "

اسراف اور عیش پرستی پر دولت صرف کرنا ممنوع ہے، فضول خرچی کو شیطانی فعل کہا گیا ہے۔
فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔
(سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲۷)

شریعت سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار دیتی ہے اور مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی یا کوئی اور زیور اور ریشم کے کپڑے پہننا بھی ناجائز نہیں، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ حضورؐ نے کہا جو کوئی چاندی یا سونے کے برتن میں کچھ پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بھرتا ہے (مسلم، کتاب اللباس)

حضرت برار بن عازبؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے سات باتوں سے منع کیا ہے جن میں ریشم کا لباس پہننا اور سونے کی انگوٹھی پہننے کی ممانعت بھی ہے (مسلم، کتاب اللباس)

اسی طرح اللہ اور اسکے رسول نے رزق اور دولت کے نامناسب صَرف کی تمام راہیں مسدود کردیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ مدیں بھی بتادیں جن پر خرچ کرنا واجب یا مستحب ہے اور جن پر آخرت میں بہت بڑا اجر ملے گا۔

از :- مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی

متعہ کی حرمت پر قرآنی دلائل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے سے قبل "دورِ جاہلیت" میں عفت وعصمت نام کی کوئی چیز نہ تھی، رشتۂ ازدواج کا جو بنیادی مقصد تھا وہ بھلایا جاچکا تھا، لوگوں کی نظروں سے شرم وحیا اٹھ چکی تھی، حالت یہاں تک پہونچ گئی کہ اپنی بیوی کو غیروں کی آغوش میں دینا کوئی معیوب نہ سمجھا جاتا تھا، اور عورتیں اپنے شوہر کو چھوڑ کر دوسروں سے تعلقات قائم کرتے ہوئے ذرا بھی عار محسوس نہ کرتیں، اس انسانیت سوز اور حمیت گداز رواج کا خاتمہ قرآن کریم کی زبانی ہمیشہ کیلئے کردیا گیا، ارشاد ہے

ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلاً (پ۱۵ بنی اسرائیل ع۴) — اور زنا کے قریب (بھی) نہ جاؤ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔

اس آیت پاک میں تنبیہ کی گئی کہ زنا کرنا تو بہت دور کی بات ہے، زنا کے قریب جانے کی بھی اجازت نہیں، یعنی ہر وہ قول وعمل بلکہ ہر وہ حرکت جو انسان کو زنا تک پہنچانے والی ہو، قرآن کی نظر میں بہت بڑا جرم اور بہت بڑی برائی ہے اسی لئے سب سے بچنے کا مطالبہ کیا گیا ہے حضرت امام فخر الدین رازی رح (۶۰۶ھ) نے زنا کے مفاسد کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

(۱) زنا سے نسب مختلط اور مشتبہ ہوجاتا ہے، آدمی یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ زانیہ کی یہ اولاد کس مرد سے ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بچے کی پرورش کا کوئی مرد بھی ذمہ دار نہیں بنتا (بچہ ضائع ہوجاتا ہے یا خود ماں ایسے بچے کو مار ڈالتی ہے اور پھینک دیتی ہے یا وہ غریب بچہ سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے نتیجتہً تباہ وبرباد ہوجاتا ہے) جو عالم کی ویرانی اور انقطاع نسل انسانی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

(۲) زانیہ پر دسترس شرعی قانون میں کسی کو حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ کسی کے ساتھ باضابطہ اس

نے نکاح نہیں کیا ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ اس عورت پر قبضہ کرنے کی سعی ہر شخص کی جانب سے ہوسکتی ہے اور وجہ ترجیح کسی کو بھی حاصل نہ ہوگی، پھر اس راہ میں تباہیوں اور بربادیوں کے جو طوفان اٹھتے رہتے ہیں، معاشقہ اور آوارگی کی تاریخوں میں اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

③ زناکار عورت کو زنا کی لت پڑجاتی ہے، طبع سلیم رکھنے والے مرد کو ایسی عورت سے گھن معلوم ہوتی ہے، پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی سلیم الطبع اس سے شادی تک کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرسکتا، محبت والفت تو خیر دور کی بات ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جو عورت زنا میں مشہور ہوجاتی ہے اس سے عموماً لوگ نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور سوسائٹی میں اسے حقیر اور ذلت آمیز نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

④ زنا کا جب دروازہ کھل گیا، کوئی مستقل قاعدہ وقانون باقی نہ رہا، تو پھر کسی خاص مرد کو کسی خاص عورت سے کوئی خاص لگاؤ باقی نہ رہے گا، جس کو جہاں موقع مل گیا، اور جو کچھ کر گزرنا ہے کر گذرتا ہے، اور یہی حال حیوانات کا ہے، پھر انسان وحیوان میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔

⑤ عورت سے صرف یہی مقصد نہیں کہ اس کے پاس پہونچ کر جنسی تقاضے پورے کئے جائیں بلکہ مقصد یہ بھی ہے کہ دوجان مل کر ایک دوسرے کے رفیق وشریک ہوں، گھر کے کاموں میں بھی، کھانے پینے میں بھی، بچوں کی تعلیم وتربیت میں بھی، اور زندگی کی دوسری ضروریات میں بھی، پھر غم میں بھی اور خوشی میں بھی، تنگ حالی وخوش حالی میں بھی، اور یہ ساری باتیں اس وقت تک قطعاً پیدا نہیں ہوسکتیں جب تک عورت کسی ایک کی جائز طریقہ پر ہوکر نہ رہے، اور اس کی شکل یہی ہے کہ زنا کو بالکلیہ حرام قرار دے دیا جائے اور نکاح کے قانونی دائرہ میں عورت ومرد کے تعلقات کو محدود کیا جائے۔

⑥ ہم بستری پردہ کی بات ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کا تذکرہ اشارۃً وکنایۃً کیا جاتا ہے اور کوئی اس کام کو کرتا ہے تو پردہ کی اوٹ میں کرتا ہے کہ کسی کی نگاہ نہ پڑنے پائے بس معلوم ہوا کہ اس کو کم سے کم کرنا قرین عقل وقیاس ہے اور اس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ جائز طور پر ایک عورت ایک مرد کی ہوکر رہے ورنہ پھر یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔

یہ چھ خرابیاں تو وہ ہیں جو بالکل عیاں ہیں، ورنہ زنا کے مفاسد اور خرابیاں بہت سی ہیں
(تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۳۹۴ بحوالہ اسلام کا نظام عفت)

حضرت امام رازیؒ کی اس تحقیق و تفصیل سے معلوم ہوجاتا ہے کہ زنا کے مفاسد اور اس کی برائیاں اس قدر اظہر من الشمس ہیں کہ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کرسکتا، اب غور طلب بات یہ ہے کہ متعہ کے عام کردینے یا اسے قانونی اجازت دینے میں درحقیقت زنا ہی کا دروازہ کھول دینا ہے اسلئے کہ متعہ میں وہی کچھ ہوتا ہے جو زنا میں پایا جاتا ہے اور زنا کے مفاسد اور خرابیاں ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، اس آیت کریمہ نے متعہ کی حرمت کو واضح کردیا ہے کہ اسلام میں اس کی قطعًا اجازت نہیں ہے، چہ جائے کہ اسے حکم خداوندی قرار دیا جائے۔

(۲) ارشاد ربّانی ہے۔

والذین هم لفروجهم حفظون ٥ الا علی ازواجهم اوما ملکت ایمانهم فانهم غیر ملومین ٥ فمن ابتغی ورا ء ذلک فاولئک هم العدون (پ۱۸ المؤمنون ع۱)

(اور فلاح پانے والے وہ لوگ ہیں جو) اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں مگر اپنی عورتوں پر یا مملوکہ باندیوں پر، سو ان پر کچھ الزام نہیں پھر جو کوئی اسکے علاوہ ڈھونڈے وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

ان آیات پاک میں اس بات کا بیان ہے کہ وہ مؤمن آخرت میں فلاح پانے والے ہیں جنمیں یہ اوصاف ہوں، ان میں سے ایک اپنی عصمت کی حفاظت کرنی ہے، اپنی بیوی اور باندی کے علاوہ اس بات کی ہرگز اجازت نہیں ہے کہ کسی غیر محرم عورت کے ساتھ تعلق رکھے، یہ زنا کے حکم میں ہے، اور ایسے لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہیں، جس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام میں متعہ کی اجازت نہیں ہے، اگر اجازت ہوتی تو بیوی، باندی کے علاوہ اس کی تصریح کی جاتی، لیکن یہاں ان دونوں کو چھوڑ کر تیسری قسم کی کوئی تصریح نہیں بلکہ تیسری قسم کی تردید کی گئی ہے، اور ایسے لوگوں کو حد سے تجاوز کرنے والے بتایا گیا ہے۔

(۳) ارشاد ربّانی ہے۔

ولیستعفف الذین لایجدون نکاحًا حتی یغنیهم الله من فضله الایة (پ۱۸ النور ع۴)

اور اپنے آپ کو تھامتے رہیں، جن کو نکاح کا سامان نہیں ملتا جب تک کہ مقدور دے اللہ ان کو اپنے فضل سے۔

اس آیت شریفہ میں بتلایا گیا ہے کہ جب انسان شادی نہ کرسکے اور مجبور ہو اور مالی حالت خراب ہونے کے باعث بیوی نہ مل رہی ہو تو اسے ضبط نفس اور پاکدامنی کا دامن تھامنا چاہئے اور جب وسعت ہوجائے تو پھر وہ شادی کرے، لیکن ان دنوں میں عفت و پاکدامنی کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے مجبور لوگوں کو حکم فرمایا ہے کہ روزہ رکھا کرو کیونکہ اس کے ذریعہ خواہشات اور شہوات کا زور ختم ہوجائے گا اور ایک انسان غلط قدم اٹھانے سے بچ جائیگا، کتب احادیث میں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں جن میں بعض صحابہ کرام رض مجبوریوں کی بنا پر شادی نہ کرسکے، حالانکہ وہ نکاح کرنا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو کسی اور طریقہ کو اپنانے کے بجائے روزہ رکھنے کا حکم فرمایا تاکہ شہوات کی قوت مغلوب ہوجائے، چنانچہ ان حضرات نے اس پر عمل کیا اور اپنے آپ کو گناہ سے بچایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء (متفق علیہ مشکوۃ ص۲۶۷ صحیح بخاری ج ۲ ص۷۵۸)

اے نوجوانو تم میں سے جو شادی پر قدرت رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ شادی کرلے کہ یہ شادی نگاہ کو نیچی کردیتی ہے اور اس کے ذریعہ شرمگاہ کی حفاظت ہوجاتی ہے اور جو شخص شادی پر قدرت نہیں رکھتا اس کو لازم ہے کہ روزہ رکھے کہ (روزہ) شہوت کو توڑتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کو نکاح کی ترغیب فرمائی کہ نکاح کے بعد عفت و پاکدامنی نصیب ہوگی، نظر کی حفاظت ہوگی، اور اگر کسی وجہ سے شادی نہ ہوپائے اور شہوت میں کمی نہ آئے تو پھر روزہ رکھنے کا حکم فرمایا کہ اس کے ذریعہ شہوت کا علاج ہوگا[1] اور عفت و عصمت پر حرف نہ آئیگا، جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں متعہ کے حلال ہونے کا ذرا بھی تصور ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ضرور تذکرہ فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ اگر کسی وجہ سے شادی نہ ہوسکے تو متعہ ہی کرلیا کرو، لیکن آپ نے ایسا نہیں فرمایا بلکہ اس کا علاج یہ بتایا کہ مسلسل روزہ رکھو، سو قرآن و حدیث میں اس کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ اس کی صریح تردید ہے۔

لے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اس طرح ارشاد فرماتے ہیں (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(۵) اللہ تعالیٰ محرمات کے بیان کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

و احل لکم ماوراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین فما استمتعتم بہ منھن فاٰتوھن اجورھن فریضۃ ولا جناح علیکم فیما تراضیتم بہ من بعد الفریضۃ۔

(پ۵، النساء ع ۴)

اور حلال ہیں تم کو سب عورتیں ان کے سوا کہ تم انھیں اپنے اموال سے تلاش کرو اور قید نکاح میں رکھنے والے ہو نہ کہ مستی نکالنے کو پس جن عورتوں سے تم نے فائدہ اٹھایا تو ان کو ان کے حق دو جو مقرر ہوئے ہیں اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ مقرر کئے ہوئے مہر کے بعد اور مہر انھیں دو۔

اس آیت پاک میں اس امر کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ جن عورتوں سے نکاح حلال ہے انھیں چند شرطوں کے بعد اپنے نکاح میں لاسکتے ہو یعنی ان کے ساتھ شادی جائز ہے ان شرائط میں سے خاص طور پر محصنین غیر مسافحین کے الفاظ متعہ کی حرمت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں

محصنین :۔ یعنی جن عورتوں سے تم نکاح کرو تو اس کا مقصد محض وقتی اور عارضی نہ ہو بلکہ دائمی ہو ایسا نہ ہو کہ چند دن کی عیش کی نیت سے اس کے ساتھ شادی رچالو، پھر چھوڑ دو، یہ طریقہ غلط ہے، جب تم نے ان کے ساتھ نکاح کیا ہے تو شرط یہ ہے کہ ان کو ہمیشہ بیوی ہی بنا کر

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) حدیث یہ ہے کہ فمن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء ، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت سے روزے رکھنا اور مسلسل روزے رکھنا ایسے حال میں مفید ہوتا ہے ، نہ کہ صرف گاہ گاہ دو چار روزے رکھ لینا ، علیہ لزوم پر دال ہے ، اور لزوم کے دو درجے ہوتے ہیں ایک اعتقادی ایک عملی یہاں اعتقادی درجہ تو مراد نہیں کیونکہ یہ روزہ فرض نہیں بلکہ عملی درجہ مراد ہے اور وہ ہوتا ہے تکرار سے جبکہ بار بار عمل کیا جائے اور عادۃً لازم کر لیا جائے ، اور میں نے کہا کہ دیکھو اس کی ایک ظاہر تائید ہے رمضان میں مسلسل ایک ماہ تک روزے رکھے جاتے ہیں اور تجربہ ہے کہ شروع میں تو قوت بہیمیہ شکستہ نہیں ہوتی بلکہ رطوبات فضلیہ کے ساختہ ہوجانے کی وجہ سے اس میں قوت اور انتعاش ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ ضعف بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ اخیر میں پورا ضعف ہوتا ہے جس سے قوت بہیمیہ شکستہ ہوجاتی ہے کیونکہ اس وقت روزوں کی کثرت متحقق ہوجاتی ہے۔

(الافاضات جلد ۹ ص۱۹۳)

رکھو (یہ الگ بات ہے کہ کسی وجہ سے آپس میں نااتفاقی ہوجائے اور طلاق کی نوبت آجائے لیکن تم پہلے سے ایسی نیت نہ کرو)

غیر مسافحین:۔ تمہارا اس نکاح سے مقصد صرف مستی نکالنا نہ ہو یعنی محض شہوت اور خواہش پوری کرنے کی نیت نہ ہو جیسا کہ زنا میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد فما استمتعتم فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ جن عورتوں سے تم نے ان شرطوں کے ساتھ نکاح کرکے فائدہ اٹھالیا ہے (یعنی جماع اور صحبت کرلی ہے) تو ان عورتوں کا مہر جو بھی مقرر ہوا ہو وہ ان کو دیدو یعنی مہر ادا کرنا ہوگا، اگر صحبت سے پہلے طلاق کی نوبت آجائے تو مرد کے ذمہ نصف مہر اور خلوت کے بعد یہ صورت ہو تو پھر پورا مہر ادا کرنا ہوگا ——— ——— ٹال مٹول کی کوشش نہ کرو، اور اس باب میں تم پر کچھ مواخذہ نہ ہوگا کہ مقررہ مہر کے بعد تم آپس میں مہر کی مقدار گھٹاؤ یا بڑھادو یعنی عورت اپنی خوشی سے مہر نہ لے یا کم لے یا مرد اپنی خوشی سے مہر زیادہ دے تو اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔

قرآن پاک کی اس آیت میں شیعی متعہ کا بیان سرے سے موجود ہی نہیں، لیکن شیعہ اثنا عشریہ نے، م، ت، ع، کو دیکھ کر اس سے متعہ کے جائز ہونے اور اپنے اصطلاحی متعہ کے ثبوت کا فتویٰ دے دیا حالانکہ جس کی قرآن کریم کے سیاق وسباق پر نظر ہوگی وہ ہرگز اس آیت سے متعہ کے جواز کی دلیل نہ دے گا، اسلئے کہ؛

اس آیت میں محصنین غیر مسافحین کے الفاظ متعہ اصطلاحی کی جڑ کاٹ رہے ہیں کیونکہ متعہ میں عورتوں کو دائمی عورت کا درجہ نہیں ملتا، محض وقتی اور عارضی ہوتا ہے، اسی طرح متعہ والی عورت کو کوئی بیوی نہیں کہتا، نہ اسکے نان نفقے کی فکر ہوتی ہے اور نہ لباس ورہائش کا نہ بچے کی، بس صرف شہوت پوری کرنا مقصود ہے، اور غیر مسافحین کا جملہ اس کی پوری تردید کررہا ہے کہ اس کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں ہے۔
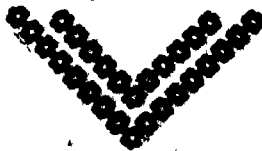
الحمد للہ الذی ینجی الذین اتقوا بمفازتہم لا یمسہم السوء ولا ہم یحزنون والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ صلوٰۃ تنجینا بہا من جمیع الاھوال والآفات وتقضی لنا بہا جمیع الحاجات، امابعد۔

اعیانِ ملت:۔ اس عظیم الشان اجلاس سے متعلق جو امتیاز مجھے عطا کیا گیا ہے اس کو میں اپنے واسطے دنیا و آخرت میں باعث شرف سمجھتا ہوں اور اپنی اس خوش بختی پر نازاں ہوں کہ علماء اعلام و اعیانِ ملت کی نظر انتخاب مجھ جیسے بے بضاعت اور تہی دامن پر پڑی یہ میرے لئے یقیناً نیک فال ہے اور میں شہداء اللہ فی الارض کے انتخاب کو اپنے لئے ذریعہ سعادت سمجھتا ہوں۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل ٭ نسیم صبح تیری مہربانی۔

محبانِ ملک و ملت:۔ جمعیۃ علماء ہند ہی وہ تنظیم ہے جو ملک کے تحفظ قومی اتحاد کمزور و مظلوم انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد کی ایک تاریخ رکھتی ہے، اس نے ملک وملت کے مسائل و مشکلات کی تشخیص اور اس کے ازالہ کے لئے تجاویز پر غور و فکر میں کبھی بھی مساہلت اور سستی سے کام نہیں لیا ہے اور قومی اتحاد و یگانگت کو توڑنے یا نقصان پہنچانے والی ہر طاقت کا بر وقت مقابلہ کیا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند ہی وہ تنظیم ہے جس نے ملک کے جمہوری نظام اور سیکولر کردار کے تحفظ کے لئے بار بار عوام و خواص کو آواز دی ہے اور انھیں ادائے گی فرض کے واسطے جھنجوڑا ہے، آج کا ہمارا یہ عظیم الشان اجتماع بھی اسی احساس فرض کی ایک علامت ہے

رہبران قوم ! یہ ایک انمٹ حقیقت ہے کہ آزادئ وطن کی تحریک میں ہندو اور مسلمانوں نے کندھے سے کندھا ملا کر پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ برطانوی سامراج کے خلاف جد وجہد کی اور ہر قسم کی قربانیاں دیں، لیکن ہمیں اس تاریخی واقعہ سے بھی چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ ہماری قومی سیاست کے ہر دور میں ایک ایسے طبقے کا وجود بھی پایا جاتا رہا ہے جو قومی اتحاد و یک جہتی کے مقابلہ میں غلط مذہبی احیاء پرستی اور فرقہ واریت کو ترجیح دیتا رہا ہے، جس کے غور وفکر اور سوچ کا دائرہ ایک خاص فرقہ کے مفاد کی حد تک محدود رہا ہے لیکن گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، مولانا ابو الکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی وغیرہ قوم پرور لیڈروں کے انصاف پسند رویہ کی بنا پر احیاء پرستوں کو ابھرنے کا موقع نہ مل سکا، گاندھی جی کے قتل کے بعد اس طبقے نے ہاتھ پیر پھیلانا شروع کر دیا اور آر ایس ایس کی رہنمائی میں ہماری قومی زندگی میں تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا زہر گھولنے کا کام منظم طریقے پر شروع کر دیا گیا، بھارتیہ جنتا پارٹی، شیوسینا، بجرنگ دل، وشو ہندو پریشد وغیرہ فاشسٹ نظریات کی حامل تنظیمیں دراصل اسی مسلسل عمل کی پیداوار ہیں، فاشزم تحریکوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ درج ذیل حربے استعمال کرتی ہیں۔

(۱) کسی ایک فرقہ کے خلاف ملک میں انتہائی نفرت پیدا کر دینا

(۲) افہام وتفہیم کے بجائے جارحیت اور تشدد کے ذریعہ اندھی اطاعت پر مجبور کرنا۔

(۳) اکثریتی فرقہ کو قوم کے ہم معنی ٹھہرا کر اس کی مصنوعی اور غیر واقعی مظلومیت کا اظہار اور اس فرضی مظلومیت کو دور کرنے کے نام جارحانہ قوم پرستی کو فروغ دینا۔

آر ایس ایس پریوار کی عملی زندگی کے حقیقت پسندانہ تجزیہ سے صاف ظاہر ہے کہ فاشسٹ پریوار کے تمام تر حرکت وعمل کا محور یہی مذکورہ حربے ہیں اور جس کا نشانہ ملک کی دیگر اقلیتوں کے علاوہ بطور خاص مسلمان ہیں، یہ ایک بہت بڑا قومی المیہ ہے کہ قومی حکومتیں اور سرکاری مشینری ان فاشسٹ

پارٹیوں کے پروپیگنڈوں اور مداخلت سے اس قدر متاثر اور مرعوب ہیں کہ جمہوریت کی بقاء، سیکولرزم کے تحفظ اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کی بجائے وہ آر ایس ایس پریوار کے نظریات اور پروگراموں پر عمل کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں، قومی حکومتوں اور سیکولر پارٹیوں کی اس پسپائی کی وجہ سے ملک میں فرقہ واریت، نفرت فسادات، تشدد، انارکی اور لاقانونیت بڑھ رہی ہے۔

سامعین عالی قدر:۔ تاریخ تمدن ومعاشرت اس بات پر شاہد ہے کہ تاریخ کے ہر عہد میں انسانی افراد کے سیاسی اتحاد کی بنیاد کچھ لازمی حقوق کی حفاظت وصیانت رہی ہے انھیں حقوق کے تحفظ وانتظام کو علمی اصطلاح میں سیاست وحکومت کے الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے تمدن کی ارتقار کے ساتھ حقوق کی نوعیت وتعداد میں تبدیلی واضافہ ہوتا رہا ہے، لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ حکومت کی ہر شکل ونوع خواہ وہ شخصی سلطنت ہو یا جمہوری ریاست اپنے زیر حکومت افراد کے چند بنیادی حقوق تسلیم کرتی رہی ہے۔

آج کی متمدن ومہذب دنیا میں بین الاقوامی سطح پر جن حقوق کو لازمی طور پر تسلیم کیا گیا ہے ان میں عدل وانصاف کا حصول جان ومال عزت وآبرو کی حفاظت، مذہبی وتہذیبی تحفظ، ذرائع معیشت وسیاست میں مساوات، یکساں شہری حقوق وغیرہ سرفہرست ہیں، کس قدر شرم وافسوس کا مقام ہے کہ فرقہ پرست پارٹیوں کی بے جا مداخلت اور جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوبیت کی بنا پر ملک کی اقلیتی اکائیوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ ان بنیادی حقوق کے معاملے میں امتیاز برتا جا رہا ہے اور ہماری قومی حکومتیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں "من وتو" کے غیر منصفانہ اصول پر کاربند ہیں چنانچہ آزادی کے اس ۴۹ سالہ دور میں تقریباً ۱۵-۲۰ ہزار چھوٹے بڑے فسادات ہو چکے ہیں اور ادھر چند سالوں سے تو یہ ہنگامے یک طرفہ مسلمانوں پر حملہ کی شکل میں ہونے لگے ہیں، ان خونی ہنگاموں میں ہزارہا ہزار انسانوں کی جانیں تلف کی گئیں اور اربوں مالیت کی جائیدادیں تباہ کی گئی ہیں، درندگی وسفاکی کا یہ مظاہرہ کس قدر بھیانک اور لرزہ خیز ہے کہ معصوم بچوں اور بے قصور عورتوں کو زندہ بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جاتا ہے مگر ہماری قومی حکومتیں آگ وخون کے اس طوفان کے سدباب میں قطعی طور پر ناکام ہیں، حکومتوں کی اس خود اختیاری ناکامی کو دیکھ کر اقلیتوں اور بطور خاص مسلمانوں میں اپنے جان ومال وغیرہ کی جانب سے بے اعتمادی اور عدم تحفظ کا احساس بڑھتا جارہا ہے اور یہ خطرہ پیدا ہونے لگا ہے کہ کہیں وہ محرومی اور مایوسی میں مبتلا ہو کر جذباتیت

کا شکار نہ ہو جائیں۔ یہ

یہ آگ سلگتی ہے جتنی اتنا ہی دھواں کم دیتی ہے
احساس ستم بڑھ جاتا ہے تو شور و فغاں کم ہوتا ہے

معاشی حقوق میں امتیاز

معاشی حقوق کے سلسلے میں بھی مذہب و نسل کی بنیاد پر امتیازی برتاؤ ایک عمومی رویہ بن چکا ہے، اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی معاشی زبوں حالی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ درج فہرست اقوام اس معاملہ میں اس سے بدرجہا بہتر ہیں، سرکاری روزگار اور ملازمتوں کی صورت حال جو یکم جنوری ۱۹۸۰ء تک تھی اس کا ایک سرسری جائزہ ملاحظہ کیجئے جس سے بڑی حد تک پتہ لگ جائیگا کہ مسلمانوں کو ہماری قومی حکومتیں کہاں پہونچانا چاہتی ہیں۔

	روزگار	مسلم نمائندگی	درج فہرست اقوام کی نمائندگی
۱:	آئی اے ایس	۳٫۲۷ فیصد	۹٫۹ فیصد
۲:	آئی پی ایس	۲٫۷ فیصد	۹٫۸ "
۳:	آئی ایف ایس	۳٫۳۷ "	۱۶٫۴ "
۴:	سنٹرل سب آرڈی نیٹ سروسز	۱٫۵۶ "	۱۳٫۱ "
۵:	مرکزی حکومت کے دفاتر میں	۴٫۰ "	۱۴٫۲۶ "
۶:	ریاستی حکومت کے دفاتر میں مجموعی	۶ ۶٫۱ "	۱۴٫۴۶ "
۷:	سرکاری زمرہ کے کارخانوں میں	۱۰٫۵۸ "	۱۸٫۱۵ "

اسی تفصیل پر دیگر سرکاری زمرہ کے روزگاروں اور ملازمتوں کا قیاس کر لیجئے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

سیاسی حالت

سیاسی حالت بھی افسوسناک حد تک ابتر ہے، مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے پارلیمنٹ

میں ان کی نمائندگی ۴، ۵، ہونی چاہیئے، جس کا تصور بھی موجودہ روش کو دیکھتے ہوئے ایک فعل عبث سے زیادہ نہیں ہے، گرام پنچایتوں کی سطح پر تو حالت اور بھی خراب ہے، ایک فیصد سے بھی کم مسلم نمائندگی رہ گئی ہے، ضلع پریشد، میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کا بھی یہی حال ہے۔

مذہبی ولسانی حقوق

اس انتہائی جذباتی مسئلہ پر ہمیں کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، شہید بابری مسجد اور سخت جان اردو کی داستان الم ملک کی فضاؤں میں خوب گونج رہی ہے۔

شہری حقوق

یکساں شہری حقوق کے سلسلے میں ہماری سرکاریں فاشسٹ طاقتوں کے جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈوں سے متأثر ہوکر اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ سردمہری بے حسی، اور خودغرضی کا سلوک کرتی آرہی ہے۔

یکساں شہری حقوق

قانون وانصاف، آئین ودستور اور اخلاقی وانسانی تقاضہ تو یہ ہے کہ مذہب وملت، رنگ و نسل اور تہذیبی ولسانی دائروں سے قطع نظر بغیر کسی امتیاز وتفریق کے ہر شہری کو یکساں طور پر ہر قسم کے شہری حقوق حاصل ہوں، شہریوں پر ان حقوق کے استعمال کرنے میں کسی طرح کی کوئی قدغن لگائی جائے نہ ان کے خلاف کوئی سازش رچی جائے اور نہ اس معاملہ میں ان پر کسی طرح کا ظلم وجبر روا رکھا جائے مگر صورت حال یہ ہے کہ فرضی اور موہوم خدشات کو حقیقت ثابتہ بتا کر ملک کی اقلیتوں، خصوصاً مسلمانوں سے نہ صرف ان کے حق انتخاب اور ووٹ دینے کے بنیادی اختیار کو سلب کرلینے بلکہ سرے سے انھیں حق شہریت سے محروم کردینے کے لئے طرح طرح کے سیاسی اور غیرسیاسی ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ ہماری قومی سیکولر حکومتوں کے دیدہ ودانستہ بلکہ اشتراک وعمل سے ہورہا ہے، اس سلسلہ میں صوبہ آسام کی اقلیتیں بطور خاص ناانصافیوں اور مظالم

کا شکار ہیں، چونکہ ہمارے اس عظیم الشان اجتماع اور اس تاریخی کانفرنس کا اصل اور بنیادی موضوع مسئلہ حق شہریت اور حق رائے دہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو کی جائے۔

مسئلہ آسام

اس بات سے کون ناواقف ہے کہ آسام اور بنگلہ دیش کی سرحد قدرتی نہیں بلکہ وضعی ہے دونوں کے درمیان حد فاصل کے طور پر نہ دریا ہے نہ پہاڑ نہ جنگلات، اس لئے جانبین سے آمد و رفت میں قطعی کوئی دشواری نہیں ہے، آسام سرحد کی یہ وہ غیر اختیاری کمزوری ہے جس سے تعصب پسند و فرقہ پرست ذہنوں کو بات کا بتنگڑ بنانے کا بہانہ مل جاتا ہے، علاوہ ازیں ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے دوران میں یہاں انتہائی خوں ریز قسم کے متعدد فسادات ہوئے جس کے صدمہ کی تاب نہ لاکر لگ بھگ ڈھائی لاکھ مسلمان اپنی جان بچانے کی غرض سے اپنی موروثی آبادیوں سے بھاگ کر سرحد پار چلے گئے، اس بھگدڑ کی وجہ سے گاؤں کے گاؤں مسلم آبادی سے خالی ہو گئے، اتفاق سے اسی زمانہ میں آسام کی مردم شماری ہو رہی تھی، ظاہر ہے کہ اس مردم شماری میں ترک وطن کرنے والے نہ آسکے، نہرو لیاقت معاہدہ کے بعد جب حالات میں کچھ سدھار پیدا ہوا تو ان میں سے اکثر لوگ پھر اپنی اپنی بستیوں میں واپس لوٹ آئے، ۱۹۶۱ء میں جب پھر مردم شماری ہوئی تو لازمی طور پر مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا، یہ اضافہ درحقیقت ان ہی لوگوں کی وجہ سے ہوا تھا جو ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے وقت فسادات کے خوف سے نقل مکانی کر کے سرحد پار چلے گئے تھے اور حالات کے معمول پر آجانے کے بعد پھر اپنے وطن میں واپس آگئے تھے، لیکن اس اضافہ کو بہانہ بنا کر مسلمانوں کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا گیا اور یہ بات اڑادی گئی کہ یہاں گیارہ لاکھ پاکستانی آبسے ہیں اس افواہ کا اڑنا تھا کہ ہمارے ملک کی فرض شناس پولیس حرکت میں آگئی، رات کی تاریکی میں آکر پولیس گاؤں کا محاصرہ کر لیتی، صبح کے وقت جب لوگ بیدار ہوتے تو انھیں پتہ چلتا کہ وہ محصور ہیں، سارے دن ان کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادوں کو کوڑیوں کے داموں نیلام کیا جاتا پھر ان خانماں برباد وں کو پولیس ٹرکوں میں ٹھونس کر سرحد پار لے جا کر مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش میں دھکیل آتی، پولیس کے اس غیر قانونی وحشیانہ جبر و تشدد سے مسلمان چیخ اٹھے، ہر طرف ہاہا کار مچ گئی، یہ مصیبت کے مارے دردر

ٹھوکریں کھاتے ہر ایک کو فریاد رسی کے لئے آواز دیتے مگر ان کی ساری چیخ و پکار اور آہ و فغاں صدا بصحرا ہو گئیں، ان کی پریشان حالی اور درماندگی پر کسی کو بھی رحم نہیں آیا، حتی کہ کانگریس حکومت جو اپنے اونچے دعووں، مضبوط نظام اور وسیع تر اختیارات کے باوجود ان مصیبت زدوں کی کوئی مدد نہ کرسکی اور بجائے اس کے کہ وہ ان بے سہاروں کے لئے سہارا بنتی اور گرتے ہوؤں کو اٹھاتی وہ خود پھسل گئی، بلند بانگ دعوی کرنے والی سیاسی وغیر سیاسی پارٹیوں سے مایوس و نامراد ہو جانے کے بعد یہ مظلوم ایک وفد کی شکل میں جمعیۃ علماء ہند کے پاس پہونچے، یہ وہ زمانہ تھا کہ جمعیۃ کے روح رواں، فعال و متحرک قائد حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی بستر علالت پر تھے، اور اس قدر نڈھال و ناتواں ہو چکے تھے کہ جمعیۃ کی مجلسوں اور میٹنگوں میں بھی شرکت سے قاصر تھے، بہر حال جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ نے آسام کے اس مظلوم وفد کی داستان الم سنکر صورت حال کی مزید تحقیق کے لئے ایک سہ رکنی وفد جو راقم الحروف (یعنی اسعد) مولانا وحید الدین قاسمی اور جناب محب الحق ایڈوکیٹ ایم پی پر مشتمل تھا، آسام بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

عاملہ کے فیصلہ کے مطابق یہ وفد آسام کے لئے روانہ ہو گیا، آسام کے مسلمانوں پر خوف وہراس کا اس قدر غلبہ تھا کہ وفد جب ڈھبری آسام کے ہوائی اڈہ پر اترا تو اسے خوش آمدید کہنے والا کوئی نہ تھا، تن تنہا جمعیۃ علماء آسام کے سکریٹری جناب عبد الباری ایڈوکیٹ اپنی گاڑی لئے نظر آئے خدا خدا کر کے یہ وفد شہر پہونچا تو اسے اپنے یہاں ٹھہرانے کی کوئی ہمت نہ کرسکا، مجبوراً وفد نے سرکٹ ہاؤس میں قیام کیا، وفد نے انتہائی مشقت جھیل کر تین دن کے اندر ڈھبری، ماربیٹا، منگل دوئی تیز پور، نارتھ لکھیم پور، ڈبروگڈھ، جورہاٹ اور سب ساگر، منگاؤں اور گوہاٹی وغیرہ ۲۰ مقامات کا دورہ کیا، لوگوں سے مل کر حالات و واقعات معلوم کئے اور پوری تحقیق کے ساتھ اعداد و شمار اکٹھا کئے تحقیقات کا کام مکمل کر لینے کے بعد میں نے یہ تجویز رکھی کہ ایک جلسہ عام کیا جائے تاکہ خوفزدہ مظلوموں کی کچھ ڈھارس بندھے اور ان کے اندر حالات سے نپٹنے کا عزم و حوصلہ ہو لیکن ان پر اس قدر خوف وہراس طاری تھا کہ وہ جلسۂ عام کا انتظام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو میں نے کہا کہ اسی سرکٹ ہاؤس کے لان میں لاؤڈ اسپیکر لگا کر ہم تقریر کریں گے، چنانچہ اسی لان میں جلسہ ہوا جس میں میں نے اور وفد کے دیگر ارکان نے صراحت کے ساتھ یہ بات کہی کہ ہم کسی غیر ملکی کی

حمایت نہیں کرتے اور نہ ان کے یہاں بسنے کی ہمت افزائی کرتے ہیں، آئین ہند نے پوری وضاحت کے ساتھ ہندوستانی اور ہندوستانیت کی تعریف کردی ہے، اس لئے اس تعریف کے تحت کسی ہندوستانی پر غیر ملکی ہونے کا بیجا الزام لگاکر اس پر ظلم وتشدد کے پہاڑ توڑنا ان کے اموال اور جائیدادوں کو تباہ و برباد کرکے اسے ملک بدر کردینا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، آپ حضرات اس خلاف قانون رویہ کی ہر ممکن طریقہ سے مزاحمت کریں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

اس کے بعد یہ وفد شیلانگ پہونچا اس وقت فخرالدین علی احمد صاحب مرحوم (سابق صدر جمہوریہ) آسام کے آنارنی جنرل تھے، انھوں نے وفد کی بھرپور مدد کی، وفد نے اس وقت کے وزیراعلیٰ چالیہا صاحب، چیف سکریٹری، ہوم سکریٹری وزراء اور دیگر اعلیٰ افسران سے ملاقات کی اور انھیں صحیح صورت حال سے آگاہ کیا، لیکن اس زمانہ کے وزیر داخلہ لال بہادر شاستری غلط اطلاعات کی بنیاد پر ایک غیر ذمہ دارانہ بیان دے چکے تھے اس لئے ریاستی حکومت بے بس ہوکر رہ گئی اور کچھ بھی نہ کرسکی۔

بدقسمتی سے اسی دوران ہند چین جنگ چھڑ گئی جس کی بنا پر کارروائی آگے نہ بڑھ سکی جس سے معلوم ہوا کہ مذہب وزبان کی بنیاد پر ظلم وستم کا سلسلہ بدستور جاری ہے اور مسلمانوں کو مختلف ذرائع سے ملک چھوڑنے پر مجبور کیا جارہا ہے، اس انتہائی تشویشناک صورت حال کے پیش نظر پرائم منسٹر اور ہوم منسٹر کو علی الترتیب میمورنڈم دیا گیا مگر اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آیا تو میں نے ایک پریس کانفرنس بلائی اور ان ساری خلاف قانون وانصاف کارروائیوں کے خلاف بیان دیا، اس بیان کو بین الاقوامی سطح پر اہمیت دی گئی، جس پر پاکستانی ہائی کمشنر نے خاص طور پر نوٹس لیا اور میرے خلاف فائل تیار کرکے وزارت خارجہ کو بھیجی جس سے متاثر ہوکر اس وقت کے وزیر خارجہ راجہ دنیش سنگھ نے حافظ محمد ابراہیم مرحوم سے میری شکایت کی، اس کے بعد جنرل شاہنواز سے بھی شکایت کی، جنرل شاہنواز نے مجھ سے رابطہ قائم کرکے صورت حال بیان کی تو میں نے ان کے سامنے اپنے دورۂ آسام کی رپورٹ پیش کردی اور انھیں بتایا کہ پریس کانفرنس میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اس سے بہت کم ہے جو آسام میں ہورہا ہے، وہاں نہ تو کوئی قانون ہے نہ انصاف، اس کے بعد براہ راست دنیش سنگھ صاحب سے ملاقات ہوئی اور مسئلہ آسام پر ان سے کھل کر بات ہوئی۔

علاوہ ازیں حکومت کے دیگر ذمہ داران سے بھی متعدد بار گفت وشنید ہوئی، جس میں فخر الدین علی احمد مرحوم بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں ٹریبونل کا قیام عمل میں آیا اور طے پایا کہ این آر سی کی ایک نقل جمعیۃ علماء کو دی جائے اور ایک کانگریس کو اور اس میں جن لوگوں کا نام پایا جائے اس کو ہندوستانی مانا جائے، بصورت دیگر دوسرے ثبوت طلب کئے جائیں، بالآخر ۱۹۶۹ء میں آسام کے وزیر اعلیٰ چالیہا صاحب نے آسام اسمبلی میں اعلان کیا کہ ریاست میں اب کوئی غیر ملکی نہیں ہے۔ اس اعلان کی ایک تحریری نقل جمعیۃ علماء کو بھی ارسال کی گئی، چنانچہ اس اعلان کے بعد غیر ملکیوں کے تصفیہ کے لئے جو ٹریبونل قائم کئے گئے تھے وہ ختم کر دیئے گئے، اس طرح خدا خدا کر کے ظلم وستم کا سلسلہ بند ہوا اور لوگوں نے چین وسکون کی سانس لی، لیکن فرقہ پرست تنظیموں اور حکومت کی انفعال مزاجی کی بنا پر چین وسکون کے ایام دیرپا نہ ہوسکے اور تقریباً سات آٹھ سال کی خاموشی کے بعد مسلمانوں کے خلاف پھر سے پرتشدد تحریک شروع کر دی گئی، اس شور وغوغہ اور ہنگامے کے دوران ۱۹۷۱ء کو (CUT-OF-EYEAR) کی آخری حد تسلیم کئے جانے کے اسٹینڈ پر ۱۹۸۳ء کا کانگریس نے آسام کا الیکشن لڑا اور اسی یقین دہانی پر مذہبی ولسانی اقلیتوں نے کانگریس کی بھرپور تائید وحمایت کی اور اسے کامیابی کی منزل پر پہنچایا جس کی قیمت انھیں ہزاروں جانوں کی قربانی کی صورت میں ادا کرنی پڑی، جس میں "نیلی" کا قتل عام ایسا بدترین حادثہ تھا کہ جس سے عالم انسانی بھی چیخ پڑا، آخر کار اصول وقانون اور عدل وانصاف کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے موجودہ چیف منسٹر نے بڑی حد تک حالات پر قابو پالیا اور غیر آئینی ایجی ٹیشن نے دم توڑ دیا، اسی زمانہ میں دوبارہ ٹریبونل کے ذریعہ غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے والوں کی تعین کیلئے پارلیمنٹ نے ایک قانون کی منظوری دی اور ساتھ ہی ووٹروں کی فہرست میں بڑے پیمانے پر نظر ثانی کی گئی، ان قانونی کارروائیوں سے اندازہ ہوچکا تھا کہ سارے مسائل منصفانہ طریقے پر حل ہوجائیں گے، عین انھیں امید افزا حالات میں بعض غیر حقیقت پسند آسامی لیڈروں کی باتوں میں آکر پرائم منسٹر نے ۱۹۸۵ء میں اپنی شکست کا اعلان کر کے آسام اسٹوڈنٹس یونین اور آسام گن پریشد کے لیڈروں سے غیر معقول سمجھوتہ کرلیا، چنانچہ آسام کے چیف منسٹر ہتیشور سیکیا نے ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء کے سنڈے میگزین میں اس المیہ پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا۔

" اس وقت تک ہماری آسام کانگریس کی لیجسلیچر پارٹی اور ہمارے سپورٹر ۱۹۷۱ء کے سال پر تصفیہ کیلئے اٹل ہیں، اس وجہ سے کہ اس دوران جب کہ ہمارے چار لاکھ عوام خانماں برباد ہو چکے ان کے مکانات برباد ومسمار ہو چکے اور ہم بدبختی کے ان تاریک دنوں میں بھی ۱۹۷۱ء کے موقف پر قائم رہے جب کہ غارت گری کے طوفان میں گھروں سے نکلنا مشکل تھا تو اب جب کہ بدترین دور گذر گیا ہمارے بچے اسکول جاسکتے ہیں، تقریبات میں شرکت کرسکتے ہیں اور زندگی معمول کے مطابق ہے پھر یہ کہ تمامتر نقصانات کے باوجود ہم ۱۹۷۱ء کے موقف پر جمے رہے، نیز ۱۹۸۳ء کے الیکشن میں ہم نے چار ہزار بے گناہوں کی بھینٹ چڑھائی (یہ سرکاری اعداد وشمار نیلی کے قتل عام کے سلسلہ میں بہت کم ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دس ہزار سے زیادہ انسانوں کا قتل عام ہوا تھا) ان احساسات وجذبات کیساتھ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر ۱۹۷۱ء کے علاوہ کسی اور تاریخ کو شہریت کے (cut of year) کے طور پر تسلیم کیا گیا تو اس کا رد عمل اس پر کیا ہوگا "

آخر میں مسٹر سیکیا نے اپنی بے چارگی اور بے بسی کا اظہار یوں کیا ہے کہ " وزیر اعظم جو کہتے ہیں ہم اس کے پابند ومطیع ہیں اس لئے ہم اسے قبول کریں گے "

خیر چیف منسٹر سیکیا مجبور وبے بس تھے لیکن جمعیۃ علماء تو مجبور نہیں تھی اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ دستور وآئین کی اس پامالی کو ہم کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتے، اس کے خلاف ہم آخری دم تک لڑتے رہیں گے چنانچہ اس سلسلہ میں ۷ ار نومبر ۱۹۸۵ء کو جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام "شہری حقوق کنونشن" کیا گیا جس میں کھل کر سیاسی وغیر سیاسی لیڈروں اور دانشوروں نے آسام کے سلسلے میں حکومت کے رویہ پر تنقید وتبصرہ کیا، ان سب کوششوں کے نتیجہ میں ۱۹۹۰ء میں الیکشن کمیشن نے بڑے پیمانے پر ووٹروں کی فہرست کی نظر ثانی کرائی۔ کسی بھی حلقے کے ووٹروں کی فہرست اور اس کی قانونی طور پر کوئی قابل اعتراض چیز سامنے نہیں آئی۔

چنانچہ اسی ووٹر لسٹ کے مطابق ۱۹۹۰ء کا الیکشن ہوا اور کسی فرد یا جماعت نے اس الیکشن کو اس بنیاد پر چیلنج نہیں کیا کہ ووٹروں کی فہرست غلط تھی یا اس فہرست میں غیر ملکیوں کے نام شامل تھے جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ ووٹر لسٹ حکومت اور اپوزیشن پارٹیوں سب کے نزدیک صحیح اور درست ہے۔

مگر دو سال کے بعد یعنی ۱۹۹۲ء میں پھر بعض تنظیموں کی طرف سے آواز بلند کی جانے لگی کہ آسام میں بڑی تعداد میں غیر ملکی کسی مخفی ارادوں کے تحت آبسے ہیں۔ اسے بدقسمتی نہ کہا جائے تو پھر آخر کیا کہا جائے کہ ساری چھان بین اور تحقیقات کے باوجود الیکشن کمیشن مذکورہ بالا تنظیموں کے غلط پروپیگنڈوں سے متاثر ہوگیا اور ان کے دباؤ کو قبول کرتے ہوئے گمراہ کن نام نہاد رہنما خطوط جاری کر دیئے اور جو مسئلہ ۱۹۹۰ء میں متفقہ طور پر طے ہو چکا تھا اسے از سر نو زندہ کر دیا گیا، اور اس غیر قانونی رہنما خطوط کو بنیاد بنا کر تقریباً تیس لاکھ شہریوں کے نام ووٹر لسٹ سے خارج کر دیئے گئے جن میں ایک مختصر سی تعداد کے علاوہ سب ہی مسلمان ہیں۔

اس نام نہاد رہنما خطوط میں الیکشن کمیشن نے دستور' انصاف' قانون اور گذشتہ تمام کارروائیوں کو پس پشت ڈال کر حق شہریت کے ثبوت کیلئے صرف تین چیزوں کا مطالبہ کیا ہے۔

(۱) پیدائشی سرٹیفکٹ۔ جب کہ خود حکومت آسام کی جانب سے اب تک اس کا انتظام نہیں کیا جا سکا ہے۔

(۲) ۱۹۶۶ء کی ووٹر لسٹ میں نام کا موجود ہونا جس کے بارے میں حکومت آسام کا کہنا ہے کہ پچاس فیصد یہ لسٹ ضائع ہو چکی ہے۔

(۳) ۱۹۵۱ء کی این آر سی جو سرکار کی تحویل میں ہے اور مردم شماری کا محکمہ معترف ہے کہ یہ نا تمام اور غیر مکمل ہے جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ کسی مخفی سازش کے تحت اس ہتھکنڈے کے ذریعہ لاکھوں ہندوستانی شہریوں کو ان کے حق شہریت سے محروم کر دینے کی ناروا کوشش کی گئی ہے۔

اسی کے ساتھ اس وقت ووٹروں کی جو فہرست تیار کی گئی ہے اس میں تقریباً ۲۵، ۳۰ لاکھ شہریوں کے نام شامل نہیں کئے گئے ہیں، آج کی مہذب دنیا میں کسی مہذب جمہوری حکومت کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جو اپنے شہریوں کو حق شہریت سے محروم کر دینے کی ہوس میں دستور و ضابطہ، قانون و انصاف اور اخلاق و انسانیت کا کھلے عام اس طرح مذاق اڑا رہی ہے۔

مسئلہ کے منصفانہ حل کی ضرورت اور طریقہ کار

الحاصل یہ کرب انگیز مسئلہ سیاسی مصلحتوں کی صلیب پر لٹک رہا ہے، جس کے حل کی سنجیدہ و

مخلصانہ کوشش سے نہ صرف گریز کیا جاتا ہے بلکہ ذہنی تحفظات کے تحت سلجھے ہوئے معاملات کو بھی الجھا دیا جاتا ہے، لیکن یہ طریقۂ کار اور غیر معقول روش ملک و قوم اور خود سیاسی رہنماؤں کے حقیقی مفاد کے سراسر خلاف ہے، کیونکہ ملک کی اس قدر بڑی اقلیت (جو بذات خود ایک اکثریت ہے) کو غیر مطمئن اور یاس و ناامیدی میں مبتلا رکھ کر ملک کے استحکام و ترقی کی باتیں کرنا محض خود فریبی ہے، اس لئے دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ ملک و قوم کے مصالح کے پیش نظر اس مسئلہ کو پہلی فرصت میں حل کر لیا جائے جس کی منصفانہ صورت یہی ہے کہ :

۱ :۔ ووٹر لسٹ پر نظر ثانی کی جائے جس کیلئے ایسا عملہ مقرر کیا جائے جو بغیر کسی جانب داری کے اپنی ذمہ داریوں کو اصول و انصاف کے مطابق ادا کرے۔

۲ :۔ ملک کے شہریوں کو خواہ مخواہ کے لئے ثبوت کا مطالبہ کر کے پریشان نہ کیا جائے، ہاں جو لوگ واقعی مشتبہ ہیں انھیں سے ثبوت طلب کیا جائے

۳ :۔ درج ذیل امور میں سے کسی ایک کو ثبوت شہریت کے لئے کافی سمجھا جائے۔

الف :۔ جائیداد کا پٹہ

ب :۔ راشن کارڈ

ج :۔ اسکول و کالج کی سارٹیفکٹ

د :۔ پاسپورٹ

ہ :۔ مکان وغیرہ کے کرایہ کی رسیدیں

و :۔ برتھ سارٹیفکٹ

ز :۔ کوئی بھی ایسا کاغذ جو اس بات کا مظہر ہو کہ شخص ۱۹۶۶ء سے پہلے ہندوستان کا شہری تھا۔

ح :۔ ۱۹۶۶ء ووٹر لسٹ

ط :۔ این آر سی ۱۹۵۱ء

ی :۔ سٹیزن سارٹیفکٹ (شہریت کا تصدیق نامہ)

دیگر صوبوں میں بھی اس فتنہ کو برپا کرنے کی مذموم کوشش

مغربی بنگال اور راجستھان کے اضلاع باڑمیر، جیسلمیر وغیرہ سرحدی علاقوں کے بارے میں غیر ملکیوں کا ہوا کھڑا کرکے اقلیتوں کو پریشان اور دہشت زدہ کرنے اور انھیں اجاڑنے کی شرمناک مہم جاری ہے، مغربی بنگال میں بنگلہ دیشی دراندازی کی جھوٹی مبالغہ آمیز خبریں کلکتہ کے اخبارات ٹیلی گراف، یوگانتر، آنند بازار پتریکا وغیرہ میں شائع ہوتی رہی ہیں خود ملک کی راجدھانی دلی کے سلسلے میں بھی ناقابل یقین مبالغہ کے ساتھ یہی شہرت دی جارہی ہے، اسی طرح بہار کے ضلع کٹیہار میں شیرشاہ وادی برادری کے لوگ جو شیرشاہ سوری کے زمانہ سے آباد ہیں اور ہندوستان میں رہتے ہوئے اس کی کئی پشتیں گذر گئی ہیں لیکن اب انھیں بھی بنگلہ دیشی بنا کر ان کو آبادیوں سے خارج کرنے کی مہم چلادی گئی ہے، ضرورت ہے کہ حکومت اس معاملہ پر خصوصی توجہ دے اور اس فتنۂ نوزائیدہ کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دے ورنہ پورے ملک میں اضطراب وانتشار پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔

ووٹر لسٹوں سے ناموں کا اخراج

حالیہ انتخاب کے موقع پر ایک نئی سازش مزید ابھر کر سامنے آئی وہ یہ کہ دہلی، یوپی وغیرہ صوبوں میں بڑے پیمانے پر ووٹر لسٹوں سے ووٹروں کے نام حذف کردیئے گئے ہیں، اس مذموم حرکت میں بھی مسلمانوں کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا ہے، چنانچہ قومی آواز ۱۹/۱۱/۹۳ کی ایک خبر میں ہے کہ بلیماران، پہاڑی بھوجلہ اور لال کنواں میں رہنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس مرتبہ ووٹ دینے کا حق استعمال کرنے سے محروم رہے، کیونکہ ان لوگوں کے نام ووٹر لسٹ میں موجود نہیں تھے، جب کہ یہ لوگ گذشتہ کئی دہائیوں سے ووٹ دیتے رہے ہیں، یہ تعداد ہزاروں میں ہے اور بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا نام لسٹ میں ہے مگر غلط تحریر ہے۔

پرتاپ دہلی اپنی اشاعت مورخہ ۸/۱۱/۹۳ میں خبر دیتا ہے کہ بھاری تعداد میں کل ووٹر ووٹ دینے کے حق سے محروم رہ گئے، تماشہ یہ ہے کہ یہ صرف فروری میں ووٹر لسٹوں میں ترمیم

کرائے جانے کے بعد ہوا، اوکھلا حلقہ نمبر ۴۴ میں مکان نمبر ایف ۱۸ سے سلطان صدیقی اور نکہت شاہین کے نام غائب ہیں، اس کالونی میں ۲۲ سو ووٹ تھے، صرف سات سو رہ گئے، حلقہ شاہدرہ کے علاقہ شواکھنڈ کے مکان نمبر ۱۸۰ سے محمد حسن اور ان کے تقریباً سات اہل خانہ کے نام فہرست سے غائب ہیں، بلی ماران میں مکان نمبر ۲۴۸ کے نام غائب ہیں، احاطہ کالے صاحب میں حافظ محمد الیاس اور ان کی بیگم عائشہ کوثر اور تین لڑکوں کے نام غائب ہیں۔

قومی اخبار کا بیان ہے کہ دیلکم، سیماپوری اور سیلم پور کے سیکڑوں افراد نے آج الیکشن آفس کے سامنے مظاہرہ کیا اور دھرنا دیا، مظاہرین کا کہنا ہے کہ سیلم پور اور سیما پوری کے حلقوں میں ہزاروں ووٹروں کے نام بنگلہ دیشی ہونے کے شبہ میں ووٹر لسٹوں سے نکال دیئے گئے، اس پر ہزاروں افراد نے الیکشن آفس میں دعوے بھیجے، ان میں کچھ وصول کر لئے گئے کئی ہزار نام ووٹر لسٹوں میں بڑھا دیئے گئے، مگر مظاہرین کا دعویٰ ہے کہ بڑھائے گئے تمام نام فائنل ووٹر لسٹ میں شائع نہیں کیے گئے اور خاص طور سے مسلمانوں کے بڑھے ہوئے نام تو بالکل نہیں دیئے گئے، غیر قانونی طور پر ناموں کے اخراج کی یہ صرف دہلی کے چند حلقوں کی روداد ہے، بعینہ یہی صورت حال دیگر صوبوں کی بھی ہے اس طرح گویا کروڑوں شہریوں کا حق رائے دہی ناجائز طور پر سلب کر لیا گیا۔

آر ایس ایس اور بی جے پی پریوار کے کارکنوں نے اس سلسلہ میں اہم رول ادا کیا ہے، کیونکہ انھیں یقین ہے کہ مسلمانوں کے ووٹ ان کے خلاف استعمال ہوں گے، اس لئے مسلمانوں کے ووٹوں کے توازن کو گھٹانے کے لئے یہ غیر قانونی مہم چلائی گئی، ان فرقہ پرست و فسطائی پارٹیوں کے اچھے خاصے کارکن حکومت کی مشنری میں داخل ہیں اس لئے اس معاملہ میں بڑے عزم و احتیاط، دیدہ وری اور بیدار مغزی کی ضرورت ہے۔ ایک حد تک یہ بات قابل اطمینان ہے کہ الیکشن کمیشن کو اس گھناؤنی سازش کا قدرے ادراک ہوگیا ہے اور بعض ریاستوں میں از سر نو ووٹر لسٹ تیار کرنے کے احکام جاری کر دیئے گئے ہیں، لیکن اس پیوندکاری اور جزوی بخیہ گری سے اس ہمہ گیر دسیسہ کاری کی اصلاح نہیں ہوگی بلکہ ضروری ہے کہ پورے ملک میں نئے سرے سے ووٹر لسٹ تیار کی جائے اور اس کے لئے واضح طور پر پہلے سے احکام جاری کر دیئے جائیں کہ قابل اعتبار شہریت کی صورت میں ثبوت کے طور پر فلاں فلاں کاغذات تسلیم کیے جائیں گے، مناسب یہی ہے کہ آسام کی شہریت

کے سلسلہ میں جن کاغذات کو بطور ثبوت کے تسلیم کئے جانے کی تجویز پیش کی گئی ہے انھیں کو ہر صوبہ میں معتبر مان لیا جائے تاکہ ملک کے شہری بے جا مصارف کے بار اور ناحق پریشانیوں سے محفوظ رہیں ووٹر لسٹیں تیار ہو جائیں تو انھیں شائع کر دیا جائے تاکہ جن کے نام کسی وجہ سے چھوٹ گئے ہوں وہ درخواست دیکر اپنے نام لسٹوں میں شامل کرا سکیں، اس لئے عام طور پر ہفتہ عشرہ کی میعاد دی جاتی ہے جو یقینی طور پر ناکافی ہے، اس لئے درخواستوں کے واسطے کم از کم ایک ماہ کی مہلت دی جائے۔

برادران ملک وملت:- بلاریب آج نفرت وتعصب کے ہم شکار ہیں اور حکومت وقت بھی کرسیٔ اقتدار سے چپکے رہنے کی ہوس میں قانون وانصاف قائم کرنے کے بجائے فسطائی طاقتوں کی خواہش کی تکمیل میں لگی ہوئی ہے۔ پھر بھی ہمیں دل برداشتہ اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، قانون فطرت ہے کہ جب محرومیاں حد درجے تک پہونچ جاتی ہیں تو انھیں کے اندر سے کامیابیوں کی کرنیں پھوٹ پڑتی ہیں، مظالم اور زیادتیوں سے دل برداشتہ اور پست ہمت ہونے کے بجائے اپنے حوصلوں کو بلند اور عزائم کو پختہ رکھئے اور پامردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کے لئے تیار رہئے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے کسی بھی جائز جد وجہد سے دریغ نہ کیجئے "ہمت مرداں مدد خدا"، اور ببانگ دہل اعلان کر دیجئے کہ اگر اس نفرت وتعصب، تشدد وجارحیت اور ظلم وناانصافی کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے حقوق اور تشخص سے دست بردار ہو کر اس نازی ازم کے آگے گھٹنے ٹیک دیں، جو فرقہ پرست طاقتوں کا منتہائے مقصود ہے تو کان کھول کر سن لیں کہ ان کا یہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، ہم نے اپنے خون جگر سے سینچ کر اس ملک کو بہار بداماں بنایا ہے، اس کی ہزار سالہ تاریخ میں برابر کے شریک ہیں اور شریک رہیں گے ظلم وجبر کی کوئی بھی طاقت وطن عزیز سے ہمارے اس رشتے اور تعلق کو توڑ نہیں سکتی۔

میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا بس انھیں معروضات پر آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو رہا ہوں الحمد للہ اولا وآخرا وصلی اللہ علی النبی الامی وبارک وسلم

رویت کے طبعی اصول

(۱) دنیا ایک کرہ (GLOBE) ہے نہ کہ مسطح میدان اس لئے ایک جگہ رویت کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ رویت اسی وقت پوری دنیا میں بھی ہو

(۲) چاند کی اپنی روشنی نہیں، سورج کی کرنیں چاند سے منعکس ہو کر زمین کی طرف بھی آتی ہیں دوسرے کرّوں کے بہ نسبت چاند سے روشنی کا انعکاس بہت کم ہے زمین کے مقابلے میں یہ صرف ۱/۴ حصہ ہے، پہلے دن چاند کی سطح کا بمشکل ۱٪ حصہ منور ہوتا ہے۔

(۳) چاند کا صرف ایک رخ زمین کی طرف رہتا ہے، دوسرا نصف حصہ ہمیشہ ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے، نئے چاند (NEW. MOON) کے وقت یہ مکمل تاریک رخ ہی زمین کی طرف ہوتا ہے، اسی لئے نیا چاند ہمیشہ غیر مرئی ہوتا ہے (کوئی اس کی رویت کا دعویٰ کرے یا شہادت دے تو وہ وہم یا کذب بیانی ہے)

(۴) چاند کی سطح تھالی کی طرح ہموار اور مسطح نہیں بلکہ اونچی نیچی ہے، اس لئے سورج کی کرنوں کا انعکاس غیر مرئی نیا چاند بنتے ہی فوراً شروع نہیں ہوتا، چاند کی پہاڑیاں اور غار اگلے چند گھنٹوں تک روشنی کے انعکاس کی زمینی رویت کے لئے آڑے رہتے ہیں، عدم رویت کی یہ مدت دنیا کے مختلف حصوں میں ۱۴ سے ۵۰ گھنٹے تک ہو سکتی ہے۔

(۵) چاند کی گردش کا یہ حساب ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے تک انتہائی قطعیت سے معلوم

ہے یہ حساب نہ تو ظن و تخمین ہے اور نہ اس کا مستقبل کی پیشین گوئیوں اور جیوتش سے کوئی تعلق ہے خود قرآن کریم نے والشمس والقمر بحسبان فرما کر اس بدیہی حقیقت سے عرصہ ہوا پردہ ہٹا دیا ہے

(۶) چاند مہینے کی آخری تاریخوں میں نئے چاند (New Moon) سے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد غیر مرئی ہوتا ہے، پھر ۲۹ یا ۳۰ کو ہلال کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، روزانہ بڑھتے بڑھتے یہ بدر بن جاتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے صبح کے وقت ہلال کی شکل اختیار کر لیتا ہے، قرآنی آیت "والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم" میں اسی طبعی قانون کی طرف اشارہ ہے۔

(۷) جہاں چاند قمری ماہ کی پہلی تاریخ کو نظر آیا تھا وہاں تیسویں دن عارض نہ ہو تو لازماً نظر آئے گا اگر تیسویں دن باوجود صحو کے رویت نہیں ہوتی تو یکم کو رویت کا دعویٰ غلط اور جھوٹا ہے اسلئے تیس دن کے بعد یہ کہہ کر عید منا لینا یا رمضان شروع کر دینا کہ مہینہ کے ۳۰ دن پورے ہو چکے چاند نظر نہیں آتا تو نہ سہی، رویت کے اصولوں کے صریحاً خلاف ہونے کے علاوہ فقہاء کی آراء کے بھی خلاف ہے۔

رویت بیضوی کا دائرہ

(۱) رویت ہلال کی ابتدا ہر مہینے کرۂ ارض پر ایک نئے مقام سے ہوتی ہے، شمسی تاریخی لائن (IDL) جو ۱۸۰ طول البلد پر طے شدہ مفروضہ ہے کی طرح قمری تاریخی لائن (ILDL) کو کسی ایک طول/عرض البلد یا کسی متعین مقام مثلاً مکہ مکرمہ سے ہر ماہ کے لئے لازمی مفروضہ نہیں بنایا جا سکتا اولین رویت کا مقام ہر ماہ بدلتا رہتا ہے نہ صرف مشرق سے مغرب کی جانب بلکہ شمال سے جنوب بھی۔

(۲) چاند کی اولین رویت سورج کی طرح شمالاً/جنوباً نہیں ہوتی بلکہ ابتدائی مقام (POINT X) سے ایک بیضوی دائرے کے اندر مغرب کی سمت بڑھتی چلی جاتی ہے، یہ دائرہ شمالاً و جنوباً وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اور عموماً ۲۴ گھنٹے میں دنیا کے صفر تا ۴۵ درجہ شمال و جنوب میں واقع عروض البلاد کے اندر سارے مقامات پر محیط ہو جاتا ہے، اس دائرے کے باہر انتہائی شمال یا جنوب میں واقع مقامات پر رویت میں مزید ایک دن لگے گا۔

(۳) ایک بار جس مقام سے رویت کی ابتدا ہو جاتی ہے تو اس کے مغرب میں واقع بیضوی دائرے کے اندر ہر مقام پر اسی دن رویت لازماً ہوگی، یہ ناممکن ہے کہ ایک مقام پر رویت واقعۃً ہو جائے اور اس کے مغرب میں رویت نہ ہو، جیسا کہ سعودی عرب میں جس دن رویت کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس سے مغرب میں واقع ممالک مراکش، تونس، یورپ حتیٰ کہ امریکہ تک میں اس دن تو کیا دوسرے دن بھی رویت نہیں ہوتی جس کا گذشتہ پچیس سالوں میں بارہا تجربہ ہوا جو سعودی دعوائے رویت کے غیر محقق اور غلط ہونے کی بین دلیل ہے۔

رویت ہلال کے چند عوامل

سطح ارض سے رویت بصری کے لئے نئے چاند New Moon کو ہلال (Cresent) کریسنٹ بننے تک جو وقفہ درکار ہوتا ہے اس کے تعین میں بہت سے عوامل کام کرتے ہیں، چند اہم یہ ہیں

(۱) چاند کا افقی زاویہ (ANGLE) (۲) چاند کی افقی بلندی (ALLITUDE)
(۳) غروب شمس و قمر میں تفاوت (۴) چاند کی عمر
(۵) فضائی موسمی حالات (۶) تجربہ اور مددگار آلات وغیرہ۔

(۱) افقی زاویہ :- افق پر غروب آفتاب کے وقت چاند سورج سے کم از کم ۱۱ / ۱۲ درجے یا زیادہ دوری پر ہو۔
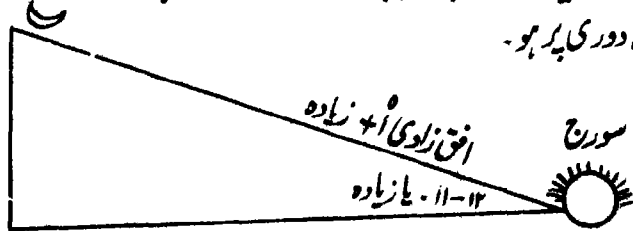
(۲) افقی بلندی :- غروب آفتاب کے وقت چاند افق پر ۸ درجہ یا اس سے زیادہ بلندی پر ہو
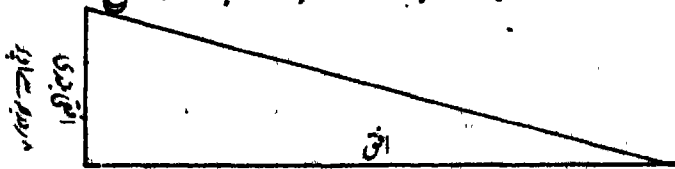
اس وقت تک مطلع پر اتنی تاریکی چھا جائے گی کہ انسانی آنکھ چاند سے منعکس ہونے والی روشنی

اور افق پر موجود سورج کی روشنی میں فرق محسوس کرسکے۔ اگر غروب کے بعد ابتدائی ۱۵ منٹوں میں چاند افق سے صرف ۵-۴ درجہ بلندی پر ہو تو اس کی رویت ناممکن ہوگی۔ افق کے نچلے حصے پر موجود سورج کی روشنی اور چاند کا صرف ۱/۱۰۰ حصہ روشن ہونے کی وجہ سے رویت کا امکان بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔

(۳) **مطلع پر روشنی:۔** عام انسانی آنکھ غروب آفتاب کے بعد مطلع پر منتشر روشنی اور چاند سے منعکس ہونے والی روشنی ( ) کا فرق اس وقت محسوس کرسکتی ہے جب سارے امکانی عوامل رویت کے ساتھ چاند کی عمر ۲۰ گھنٹے کے قریب ہو، بعض دفعہ اس سے کم عمر کا چاند بھی دیکھا جاسکتا ہے (جب کہ دوسرے عوامل بہت اچھے ہوں جیسے افقی زاویہ بلندی اور فضا کا شفاف ہونا) دھواں۔ آتش فشاں پہاڑوں کا گرد وغبار، آندھی، بادل وغیرہ سے رویت کا امکان کم ہوجاتا ہے۔

دیکھنے والے کی عمر، بصارت، رویت کا سابقہ تجربہ، مطلع پر چاند کے صحیح مقام اور اس مہینہ ہلال کی معینہ شکل کا علم وغیرہ عوامل رویت پر اثرانداز ہوتے ہیں، مثلاً چاند غروب آفتاب کے مقام سے شمال کی جانب تھا اور تلاش کرنے والے اس کو جنوب کی جانب تلاش کرتے رہے تو رویت محال ہوگی۔

مصری تقویم

مصر میں مرحوم جمال عبدالناصر کے دباؤ کے تحت ۱۹۶۶ء سے علماء نے غیر مرئی چاند، (New Moon) کو بھی ہلال تسلیم کرلیا ہے اور رویت کے بجائے اصول یہ طے کیا کہ اگر نیا چاند غروب آفتاب کے بعد ۵ منٹ یا اس سے زیادہ افق پر موجود ہو (کہ نہ دیکھا جائے) تو رویت مان لی جائے گی اور اگلا دن قمری مہینہ کی پہلی تاریخ ہوگی، ۱۹۸۶ء سے ۵ منٹ کے بجائے چاند کا افق پر صرف ایک منٹ باقی رہنا ہی کافی مان لیا گیا ہے۔

"ویکفی دقیقة واحدة بدلا من الدقائق الخمسة بعد غروب الشمس لکی نقول ان الھلال قد ولد۔"

مصر میں آج بھی بجائے رویت ہلال کے افق پر وجود قمر کی بنیاد پر رمضان و عیدین کا تعین کیا جاتا ہے چنانچہ مصری و سعودی تقویم، عموماً برابر چلتی ہے، فرق رمضان و عیدین پر اس وقت ہو جاتا ہے جب سعودی عرب میں "محاق" "نیومون" سے بھی پہلے غیر مرئی چاند کے دیکھے جانے کی غلط شہادت کی بنیاد پر رمضان و عیدین کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو مصری قمری تاریخ سعودی تاریخ سے ایک دن مؤخر ہو جاتی ہے جیسا کہ ۱۹۹۲ء میں رمضان و عید پر ہوا۔

سعودی ام القریٰ تقویم

اس کے بنانے والے ڈاکٹر فضل احمد صاحب (اصلاً پاکستانی اب ریاض میں مقیم ہیں) سے راقم کی اس موضوع پر ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں مکاتبت ہوئی۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

خدا کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ ۱۴۰۰ھ سال میں اللہ نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ میں نے آسٹرونومیکل حساب کی بنیاد پر اسلام کا سب سے پہلا اسلامی کلینڈر ۱۹۷۲ء میں بنایا تھا جو حکومت سعودی عرب نے اسے اپنا سرکاری کلینڈر قرار دیا۔ . . . .

جب سورج زمین چاند ایک (PLANE) سیدھ میں آتے ہیں تو اسے نیومون کہا جاتا ہے، عربی میں اقتران اور انگلش میں (conjunction) کہتے ہیں اس کے فوراً بعد ہلال بننا شروع ہو جاتا ہے، جب وہ چھ سات ڈگری ہٹ جائے اور زمین پر ہوا اور دن کی روشنی نہ ہو تو یہ ہلال آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے . . . . . .

عموماً اگر موسم صاف رہے تو (آفتاب سے) ساڑھے دس درجہ (دوری) پر ہلال آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے، یعنی اگر چاند سورج سے تقریباً ۴۲ منٹ بعد غروب ہو رہا ہو تو موسم کی اجازت سے دکھائی دے گا۔

(جواب، ب) چاند کی رویت سے کیا مراد ہے آپ کی ؟ یہ سوال بڑا ٹیڑھا ہے اور جواب کئی (FACTORS) پر منحصر ہوتا ہے، اس رویت کا تعین علمائے دین کو کرنا ہوگا، جو وہ ۱۴۰۰ سال سے نہیں کر سکے ہیں اور غالباً اگلے ۱۴۰۰ سال تک بھی نہیں کر سکیں گے، حساب سے ہر رویت کا تعین ہو سکتا ہے

رویت کا تجزیہ کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں

نیومون رویت کا ۳° رویت کا ۵۶ رویت کا ساڑھے دس ڈگری رویت کا وغیرہ وغیرہ
سوائے نیومون رویت کے باقی تمام رویت کا اطلاق ساری دنیا پر نہیں ہوسکتا،
اس کا جواب انگلش میں ملاحظہ ہو۔

CONJUNCTION IS INDEPENDENT OF PLACE
AND TIME OF OBSERVATION.

اس لئے یہ ساری دنیا کے لئے ADOPT کہا جا سکتا ہے، میں اسی اصول پر رسمی
ام القریٰ بناتا ہوں　　گم کردہ فلک فضل احمد۔

ڈاکٹر صاحب کے خط سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں سنہ ۱۹۸۹-۱۰-۱۵-۱۶-۳ ۱۴۱۰

(۱) نیومون کے بعد ہلال بننا شروع ہوتا ہے اس سے پہلے نہیں۔
(۲) نیومون کے فوراً بعد ہلال نظر نہیں آسکتا (سعودیہ میں فوراً بعد بلکہ اس سے بھی پہلے رویت کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟)
(۳) ہلال کو نظر آنے کے لئے نیومون کے بعد کم از کم ساڑھے دس درجہ سورج سے دور ہونا ضروری ہے
(۴) نیومون (غیر مرئی چاند) ہی کو سعودی عرب میں رویت تسلیم کرلیا گیا ہے
(۵) حساب سے ہر رویت کا تعین ہوسکتا ہے (رویت بصری ضروری نہیں)
(۶) تقویم ام القریٰ میں نیومون (غیر مرئی چاند) سے اگلا دن اسلامی ماہ کا پہلا دن فرض کرلیا گیا۔

تقویم امّ القریٰ کا ترتیبی تجزیہ

فضل احمد صاحب نے تصدیق کردی ہے کہ امّ القریٰ تقویم کو بجائے امکان رویت کے نیومون پر مرتب کیا گیا ہے، مزید ستم یہ ہے کہ اس میں بھی سعودی عرب کے معیاری وقت سے قطع نظر کرکے اسے برطانیہ کے گرین وچ وقت GMT کے مطابق مرتب کیا گیا ہے، یعنی اگر گرین وچ GMT وقت کے مطابق رات گیارہ بجکر ۵۹ منٹ پر بھی چاند پیدا ہوگیا تو سعودی عرب میں گذشتہ شام سے اسلامی ماہ شمار کرلیا گیا حالانکہ وہاں نیومون بھی اگلے دن صبح ہی رہا تھا۔

اسلامی ماہ	تاریخ نیومون	تقویم ام القریٰ	مصری تقویم	مکہ مکرمہ غروب شمس وقمر کا تفاوت	تقویم امکان رویت
محرم ۱۴۱۳ھ	۳۰ رجون ۱۹۹۲ء	یکم جولائی ۱۹۹۲ء	۲ رجولائی ۱۹۹۲ء	۳ + منٹ	۲ رجولائی ۱۹۹۲ء
صفر	۲۹ جولائی	۳۰ جولائی	۳۰ جولائی	۲۰ - منٹ	یکم اگست
ربیع الاول	۲۸ راگست	۲۹ راگست	۳۰ راگست	۶ + منٹ	۳۰ راگست
ربیع الثانی	۲۶ ستمبر	۲۷ ستمبر	۲۸ ستمبر	۱۱ - منٹ	۲۹ ستمبر
جمادی الاوّل	۲۵ راکتوبر	۲۶ راکتوبر	۲۷ راکتوبر	۲۸ - منٹ	۲۸ راکتوبر
جمادی الثانی	۲۴ نومبر	۲۵ نومبر	۲۶ نومبر	۳ + منٹ	۲۶ رنومبر
رجب	۲۴ دسمبر	۲۵ دسمبر	۲۵ دسمبر	۱۹ + منٹ	۲۶ دسمبر
شعبان	۲۲ جنوری ۱۹۹۳ء	۲۳ جنوری ۱۹۹۳ء	۲۴ جنوری ۱۹۹۳ء	۹ - منٹ	۲۴ جنوری ۱۹۹۳ء
رمضان	۲۱ فروری	۲۲ فروری	۲۲ فروری	دونوں ساتھ	۲۳ فروری
شوال	۲۳ مارچ	۲۴ مارچ	۲۴ مارچ	۸ + منٹ	۲۵ مارچ
ذی قعدہ	۲۱ رابریل	۲۲ راپریل	۲۳ راپریل	۲۱ - منٹ	۲۴ راپریل
ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ	۲۱ رمئی	۲۲ مئی	۲۲ مئی	دونوں ساتھ	۲۳ رمئی

قمری مہینہ کی ابتدار

اسلامی قمری ماہ کی ۲۹ ویں کو چاند کی رویت نہ ہونے کی صورت میں ۳۰ دن مکمل ہونے پر دوسرے اسلامی ماہ کی ابتداء۔ اس صورت میں تو بلاچون وچرا درست ہے جب کہ مہینہ کی ابتداء ہلال کی عمومی رویت پر ہوئی ہو، مگر جب مہینہ کی ابتدار بجائے عمومی رویت کے شاہدوں کی شہادت کی بنیاد پر ہوئی ہو اور ۳۰ ردن پورے ہونے پر افق صاف ہونے کے باوجود چاند کی رویت نہ ہو تو فقہی اصول کے مطابق ۳۰ دن پورے ہونے کی وجہ سے دوسرا مہینہ شروع نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ مانا جائے گا کہ شاہدوں کی غلط شہادت کی بنا پر مہینہ کی ابتدا غلط ہوئی ہے ورنہ ۳۰ ویں دن

یقیناً چاند کی رویت ہوتی، مطلقاً اسلامی قمری ماہ کے ۳۰ دن پورے ہوجانا یہ اسلامی ماہ کے اختتام و ابتداء کی دلیل نہیں۔

رویت بصری پر مبنی اسلامی تقویم

ہند و پاک، بنگلہ دیش، بعض افریقی ممالک عملی طور پر اور مملکت مغرب (مراکش) سرکاری طور پر ہلال کی بصری رویت کو بنیاد مانتے ہوئے رمضان و عیدین کا تعین کرتے ہیں اور سال بھر کیلئے نیومون کے بعد امکان رویت پر تقویم کو مرتب کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سعودی و مصری تقویم اور مراکش و ہند و پاک وغیرہ کی اسلامی تقویم میں ایک دن اور گاہے گاہے دو دن کا فرق ہوجاتا ہے، سعودی و مصری تقویم ہمیشہ ایک یا دو دن مقدم ہوتی ہے کیونکہ اس کی بنیاد نیومون یا اس سے بھی پہلے ہے۔

ذرائع ابلاغ کے اس ترقی یافتہ دور میں خبروں کے ساتھ ٹیلی ویژن کے ذریعہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی چلتی پھرتی تصویریں ایک مقام سے دوسرے مقام پر آنِ واحد میں منتقل ہوجاتی ہیں، ان ذرائع نے جہاں دنیوی زندگی میں آسائش اور معاشرت و معیشت میں سہولت پیدا کی، وہاں ان سے نئے نئے دینی مسائل اور الجھنیں بھی پیدا ہوئیں ان میں سے رمضان و عیدین کے موقعہ پر مختلف مسلم ممالک سے فیصلہ رویت کی نشر ہونے والی خبریں اور اطلاعات ہیں۔

حرمین شریفین کے تقدس اور پاسبان حرمین شریفین کے احترام اور حرمین شریفین کے قبلہ و کعبہ اور مقامات حج ہونے کے ناطے وہاں سے رمضان و عیدین کے تعین کی نشر ہونے والی خبریں پورے عالم اسلام بالخصوص یورپ و امریکہ اور ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیتیں غیروں کی ماتحتی میں مقیم و آباد ہیں سخت انتشار و خلفشار کا سبب بن رہی ہیں، اکثر نوبت تلخ کلامی اور لڑائی تک آجاتی ہے۔

رمضان و عیدین پر سعودی عرب سے ہونے والے سرکاری فیصلہ رویت کا تجزیہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاند کی گردش اور رویت ہلال کا کوئی طبعی قانون بنایا ہی نہیں ہے بلکہ یہ نظام یوں ہی اٹکل پچو طریقہ پر چل رہا ہے، کوئی ۲۷ شعبان ہی کو رمضان کا چاند

دیکھ لیتا ہے، چاند افق سے نیچے جا چکا ہے اور کوئی اس کو دیکھنے کا دعویٰ کر دیتا ہے، ابھی چاند ہلال بننا بھی شروع نہیں ہوا کہ اس کو دیکھنے کا دعویٰ کیا جارہا ہے، گویا بچہ ماں کے پیٹ میں ہے اور دعویٰ کیا جارہا ہے کہ اس کو دیکھا، گود میں اٹھایا وغیرہ۔

بعض حضرات کو یہ خوش فہمی ہے کہ سعودی عرب کے رمضان وعیدین کے اعلانات چاند کی بصری رویت کے مطابق ہوتے ہیں، کسی بھی رصدگاہ سے یہ سادہ سا سوال کیا جائے کہ سعودی سرکاری اعلان رویت کے مطابق اس دن وہاں چاند کی رویت ممکن بھی تھی یا نہیں، اور چاند سعودی افق کے اوپر تھا یا نیچے۔

مثلاً ۱۴۱۲ھ م ۱۹۹۲ء کو یکم رمضان سعودی سرکاری اعلان کے مطابق ۴ر مارچ بروز بدھ تھی، یعنی ۳ر مارچ ۹۲ء بروز منگل سعودی عرب میں چاند کی رویت ہوئی، نیومون ۴ر مارچ ۹۳ء بروز بدھ سہ پہر سعودی معیاری وقت کے مطابق ۴ بجکر ۲۲ منٹ پر تھا، دنیا کی کسی بھی رصدگاہ سے پوچھئے کہ کیا کرۂ ارض کے کسی بھی خطہ میں ۳ر مارچ کو چاند کی رویت ممکن تھی، ہر جگہ سے جواب نفی میں ہوگا کہ نیومون نہیں بنا تو رویت کیسی، ابھی پچھلے مہینے کے چاند کی عمر پوری نہیں ہوئی تو جس کا وجود افق پر نہیں تو شہود کیسے، اگر سعودی عرب کی رویت درست ہوتی تو اسی شام اس کے مغرب میں واقع ہر ملک میں رویت لازماً ہوتی جبکہ رویت اگلے دن بھی نہیں ہوئی، چنانچہ محقق رویت کے مطابق وہ کرۂ ارض پر مختلف جگہوں میں جمعرات اور جمعہ کو دو اور تین دن بعد دیکھا گیا۔

شہادت رویت

شہادت رویت میں گواہوں کی عدالت تیقظ سلامتی حواس، حدت نظر، شک وتہمت سے برأت کی تحقیق کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ فلکی حساب کے مطابق آج رویت ممکن بھی ہے یا نہیں کیونکہ مشہود بہ کے لئے امکان شرط ہے، شہادت رویت پرکھنے کا ایک سادہ سا اصول یہ بھی ہے کہ جس مقام پر رویت ہلال کی اولین شہادت دی جارہی ہے اس سے مغرب میں واقع ہر مقام پر جہاں مطلع صاف ہو اس دن لازماً رویت ہوگی اگر مغرب میں واقع علاقے میں مطلع صاف ہونے

کے باوجود رویت نہیں ہوتی تو مشرق میں واقع مقام پر رویت کی شہادت کا دعویٰ قطعاً غلط ہے

آخری بات

چاند کی گردش کے بارے میں فلکی حساب سیکنڈ کے ہزارویں حصے تک دنیا کے ہر مقام کے لئے درست ہے، البتہ رویت میں دوسرے عوامل اور عوارض (جن میں سے بعض کا اوپر ذکر ہوا) ہونے کی وجہ سے رویت نہ ہو یہ ممکن ہے مگر اس کی وجہ سے فلکی حساب کی قطعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی فلکی حساب کے امکان رویت کی قطعیت کی بنیاد پر صاف مطلع کے باوجود رویت نہ ہونے کی صورت میں رمضان وعیدین یا اسلامی ماہ کی ابتداء کی جائے گی، کیونکہ چاند کا آفتاب کی شعاعوں سے دور ہونا یا افق پر بلند ہونا یہ سبب ہے چاند کی رویت کا نہ کہ سبب ہے اسلامی ماہ کے آغاز واختتام کا، اسلامی ماہ کا آغاز واختتام تو چاند کی بصری رویت ہی پر ہوگا۔

البتہ قدیم وجدید مسلم وغیر مسلم ماہرین فلکیات اس بات پر متفق ہیں، کسی کو بھی اسمیں آج تک قطعاً کوئی اختلاف نہیں، حتیٰ کہ سعودی ام القریٰ تقویم کے مرتب بھی کہ نیومون سے پہلے اور اس کے فوراً بعد دنیا کے کسی خطے میں بھی چاند کی رویت نہیں ہوسکتی، اور تجربہ سے بھی یہی ثابت ہے اور کوئی تجربہ کرنا چاہے تو آج بھی کرسکتا ہے کہ وہ نیومون سے پہلے اور فوراً بعد اپنے افق پر چاند کی رویت کا تجربہ کیجئے اور اپنا اطمینان قلب کرلیجئے، جو لوگ سعودی عرب میں مقیم ہیں یا رمضان سے حج تک وہاں رہنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں وہ ۲۱ فروری ۱۹۹۳ء (رمضان) ۲۲ مارچ ۹۳ء (عید الفطر) اور ۲۱ مئی ۹۳ء (ذی الحجہ) کو اپنے قیام کے مقام سے غروب آفتاب کے بعد کم از کم اگلے ۳۰ منٹ تک رویت کا اہتمام کریں، ۲۱ فروری اور ۲۱ مئی تو رویت کا سرے سے امکان ہی نہیں ہے، اس لئے کہ سورج اور غیر مرئی چاند دونوں ایک ہی وقت پر غروب ہو رہے ہیں، ۲۲ مارچ کو چاند مکہ مکرمہ کے افق پر تقریباً ۸ منٹ رہے گا آپ نظریں جمائیں اور اگلے ۱۵ منٹ تک انتظار کریں۔ افق پر بہت نیچے، اگر ہلال نظر نہ آئے تو بددل نہ ہو، انسانی تاریخ میں اب تک تو کوئی ۸ منٹ کم کیا ۲۰۔۲۵

منٹ بعد ڈوبنے والا چاند بھی دیکھ نہیں سکا ہے، اگر مطلع صاف تھا اور رویت نہیں ہوئی تو پھر اگلے دن عید الفطر منانے کا مطلب ایک ہی ہے کہ آپ نے رمضان کا ایک فرض روزہ کھو دیا ہے۔

علم فلک اور تجربہ کی روشنی میں عدم امکان رویت کی دس صورتیں

۱:۔ اسلامی ماہ کے آخر میں جانب مشرق صبح صادق کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے چاند دیکھا جائے تو اسی دن شام چاند کی رویت قطعاً ناممکن ہے کیونکہ وہ شام کو غروب آفتاب سے پہلے غروب ہو جائے گا۔

۲:۔ اسلامی ماہ کی ۲۹ تاریخ کو شہادت کی بنیاد پر رویت ثابت کی گئی، دوسرے دن افق صاف ہونے کے باوجود چاند کی رویت نہ ہو تو شہادت غلط قرار دی جائے گی کیونکہ جو چاند ۲۹ ویں کو دیکھا جائے وہ دوسرے دن لازماً نظر آئے گا۔

۳:۔ افق، غبار، ابر، بادل، دھند، وغیرہ سے صاف ہونے کی صورت میں چند افراد کا دعوائے رویت ناقابل قبول ہے، چاند افق پر ہوتا تو عمومی رویت ہوتی

۴:۔ چاند کی گردش کا حساب فلکی قطعی طور پر چاند کی رویت کی نفی کرے اس دن چاند کو رویت کا دعویٰ قطعاً ناقابل قبول ہے۔

۵:۔ ۲۹ ویں کو ابر کی وجہ سے شہادت کی بنیاد پر مہینہ شروع کیا گیا، تیس دن پورے ہونے پر افق صاف ہونے کے باوجود چاند کی رویت نہ ہو تو پہلے گواہوں کی تکذیب کی جائے گی، محقق رویت پر ۳۰ دن مکمل ہونے پر چاند کی رویت یقینی ہے۔

۶:۔ سورج گہن کے وقت چاند کی رویت کا دعویٰ قطعاً غلط اور غیر ممکن ہے (جیسا کہ سعودی عرب میں یکم محرم ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲ر جولائی ۱۹۹۱ء امریکہ میں مکمل سورج گہن کے دن رویت کا دعویٰ کیا تھا)

۷:۔ جس علاقہ سے چاند کی اولین رویت کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس سے مغرب میں واقع علاقوں میں باوجود صحو کے اس دن رویت نہ ہو تو مشرقی علاقے کا دعویٰ رویت غلط ہے

۸:۔ نئے چاند کی ولادت (محاق) سے پہلے چاند کی رویت قطعاً غیر ممکن ہے۔

(۹) چاند آفتاب سے پہلے غروب ہو جائے تو بھی اس کی رویت قطعاً ناممکن ہے۔

(۱۰) جب چاند اور آفتاب دونوں ایک ساتھ غروب ہوں تب بھی رویت قطعاً غیر ممکن ہے۔

(مذکورہ بالا تمام رویت کی غیر ممکن صورتوں پر سعودی عرب میں رمضان و عیدین کے موقعہ پر مجلس قضاء اعلیٰ کی طرف سے ہمیشہ شهد شاهدان نقضیٰ علیہ فرما کر رویت کا اعلان کر دیا جاتا ہے، سعودی عرب کے کون سے علاقے میں کہاں اور کس نے چاند دیکھا اس کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی۔)

آخر میں سال رواں ۱۴۱۳ھ کے ماہ شعبان، رمضان و شوال کا سعودی عرب کا فلکی حساب قارئین کے تجربہ اور غور و فکر کے لیے پیش نظر ہے

	ام القریٰ تقویم ۱۴۱۳ھ	نیا چاند مطابق سعودی وقت	مکہ مکرمہ غروب آفتاب	غروب آفتاب کے وقت ہلال کی عمر
یکم شعبان	۲۳ جنوری ۹۳ء	۲۲ جنوری ۲۱ بجکر ۲۰ منٹ	۶ بجکر ۵ منٹ	منفی ۳ گھنٹے ۲۲ منٹ (نیو مون بعد غروب آفتاب)
یکم رمضان	۲۲ فروری	۲۱ فروری ۱۶ بجکر ۵ منٹ	۶ بجکر ۲۲ منٹ	۲ گھنٹے ۱۷ منٹ
یکم شوال عید الفطر	۲۴ مارچ	۲۳ مارچ ۱۰ بجکر ۱۴ منٹ	۶ بجکر ۳۴ منٹ	۸ گھنٹے ۲۴ منٹ۔

۲۶ سال کے تجربہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سعودی عرب میں رمضان و عیدین کے موقعہ پر تقویم ام القریٰ کے مطابق یا اس سے بھی ایک دن مقدم شہادت کی بنیاد پر اسلامی یکم تاریخ کا سرکاری اعلان کر دیا جاتا ہے۔

قارئین خود فیصلہ کریں شعبان کا چاند سعودی افق پر موجود نہیں، رمضان کے چاند کی عمر غروب کے وقت ۲ گھنٹے ہے اور عید الفطر کے چاند کی عمر ۸ گھنٹے، کیا اس دن چاند کی بصری رویت ممکن ہے؟ قطعاً نہیں۔!!

قمر راہ نگری

حق پہ باطل کی جو یلغار ہے ایسا کیوں ہے؟ روز اک فتنہ جو بیدار ہے ایسا کیوں ہے
گل جہاں ہم سے جو بیزار ہے ایسا کیوں ہے؟ کوئی مونس ہے نہ غم خوار ہے ایسا کیوں ہے
ربِّ اکبر کہ ہے معبودِ حقیقی سب کا اس کی طاعت سے جو انکار ہے ایسا کیوں ہے
سنّتِ نبویؐ سے ہم دور ہوئے جاتے ہیں گرم بدعت کا جو بازار ہے ایسا کیوں ہے
دینِ حق کا کبھی داعی تھا جو اس دنیا میں اب وہ باطل کا پرستار ہے ایسا کیوں ہے
حسنِ اخلاق سے اب رشتہ نہیں کیوں اپنا دل شکن اپنا جو کردار ہے ایسا کیوں ہے
اپنی بے عملی کا احساس نہیں کیوں ہم کو؟ عیش کوشی سے جو یہ پیار ہے ایسا کیوں ہے
ساری دنیا میں ہمیں آج ہیں کیوں مشقِ ستم یہ جو یلغار پہ یلغار ہے ایسا کیوں ہے
یہی مسلم کہ تھے سرتاپا خلوص اور وفا ان میں اب جنگ اور پیکار ہے ایسا کیوں ہے
پہلے مقصود مسلماں کا رضائے رب تھا اب وہ دنیا کا طلب گار ہے ایسا کیوں ہے
مسجدیں جن سے تھیں آباد کبھی آج وہی رونقِ کوچہ و بازار ہے ایسا کیوں ہے

آخرت کی نہیں کیوں آج ہمیں فکر قمر
ہم کو پیارا یہی سنسار ہے ایسا کیوں ہے؟

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد و حساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جا رہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگا دی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھا لیا گیا، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات مُعاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے، آمین۔

پتہ

ڈرافٹ و چیک کیلئے :- " دارالعلوم دیوبند " اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے :- حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پن کوڈ نمبر 247554

COD-NO- 01336
PHON-NO. 22429
دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
PIN-NO-247554
دارالعلوم
جلد نمبر ۷۹
شمارہ نمبر ۴
ماہ شوال المکرم ۱۴۱۴ھ مطابق اپریل ۱۹۹۴ء
فی شمارہ ۶/=
سالانہ ۶۰/=
نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
مدیر
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند
سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۳۰۰/= روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/= ”
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/= ”
ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس اختر سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت [illegible] مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

ہمارے ملک ہندوستان نے آزادی کے تقریباً ۴۸ سال پورے کرلیے ہیں، قوموں اور ملکوں کے عروج وزوال، ارتقاء وانحطاط میں یہ مدت اگرچہ کوئی فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتی پھر بھی یہ ایک ایسا لمبا وقفہ ہے جس میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہوجاتے ہیں، اس لئے ملک کی تعمیر وترقی اور پستی وگراوٹ کا جائزہ لیتے وقت اسے یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

آزادی کے اس ۴۸ سالہ عہد میں باستثناء ڈیڑھ دو سال کے ملک کی زمام اقتدار "کانگریس" ہی کے دستِ تصرف میں رہی ہے، اور آج بھی بلا شرکت غیرے وہی اس پر قابض ومتصرف ہے، بلا شبہ اس مدت میں ہندوستان نے علم وسائنس، صنعت وحرفت، تجارت وزراعت وغیرہ میدانوں میں قابلِ ذکر پیش رفت اور ترقی کی ہے، اور بلاشبہ ان میدانوں میں آج اسے اپنے پڑوسی ملکوں پر واضح برتری اور نمایاں فوقیت حاصل ہے، اپنی اس کامیابی پر کانگریسی حکومت بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔

لیکن علمی صنعتی اور زراعتی میدانوں میں اس خوش آئند پیش قدمی پر اظہارِ مسرت کے ساتھ حکمراں طبقہ کو اس تلخ حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ۴۸ سال کے اس عرصہ میں ہمارا ملک اخلاقی اعتبار سے پستی اور گراوٹ کی انتہا کو پہونچ گیا ہے، انارکی، لاقانونیت، جھوٹ، فریب

لوٹ کھسوٹ، تعصب، منافرت، جھگڑا، فساد اور قتل و غارت گری ملک کے معاشرے کا لازمی جزو بن چکے ہیں، دفتر کے معمولی چپراسیوں سے لے کر عزت مآب وزراء تک قانون اور اخلاق سے بالاتر ہو کر زر اندوزی میں لگے ہوئے ہیں، سرکاری عدالتوں میں دن دھاڑے عدل و انصاف نیلام ہوتا ہے، اور وہ ملک جو امن و آشتی کا گہوارہ اور محبت و اخوت کا سدابہار چمنستان تھا جس کی رواداری و صلح جوئی پورے عالم میں مشہور تھی، عدم تشدد اور اہنسا جس کا قومی آئیڈیل تھا، آج وہی ملک منافرت و تعصب کی آماجگاہ اور ظلم و تشدد کی رزم گاہ بنا ہوا ہے، سال کا کوئی مہینہ اور مہینہ کا کوئی ہفتہ ایسا نہیں گذرتا جس میں مذہب یا ذات برادری کے نام پر فساد، غارت گری اور خوں ریزی کا بازار گرم نہ ہوتا ہو، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی اقلیتیں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی ہیں اور ان کے اندر اپنی مدافعت کے لئے ہتھیار سنبھال کر میدان میں نکل آنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

اگر ملک کے یہی لیل و نہار رہے اور جبر و تشدد کے اس سیل رواں کے آگے بند لگانے کی کوشش نہیں کی گئی تو اس کی سرکش موجیں نہ صرف صنعتی و معاشی ترقیات کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیں گی بلکہ ملک کی سالمیت اور استحکام کی بنیادوں کو بھی اکھاڑ پھینکیں گی، اور اس تباہی و بربادی، انتشار و اختلال کی تمامتر ذمہ داری تنہا کانگریس پارٹی اور اس کی حکومت کے سر آئے گی، اس لئے حکومت وقت کو اگر ملک کا استحکام، اسکی سالمیت اور اپنی نیک نامی نہیں بلکہ اپنا وجود و بقا عزیز ہے تو اسے پہلی فرصت میں دہشت گردی اور تشدد پسندی کے رجحان کو جس طرح بھی ممکن ہو ختم کرنا چاہئے، کیونکہ کوئی بھی حکومت چاہے وہ اقتصادی و معاشی طور پر کتنی ہی مستحکم و مضبوط کیوں نہ ہو، ظلم و جور کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی ؎

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

ہٹلر اور مسولینی کی قوت اور شوکت اور رعب و دبدبہ سے کون واقف نہیں ہے لیکن ظلم و تشدد نے انھیں ذلت و نکبت کے ایسے گڑھے میں پہونچا دیا ہے کہ آج عزت کے ساتھ ان کا نام لینے کا بھی کوئی روادار نہیں ہے، برطانوی سامراج کی سبق آموز اور عبرت خیز

داستان نگاہوں کے سامنے ہے، ایک وقت وہ تھا کہ اس کی حدود سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا مگر مکروفریب اور ظلم وستم کی خوئے بدنے انھیں آج ایک محدود خطے میں محصور ہوجانے پر مجبور کر دیا ہے۔

اربابِ اقتدار کو ان واقعات سے سبق لینا چاہئے، اور اس غلط فہمی میں ہرگز رہنا نہیں چاہئے کہ فسطائی اور دہشت پسند طاقتوں کا رخ ہمارے بجائے اقلیتوں کے ایک خاص طبقہ کی جانب ہے، اور ان کے ہاتھوں جان و مال کا جو زیاں ہو رہا ہے اس سے ملک یا ہماری حکومت کو کوئی نقصان نہیں پہونچ رہا ہے، نہیں نہیں مظلوموں کا خون ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائیگا اور اُن کے جھلستے ہوئے جسموں کا دھواں برق سوزاں بن کر تمھارے خرمنِ اقتدار کو خاکستر کردیگا سہ

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمھارا تذکرہ تک بھی نہ ہوگا داستانوں میں

حادثہ جانکاہ

مورخہ ۱۹ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ کو دارالعلوم دیوبند کے ہر دل عزیز استاذ حضرت مولانا احرار الحق صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور خلاصۃ العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ کے اہم خلفاء میں تھے، تواضع وانکساری، سادگی اور پاک نفسی میں مرحوم اپنی مثال آپ تھے، زہد وقناعت اور عبادت وریاضت میں اکابر کے نمونہ تھے، مولانا سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور وہ صحیح معنوں میں حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کی بزم دوشیں کی ایک روشن شمع تھے مگر افسوس کہ وہ بھی خاموش ہوگئی، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اپنی آغوش مغفرت میں جگہ دے کر ہر قسم کی رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرمائیں۔

نوٹ:۔ انشاء اللہ کسی آئندہ شمارہ میں مولانا کے تفصیلی حالات لکھے جائیں گے

کلام الٰہی اور کلام رسولؐ کا شائستہ اسلوب

از — مولانا اخلاق حسین قاسمی

جنسی مسائل پر ایک کتاب کی اشاعت نے یہ ضرورت واضح کی کہ کلام الٰہی اور کلام نبوی کا جو شائستہ اور مہذب اسلوب ہے اسے واضح کیا جائے۔

جنسی مسائل کی تشریح میں فقہ کی درسی کتابوں کا پیرایہ بیان تعلیمی اور تربیتی ہے، لیکن اس پیرایہ بیان پر قرآن کریم اور کلام نبوی کو قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

قرآن و حدیث میں نہایت جامعیت کے ساتھ اشاروں اور کنایوں سے کام لیا گیا ہے تاکہ قرآن اور حدیث کا معیار تہذیب بھی دوسری کتابوں سے ممتاز رہے۔

مذہبی عربی کتابوں کے اردو تراجم سے جہاں اشاعت دین اور تبلیغ اسلام کے پہلو سے فائدہ پہونچا وہاں اس کا مضر اور نقصان رساں پہلو بھی سامنے آیا کہ ہر اردو خواں شخص نے ان تراجم سے احادیث نقل کرنی شروع کردیں اور شارحین حدیث نے ان پر جو کلام کیا ہے وہ نظرانداز ہوگیا۔

ماضی میں مشہور عالم ڈپٹی نذیر احمد نے امہات الامہ نامی کتاب لکھی اور اس میں مصنف نے اردو زبان کے فحش محاوروں سے کام لیا اور منصب نبوت کا تقدس اس سے مجروح ہوا، چنانچہ امت کے احتجاج پر اس کتاب کو جامع مسجد کے چوراہے پر نذر آتش کیا گیا۔

قرآن کریم کا مہذب اسلوب:-

سب سے پہلے کلام الٰہی کے شائستہ اسلوب پر غور کیا جائے۔

قرآن کریم نے جنسی مسائل میں مسلمانوں کی اصلاحی رہنمائی کا فرض بھی ادا کیا ہے اور اس میں نہایت شائستہ کنایات سے کام لیا ہے۔

عربی لغت میں مباشرت کے معنی کسی کام میں مشغول ہونے کے ہیں اور لمس کے معنی چھونے کے ہیں اور افضاء کے معنی پہنچنے اور پہنچانے کے ہیں۔

قرآن کریم نے ان تینوں لفظوں کو بطور معنی مجازی (کنایہ) جماع اور شب باشی کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، اس فعل زوجیت کے لئے عرب میں جو الفاظ عام محاورات میں بولے جاتے تھے ان سے قرآن کریم نے احتراز کیا ہے۔

باشروھن ــــ ولا تباشروھن (بقرہ ۱۸۶) تم لوگ ان بیویوں کے ساتھ قربت کرو، اور اعتکاف کی حالت میں قربت نہ کرو ــــ اردو میں یہ مجاز وکنایہ شب باشی کے مفہوم میں صریح اور بازاری محاورہ بن گیا ہے۔

اَوْ لٰمستم النساء (نساء ۴۳) یا تم عورتوں سے قربت کرکے آؤ۔ وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ (نساء ۲۱) اور تمھارے بعض تمھارے بعض تک پہونچ چکے یعنی تم ان عورتوں سے مہر کیسے واپس لوگے جب کہ تمھارے اور ان کے درمیان قربت ہو چکی ہو۔

علماء تفسیر نے لکھا ہے کہ قرآن کریم عام طور پر قریش عرب کی زبان اور ان کے محاورات میں گفتگو کرتا ہے، لیکن خاص مسائل میں وہ اپنی خاص زبان اختیار کرتا ہے اور خاص اسلوب وضع کرتا ہے، جو قرآن کریم کا مستقل معجزہ ہے۔

کلامِ رسولؐ کا شائستہ اسلوب :-

یہی صفت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام (احادیث نبویؐ) کے اندر پائی جاتی ہے، ایک موقعہ پر بنو فہد کے ایک وفد نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، حضور! ہم اور آپ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک ہی مقام پر ہم سب نے پرورش پائی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ایسی عربی زبان میں بات چیت کرتے ہیں جس کی لطافت اور بلاغت اکثر لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔

آپؐ نے فرمایا ان اللہ عزوجل اَدَّبَنِی فَاَحْسَنَ اَدَبِی وَنَشَاْتُ فِی بَنِی سعد بن بکر (اللہ تعالیٰ نے میری (لسانی) تربیت خود فرمائی اور بہت خوب فرمائی اور میں عرب کے

فصیح خاندان بنی سعد میں پروان چڑھا ہوں۔

حضورؐ کے کلام کا ادبی معیار بہت بلند تھا اور اس کے ساتھ عام فہم سادگی بھی تھی، آپ کبھی بازاری اور گھٹیا الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے، آپ ہدایت انسانی کے عظیم مشن پر فائز تھے۔ اور اس کو پیش کرنے کے لئے خدائی وحی اور آسمانی الہام کی رہنمائی میں آپ کی زبان کا (قرآن کریم کے بعد) ایک معجزانہ اسلوب بن گیا تھا۔

حضورؐ کی صفت حیاء:-

ابو سعید خدری رضؓ فرماتے ہیں کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَشَدّ حیاءً من العذراء فی خِدرِھا وکان اذا کرہ شیئا عرفنا فی وجہہ (شمائل ترمذی ۲۶)، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں حد درجہ حیاء تھی، ان کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ جو پردہ میں رہتی ہیں۔ چنانچہ جب آپ کے سامنے کوئی ناگوار بات ہوتی تھی تو ہم آپ کے چہرہ پر اس کا اثر محسوس کر لیتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ حضورؐ کی شائستہ مزاجی اور سنجیدہ کلامی کے بارے میں فرماتی ہیں لم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاحشًا ولا مُتفحِّشًا (ایضاً ۲۵) فحش گوئی کرنا نہ آپ کی عادت تھی اور نہ آپ کبھی بناوٹی طور پر فحش کلامی کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضؓ ہی کا بیان ہے کہ حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے انّ من اشرّ الناس من ترکہٗ الناس اتقاء فحشہ (شمائل ۲۵) وہ شخص لوگوں میں بدترین شخص ہے جس کی فحش کلامی کے خوف سے لوگ اس سے کنارہ کرتے ہوں۔

حضرت امام حسین رضؓ اپنے بڑے بھائی امام حسن رضؓ سے روایت کی جب امام حسینؓ نے ان سے اپنے نانا جان کی سیرت کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا ولا یطلبُ عورتہٗ آپ کی سیرت و خصلت میں سے ایک صفت یہ تھی کہ آپ لوگوں سے قابل شرم باتیں دریافت نہیں کرتے تھے۔

جنسی قربت کیلئے آپؐ کا اسلوب :-

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنسی فعل کو مختلف مجازی پیرایوں میں بیان کرتے تھے، ایک موقع پر فرمایا یدعوا امرأتہ الیٰ فراشہ (ص۲۸) وہ شوہر اپنی عورت کو بستر کی طرف بلائے اور وہ انکار کردے تو خدا اس عورت سے ناراض ہوجاتا ہے، ایک روایت میں فرمایا اذا الرجل دعا زوجتہ فلتاتہ وان کانت علی التنور (۲۸) جب شوہر اپنی ضرورت کے لئے اپنی بیوی کو بلائے تو وہ اس کی تعمیل کرے اگرچہ وہ چولھے پر بیٹھی ہو، ایک روایت میں فرمایا ننگے ہونے سے پرہیز کرو، کیونکہ تمھارے ساتھ وہ فرشتے رہتے ہیں جو کبھی تم سے الگ نہیں ہوتے سوائے دو موقعوں کے ایک اس وقت جب تم قضاء حاجت کرو، دوسرے اس وقت جب انسان اپنی بیوی کی طرف بڑھے (ترمذی جلد ۲ ص۱۲۵) اس ہدایت میں حضورؐ نے جنسی قربت کیلئے قرآنی لفظ افضاء استعمال فرمایا اہل عرب فعل قربت کیلئے جماع کا لفظ استعمال کرتے تھے اس کے حقیقی معنی جمع ہونا اور اکٹھا ہونا ہے مرد اور عورت کے اکٹھا ہونے کو مجازاً جماع کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا، حضورؐ نے ایک روایت میں اس لفظ کو بھی استعمال فرمایا (مشکوٰۃ ص۲۸)

صحابۂ کرام کا ادب حضورؐ کے ساتھ :-

حضرات صحابۂ کرام حضورؐ کے مزاج سے واقف تھے اور کبھی آپ کے سامنے اپنی گفتگوؤں میں یا کسی سوال میں کوئی ناشائستہ لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔

ایک شخص نے اپنی باندی کے ساتھ عزل کرنے کا مسئلہ پوچھا اور اس طرح سوال کیا ان لی جاریۃ ھی خادمتنا وانا اطوف علیھا واکرہ ان تحمل (مشکوٰۃ ص۲۷۵) میری ایک باندی ہے جو میری خدمتگزار ہے اور میں اس کے گرد پھرتا ہوں اور اسے پسند نہیں کرتا کہ وہ حاملہ ہو، انھوں نے فعل قربت کو طواف کرنے کے مجازی پیرائے میں بیان کیا، حضرت امام حسینؓ نے اپنے ماموں جناب ہالہ (حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر کے لڑکے) کے حوالے سے حضورؐ کے شخصی اوصاف کے بارے میں بہت کچھ بیان کی۔ ھو منھوس العقب یعنی قلیل لحم العقب آپ

کا پچھلا بہت ہلکا تھا، پچھلے حصہ کے لئے عام لوگ جو الفاظ استعمال کرتے تھے ان سے راوی نے پرہیز کیا اور ایک عام لفظ عقب استعمال کیا۔

خلوت کی باتیں کرنے کی ممانعت :-

حضرت عائشہ صدیقہ رض فرماتی ہیں حضورم نے ارشاد فرمایا :- ان من اشر الناس عند اللہ منزلۃ یوم القیامۃ الرجل یفضی الی امرأتہ وتفضی الیہ ثم ینشر سرھا (مشکوۃ ۲۷۶ بحوالہ مسلم شریف)
لوگوں میں بدترین شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اپنی عورت کے پاس جائے، پھر وہ شخص راز کی باتوں کو پھیلائے۔

اس وعید کے مطابق آپ کے صحابہ رض اور خاص کر آپ کی ازواج مطہرات کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی قربت کے حالات کو بیان کرتی ہوں گی، اور یہ بات کہ خود حضورم اپنی وعید اور تنبیہ کے باوجود ایسا عمل کرتے ہوں گے؟ شقی انسان ہی اس کا تصور کرسکتا ہے؟

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے منی اور مذی کے مسائل دریافت کرنے کے لئے حضرت مقداد کو حضورم کے پاس بھیجا اور شرم کی وجہ سے خود جاکر حضورم سے سوال نہیں کیا کیونکہ حضرت علی ؓ حضورم کے داماد بھی تھے۔

حضرت عمر رض کا واقعہ :-

صحابہ کرام کی حضورم کے سامنے شائستہ کلامی کی بحث میں حضرت عمر رض کا ایک واقعہ قابل غور ہے بعض لوگ اس واقعہ کو تفسیر کی کتابوں میں سرسری طور پر دیکھ کر نقل کر دیتے ہیں۔ ذیل میں اس واقعہ کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مسند احمد کے حوالہ سے ابن کثیر نے حضرت ابن عباس رض کا یہ قول (عن سعید ابن جبیر) نقل کیا ہے کہ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا : میں ہلاک ہوگیا یا رسول اللہ آپ نے فرمایا، کیا ہوا؟ حضرت عمر نے عرض کیا ــــ حولت رحلی فی البارحۃ۔ حضور! میں نے رات کو اپنے کجاوہ کا رخ پھیر دیا ــــ حضور نے اس پر سورۂ بقرہ کی آیت (۲۲۳) تلاوت فرمائی۔

اس کتاب کے مؤلف نے بریکٹ میں یہ تشریح کی ہے (یہ اشارہ ہے یعنی پشت کی طرف سے جماع کرلیا (صفحہ ۹۴)

اس اثر کی روایتی حیثیت سے پہلے حضرت عمرؓ کے اس کنایاتی فقرہ کے مفہوم پر غور کرو، جو غیر طبعی اور غیر فطری مفہوم اس مولف نے لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اپنی عورت کے ساتھ کروٹ سے صحبت کی ہے ــــ تحویل کا یہ مفہوم حضرت نافع کے اس قول سے واضح ہوتا ہے۔

حضرت نافع (شاگرد ابن عمرؓ) فرماتے ہیں کہ مدینہ کے یہود کروٹ سے صحبت کرتے تھے "انما یوتین علی جنوبھن اھ" چونکہ یہ فعل یہودیوں کا تھا، اس لئے حضرت عمرؓ نے خیال کیا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلط حرکت نہ ہوگئی ہو، حضورؐ نے ان کی غلط فہمی دور کردی کہ نہیں، اس میں کوئی حرج نہیں۔

روایتی حیثیت :-

حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے اس قول میں یہ کہا گیا ہے کہ اس واقعہ پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی، لیکن ابن کثیر نے مجاہد سے حضرت ابن عباس کا قول بروایت سنن ابوداؤد نقل کیا ہے کہ یہ آیت مہاجرین کے ایک خاندان کے بارے میں نازل ہوئی جس کے ایک فرد نے مدینہ کی انصاری خاتون کے ساتھ نکاح کرکے آزادی کے ساتھ صحبت کرنی چاہی اور انصاری عورت نے ایک ہی (عام طریقہ پر) صحبت کرنے پر اصرار کیا ورنہ علیحدگی کی دھمکی دی۔

یہ واقعہ حضورؐ کے علم میں آیا، اور آپ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی ــــ اسی کے ساتھ ابن کثیر نے بخاری اور مسلم کی متفقہ حدیث بیان کی ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہودیوں کا غلط خیال تھا کہ عقب کی طرف سے جماع کرنے سے بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔

اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ نازل ہوچکی تھی حضرت عمرؓ کے واقعہ میں حضورؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

مفسرین نے تشریح کی ہے کہ حضورؐ کے تلاوت کرنے اور کسی موقعہ پر پیش کرنے کو

بھی نازل ہونے سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

علامہ ابن کثیر نے ابوداؤد کی روایت کی تائید میں مسند امام احمد اور طبرانی کے حوالے سے دو روایتیں نقل کی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سعید ابن جبیر والے قول کو ابن کثیر مرجوح قرار دے رہے ہیں۔

ابن عمرؓ کو بدنام کرنے کی کوشش :-

حضرت عمرؓ کے بارے میں جو قول واثر ابن عباس عن سعید ابن جبیر نقل کیا گیا ہے وہ اسرائیلیات کا حصہ ہے، جس میں اس جلیل القدر صحابی کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس خیال کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جسے امام نسائی نے بیان کیا ہے۔

کچھ لوگوں نے حضرت نافع سے سوال کیا کہ آپ کی طرف سے کچھ لوگ یہ نقل کرتے ہیں کہ آپ اپنے استاد حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے بارے میں یہ بیان کرتے ہیں کہ افتیٰ ان توتی النساء فی ادبارھن ـــ قال کذبوا علی ۔ عبداللہ ابن عمر عورتوں کے ساتھ پیچھے (دبر) کے حصہ میں صحبت کرنے کے جائز ہونے کا فتویٰ دیتے تھے، نافع نے جواب دیا کہ وہ مجھ پر جھوٹ باندھتے ہیں، مجھ سے تو ابن عمرؓ نے آیت بقرہ (۲۲۳) کے شان نزول میں روایت بیان کی (اوپر بخاری، مسلم اور ابوداؤد کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے)

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس فعل حرام کے جائز ہونے کے قول کو بعض لوگوں نے امام مالکؒ اور فقہاء مدینہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے، حالانکہ متعدد صحیح احادیث میں اس فعل کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور یہی مسلک تمام فقہاء کا ہے۔ (ابن کثیر جلد اول ص۲۶۱ ـــ ۲۶۲ مصری)

علمی سطح پر اسلام کی عظیم ہستیوں کے بارے میں جو منافقانہ سازشیں کی جارہی تھیں یہ پروپیگنڈہ بھی انہی کا حصہ ہے۔

علمی سطح پر سیاسی ہزیمت زدہ طبقہ نے جو دھاندلی مچائی اس سے نہ صحابۂ کرام محفوظ رہے اور نہ فقہاء کرام محفوظ رہے۔

نکاح وطلاق کا اسلامی ضابطہ

از ـــــــــ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

اسلامی شریعت میں جو درحقیقت ایک پاکیزہ نظام حیات اور مکمل دستور زندگی کا دوسرا نام ہے، رشتۂ نکاح کو ایک امتیازی مقام ومرتبہ حاصل ہے، قرآن وحدیث کے بیانات سے مرد وعورت کے اس حیات آفریں تعلق کی بڑی اہمیت معلوم ہوتی ہے، چنانچہ مولائے کائنات نے اپنی نعمتِ ربوبیت کا ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر رشتۂ زوجیت کی افادیت واہمیت کی جانب اشارہ فرمایا۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً [1]

اور اس کی (ربوبیت ووحدانیت کی) نشانیوں سے ہے یہ کہ بنادیئے تمہارے واسطے تمہاری جنس سے جوڑے، تاکہ چین حاصل کرو ان کے پاس اور پیدا کردیا تمہارے اندر پیار ومحبت۔

یعنی فطری وپیدائشی طور پر مرد وعورت کے درمیان جو خاص قسم کی محبت ورحمت پیدا کردی گئی ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ازدواجی رشتہ کا مقصد پورے طور پر حاصل ہو، یہ قدرت کا عجیب کرشمہ اور عظیم نشانی ہے کہ ایجاب وقبول کے دو بول کے بعد زوجین کے اندر ایک انقلاب عظیم پیدا ہوجاتا ہے کہ ابھی اجنبیت تھی، ابھی یگانگت پیدا ہوگئی، ابھی بے تعلقی تھی منٹ بھی نہیں گذرا کہ تعلق پیدا ہوگیا، دلوں کے اسی انقلاب کو آیت اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں صراحت کے ساتھ نکاح کی ترغیب اور اس کی ضرورت وافادیت کو واضح کیا گیا ہے، ایک طویل حدیث کے آخر میں آپؐ نے نکاح کو اپنی سنت بتاتے ہوئے اس کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے "فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ" جو شخص میری سنتِ نکاح سے منہ پھیرے وہ میرے طریقہ پر نہیں ہے [2]

---

[1] سورۃ الروم۔ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۸۔

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے "ان سنتنا النکاح" نکاح ہماری سنت ہی ہے۔[1]،
ایک حدیث میں اسے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔
"اربع من سنن المرسلین الحناء والتعطر والسواک والنکاح" چار چیزیں اللہ کے رسولوں کی سنت ہیں مہندی کا خضاب (بعض نسخوں میں الحنا کے بجائے الحیاء ہے) عطر کا استعمال مسواک کرنا اور نکاح کرنا[2]

ایک حدیث میں نکاح کی ترغیب ان الفاظ میں دی گئی ہے "اذا تزوج العبد فقد استکمل نصف الایمان فلیتق اللہ نصف الثانی[3]" مرد مومن نے جب نکاح کرلیا تو اس نے اپنے نصف دین کو مکمل کرلیا لہذا دوسرے نصف کے سلسلہ میں اسے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے (چونکہ عموماً آدمی فرج اور بطن کی خواہش و اشتہار کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو جب اس نے نکاح کرکے اپنے فرج کی عفت و حفاظت کا انتظام کرلیا تو گویا اس نے اپنے نصف دین کو پورا کرلیا، اب رہ گیا معاملہ پیٹ کی خواہش کا تو اس کا علاج تقویٰ بتایا گیا اس طرح پورے ایمان کی حفاظت ہوجائے گی۔

ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص جوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یامعشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحسن للفرج[4] اے جوانو تم میں سے جو نکاح کی قدرت رکھے (یعنی اسے بیوی کی مہر اور خرچہ دینے کی قدرت ہو) تو چاہئے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ یہ نگاہوں کو خوب جھکانے والا اور فرج کی اچھی طرح حفاظت کرنے والا ہے، مطلب یہ ہے کہ نکاح آدمی کی عفت و پاکدامنی کا بہترین ذریعہ ہے، لہذا نکاح پر قدرت رکھتے ہوئے اس سے پہلوتہی کرنے سے آنکھ اور فرج کے گناہ میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

انھیں جیسی احادیث کے پیش نظر امام اعظم ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ نے عبادات نافلہ میں اشتغال کے مقابلہ میں نکاح کو افضل قرار دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ نکاح کی حیثیت

---

[1] مسند امام احمد ج ۵، ص ۱۶۳، [2] انتقاء الترغیب والترهیب ص ۱۸۲، [3] رواہ البیہقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ ج ۲، ص ۲۶۸۔ [4] رواہ الامام البخاری فی صحیحہ کما فی المشکوٰۃ، ج ۲، ص ۲۶۷

صرف ایک معاملہ و معاہدہ ہی کی نہیں ہے بلکہ عام معاملات و معاہدات سے بالاتر یہ ایک گونہ عبادت و سنت کی حیثیت بھی رکھتا ہے جس میں خالق کائنات کی طرف سے انسانی فطرت میں پیدا کردہ شہوانی جذبات کی تسکین کا ایک بہترین اور پاکیزہ سامان بھی ہے، اور ازدواجی تعلقات سے بقاء نسل انسانی اور تربیت اولاد کا حکیمانہ نظام موجود ہے۔

نکاح ایک عربی لفظ ہے جس کا اصلی مادہ "ن، ک، ح" ہے۔ کہا جاتا ہے "نکح المرأۃ" فلاں نے عورت سے شادی کی، "نکح المطر الارض" بارش زمین میں جذب ہوگئی، "نکح الدواء" دوا نے اثر کیا، "نکح النعاس عینہ" اس کی آنکھوں میں نیند سرایت کر گئی۔ ان سب محاوروں میں جذب وضم کا معنیٰ مشترک ہے، چنانچہ اسلام نے اس من تن شدم تو جاں شدی کے مفہوم کو نہایت بلیغ و دل نشیں اسلوب میں بیان کیا ہے جس میں نکاح کے مفہوم کی بھی رعایت ہے اور نکاح سے شرعی مطلوب واقعی کا بیان بھی ہے، قرآن کا ارشاد ہے "ھن لباس لکم وانتم لباس لھن" گویا چولی دامن یا بالفاظ دگر جسم و سایہ کے رشتہ کی تعبیر ہے، کہ عورتیں تمھارے لئے بطور لباس کے ہیں اور تم ان کے لئے لباس کے مانند ہو، دونوں کے منافع باہم مشترک ہوگئے۔ زوجین کا یہی مشترک منافع وسعت پذیر ہو کر کے خاندانی اشتراک کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس کے زیر سایہ صالح اسلامی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ رشتہء نکاح کی اس خصوصی اہمیت وافادیت کی بنا پر شریعت نے اس کے انعقاد اور وجود پذیر ہونے کے لئے کچھ ایسے آداب اور ضروری شرائط مقرر کی ہیں جو دیگر معاملات خرید و فروخت اجارہ معاہدہ وغیرہ میں نہیں ہیں، مثلاً ہر عورت اور مرد سے نکاح درست نہیں، اس بارے میں اسلامی شریعت کا ایک مستقل قانون و ضابطہ ہے جس کی رو سے بہت سی عورتوں اور مردوں کا باہم نکاح نہیں ہو سکتا، دیگر معاملات کے منعقد و مکمل ہونے کے لئے گواہی شرط نہیں ہے، جب کہ نکاح کے صحیح ہونے کے واسطے گواہوں کا موجود ہونا شرط ضروری ہے، اگر مرد و عورت بغیر گواہوں کے نکاح کرلیں تو یہ نکاح قانون شریعت کے لحاظ سے باطل اور کالعدم ہوگا۔

نکاح ایک دائمی رشتہ

اسلام کا مطمح نظر یہ ہے کہ پاکیزہ رشتہ اور قابل احترام معاہدہ زندگی میں قائم و دائم رہے، اس کے توڑنے اور

ختم کرنے کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ اس رشتہ کو منقطع اور ختم کرنے کا اثر صرف زوجین پر ہی نہیں پڑتا بلکہ نسل و اولاد کی تباہی اور بسا اوقات خاندانوں میں فساد و نزاع تک کی نوبت پہونچ جاتی ہے جس سے پورا معاشرہ بری طرح متاثر ہوجاتا ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ازدواجی و عائلی مسائل کو دیگر تمام معاملات سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہے کہ دنیا کے عام معاشی مسائل میں تجارت، شرکت، اجارہ وغیرہ کے سلسلے میں قرآن نے صرف اصول و کلیات کے بیان پر اکتفار کیا ہے ان کے فروعی مسائل شاذ و نادر ہی قرآن کے زیر بحث آتے ہیں، برخلاف نکاح و طلاق کے، ان کے صرف اصول بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے اکثر و بیشتر فروع و جزئیات بھی براہ راست حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کردیئے ہیں۔

زوجین کی ازدواجی زندگی سے متعلق جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، اسلام نے میاں بیوی کو اپنے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے مردوں سے کہا کہ عورت تیری باندی یا نوکرانی نہیں ہے بلکہ وہ تیری رفیقۂ حیات اور برابر کی شریک زندگی ہے، چنانچہ فرمایا گیا "ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف" کہ جس طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں جن کی ادائیگی لازمی ہے اسی طرح مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمہ ہیں جنھیں پورا کرنا ضروری ہے۔

یہ آیت پاک مرد و عورت کے حقوق باہمی کے سلسلے میں ایک قانونی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے

مرد کی حکیمانہ برتری

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ دنیوی معاملات میں مرد کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، لیکن مردوں کی یہ برتری آمریت و استبداد کی نہیں ہے بلکہ مردوں کو بھی قانون شرع اور بعض معاملات میں عورتوں سے مشورہ کا پابند بنایا گیا ہے، درحقیقت یہ تفوق و برتری خاص مصلحت و حکمت کے تحت ہے اور عطیۂ الٰہی ہے جس میں مردوں کی سعی و عمل یا عورتوں کی کوتاہ دستی و بے عملی کا کوئی دخل نہیں ہے، پھر مردوں کی افضلیت کو بیان کرنے کے لئے قرآن حکیم نے عجیب حکیمانہ اسلوب اختیار کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ "الرِّجَالُ قَوّامُونَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ"

۱؎ سورۃ النساء

مرد حاکم و نگراں ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے اس اسلوب میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا بعض اور جزو قرار دیکر اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کسی چیز میں مردوں کو فوقیت اور برتری ثابت ہے تو بھی اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہئے جیسے کہ انسان کا سر ہاتھ سے افضل و برتر ہے، تو جس طرح سر کی افضلیت ہاتھ کے مقام و مرتبہ اور اہمیت کو کم نہیں کرتی اسی طرح مرد کا حاکم ہونا عورت کے درجہ کو کم نہیں کرتا، یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے مثل اعضاء و اجزاء کے ہیں گو مرد سر ہے تو عورت بدن ہے، انسانی جسم اسی وقت حقیقی سکون و راحت حاصل کر سکتا ہے جب کہ جسم کے سارے اعضاء صالح اور تندرست ہوں چنانچہ نیک بیویاں مرد کی سعادت کی علامت ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ما استفاد المؤمن بعد تقوی اللّٰہ خیرا لہ من زوجة صالحة ان امرها اطاعته وان نظر الیها سرته وان اقسم علیها ابرته وان غاب عنها نصحته فی نفسها وماله رواه ابن ماجه[1]

تقویٰ کے بعد کسی مرد مومن نے صالحہ بیوی سے بہتر کوئی چیز حاصل نہیں کی ایسی نیک سیرت و خوبصورت بیوی کو اگر شوہر کوئی حکم دیتا ہے تو وہ اسے بجا لاتی ہے اور اگر اس کی جانب دیکھتا ہے تو وہ اسے شاداں و فرحاں کر دیتی ہے اور اگر شوہر اس عورت پر قسم کھا لیتا ہے (مثلاً یہ کہ وہ یہ کام کرے گی) تو وہ کام کر کے اس قسم میں اسے صادق کر دیتی ہے، اور اگر شوہر کہیں چلا جاتا ہے تو اس کی غیبوبت در غیر موجودگی میں اپنی ذات کی اور شوہر کے مال کے سلسلے میں خیر خواہی کا معاملہ کرتی ہے یعنی اپنی ذات کو فسق و زنا سے اور شوہر کے مال کو خیانت اور ضائع ہونے سے بچائے رکھتی ہے۔

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک

شوہر و بیوی کے تعلقات انتہائی ذاتی ہوتے ہیں اور بربنائے بشریت بسا اوقات دونوں میں رنجش بھی ہو جاتی ہے، بعض دفعہ شوہر غصہ میں ڈانٹ ڈپٹ کر دیتا ہے اور کبھی بیوی بھی ناز دکھاتی ہے اس سلسلے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے۔

استوصوا بالنساء خیرا فانهن خلقن من ضلع وان اعوج شیء فی الضلع اعلاه فان ذهبت تقیمه کسرته وان ترکته لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء خیرا (متفق علیه)[2]

---

[1] الترغیب والترهیب ص ۱۸۲ ۔ [2] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۸۰

عورتوں کے ساتھ خوش معاملگی اور بھلائی کی وصیت اور تاکیدی حکم کو قبول کرو، کیونکہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں (جو ٹیڑھی ہے) پسلی کی ہڈیوں میں سب سے زیادہ کج اور ٹیڑھی اوپر کی پسلی ہے اگر تو اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) اسے توڑ ڈالے گا، اور اگر تو نے اسے یونہی چھوڑ دیا تو وہ بحالہ ہمیشہ کج ہی رہے گی، یہی حال عورتوں کا ہے کہ وہ اپنے انفعالی مزاج اور زود رنج طبیعت کی بنا پر اعمال و اخلاق کے لحاظ سے استقامت و درستگی پر نہیں رہتیں اگر مرد انھیں درست و مستقیم طریقہ پر رکھنے کی سعی کریں گے تو اس کا لازمی نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوگا، اس لئے عورتوں سے انتفاع و استفادہ کی بس یہی شکل ہے کہ ان کی بدخلقی اور درشت مزاجی کو برداشت کیا جائے اور ان کے ساتھ نرمی و ملاطفت کا برتاؤ کیا جائے

ایک دوسری حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نہایت مؤثر نفسیاتی ہدایت فرمائی ہے ارشاد ہے لا یفرك مومن مومنة ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر. رواہ مسلم[1] کوئی مرد مومن اپنی بیوی سے نفرت و دشمنی نہ رکھے اگر اسے عورت کی کوئی خصلت ناپسند ہے تو دوسری عادت پسند ہوگی (کیونکہ آدمی کے سارے اعمال و اخلاق برے ہی نہیں ہوتے بلکہ بعض عمدہ اور بھلے بھی ہوتے ہیں لہذا نباہ کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے اچھے اخلاق و اعمال کو پیش نظر رکھا جائے اور بری عادتوں سے چشم پوشی کی جائے اور صبر و تحمل کے ساتھ ان سے حسن معاشرت کا معاملہ کیا جائے، خود قرآن میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا[2] اور زندگی گذارو عورتوں کے ساتھ پسندیدہ طور پر اور اگر وہ تمھیں پسند نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ تمھیں ایک چیز ناپسند ہو اور اسی ناپسند چیز میں اللہ تعالیٰ تمھارے لئے خیر کثیر مقدر فرمادے۔

زوجین کی نزاع کا نظام اصلاح

بہر حال زوجین کے بارے میں اسلام کا تصور یہی ہے کہ یہ ایک جان دو قالب کی تصویر و تعبیر ہوں، پھر بھی اگر بتقاضائے بشریت ان میں ناچاقی پیدا ہو جائے تو صبر و تحمل سے معاملہ کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، چنانچہ مرد جسے عورت پر قوام و نگراں بنایا گیا ہے کو خطاب ربانی ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ ج ۲، ص ۲۸۰ - [2] سورۃ النساء -

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ الآیۃ[1]

اور جن عورتوں کے متعلق تمھیں بدخوئی ونافرمانی کا یقین ہوجائے تو انھیں سمجھاؤ بجھاؤ اور انھیں خوابگاہ میں اکیلے چھوڑدو، اور (بطور تادیب کے) انھیں مارو ۔ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت سے نافرمانی اور اطاعت میں کمی محسوس کرو تو سب سے پہلے سمجھا بجھا کر ان کی ذہنی اصلاح کرو اس سے کام چل گیا تو معاملہ یہیں ختم ہوگیا اور دونوں ذہنی اذیت وگناہ سے بچ گئے، اگر فہمائش ووعظ ونصیحت سے کام نہ چلے تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی ناراضگی کا عملی اظہار کرو اور اپنا بستر الگ کرلو، اگر یہ نفسیاتی تنبیہ بھی غیر مؤثر ثابت ہو اور اس شریفانہ سزا کے باوجود عورت اپنی بددماغی اور کجروی سے باز نہ آئیں تو بغرض اصلاح وتادیب انھیں مارو مگر اسی قدر کہ ہڈی نہ ٹوٹے نہ بدن پر اس کا نشان باقی رہے، غرض ہر تقصیر کا ایک درجہ ہے اسی کے موافق تادیب وتنبیہ کی اجازت ہے جس کے تین درجے ترتیب وار آیت میں مذکور ہیں، مارنا پیٹنا آخر کا درجہ ہے سرسری اور معمولی قصور پر مارنا پیٹنا مناسب نہیں ہے ۔ چنانچہ بلا وجہ یا ضرورت سے زائد بیویوں کو مارنے والوں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے" لیس اولئك بخیارکم[2] یہ لوگ تمھارے اچھے افراد نہیں ہیں" اگر اس آخری سرزنش کے بعد وہ راہ راست پر آجائیں تو مقصد پورا ہوگیا، درستگی معاملات کے بعد بھی خواہ مخواہ کے لئے ان کے پیچھے پڑے رہنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے ۔

یہ ہے زوجین کے مابین نزاع کا اسلامی نظام اصلاح جس کے تحت گھر کا جھگڑا گھر ہی میں ختم ہوجاتا ہے، لیکن بعض اوقات زوجین کی باہمی کشمکش اور نزاع اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ اصلاح حال کی مذکورہ صورتیں کارگر نہیں ہوتیں، اس شدید اختلاف کی صورت میں بھی رشتۂ نکاح کو توڑنے کے بجائے اسلام کی ہدایت ہے کہ اصلاح حال کی ایک کوشش اور کرلی جائے، قرآن حکیم کہتا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ یُّرِیْدَا اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ۔[3]

---

[1] سورۃ النساء، [2] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۸۲، [3] سورۃ النساء۔

اور اگر تم کو معلوم ہو کہ زوجین میں اختلاف وضد ہے (اور وہ اپنے باہمی نزاع کو خود نہ سلجھا سکیں گے) تو ایک منصف مرد کے اقارب میں سے اور ایک منصف عورت کے عزیزوں میں سے (بغرض فیصلہ زوجین کے پاس بھیجو) اگر یہ دونوں منصف زوجین کے مابین اصلاح حال کا قصد کریں گے تو اللہ تعالیٰ (ان کے حسن نیت وسعی سے) زوجین میں اتفاق پیدا کر دے گا۔

رفع نزاع واصلاح حال کا یہ ایسا آسان، پاکیزہ اور شریفانہ طریقہ ہے جس سے کوچہ وبازار کی رسوائی اور جگ ہنسائی کے بجائے خاندان کی بات خاندان تک محدود رہ جاتی ہے اور عزیز واقارب کے جذبۂ خیر خواہی سے مصالحت وموافقت کی صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

ان تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک بہت ہی سنجیدہ وقابل احترام معاملہ ہے جو اس لئے کیا جاتا ہے کہ باقی رہے یہاں تک کہ موت ہی زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کر دے، یہ ایک ایسا قابل قدر رشتہ ہے جو اتباع سنت، رضائے الٰہی اور تکمیل انسانیت کا ذریعہ ہے، اس کے استحکام پر گھر، خاندان اور معاشرے کا استحکام موقوف ہے اور اس کی خوبی وخوشگواری پر معاشرے کی خوبی وبہتری کا مدار ہے، یہ ایک ایسا عقد ہے جس کے انقطاع اور ٹوٹنے سے صرف میاں بیوی ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس سے پورا انتظام خانگی بکھر جاتا ہے اور بسا اوقات فساد ونزاع اور مقدمہ بازی تک نوبت آجاتی ہے جس سے معاشرہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس لئے اسلام نے ان اسباب ووجوہ کو جو اس محترم وبابرکت رشتہ کی بقاء کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں انھیں راہ سے ہٹانے کا مکمل انتظام کر دیا ہے۔

لیکن بسا اوقات حالات اس قدر بگڑ جاتے ہیں اور زوجین کا اختلاف ایسی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ اصلاح موافقت کی ساری کوششیں بے سود وناکارہ رہ جاتی ہیں اور رشتۂ ازدواج سے مطلوب ثمرات وفوائد حاصل ہونے کے بجائے زوجین کا باہم ایک ساتھ رہنا عذاب بن جاتا ہے، ایسی ناگزیر حالت میں ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی دونوں کے لئے بلکہ پورے خاندان کے لئے راحت وسلامتی کی راہ ہوتی ہے، اس ازدواجی تعلق کو ختم کرنے کو "طلاق" کہا جاتا ہے، جن مذاہب میں طلاق کا اصول نہیں ہے ان میں ایسے حالات میں سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، اور بعض اوقات انتہائی برے اور خطرناک نتائج سامنے آجاتے ہیں اسلئے

شریعت اسلامی نے ایسے ناگزیر حالات میں طلاق کی اجازت دی، اور بعض دیگر مذاہب کی طرح یہ نہیں کہا کہ یہ رشتہ ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے بلکہ قوانین نکاح کی طرح طلاق و فسخ کے لئے بھی عادلانہ وحکیمانہ قانون اور ضابطے مقرر کئے۔

طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا جس میں عادتاً فکر و تدبر اور تحمل و برداشت کا مادہ عورت سے زیادہ ہوتا ہے، اور خود عورت کی مصلحت کے تحت عورت کے ہاتھ میں یہ آزادانہ اختیار نہیں دیا کیونکہ اپنے انفعالی مزاج کی بنا پر وہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جاتی ہیں علاوہ ازیں مرد کی قوامیت وافضلیت بھی یہی چاہتی ہے کہ یہ اختیار اسی کو حاصل رہے لیکن عورت کو بھی اس حق سے یکسر محروم نہیں کیا کہ وہ "کالمیت فی ید الغسال" شوہر کے ظلم اور زیادتیوں کا نشانہ بنی رہے اور اپنی رہائی کے لئے کچھ نہ کر سکے بلکہ اسے بھی یہ حکم دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے قانون کے مطابق نکاح فسخ کرا سکتی یا طلاق حاصل کر سکتی ہے

پھر مرد کو طلاق کا اختیار دے کر اسے بالکل آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اسی کے ساتھ اسے یہ تنبیہ بھی کی گئی ہے ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق[1] اللہ کی حلال کردہ چیزوں میں (بغیر ضرورت کے) طلاق سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

نیز مرد کو تاکیدی ہدایت دی گئی کہ کسی وقتی وہنگامی تاثر ناگواری میں طلاق کے حق کو استعمال نہ کیا جائے

ان تمام ہدایات اور پیش بندیوں کے باوجود کوئی شخص نادانی وحماقت یا شدت تاثر میں بیک تلفظ تین طلاقیں دے کر اپنا پورا اختیار استعمال کرلے تو شرعی ضابطہ کے مطابق تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی ایسا شخص بیوی سے محروم ہو جانے کے ساتھ شریعت اسلامی کی نظر میں مجرم ومعصیت کار ہوگا، ظاہر قرآن احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ سے یہی ثابت ہے کہ مجلس واحد یا کلمۂ واحدہ کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہونگی شریعت اسلامی کا یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر عہد فاروقی میں اجماع ہو چکا ہے اور جمہور تابعین، ائمہ محدثین فقہاء مجتہدین، اکابر علم ودین کا اسی پر اتفاق ہے ابتدائے اسلام سے آٹھویں صدی ہجری کے اوائل تک امت کے اس اتفاقی واجماعی مسئلہ کے خلاف کوئی قابل اعتبار آواز سنائی نہیں دیتی۔

دلائل کی تفصیل کیلئے ہماری کتاب "تین طلاق صحیح ماخذ کی روشنی میں" دیکھی جائے۔

---

[1] سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۳۰۲ والمستدرک للحاکم ج ۲ ص ۱۹۶ قال الذہبی صحیح علی شرط مسلم

میں نے اس زمانہ میں اپنی قوم کو نہایت خراب حالت میں دیکھا جن پر ٹھیک یہ مثل صادق آتی ہے سہ

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
گئے دونوں جہاں کے کام سے ہم
نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے (۱)

قوم، کیا دنیا کی باتوں میں اور کیا دین کے کاموں میں، ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی کہ اِدھر اُدھر کی چیزیں تو درکنار وہ اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی جس میں پڑی تھی، پھر میرا دل آخر دل ہی تھا، پتھر نہ تھا جو نہ پگھلتا اور اپنی قوم کی حالت پر غم نہ کرتا، ایک مدت تک اسی غم میں پڑا رہا، سوچتا رہا کہ کیا کیجئے، جو خیالی تدبیریں کرتا کوئی بن پڑتی نہ معلوم ہوتی تھی، جتنی امیدیں کرتا تھا سب ٹوٹ جاتی تھیں، آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے، کرو جو کچھ کر سکو ہو یا نہ ہو، اسی بات پر دل ٹھہرا، ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا، اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا (۲)

میں نے اس کی حالت موجودہ پر غور کیا اور جو آئندہ اس کی حالت ہونے والی ہے اور جو اسباب کہ اس کے تنزل کے ہوئے ان کو تحقیق کیا، اور جہاں تک ممکن ہوا اوروں کو سمجھایا اور اس درماندہ قوم کی مدد پر یا فلاح پر کمر باندھی (۳)

میں نے یقین کیا کہ تعلیم اور صرف تعلیم ہی ان کی خراب حالت کے درست کرنے کا علاج ہے (۴)

سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے[۵]

جب کہ میں نے علی گڑھ میں کالج کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اور اس کا ایک ایسا وسیع تعلیم گاہ بنانا تجویز کیا جس میں کافی تعداد ہماری قوم یعنی ملک کے باشندوں ہندو اور مسلمان دونوں کی گنجائش ہو اور دونوں گروہ عمدہ طور سے وہاں تعلیم اور تربیت پائیں، جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو میں لندن گیا، وہاں کے کالجوں، بورڈنگ ہاؤسوں، کیمبرج کے طلبہ کے رہنے کا حال دیکھا اور سمجھا کہ حقیقت میں جب تک اپنے ملک کے بچوں کیلئے ایسی جگہ نہ بنائیں تو تعلیم اور تربیت ناممکن ہے۔[۶]

لندن ہی میں میں نے اس مدرسہ کے قائم کرنے اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا، یہاں تک کہ جس نقشہ پر آپ اس کالج کی عمارتوں کو بنتا ہوا دیکھتے ہیں یہ بھی لندن ہی میں قرار پاچکا تھا، ان تجویزوں کو مکمل کرکے میں نے لندن سے واپس آنے کا ارادہ کیا اور لندن ہی میں اس کام کے جو نہایت اہم تھا، شروع کرنے کے تین طریقے قرار دیئے۔

اول:۔ ایک ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے عموماً خیالات تعصب، جو مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یوروپین سائنسز و لٹریچر کا پڑھنا کفر اور مذہب اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں، دور ہوں۔

دوم:۔ خود مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ وہ یوروپین سائنسز اور لٹریچر کو کیوں نہیں پڑھتے اور اس میں ان کو کیا اندیشہ ہے۔

سوم:۔ کالج کے لئے چندہ شروع کیا جائے اور جس وقت موقع ہو علی گڑھ میں کالج قائم کیا جائے، لندن ہی میں علی گڑھ (کالج) کا مقام قرار پاچکا تھا۔[۷]

تہذیب الاخلاق کا اجراء:۔

ہندوستان میں پہونچ کر تجویز اول کے مطابق میں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، اس کے سرے پر جو اس کا نام اور اس کی گرد جو خوبصورت بیل چھپتی تھی وہ ٹائپ لندن ہی میں بنوایا تھا اور اپنے ساتھ لایا تھا۔[۸]

قومی بھلائی کے ولولوں میں سے تہذیب الاخلاق کا نکالنا بھی ایک ولولہ تھا جس کا اصلی

مقصود قوم کو اس کی دینی اور دنیاوی ابتر حالت کا جتلانا اور سوتوں کو جگانا بلکہ مردوں کو اٹھانا اور بند سڑے ہوئے پانی میں تحریک پیدا کرنا تھا۔[۹]

وہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال ۱۳۰۱ نبوی اور ۱۲۸۷ھ جب کہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا، امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جائے گا۔[۱۰]

جب پہلا تہذیب الاخلاق نکلا تھا اس وقت ضرورت تھی کہ قوم کو یورپین سائنس ولٹریچر کی تعلیم پر، جس کو وہ کفر یا شرعاً حرام سمجھتے تھے، متوجہ کیا جائے، اس لئے اس کے مضامین اس بات پر ہوتے تھے کہ شرعاً تعلیم یورپین سائنس ولٹریچر ممنوع نہیں ہے اور قوم کو اس کی تعلیم پر متعدد طرز سے متوجہ کیا جاتا تھا، پھر جو خیالات قوم میں ایسے بیٹھے ہوئے تھے جو ترقی اور تہذیب کے مانع تھے ان کو دور کیا جاتا تھا اور شرعاً اور عقلاً ان پر بحث ہوتی تھی۔[۱۱]

گو تہذیب الاخلاق کی بہت مخالفت ہوئی، خاص اخبار اور پرچے اس کی مخالفت پر جاری ہوئے لیکن اس کو بڑی کامیابی ہوئی[۱۲] بعض لوگوں نے ہمارے پرچہ کا نام "تخریب الاخلاق" اور "تخریب الآفاق" رکھا،[۱۳] کانپور، گورکھپور و مرادآباد سے ان مضامین کی تردید میں رسالے نکلے۔[۱۴]

ہم نے بذریعہ اپنے اس پرچہ کے اپنی قوم کی خدمت کی، مذہبی بے جا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی اس سے خبردار کیا، دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی اس میں ان کو روشنی دکھلائی، مذہب اسلام پر نادانی کی جس قدر گھٹائیں چھا رہی تھیں ان کو ہٹایا، اور اس کے اصلی نور کو جہاں تک ہم سے ہوسکا، چمکایا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا، قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو زبان کے علم و ادب کا ترقی پانا یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا۔[۱۵]

سرسید نے ایک نئے اسلامی قمری سنہ کے اجراء کی کوشش کی جو حضور اکرم کے اعلان نبوت سے شروع ہوتا تھا اور اس کا پہلا مہینہ شوال قرار دیا، یہ سلسلہ انھوں نے تہذیب الاخلاق کی ساتویں جلد سے شروع کیا مگر ان کا جاری کردہ سنہ نبوی مروج نہ ہوسکا۔

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کا قیام :-

دوسری تجویز کے مطابق ایک کمیٹی قائم ہوئی اور "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" اس کا نام رکھا اور بذریعہ جواب مضمونوں کے عموماً مسلمانوں سے اس کی نسبت استفسار کیا، آپ اس بات کو سننے سے کچھ متعجب نہ ہوں گے کہ اس کا اشتہار لندن ہی میں چھپوالیا تھا اور وہ مضمون جس کا جواب پوچھا گیا تھا سب سید محمود کے لکھے ہوئے اور تجویز کیے ہوئے تھے، اس کمیٹی کو نہایت کامیابی ہوئی اور بہت بڑی کامیابی کے ساتھ اس کا کام ختم ہوا اور کام ختم ہونے پر اس کالج کا قائم ہونا قرار پایا۔[16] جب کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم ہوئی میں اس کا سکریٹری تھا۔[17]

ایم اے او کالج فنڈ کمیٹی (خزنۃ البضاعۃ) کا قیام :-

کالج کا قائم ہونا ہی مقصود تھا جو تجویز سوم میں قرار پایا تھا، ۱۸۷۲ء میں چندہ جمع کرنے کے لئے بمقام بنارس ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی رکھا گیا اور کامیابی سے اس کا کام چلنا شروع ہوا، اس کمیٹی نے مختلف مقامات میں سب کمیٹیاں واسطے وصولی چندہ کے مقرر کیں، من جملہ ان سب کمیٹیوں کے ایک سب کمیٹی علی گڑھ میں مقرر کی۔[18]

مدرسہ کا اجراء = مقام علی گڑھ کا انتخاب

اسی سال بنارس کی کمیٹی میں تجویز پیش ہوئی کہ مدرسہ کہاں بنایا جائے۔

دیران دلی میں (جہاں بجز چند دیوارہائے لنبیدہ و بزرگان گور خوابیدہ کے کچھ نہیں ہے) مدرسۃ العلوم قائم کرنے پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا۔[19]

میں نے علی گڑھ کو اس کے لئے پسند کیا۔ علی گڑھ میرا وطن نہیں تھا اور نہ وہاں سے مجھ کو کچھ تعلق تھا مگر صرف اس خیال سے کہ وہ ایسا مقام ہے جو چاروں طرف سے مسلمان رئیسوں سے گھرا ہوا ہے، میرٹھ، بلند شہر، مظفر نگر، سہارنپور، آگرہ، ایٹہ اور ایک بہت بڑا مخزن مسلمان رئیسوں کا یعنی روہیل کھنڈ، جس میں معزز خاندانوں کے لوگ بستے ہیں، اس سے ملے ہوئے ہیں اور اسلئے

مسلمانوں کی تعلیم کیلئے علی گڑھ نہایت مناسب مقام ہے۔ (۲۰)

بعد تحقیقات اور طلب آرا کے ۸ نومبر ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ مدرسہ بمقام علی گڑھ بنایا جائے۔ (۲۱)

افتتاح :-

جب کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان نے مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے کی رائے قرار دی تو چند روز بعد مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کی یہ رائے ہوئی کہ ایک مدرسہ ابتدائی تعلیم کا فی الفور جاری کردیا جائے مگر ممبران کمیٹی خزنۃ البضاعۃ اس رائے سے مختلف تھے مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کو اپنی اس رائے پر اس قدر بھروسہ تھا کہ انھوں نے اس مدرسہ کے جاری کرنے کو خاص چندہ شروع کیا اور باوجودیکہ وہ ایک دفعہ نقد ہزار روپیہ دے چکے تھے دوبارہ انھوں نے ایکہزار روپیہ اور اس خاص کام کے لئے عنایت کیا، ان کی اس فیاضی کے سبب سے اور لوگ بھی شریک ہوگئے اور ممبران کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کو بمجبوری اس رائے کا تسلیم کرنا اور مدرسہ کا جاری کرنا پڑا (۲۲)

علی گڑھ کے مدرسہ کے لئے مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی سے التماس کیا گیا کہ ابتدائی مدرسہ کھولنے کی تدبیر کریں۔ (۲۳)

کمیٹی بنارس نے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو لکھا کہ یکم جون ۱۸۷۵ء سے مدرسہ جاری کریں اور اس کا اشتہار اخباروں میں دے دیں۔ بعد اس کے تاریخ افتتاح مدرسہ تبدیل کی اور بعوض اس کے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء روز سال گرہ ملکہ معظمہ تاریخ افتتاح مدرسہ قرار دی، اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کو لکھا کہ رسمیات افتتاح تاریخ مذکور کو عمل میں لائیں، چنانچہ میں خود اور بعض ممبر اس تاریخ پر علی گڑھ میں آئے اور مدرسہ کھولا گیا۔

میرا یہ کہنا کچھ بیجا نہیں کہ اگر صرف کمیٹی خزنۃ البضاعۃ ہی قائم رہتی اور مدرسۃ العلوم کا عملی کاروبار مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کی تدبیر کے مطابق جاری نہ ہوجاتا تو آجتک کمیٹی خزنۃ البضاعۃ برباد ہوجاتی اور کسی کو مدرسۃ العلوم کا قائم کرنا یاد بھی نہ رہتا، پس اس مدرسۃ العلوم کے قائم ہونے کا جہاں تک احسان ہے وہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کا ہے۔ (۲۴)

درخواست پنشن و منتقلی علی گڑھ :-

جس وقت علی گڑھ میں مدرسہ کھولنے کا ارادہ ہوا اس وقت میں نے پنشن لینے کا قصد کیا اور بذریعہ صاحب جج ہائی کورٹ کو اطلاع دی کہ میرا ارادہ پنشن لینے کا ہے اور اکاؤنٹنٹ جنرل سے نقشہ طلب کیا اور درخواست کی کہ میری مدت ملازمت اور استحقاق پنشن کی تصدیق فرمائیں،(۲۵) جس قدر زمانہ اس کی تکمیل میں لگا وہ لگا، اور وسط ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ میں آگیا، سید محمود نے مجھ کو صلاح دی کہ آپ اپنی کوٹھی کو جو علی گڑھ میں ہے اور بسبب اخراجات سفر لندن رہن ہوگئی ہے وہ چھوٹی ہے اس کو فروخت کرکے زر رہن ادا کردیجئے اور ایک دوسری کوٹھی جس میں میرے اور آپ دونوں کے رہنے کی گنجائش ہو، میں خرید لیتا ہوں، چنانچہ سید محمود نے یہ کوٹھی جس میں میں اب رہتا ہوں، خرید لی، میں نے اپنی کوٹھی مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کے ہاتھ فروخت کردی۔(۲۶)

رسم سنگ بنیاد :-

اس وقت طالب علموں کی تعداد قلیل تھی اور کوئی بورڈنگ ہاؤس نہ تھا، طالب علم جس قدر تھے چھوٹے چھوٹے کمروں میں بھر دیئے جاتے تھے، مگر رفتہ رفتہ ہر ایک چیز میں ترقی ہوتی گئی، تعمیر کا کام جو میں نے شروع کردیا تھا اس میں بھی ترقی ہوتی گئی اور ارادہ ہوا کہ والسرائے ارل نارتھ بروک کے ہاتھ سے رسم فاؤنڈیشن ادا ہو مگر ان کے دفعتہً تشریف لے جانے سے وہ ارادہ پورا نہ ہوا، لارڈ لٹن کے زمانہ میں بعد دربار قیصری فاؤنڈیشن کی رسم کا ان کے ہاتھ سے عمل میں آنا قرار پایا، آٹھویں جنوری ۱۸۷۷ء کو حضور ممدوح علی گڑھ میں تشریف لائے اور ایک نہایت پر تکلف جلسے میں رسم فاؤنڈیشن ادا ہوئی (۲۹)

ہمارے ملک کے رئیس اعظم والی ملک حاجی حرمین الشریفین نواب محمد کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں والئ رام پور نے جو مربی مدرسہ تھے فرمایا کہ اخراجات رسم فاؤنڈیشن اور دعوت لارڈ لٹن سب ان کی طرف سے کی جائے، مگر ہمارے ضلع کے فیاض رئیس کنور محمد لطف علی خاں صاحب نے جو پریذیڈنٹ

کمیٹی تھے، چاہا کہ ان کی طرف سے اور ان کے نام سے وہ دعوت رسم ادا ہو، اور ہمارے عالی ہمت راجہ سید باقر علی خاں صاحب وائس پریزیڈنٹ نے چاہا کہ ان کی طرف سے ان کے نام سے ہو، مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب نے یہ مصلحت سمجھی کہ دونوں رئیسوں کی طرف سے ہو، چنانچہ میں نے ہز ایکسی لینسی لارڈ لٹن سے بذریعہ پرائیویٹ سکریٹری خط و کتابت کی اور سر جان اسٹریچی کی سفارش سے ہز ایکسی لینسی ارل لٹن نے اس کو منظور کیا، میں نے ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور کا اس فیاضی کے لئے شکریہ ادا کیا اور ان دونوں فیاض رئیسوں کی طرف سے رسم فاؤنڈیشن ادا ہوئی، جب ہز ایکسی لینسی لارڈ لٹن بعد ادائے رسم فاؤنڈیشن کلکتہ ہو کر شملہ پہونچے تو حضور ممدوح نے پریزیڈنٹ کمیٹی کنور محمد لطف علی خاں کو تمغہ قیصری عطا فرمایا، ہم نے بھی ان کے اس احسان کو نقش کالحجر کیا اور کالج کے دو کمروں میں ان کے آنر میں نہایت خوش خط حرفوں اور خوبصورت پتھروں میں دو کتبے کھود کر لگا دیئے، اور ایک کمرے میں جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں کے آنر میں ایک کتبہ لگایا"(۲۸)

تعلیمی درجوں میں کمی:۔

یہ مدرسہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو کھولا گیا اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے اسکول کلاس اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے کالج کلاس قائم ہو گئے، یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے یہ مدرسہ یونیورسٹی کلکتہ میں فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور یکم جنوری ۱۸۸۱ء سے بی اے کلاس کے امتحان تک اور یکم جنوری ۱۸۸۳ء سے قانونی امتحان میں افلییٹ ہو گیا۔ ۱۸۸۴ء سے مدرسۃ العلوم کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان ایف اے اور انٹرنس کیلئے سنٹر ہو گیا"(۲۹)

میں نے کالج ہی میں ایک سول سروس کلاس قائم کیا تاکہ لڑکوں کو ہندوستان میں عمدہ تعلیم دے کر لندن بھیجا جائے مگر ہماری قوم کی کم توجہی اور کوتاہ اندیشی سے وہ کلاس نہ چلا، اور ٹوٹ گیا(۳۰)

رقم کی فراہمی:۔ چندہ کے حصول میں جدوجہد

اتنے بڑے عظیم الشان کام کا جیسا کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہے، اور قومی ترقی

کے جس خیال سے قائم ہوا ہے اور جس کا پورا ہونا صرف قومی امداد پر منحصر تھا، اس کی تکمیل کے لئے روپیہ فراہم کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کیونکہ روپیہ کی امداد کے بغیر اس کا پورا ہونا محالات سے تھا۔ (۳۴)

جب میں نے اپنے دوستوں سے ایسا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے روپیہ کی تعداد پوچھی جو اس کے واسطے ضروری تھی، میں نے ایک معتدل تعداد پندرہ لاکھ روپیہ کی بیان کی جو حقیقت میں اتنے بڑے کام کے واسطے کافی نہ تھی، اس تعداد کو سن کر میرے وہ دوست بھی جو میری رائے کو پسند بھی کرتے تھے، متعجب ہوئے اور ان کے منھ سے یہ آواز نکلی کہ پندرہ لاکھ روپیہ اور ہندوستان۔ کیا کچھ جنون ہو گیا ہے؟ مگر مجھے تعجب اس آواز سے نہیں ہوا، گو میں سمجھتا تھا کہ قوم کو اس کام میں پندرہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کی بھی توفیق نہیں تھی۔ (۳۱)

مجھے وہ دن یاد ہے کہ۔ اس وقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کو ناممکن تصور نہ کرتا ہو، اور جب کہ چندہ جمع کرنے کا ذکر ہوا تو جو نہایت خاص احباب تھے وہ بھی زیر لب مسکراتے تھے اور اس خیال کو جنون اور دیوانہ پن تصور کرتے تھے، مجھے وہ دن بھی خوب یاد ہے کہ جب میں نے اپنے ایک دوست کے بازو پر حضرت امام ضامن کی نیاز کا روپیہ باندھا ہوا دیکھا تو میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا مسلمانوں کی قوم سے زیادہ اور کوئی محتاج ہے؟ کیا کمیٹی خزنۃ البضاعۃ سے زیادہ اور کوئی اس روپیہ کا مستحق ہے؟ ان الفاظ نے میرے دوست کے دل پر اثر کیا اور وہ سبز کپڑا جس میں وہ نذر بندھی ہوئی تھی انھوں نے مجھ کو دیدیا، جب اس کو کھولا تو ایک روپیہ اور دو منصوری پیسے اس میں سے نکلے، اور یہ پہلا سرمایہ تھا جو ہماری کمیٹی کے خزانہ کی تھیلی میں ڈالا گیا۔ (۳۲)

ے۔ حالی لکھتے ہیں: مدرسۃ العلوم کے متعلق سب سے زیادہ مشکل کام چندہ کا وصول کرنا تھا، جن کی اولاد کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم کرنا منظور تھا، اول تو وہ پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے، دوسرے جس وقت مدرسہ کے لئے تحریک شروع ہوئی اسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے تھے اور جس کی وجہ سے مدرسۃ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے۔ اس کے سوا ہندوستانی اور خاص کر مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے محض ناواقف تھے، جب تک کسی حاکم کا دباؤ یا اشارہ نہ ہوتا تھا چندہ جمع ہونا نہایت مشکل کام تھا۔

(حیات جاوید، حصہ اول ص ۱۹۸ - ۱۹۹)

ہم نے دست گداگری ہر امیر و غریب کے سامنے دراز کیا اور اس عار کو اپنے پر گوارا کیا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ؎

بدست آہک تفتہ کردن خمیر
بہ از دست دریوزہ پیش امیر

ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قیامت کا عذاب اپنی گردن پر لیا، کالج کی تکمیل کے لئے؟ نہیں نہیں، قومی ترقی کا سامان مہیا کرنے کے لئے، لاٹری ڈالی، جوا کھیلا، اس پر بھی بس نہیں کیا اور اس شعر پر عمل کیا ؎

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا گنج زر از کہتر و مہتر بستانی

سوانگ بھرا، اسٹیج پر کھڑے ہوئے، دوستوں نے فقیروں کا بھیس بدلا، بدو بن کر اور مینڈھا بغل میں داب کر خدا کے لئے مانگا (۳۵)

حالی لکھتے ہیں۔ ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری ڈالی، ہر چند مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید نے کچھ پرواز کی اور بعد تقسیم انعامات کے بیس ہزار کے قریب کالج کو بچ رہا۔ جن دنوں میں لاٹری کی تجویز در پیش تھی دو رئیس سرسید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی، سرسید نے کہا "جہاں ہم اپنی ذات کے لئے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں، وہاں قوم کی بھلائی کے لئے بھی ایک ناجائز کام سہی"

(حیات جاوید، حصہ اول، ص ۲۰۱)

یہاں جس اسٹیج کا ذکر کیا گیا ہے وہ پینی ریڈنگ کی اسٹیج ہے جس کے متعلق حالی لکھتے ہیں، "جب اس جلسہ کی تجویز ٹھہری تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔ لوگ مطعون کریں گے اور تماشے والا کہیں گے اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی، سرسید نے کہا۔ اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا" (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص ۳۰۲)

مولوی سید اقبال علی، جو ۱۸۸۴ء کے سفر پنجاب میں سرسید کی پارٹی میں شامل تھے، لکھتے ہیں "سرسید ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے مدرسۃ العلوم کیلئے روپیہ جمع کرنے کی ہر طرح کوشش کی، امیروں سے التجا کی، والیانِ ریاست سے درخواست کی، قوم سے بھیک مانگی، غیرت کو طاق پر رکھا اور غیر قوموں کے سامنے گداگری کے لئے ہاتھ پھیلایا لاٹری کا جوا کھیلا مگر پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی، قوم کی اور ملک کی حالت یہ ہے کہ کھیل تماشے واقی ناچ رنگ کے

قوم کی عدم فیاضی کا گلہ :-

جب کہ مدرسۃ العلوم کا مسلمانوں کیلئے قائم کرنا تجویز ہوا تو مجھ کو اس کام کے انجام دینے میں بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ تر مشکلیں اور دقتیں نظر آتی تھیں، کیا مسلمانوں کی مفلسی کے لحاظ سے، اور کیا دولت مند مسلمانوں کی عیاشی کی نظر سے، اور کیا مسلمانوں کے

حاشیہ صفحہ گذشتہ) ناچ رنگ، مسخراپن سے روپیہ دہ دیتے ہیں، پس اگر کالج کمیٹی کے ممبر بھی مل کر ایک تھیٹر نائیں اور خود مقدس مقدس ممبر اس میں گانے والے اور تماشا کرنے والے ہوں تو صرف تین چار شہروں میں ماشا کرنے سے کافی روپیہ ہاتھ آجائے، انھوں نے فرمایا کہ خیال کرو کہ جب ہماری یہ قومی تھیٹر پارٹی کسی شہر بں پہونچے اور اشتہار دیا جائے کہ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سب جج علی گڑھ اس طرح کا سوانگ بھرینگے ور مولوی سید فرید الدین احمد خان بہادر سب جج کانپور یوں یوں روپ بدلیں گے، مولوی سید زین الدین خان ہادر سب جج آگرہ اس طرح ٹھٹھول کریں گے، مولوی سید مہدی علی خان منیر نواز جنگ بہادر ریونیو سکریٹری ورنمنٹ نظام حیدرآباد یہ غزل گائیں گے، مولوی مشتاق حسین صاحب ممبر صدر بورڈ ریونیو حیدرآباد کے ہاتھ میں درہ ہوگا اور محتسب کا سوانگ دکھائیں گے اور لوگ تکرار کریں گے کہ "محتسب را درون خانہ چہ کار" شی محمد ذکاء اللہ صاحب پروفیسر میور سنٹرل کالج الہ آباد "چہ غم" کا تماشا دکھائیں گے، مولوی سید اقبال علی س طرح ہنس مکھ جوان رعنا کا سوانگ بھریں گے، مولوی سید مہدی حسن صاحب "یاد فراموش" کی نقل کریں گے رسید میر تراب علی صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ایٹہ پھوار تحصیل کے روٹھ بیٹھنے کا تماشا کریں گے، مولوی خواجہ مد یوسف صاحب وکیل علی گڑھ کفایت شعاری کے ساتھ سوداگروں کی دکانوں اور نیلاموں کے مجمع میں اسباب یدنے کی نقل کریں گے، نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر پرستان کے بادشاہ بن کر آئیں گے، وزیر الدولہ یر الملک خلیفہ سید محمد حسن خان بہادر پرنس بسمارک کی نقل اتاریں گے، مولوی الطاف حسین صاحب الی اپنا مسدس گائیں گے، اور فلاں صاحب یہ نقل کریں گے اور فلاں صاحب وہ نقل کریں گے، ان ماحب کے گلے میں ڈھولک ہوگی اور وہ صاحب سارنگی بجائیں گے، ان کے ہاتھ میں مجیرے ہوں گے ان کے پاس دوتارا، اور آنریبل سرسید احمد خان بہادر سی ایس آئی بمصداق اس شعر کسی شاعر کے پکاریں گے ؎

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تاداد خود از کہتر و مہتر بستانی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس خیال سے جو گناہ کے کاموں میں روپیہ صرف کرنا تو کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے مگر مسلمانوں کے مدرسۃ العلوم میں روپیہ دینے میں سو طرح کے حیلے اور شرعی حجتوں کو پیش کرنا کمال دین داری سمجھتے ہیں" (۳۶)

ہماری قوم کا جو حال ہے وہ غیر قوموں کی نظروں میں نہایت حقارت سے دیکھا جاتا ہے میں ایک واقعہ بیان کروں گا، اگر مسلمانوں میں کچھ غیرت ہے تو اس کو سن کر بجز مرجانے کے اور کوئی علاج نہیں، کیمبرج یورنیوسٹی لندن کے ایک کالج میں بہت سا روپیہ توفیر میں جمع ہو گیا تھا اور اس کے خرچ کرنے کو جگہ نہ تھی، وہاں کے منتظموں نے تجویز کی کہ اس کالج میں جو گرجا ہے وہ بہت عمدہ نہیں ہے، اس کو توڑ کر عمدہ گرجا بنایا جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں خرچ کرنا تجویز ہوا۔ اتفاقاً ایک مسلمان بھی وہاں موجود تھا، اس نے کہا کہ اگر یہ روپیہ ہم کو مل جاتا تو ہماری قوم کے لئے ایک عمدہ کالج، جس کی ضرورت ہے، بن جاتا، اور گرجے کی تعمیر سے بھی زیادہ مفید و ضروری کام میں کام آتا،" یہ سن کر ایک شخص نے، جو اس کالج سے تعلق رکھتا تھا، جواب دیا کہ اگر تمہاری قوم ایسی ہے کہ وہ اپنی تعلیم کا انتظام بھی نہیں کر سکتی تو اس کا جیتے رہنے سے مرجانا بہتر ہے، وہ اس لائق نہیں ہے کہ اس کی کچھ بھی مدد کی جائے" (۳۷)

ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو خود میرے ساتھ گذرا ہے یعنی جس زمانہ میں کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڈھ میں قائم ہوا تو میں نے ایک نہایت معزز یوروپین افسر سے اس کی امداد کی درخواست کی، اس نے جواب دیا کہ ہم پر اس کی امداد کرنا کچھ فرض نہیں ہے، وہ تمہارا بچہ ہے ہمیں اس کو دھکا دے دینا چاہئے، اگر ہمارا بچہ ہوتا تو ہم البتہ اس کو والدین شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے" (۳۸)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہر ایک مجلس کے مسخرے ہوں گے تو کس قدر لوگ تماشا دیکھنے کو آئیں گے اور کس قدر روپیہ ہاتھ آجائے گا اگر ہم لوگ ایسا کریں اور اس طرح اپنی قوم کی بھلائی کیلئے روپیہ جمع کریں تو دنیا میں کوئی قومی عزت ایسی نہیں ہے جو اس پارٹی کو نصیب نہ ہو، اور عقبیٰ میں کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ رتبہ ثواب کا ایسا باقی نہ رہے جو یہ پارٹی حاصل نہ کرے۔

اس کے بعد مولوی سید اقبال علی لکھتے ہیں "اگر چہ میں نے اس تحریر میں بہت گستاخی کی ہے مگر مجھ کو معاف کیا جائیگا کیونکہ سید صاحب ہی کے یہ الفاظ ہیں جو میں نے لکھے ہیں۔ (سفرنامہ پنجاب، ص ۶۹-۷۰)

حالی لکھتے ہیں۔ ایک بار سر سید نے ایک شخص اجنبی مسافر انگریز سے، جو ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا

بلاشبہ اس مدرسہ کا اس قدر تعمیر ہو جانا عجائب روزگار میں گنا جاتا ہے اور یہ جو کچھ ظہور ہوا ہے ہماری قوم کے فیاض بزرگوں کی فیاضی کا نتیجہ ہے۔(۳۹)

ہر نواح کے بزرگوں اور قومی بھلائی چاہنے والوں، بلکہ انسان کے ساتھ نیکی کرنے والوں، اور علی الخصوص پنجاب کے زندہ دل بزرگوں اور والیان ریاست اور وہاں کے دیگر امراء اور رئیسان نے اور بالتخصیص اسلامی سلطنت حیدرآباد نے نہایت فیاضی سے امداد کی، ان بزرگوں کا خاص کر مجھ کو اپنی ذات سے بے انتہا شکر ادا کرنا لازم ہے کہ انھوں نے مجھ ناچیز پر اس قدر بھروسہ کیا کہ لاکھوں روپے کا چندہ مجھ کو دیدیا، نہ کسی کمیٹی کو پوچھا نہ کسی ممبر کو اور نہ یہ جانا کہ روپیہ جو دہ دیتے ہیں کہاں جاتا ہے اور کیا ہوتا ہے، میں اپنی تمام زندگی میں اس امر پر اس قدر فخر نہیں کر سکتا جس قدر کہ اس اعتماد اور طمانیت پر فخر کرتا ہوں جو میری قوم اور غیر قوم کے بزرگوں نے مجھ پر کیا۔(۴۰)

مگر میں قوم کی شکایت اس وجہ سے کرتا ہوں کہ ان فیاض لوگوں کی تعداد کو جنھوں نے کالج کی مدد کی ہے، قوم کی اس تعداد سے مقابلہ کیا جائے جو اب تک اس کی امداد میں شریک نہیں ہوئے اور جن کو بقدر اپنی حیثیت کے کالج کی مدد کرنا ضروری تھی تو ایسی نسبت نکلے گی کہ کسور اعشاریہ سے بھی اس کا بیان کرنا مشکل ہو جائے گا، پس یہ جو کچھ ہوا فیاض لوگوں کی فیاضی کا نتیجہ ہے، مگر قوم کو من حیث القوم جو کچھ کرنا ضروری تھا وہ قوم نے نہیں کیا۔(۴۱)

ہندوؤں کا احسان:۔

لاچار مدرسۃ العلوم کے بانیوں کو مسلمانوں کے اس قومی مدرسۃ العلوم کیلئے دوسری قوم کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔(۴۲)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) تھا چندہ طلب کیا، اس نے بہت رد کد کے بعد یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کیلئے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہئے، سرسید نے کہا۔ بے شک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ اگر یہ انسٹی ٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہو گیا تو انگریزوں کیلئے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ باوجودیکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے۔ وہ انگریز یہ سن کر شرمندہ ہوا اور اسی وقت ایک نوٹ جس روپے کا سرسید کی نذر کیا (حیات جاوید، حصہ اول ص ۲۱۲)

اگر ہماری قوم کی ایسی حالت نہ ہوتی تو ہم کو ایسی کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہوتی؛ مجھ کو عیسائی، ہندو جولاہا، چمار سب کے سامنے اپنی ذلیل قوم کی بھلائی کے واسطے کیوں ہاتھ پھیلانا پڑتا۔(۴۳)

جناب سردار دیال سنگھ بہادر ... العلوم پر بہت احسان کئے ہیں۔(۴۴)

میں خاص کر اپنے ہندو بھائیوں ... نہیں بھولتا جنھوں نے قوم اور اپنے بھائیوں کو تباہ حالت میں دیکھ کر ان کی بہتری کے لئے ہزاروں روپیہ چندہ میں دیا۔(۴۵)

ہندوؤں نے نہایت فیاضی سے روپیہ بطور انعام دیا اور تمام قوم کو اپنا ممنون اور زیر بار احسان کیا،(۴۶)

اس مدد میں میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں جنھوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی، مدرسے کی عمارت کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے ہمیشہ یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی۔(۴۷)

ان کا شکریہ سب سے زیادہ لازم و مقدم ہے، انھی نے اصل میں انسانیت اور خیرات کا کام کیا ہے ان کے احسانات مدرسہ کے در و دیوار سے ہمیشہ ظاہر رہیں گے۔(۴۸)

انگریزوں اور حکومت کی امداد :-

چونکہ انگریز ہمارے حاکم ہیں اور رعایا کا حق ہے کہ اپنے حاکموں سے مدد چاہے، اس لئے ہم انگریزوں سے بھی اپنے کام میں مدد کی درخواست کرتے ہیں۔(۴۹)

مسلمانان ہندوستان نہایت احسان مندی سے حضور عالی جناب ہزایکسی لینسی لارڈ ناتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہندوستان کو ہمیشہ نسل در نسل یاد رکھیں گے جنھوں نے نہایت فیاضی سے دس ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے اس مدرسہ کے دنیوی علوم کے کاروبار کو مرحمت فرمایا۔(۵۰)

حضور عالی سر جان اسٹریچی صاحب کے سی ایس آئی لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی نے نہایت مشکل وقتوں پر اس مدرسۃ العلوم کی مدد فرمائی ہے، حضور ممدوح کو ہندوستان تشریف لائے ہوئے دو تین ہفتہ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ اپنی جیب خاص سے نقد چندہ مرحمت فرمایا۔(۵۱)

سر ولیم میور ایل ایل ڈی کے سی ایس آئی نے بھی اس کام میں چندہ دینے سے مدد کی۔(۵۲)

انگلستان میں بھی مدرستہ العلوم مسلمانان کے لئے چندہ جمع کرنے کو ایک سرکلر روانہ کیا (۵۲)

ایک شریف عالی خاندان میرے دوست جی ایم کینیڈی صاحب بہادر نے جو ایڈنبرا واقع سکاٹ لینڈ کے شریف و رئیس ہیں اور جن کو کچھ تعلق ہندوستان سے نہیں ہے، ہزار روپیہ اس کام کے لئے مرحمت فرمایا۔(۵۳)

اگرچہ اس میں ہندوؤں اور قوموں کی پڑھائی کیلئے بھی موقع رکھا گیا ہے مگر بنیاد مدرسہ خاص مسلمانوں کے واسطے ہے اور اس لئے اس میں زیادہ تر یہ تھا کہ گورنمنٹ مدد دے گی یا نہیں، اگر کل قوموں کے لئے ہوتا جیسے مشنری اسکول، جس میں دینوی تعلیم بلالحاظ قوم ومذہب کے دی جاتی ہے تو گورنمنٹ کی امداد کا قاعدہ صاف تھا، لیکن ہمارے کالج کا نام ایسا تھا جس سے معلوم ہو کہ صرف مسلمانوں کیلئے قائم کیا جاتا ہے، بایں ہمہ گورنمنٹ نے نہایت نیک دلی سے وعدہ کیا کہ جس قدر روپیہ امور اور آمدنی تم جمع کر لوگے اسی قدر گورنمنٹ سے ملیگا (۵۵)

گورنمنٹ اضلاع شمال ومغرب نے ایک نہایت عمدہ اور وسیع قطعہ زمین تعدادی پونے دو سو بیگھہ پختہ کا واسطے تعمیر مکان مدرسہ اور باغ متعلق مدرسہ کے مرحمت فرمایا۔(۵۶)

ذاتی دوستوں کی فیاضی :-

ہمارے دوستوں کی فیاضی ہم کو شرمندہ نہیں ہونے دیتی ہم نے بھی اس مقولہ پر عمل کرنا اختیار کرلیا ہے کہ "خانہ دوستاں بروب ودر دشمناں مکوب" جس امر کی ضرورت ہوتی ہے دوستوں ہی سے سوال کرتے ہیں، اور کچھ شرم نہیں کرتے، اور حق یہ ہے کہ اگر دوستوں ہی سے نہ مانگیں تو کس سے مانگیں؟ لیکن ان کا شکریہ ہم پر واجب ہے، ایک دوست پر کالج کے کسی فنڈ کا چندہ کسی قدر باقی تھا ہم نے ان سے کہا کہ تھوڑا سا روپیہ رہ گیا ہے اس کو بے باق کر دو، انھوں نے کہا کہ باقی کا تو آپ نام نہ لیجئے جب تک زندگی ہے بے باقی تو نہ ہوگی، آج اس چندہ کی باقی کل دوسرے چندہ کی اسی طرح باقی دار مرجاؤں گا، پس بے باقی تو نہ ہوئی ہے نہ ہوگی مگر جس قدر روپیہ چاہو لیلو، در حقیقت یہی حال ہے، کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں سے کالج کے کسی نہ کسی فنڈ کے لئے چندہ نہ مانگتے ہوں۔(۵۷)

حوالے

(۱) آخری مضامین ، ص ۳۶ ۔
(۲) تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۶۱۸
(۳) خطبات سرسید جلد دوم ، ص ۲۳۷
(۴) آخری مضامین ، ص ۳۷
(۵) علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یکم ستمبر ۱۸۷۶ء ص ۵۴۳ ۔
(۶) سفرنامہ پنجاب ، ص ۲۵۵
(۷) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۱۰
(۸) ایضاً ص ۴۰۲
(۹) تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۶۱۸
(۱۰) ایضاً ص ۵۹۷
(۱۱) مقالات سرسید حصہ دہم ص ۴۷
(۱۲) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۰۲
(۱۳) تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۵۱۸
(۱۴) ایضاً ص ۵۱۹
(۱۵) ایضاً ص ۶۱۹
(۱۶) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۰۳
(۱۷) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۸ مئی ۱۸۷۵ء ضمیمہ ص ۶
(۱۸) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۰۳
(۱۹) ایضاً
(۲۰) مقالات سرسید حصہ ۱۲ ص ۱۷۷
(۲۱) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص [illegible]
(۲۲) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۰۳
(۲۳) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۳ جون ۱۸۷۷ء ضمیمہ ص ۱
(۲۴) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۰۳
(۲۵) ایضاً ص ۴۰۵
(۲۶) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۲ جون ۱۸۷۷ء ضمیمہ ص ۱
(۲۷) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۰۵
(۲۸) ایضاً ص ۴۰۶
(۲۹) ایضاً
(۳۰) خطبات سرسید جلد دوم ص ۴۵۴
(۳۱) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۷۹
(۳۲) ایضاً ص ۵۰۸
(۳۳) سفرنامہ پنجاب ص ۲۵۵
(۳۴) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۸ مئی ۱۸۷۵ء ضمیمہ ص ۶
(۳۵) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۵۰۸
(۳۶) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۸ مئی ۱۸۷۵ء ضمیمہ ص ۶
(۳۷) سفرنامہ پنجاب ص ۱۷
(۳۸) بحوالہ حیات جاوید حصہ اول ص ۲۴۹
(۳۹) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۵۰۹
(۴۰) ایضاً ص ۴۰۶ ۔
(۴۱) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۵۰۹
(۴۲) مقالات سرسید حصہ ۱۳ ، ص ۳۷۱
(۴۳) سفرنامہ پنجاب ص ۱۷۹
(۴۴) مکتوبات سرسید جلد دوم ص ۲۷۸
(۴۵) سفرنامہ پنجاب ص ۲۷۸
(۴۶) مقالات سرسید حصہ ۳ ص ۳۷۱
(۴۷) سفرنامہ پنجاب ص ۸۶
(۴۸) ایضاً ص ۲۷۸
(۴۹) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۱۵۶
(۵۰) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۲ نومبر ۱۸۷۵ء ضمیمہ ص ۳
(۵۱) ایضاً
(۵۲) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ، ص ۹۰
(۵۳) مقالات سرسید حصہ دہم ص ۲۲۵
(۵۴) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ، ص ۹۰
(۵۵) ایضاً ص ۱۴۹ ، ۱۵۰
(۵۶) مقالات سرسید حصہ دہم ص ۱۹۲
(۵۷) بحوالہ حیات جاوید حصہ دوم ، ص ۴۹۴

سفر دیوبند کے مشاہدات و تاثرات

مولانا شمس تبریز خان صاحب (استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی)

الحمدللہ کہ تقریباً دس سال بعد سفر دیوبند اور مادر علمی دارالعلوم کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، اور اس کی ظاہری و باطنی تعمیری و تعمیراتی سرگرمیوں کو دیکھ کر خوشگوار حیرت اور مسرت حاصل ہوئی، کہ اختلاف و مخالفت کی تند و تیز ہواؤں میں بھی کتاب و سنت، علوم اسلامیہ اور اخلاق محمدیہ کی یہ مشعل روشن ہے، اور اہل ایمان کو روشنی اور گرمی فراہم کر رہی ہے اور علوم نبویہ کا یہ چشمۂ فیض جاری و ساری ہے اور تشنگان علم و یقین کو سیراب اور دلوں کی کھیتیوں کو شاداب کر رہا ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است
خم و خمخانہ با مہر و نشان است

۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء کی صبح کو چندی اکسپریس سے دیوبند پہنچا، شہر یا قصبہ جس سماجی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے اس کا اسٹیشن اس کی نمائندگی نہیں کرتا ہے اور حکومت و محکمۂ ریل کی توجہ کا طالب نظر آتا ہے۔ پہلے حبیب مکرم جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی قاسمی (مدیر ماہنامہ دارالعلوم) کی قیام گاہ پر پہونچا مگر وہ جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کیلئے دہلی جا چکے تھے جو اصلاح معاشرہ کے دس روزہ ہندوستان گیر پروگرام کے لئے بلایا گیا تھا، اور جس میں شرکت کے لیے حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب مدظلہ سفر بخارا سے بہ عجلت تشریف لائے تھے، یہ دیکھ کر مسرت و طمانیت حاصل ہوئی کہ جمعیۃ علماء اور دارالعلوم کے علماء و اساتذہ اصلاح معاشرہ اور عوامی رابطہ کی اپنی روایتی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہیں اور وقت کی اس ناگزیر ضرورت کے لئے پورے ذوق و شوق سے دور دراز کے اسفار کی صعوبت اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔

وہاں سے اپنے دوسرے دوست جناب مولانا نور عالم صاحب امینی (مدیر ماہنامہ الداعی) کے

دفتر پہونچا جہاں انھوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا اور چائے پلائی، اور الداعی کی ترقیاتی سرگرمیوں سے واقف کرایا، مولانا امینی ماشاء اللہ بڑے فعال و مستعد نظر آئے، درس کے ساتھ الداعی کی ادارتی ذمہ داریوں سے تنہا ہی عہدہ برآ ہوتے ہیں، رسالہ ان کی ادارت میں برابر ترقی کر رہا ہے، مولانا امینی نے اپنے گھر پر بھی پر تکلف دعوت کی اور مہمان نوازی کی، کام کی دھن اور وقت کی قدر ان کی زندگی کا نمایاں پہلو معلوم ہوتے ہیں۔

پھر میں دارالعلوم کے مہمان خانے میں منتقل ہو گیا، جو جدید لوازم سے آراستہ ہے اور جہاں بے تکلف بڑے سے بڑے مہمان کو اتارا جا سکتا ہے، اور جہاں ہندوستان بھر سے آنے والے مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، مہمان خانہ کا عملہ بھی مہمان نواز اور مستعد نظر آیا۔

وہاں جا کر اور یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ میرے دیرینہ کرم فرما اور بزرگ اور مشہور اہل علم و قلم حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری مدظلہ بھی کچھ دنوں سے مقیم ہیں اور حضرت مہتمم صاحب کی دعوت پر شیخ الہند اکیڈمی کا جائزہ لینے کے لئے تشریف لائے ہیں، چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو بڑے تپاک سے ملے اور یکجائی پر مسرت کا اظہار کیا، اور پھر برابر ہم کلامی و ہم طعامی کی مسرت حاصل ہوتی رہی، قاضی صاحب مدظلہ کا زیادہ وقت کتب خانۂ دارالعلوم میں گذرتا تھا، چنانچہ ایک دو دن میں بھی ان کے ساتھ رہا جہاں مدیر کتب خانہ مولانا حکیم عبدالحمید صاحب بستوی صاحب سے ملاقات ہوئی جو صحیح معنوں میں اپنے پیش رو مولانا سلطان الحق صاحب مرحوم کے جانشین نظر آئے جن کے گرد بھی اساتذۂ دارالعلوم کا حلقہ نظر آیا، وہیں دارالعلوم کے جید اساتذہ میں مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی (استاذ حدیث) اور مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی سے ملاقات ہوئی، مولانا اعظمی علامہ طاہر پٹنی کی ایک کتاب کی تصحیح کر رہے ہیں، جس سے اہل علم مستفید ہوں گے، کتب خانے میں اپنے زمانۂ طالب علمی کے کارکن بھائی حنیف صاحب پر نظر پڑی مگر عجلت کے سبب ملاقات نہ ہو سکی اور کتب خانہ کو بھی اطمینان سے نہ دیکھ سکا۔

دفتر تعلیمات میں جناب مولانا قمرالدین صاحب گورکھپوری سے تفصیلی ملاقات رہی اور مولانا موصوف کی متانت و شرافت اور سادگی سے دل متأثر ہوا، وہیں دفتر کے قدیم کارکن منشی عزیز احمد صاحب

سے بھی ملاقات ہوئی جو محنت و وضعداری کا پیکر ہیں عہد طالب علمی میں جیسا انھیں دیکھا تھا ویسا ہی اب بھی دیکھا، سرراہے استاذ حدیث جناب مولانا عبدالحق صاحب سے بھی ملاقات ہوئی

اپنے دیرینہ کرم فرما جناب مولانا مفتی ظفیرالدین صاحب دربھنگوی صاحب سے بھی ان کی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی اور مولانا محترم اپنی روایتی سادگی و بے تکلفی اور خرد نوازی کی وضع پر قائم نظر آئے، عزیزوں میں مولانا حبیب اللہ گونڈوی سلمہ اللہ (استاذ دارالعلوم) اور مولانا محمد امین بستوی (استاذ مظاہر علوم) سے بھی ملاقات ہوگئی، اور جناب مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی کے صاحبزادے بھی آکر ملے جن سے مولانا کے بیرونی سفر کا علم ہوا۔

مسجد دارالعلوم کے سابق امام اور میرے رفیق درس مولانا عبداللہ صاحب بھی بڑے خلوص سے ملے اور پرانی یادیں تازہ ہوئیں [illegible] میں صدر مدرس ہیں، اور صلاح و تقویٰ کے پیکر، الحمد للہ اکثر نمازیں مسجد دارالعلوم [illegible] میں پڑھیں اور موجودہ امام صاحب کی قرأت بہت دل نشین محسوس ہوئی، طلبہ میں نماز و تلاوت کا اہتمام بھی نظر آیا۔

حضرت مولانا اسعد مدنی مدظلہٗ سے ان کے اصلاح معاشرہ کے سفر پر چلے جانے کے سبب عدم ملاقات کا افسوس رہا لیکن اس کی کچھ تلافی جناب مولانا سید ارشد مدنی زید مجدہٗ سے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمہ اللہ کے دولتکدے پر ملاقات سے ہوگئی جن سے ملنے کے لئے رفیق محترم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی کے ساتھ گیا تھا، مولانا نے میری عہد طالب علمی کی ملاقاتوں کا ذکر کیا اور قاضی اطہر صاحب مدظلہٗ کے ساتھ ہم دونوں کو بھی کھانے پر مدعو کیا، اور حضرت مدنی رحمہ اللہ کی مشہور زمانہ مہمان نوازی کی روایت تازہ کردی۔

برادر مکرم اور مشہور اہل قلم جناب مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کی قیام گاہ پر ان سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں انھوں نے اکرام ضیف کے ساتھ اپنی کتاب "شوریٰ کی شرعی حیثیت" عنایت فرمائی، مسلک دارالعلوم پر زیر تصنیف کتاب کا ذکر آیا، خدا کرے کتاب جلد مکمل ہوجائے وہ ایضاح البخاری کے ذریعہ حضرت مدنی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا فخرالدین صاحب رحمہ اللہ کے افادات بھی مرتب کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس دینی و علمی خدمت کو بھی تکمیل کی توفیق بخشے، وہ آج کل شیخ الہند اکیڈمی کی نگرانی بھی کررہے ہیں اور جس کی کئی اہم مطبوعات علمی دنیا میں اس کا نام روشن کررہی ہیں۔

مولانا نور عالم صاحب اور قاضی صاحب مدظلہٗ کے ہمراہ جناب مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی سے بھی ملاقات ہوئی، انھوں نے پر تکلف ناشتہ کرایا اور اپنے زیر اہتمام ایک علمی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی، مولانا موصوف ذیابیطس میں مبتلا ہوگئے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں شفار کامل عطا فرمائے

فاضل جلیل اور دارالعلوم کے استاذ حدیث جناب مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہٗ سے ان کے دولت کدے پر ملاقات ہوئی، مولانا محترم نے اپنے گجراتی مہمانوں کے ساتھ ناشتہ کرایا، مولانا نے دوران گفتگو ایک بڑی کام کی بات فرمائی کہ آدمی کیلئے تین چیزیں اہم ہیں جو علمار اور دینی زندگی گذارنے والوں کو حاصل ہیں، جن پر اللہ کا شکر کرنا چاہئے۔ (۱) گذرادقات بھر روزی۔ (۲) عزت (۳) اطمینان قلب۔ از راہ کرم مولانا زید مجدہم نے اپنی کئی کتابیں عنایت کیں جو علمی و دینی امتیاز رکھتی ہیں، مثلاً الفوز الکبیر کی شرح العون الکبیر، تسہیل ادلۂ کاملہ، فیض المنعم شرح اردو مقدمۂ مسلم، مولانا کے برادر خورد مولانا محمد امین صاحب بھی بڑے خوش اخلاقی سے ملتے رہے۔

شعبۂ قرأت کے صدر قاری ابوالحسن صاحب اعظمی سے بھی ملاقات رہی اور علم قرأت سے متعلق انھوں نے متعدد کتابیں ہدیہ کیں۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہٗ سے وطن سے واپسی پر دفتر اہتمام میں ملاقات ہوئی، بزرگانہ شفقت اور پرسش احوال فرمائی، مولانا موصوف دارالعلوم کے لئے جس محنت و ایثار اور اخلاص سے کام لے رہے ہیں وہ سارے نیازمندان دارالعلوم کے لئے باعث رشک ہیں۔

یوپی کے طلبہ نے مدنی دارالمطالعہ میں قاضی صاحب مدظلہٗ کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا اور ہم دونوں سے تأثرات لکھوائے، اس کے ارکان میں جناب مولانا ارشد مدنی صاحب کے صاحبزادے بھی ہیں، دارالمطالعہ حضرت مدنی رح سے انتساب کے سبب روز افزوں ترقی کر رہا ہے

انھیں دنوں النادی الادبی کا جلسہ ہو رہا تھا جس میں طلبۂ دارالعلوم نے قاضی صاحب کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا، طلبہ نے مولانا قاری عثمان صاحب منصور پوری، اور مولانا شوکت صاحب بستوی کے زیر تربیت عربی تقریر و تحریر پر اچھی قدرت حاصل کی ہے جس کا انھوں نے

کامیاب مظاہرہ کیا، میں نے اپنی تقریر میں تاریخ اسلام میں دین وادب کے دیرینہ رشتے کی تفصیل بیان کی کہ ہر دور میں ہمارے اسلاف نے دین کو علمی و ادبی معیاروں کے مطابق پیش کیا، قاضی صاحب مدظلہ نے بھی طلبہ کو نصیحت فرمائی اور ان کی صلاحیت پر مبارک باد دی، مولانا قاضی اطہر صاحب مدظلہ اس وقت ہمارے حلقے کے بزرگ ترین اہل علم وقلم ہیں اور علمائے دیوبند کی سادگی اور بے تکلفی اور اخلاص و ایثار کا نمونہ ہیں، علمی تحقیق وجستجو ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے، وہ پیری میں بھی جوانمردی کے ساتھ علمی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور عہد نبوی کے نظام تعلیم و تربیت پر ایک کتاب مرتب فرما رہے ہیں، ان کے ساتھ گذرے ہوئے تین چار دن بڑے قیمتی تھے، اللہ تعالیٰ انھیں علم ودین کی خدمت کے لئے تا دیر سلامت رکھے، قاضی صاحب نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کی علمی دردمندی اور ایثار پسندی کا ایک واقعہ سنایا کہ پاکستان میں کسی علمی کانفرنس کے موقع پر مولانا اکبرآبادی اور قاضی صاحب ایک بڑے ہوٹل میں ایک ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے جہاں مہمانوں کے لئے الگ الگ قیمتی اور پرتکلف کھانا آتا اور ضائع ہوتا تھا، اس پر مولانا اکبرآبادی نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے قاضی صاحب کے مشورے سے ہوٹل کو صرف ایک آدمی کا کھانا لانے کی ہدایت کردی اور طعام الواحد یکفی الاثنین کی سنت پر عمل جاری رکھا۔

دارالعلوم دیوبند نے علمی ترقی کے ساتھ عمارتی اور تعمیراتی ترقی بھی بہت کی ہے اور تازہ بستیاں آباد ہو رہی ہیں، مسجد چھتہ جدید توسیع کے بعد جدید و قدیم کا سنگم بن گئی ہے۔

اس کے علاوہ دارالعلوم کے ایک صاحب ذوق اور تعمیری صلاحیتوں کے مالک استاذ مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی ذوق شاہجہانی کے مقابلے پر اپنے ذوق ایمانی کی بدولت بغیر کسی انجینیر کی مدد کے دارالعلوم کی مسجد جدید کے عظیم الشان نقشے میں رنگ بھر رہے ہیں، اور چار سال سے اس سہ منزلہ مسجد کی تعمیر میں اولوالعزمی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، جس کے مسقف حصے میں بیک وقت انشاء اللہ چار ہزار نمازی بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہوسکیں گے، اپنا اندازہ ہے کہ یہ مسجد اپنی عظمت و وسعت کے لحاظ سے برصغیر کی ممتاز مساجد میں جگہ پائے گی، اس لئے اہل خیر کو اس صدقہ جاریہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے،

رفیق محترم مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی نے میرے ساتھ اپنا بہت سا قیمتی وقت گزارا

اور اپنی رہنمائی میں دارالعلوم کی جدید تعمیرات و توسیعات میں ٹکنیکل ادارہ، ریسنگ ہوم، جدید دارالاقامہ اعظمی منزل اور اساتذہ کالونی کی عمارات کی سیر کرائی اور اس کی ترقیات سے مطلع کیا۔ اسکے علاوہ انھوں نے مہمان نوازی کے ساتھ اپنی علمی تصانیف بھی ہدیہ کیں، ان سے ایک خوش خبری یہ ملی کہ وہ حضرت مدنی رہ کے مسودات میں سے امام مہدیؑ سے متعلق احادیث کا ایک مجموعہ دریافت کرکے اسے ترجمہ و تحشیہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں، عصری مسائل پر انھوں نے کئی کتابیں برونت تحریر کیں مثلاً فتنۂ خمینیت، اسلام میں امارت کا تصور، طلاق ثلث اور اجودھیا کے اسلامی آثار، وغیرہ، مؤخرالذکر کتاب میں انھوں نے مستند ماخذ سے اجودھیا کے مسلم اکابر اور اسلامی مساجد و مشاہد کی تاریخ مرتب کردی ہے، رسالہ دارالعلوم بھی ان کی ادارت میں برابر ترقی کررہا ہے۔

سفر دیوبند میں قبرستان قاسمی میں حاضری اور فاتحہ خوانی سعادت کی بات ہوتی ہے جہاں اکابر دیوبند بلکہ اکابر امت کے مقابر ہیں، ان بزرگوں کے مقابر کے ساتھ قریبی عرصے میں داغِ مفارقت دینے والے نامور دو استادوں حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاری رہ کی تربتوں پر بھی بادلِ گریاں حاضری دی۔

اخیر میں احاطۂ دارالعلوم میں بیٹھے ہوئے ان چار دنوں کی یادیں بصد حسرت و تمنا یہی کہہ سکتا ہوں کہ۔

؎ " چار دن کی چاندنی تھی، پھر اندھیری رات ہے "
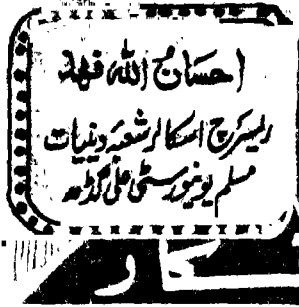
نزہۃ الخواطر کے مصنف مولانا سید عبدالحی حسنی نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کو علم افتاء میں پورے ہندوستان میں منفرد اور ممتاز قرار دیا ہے، مولانا الحسنی کے نزدیک مولانا فرنگی محلی کی شہرت علماء عرب اور علمائے اسلام میں پھیلی ہوئی تھی، وہ عجائبات زمانہ اور نوادرات ہندوستان میں سے تھے آپ کی فضیلت اور برتری میں کسی کو کلام نہ تھا۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کو مولانا فرنگی محلی سے علمی مسائل میں کافی اختلاف تھا اور دونوں حضرات نے ایک دوسرے کے افکار و نظریات کی تردید میں کتابیں اور رسائل بھی لکھیں، مولانا فرنگی محلی کی وفات کی خبر سنکر نواب صاحب کو سخت صدمہ ہوا اور برجستہ فرمایا آج علم کا سورج غروب ہوگیا، ہمارا اختلاف تو صرف چند مسائل کی تحقیق تک محدود تھا، پھر نواب صاحب نے نماز جنازہ غائبانہ کا اعلان فرمایا۔

آپ کا نام عبدالحیؒ اور کنیت ابوالحسنات ہے، والد مکرم کا نام عبدالحلیم ہے، آپ بڑے جیّد عالم تھے، علوم نقلیہ کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ میں آپ کو مہارت حاصل تھی، ساری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کی متعدد کتب متداولہ پر حواشی لکھے اور ان کے علاوہ مستقل رسائل اور کتابیں تصنیف کیں، والدہ ماجدہ وقت کے زبردست عالم مولوی ظہور علی کی صاحبزادی تھیں، نہایت دیندار، تربیت یافتہ اور سلیقہ مند خاتون تھیں، مولانا عبدالحیؒ کی ولادت یوم سہ شنبہ ذی القعدہ ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۷ء کو یوپی کے شہر باندا میں ہوئی، والد محترم اس وقت باندا میں ایک مدرسہ میں ملازم تھے، آپ کا اصل وطن لکھنؤ ہے، مولانا کا سلسلہ نسب حضرت ابو ایوب انصاری رض سے جا ملتا ہے، آپ کی عمر جب چند سال کی ہوئی تو والد مکرم باندا سے لکھنؤ چلے آئے اور تقریباً ایک سال یہیں مقیم رہے اسی دوران مولانا کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی، سب سے پہلے آپ نے حافظ قاری قاسم علی لکھنوی

سے حفظ قرآن شروع کیا لیکن ابھی عم یتساءلون بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ والد ماجد لکھنؤ سے جونپور منتقل ہوگئے، وہاں آپ نے حافظ ابراہیم پوربی سے قرآن شریف پڑھنا شروع کیا، آپ کے والد بھی آپ کو قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے، والد محترم کو آپ کی تعلیم و تربیت کی بہت فکر تھی، لیکن اس زمانے میں مولانا کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہ تھی، جب آپ کی عمر سات آٹھ سال کی تھی تو آپ کھیل کود کی جانب مائل تھے، والد ماجد کی سخت کوشش کے باوجود پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے، چنانچہ آپ کے والد آپ کی طرف سے یکسر مایوس تھے اور کہا کرتے تھے کہ افسوس میری بدقسمتی ہے کہ یہ لڑکا اس قدر بدشوق ہے، اب علم میرے خاندان سے چلا جائے گا، لیکن رفتہ رفتہ والد محترم کی مسلسل کوشش رنگ لائی، اور مولانا کی طبیعت پڑھنے کی طرف مائل ہونے لگی، دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور تراویح میں پورا قرآن سنایا، حفظ قرآن کے دوران والد ماجد نے آپ کو فارسی کی بعض کتابیں بھی پڑھا دی تھیں اور خط بھی سکھا دیا تھا، قرآن شریف سے فراغت کے بعد آپ نے لائق و ہونہار بیٹے کو عربی کی درسی کتابیں پڑھانی شروع کردیں، فارسی اور ابتدائی حساب کے لئے مولانا نے مولوی خادم حسین مظفرپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، مولوی خادم حسین صاحب مظفرپوری آپ کے والد ماجد کے ارشد تلامذہ اور مخصوص ترین احباب میں سے تھے، ابھی آپ عربی و فارسی کی درسی کتابوں کی تحصیل میں مشغول تھے کہ آپ کے والد ماجد کی ملازمت جونپور سے ختم ہوگئی، چنانچہ ۱۲۷۶ھ میں لکھنؤ واپس آنا پڑا۔ اور پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد حیدرآباد کے ایک سرکاری مدرسے میں آپ کی تقرری ہوگئی، ان تمام اسفار میں انھوں نے اپنے لائق فرزند ارجمند کو اپنے ساتھ رکھا اور ان کی تعلیم کی طرف پوری طرح متوجہ رہے، حیدرآباد میں بھی آپ کا تعلیمی سلسلہ جاری رہا، ۱۲۷۹ھ میں آپ کے والد آپ کو آپ کی والدہ کے ہمراہ لے کر حرمین شریفین کے لئے روانہ ہوگئے، وہاں انھوں نے متعدد علماء کبار سے ملاقات کی اور ان سے مولانا کا بھی تعارف کرایا، حج سے واپسی پر والد مکرم کا تقرر حیدرآباد میں عدالت عالیہ کے عہدہ پر ہوگیا، اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مولانا کا تعلیمی سلسلہ بھی بدستور جاری رکھا، اس طرح مولانا نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور تمام کتب منقولہ و معقولہ سب

اپنے والد ہی سے پڑھیں، یہاں تک کہ آپ ۱۲۸۲ھ تک سترہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہوگئے، ۱۲۸۵ھ میں والد محترم کا انتقال ہو گیا، مولانا اگرچہ تمام علوم سے فارغ التحصیل ہوگئے تھے لیکن اسکے باوجود صرف ریاضی و نجوم کی چند کتابیں اپنے والد کے ماموں نعمت اللہ بن مولوی نور اللہ سے پڑھیں۔

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد مولانا نے اپنی زندگی علم کی خدمت کے لئے وقف کردی، والد محترم کے انتقال کے بعد عدالت عالیہ کا عہدہ آپ کو پیش کیا گیا، لیکن آپ نے اس پیش کش کو محض اس وجہ سے قبول نہ کیا کہ اس کی وجہ سے علمی مشاغل میں خلل ہوگا اور پوری تندہی سے علم کی خدمت نہ کرسکیں گے لیکن آپ حیدرآباد ہی میں عرصہ تک درس و افتاء میں مشغول رہے، ۱۲۹۱ھ میں وہاں سے رخصت لے کر دوبارہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، وطن واپسی کے بعد پھر تدریسی مشاغل میں مصروف ہوگئے، نظام حیدرآباد نے آپ کے مشاغل کو دیکھ کر دو سو پچاس روپے ماہوار وظیفہ جاری کردیا، اسی پر آپ نے اکتفا کیا اور اپنے وطن ہی میں مقیم رہ کر آخری وقت تک تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، ان مشاغل کے علاوہ آپ کو کسی کام سے دلچسپی ہی نہ تھی، تعلیم و تدریس میں سخت محنت اور جفاکشی کی وجہ سے آپ کی طبیعت خراب ہوگئی اور صرع کے دورے پڑنے لگے، علاج سے جب کچھ افاقہ ہوجاتا تو آپ پھر اپنے معمولات شروع کردیتے اور اپنے مشاغل میں اسی طرح منہمک ہوجاتے، اس کا اثر صحت پر اور خراب پڑتا اور دورے زیادہ شدت کے ساتھ اور جلدی جلدی آنے لگے، آخرکار یہ مرض موت کا بہانہ ثابت ہوا، ۳۹ سال کی عمر میں یوم دوشنبہ ۳۰ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ کو علم وفضل کا یہ درخشاں آفتاب اچانک غروب ہوگیا۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے اساتذہ کی تعداد معدودے چند ہے، آپ کے اساتذہ میں آپ کے والد ماجد مولانا عبدالحلیم کی بلند پایہ شخصیت ہی قابل ذکر ہے، کیونکہ صحیح معنی میں آپ کے استاذ صرف آپ کے والد ہی تھے، آپ کے والد ماجد کی ولادت ۲۱ شعبان ۱۲۳۹ھ کو ہوئی تھی، دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا تھا، ابتدائی کتب آپ نے اپنے والد مکرم سے پڑھیں، والد محترم کے انتقال کے بعد اپنے چچا مفتی محمد اصغر سے شرح وقایہ، نور الانوار اور شرح عقائد نسفیہ

وغیرہ جیسی کتابیں پڑھیں مفتی محمد اصغر کے انتقال کے بعد باقی کتابیں مفتی محمد یوسف سے پڑھیں، فنون ریاضی کی تعلیم اپنے ماموں مولوی نعمت اللہ بن مولوی نور اللہ سے حاصل کی، تحصیل علوم سے فراغت کے بعد لکھنؤ ہی میں درس وتدریس میں مشغول ہوگئے، اس کے بعد پھر باندا تشریف لے گئے، وہاں ایک مشہور رئیس حاجی امام بخش نے اپنے مدرسے کا نظم ونسق ان کے سپرد کردیا، اس کے بعد آپ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے وہاں وزیر السلطنت نواب مختار الملک کے سرکاری مدرسہ میں آپ کا تقرر ہوگیا، چند دنوں کے بعد مدرسہ سے مستعفی ہوکر حرمین شریفین تشریف لے گئے، حج وزیارت سے فارغ ہوکر آپ دوبارہ دکن تشریف لائے تو عدالت عالیہ دیوانیہ کا کام آپ کے سپرد کردیا گیا، اس ذمہ داری کو بھی آپ نے بحسن وخوبی انجام دیا، آخر کار ۲۹ شعبان ۱۲۸۵ھ کو اس دارفانی سے کوچ فرمایا۔[۲]

آپ نے ساری زندگی تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں بسر کی متعدد کتب متداولہ پر حواشی لکھے، ان کے علاوہ متعدد رسائل اور کتابیں تصنیف کیں، آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد تین درجن کے قریب ہے جن میں سے چند مشہور ہیں حل المعاقد فی شرح العقائد، نور الایمان فی آثار حبیب الرحمٰن، غایۃ الکلام فی بیان الحلال والحرام، قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار، احوال سفر الحرمین، القول الاسلم لحل شرح سلم، معین الغائصین فی رد المغالطین وغیرہ

والد ماجد کے انتقال کے بعد مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے مولوی نعمت اللہ بن مولوی نور اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور صرف ریاضی اور نجوم وہیئت کی چند کتابیں پڑھیں، مولوی نعمت اللہ نے اپنے والد اور اپنے چچا مفتی ظہور اللہ سے اکتساب فیض کیا تھا، آپ کو علوم عقلیہ میں خصوصی کمال تھا، فنون ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مولوی نعمت اللہ عرصہ تک لکھنؤ اور فیض آباد کے عہدۂ افتاء پر فائز رہے، غدر کے بعد اس عہدہ سے کنارہ کش ہوکر بڑودہ تشریف لے گئے اور درس وتدریس کی خدمت میں لگ گئے، اس کے بعد ریاست بتیا صوبہ بہار میں راجہ بتیا کے یہاں مدرس مقرر ہوئے وہاں سے رخصت ہوکر واپس بنارس پہونچے اور فالج میں مبتلا ہوکر تین محرم ۱۲۹۰ھ کو بنارس میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

آپ کے اساتذہ میں مولوی خادم حسین کا بھی شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ مولانا نے حفظ قرآن کے بعد فارسی اور حساب کی تعلیم انہیں سے حاصل کی تھی، مولوی خادم حسین عظیم آباد بہار کے رہنے

والے تھے لیکن فرنگی محل ہی میں انھوں نے سکونت اختیار کرلی تھی، آپ مولانا عبدالحلیم کے خاص شاگردوں میں سے تھے، آپ صرف مولانا کے استاذ ہی نہیں تھے بلکہ سفروحضر کے رفیق بھی تھے، مولانا عبدالحیؒ کے انتقال کے بعد آپ ہی نے آپ کے گھر کو سنبھالا اور آپ کے ذخیرۂ کتب اور مسوّدات کو محفوظ رکھا، آپ ہی کے حسن تدبیر سے مولانا کی اکلوتی لڑکی کی شادی مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے ساتھ ہوئی اس کے بعد آپ نے فرنگی محل میں مطبع یوسفی قائم کیا اور اس کے ذریعہ مولانا کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

ان کے علاوہ اساتذہ کے ضمن میں ان علماء کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے جنھوں نے آپ کو سند و اجازت عطا فرمائی تھی، ان میں شیخ احمد بن زین دحلان، شیخ الدلائل علی الحریری المدنیؒ، شیخ عبدالغنی بن شاہ ابوسعیدؒ، سید محمد بن عبداللہؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا نے زمانہ طالب علمی ہی میں اپنی کلاس سے نیچے کے طلبہ کو درس دینا شروع کردیا تھا جب آپ فارغ التحصیل ہوگئے تو مستقل طور پر درس و افادہ کا سلسلہ جاری فرمایا، اور تقریباً سات سال تک حیدرآباد میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے اس کے بعد وطن آکر مسند درس و تدریس کو زینت بخشی اور ساری زندگی اسی مسند پر جلوہ افروز رہے، اس عرصہ میں سینکڑوں تشنگانِ علم ان کے حلقۂ درس سے فیضیاب ہوئے اور ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی، ان میں مولوی افہام اللہ لکھنوی (۱۸۶۳-۱۸۹۸ء) سید امین بن طٰہٰ نصیرالدین (۱۸۹۸-۱۹۰۳ء) مولوی انواراللہ (۱۸۴۷-۱۹۱۷ء) مولوی بدیع الزماں لکھنوی (۱۸۴۳-۱۸۸۶ء) مولوی حفیظ اللہ بندوی (م ۱۹۴۳ء) مولوی شبیر علی حیدرآبادی (۱۹۳۵ء) مولوی ظہورالاسلام فتح پوری (۱۹۱۱ء) مولوی ظہیر احسن نیموی (۱۹۰۰ء) مولوی عبدالباقی فرنگی محلی (۱۸۶۹-۱۹۴۴ء) مولوی عبدالحلیم دہلوی (۱۸۴۱-۱۹۱۷ء) مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی (۱۸۵۹-۱۹۲۶ء) مولوی عبدالحمید المعروف بحمیدالدین الفراہی (۱۸۶۳-۱۹۳۰ء) مولوی عبدالعزیز فرنگی محلی (۱۹۱۹ء) مولوی عبدالعلی آسی المدراسی (۱۹۰۸ء) مولوی عبدالغفور رمضان پوری (۱۸۵۳ء) مولوی عبدالمجید فرنگی محلی (۱۹۱۲ء) مولوی عبدالوہاب بہاری (۱۹۱۲ء) مولوی عین القضاۃ حیدرآبادی (۱۸۵۷-۱۹۲۴ء) مولوی فتح محمد لکھنوی (۱۹۰۹ء) مولوی قادر بخش سہسرامی (۱۸۵۶-۱۹۱۸ء) مولوی محمد ادریس نگرامی (۱۸۵۸-۱۹۱۱ء) مولوی محمد سلیمان پھلواری (۱۸۵۹-۱۹۳۵ء) مولوی محمد عثمان چاٹگامی (۱۸۲۶ء)

حکیم محمد یٰسین آروی (۱۳۳۳ھ) مولوی وحید الزماں حیدرآبادی (۱۸۵۹ - ۱۹۱۹ء) وغیرہ کافی مشہور ہیں، علماء نے ان کے علمی کارناموں کی وجہ سے انہیں اپنی تصانیف میں جگہ دیکر زندہ و جاوید بنادیا ہے، ان کے علاوہ آپ کے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد ہے۔

مولانا اپنے تمام فضل و کمال اور تلامذہ کی کثرت کے باوجود بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے آپ ایک اچھے واعظ اور بلند پایہ خطیب تھے اور نہایت بلیغ تقریر کرتے تھے لیکن طبعًا خاموش اور بردبار تھے بلا ضرورت بولنے سے احتراز کرتے تھے اور جب بولتے تھے تو مجلس پر چھا جاتے تھے، آپ کے اندر قناعت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، مال و دولت اور جاہ و منصب کی ہوس بالکل نہ تھی، آپ نہایت منکسر المزاج تھے، تواضع و خاکساری ان کی فطرت میں تھی، فخر و غرور کا شائبہ ان کے اندر دور دور تک نہیں پایا جاتا تھا، مولانا نے اپنی کتاب النافع الکبیر میں اپنی تصانیف کی فہرست درج کرنے کے بعد اپنے فضائل و اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ ہمارے رب کے چند انعامات ہیں جو اس نے ہم پر کئے ہیں، میں نے ان کا ذکر فخر کے طور پر نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر کیا ہے، اور اس شخص کے لئے فخر کی کیا بات ہو سکتی ہے جس کو یہ نہیں معلوم کہ قبر و حشر میں اس پر کیا گزرے گی اور میں شمار نہیں کر سکتا کہ کن نعمتوں کا فیضان اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کیا ہے اور کتنی فضیلتیں اس نے مجھ پر کی ہیں، پس اس کے لئے بہت زیادہ حمد و ثنا ہے اور اسی کے لئے شکر کثیر ہے"۔

مولانا کو اگرچہ فن مناظرہ میں بڑی مہارت تھی اور آپ کو اس فن سے کافی دلچسپی بھی تھی لیکن آپ صرف سنجیدہ اہل علم حضرات سے مباحثہ و مناظرہ پسند کرتے تھے، غیر سنجیدہ علماء و جہلاء سے شر و فساد اور خلفشار کے خوف سے حتی الامکان احتراز کرتے تھے۔

اگرچہ مولانا مسلکًا حنفی تھے اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے علو مرتبت اور عظمت شان کے پورے طور پر معترف تھے، لیکن فطری طور پر اعتدال پسند منصف مزاج اور سلیم الطبع تھے مذہبی جانبداری، گروہی تعصب اور ہٹ دھرمی ان کے اندر بالکل نہ تھی، تمام مسائل میں درمیانی راستہ اختیار کرتے تھے، چنانچہ آپ خود ہی لکھتے ہیں "اللہ تعالیٰ کا ایک احسان مجھ پر یہ ہے کہ اس نے مجھے افراط و تفریط کے درمیان چلنے والا بنایا، جب بھی کوئی اہم مسئلہ میرے سامنے

آتا ہے تو مجھے اس کے بارے میں درمیانی راستہ کا الہام ہوجاتا ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو تقلید جامد کو اختیار کرلیتے ہیں، یہاں تک کہ فقہاء کے قول کو وہ کسی حال میں ترک نہیں کرتے، اگرچہ ادلۂ شرعیہ اس کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں، اور نہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو فقہاء پر طعن کرتے ہیں اور فقہ کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں ؎۲

تقلید کے سلسلے میں مولانا کا نظریہ یہ ہے کہ اگر کسی امام کا کوئی مقلد دلیل شرعی کی بناء پر اپنے امام کے مسلک کو ترک کردے تو بھی وہ مقلد ہی رہتا ہے کیونکہ تمام ہی ائمہ فقہ سے یہ قول ثابت ہے کہ اگر ان کی رائے کے خلاف کوئی نص صریح مل جائے تو اس صورت میں ان کی رائے کو ترک کردیا جائے، مولانا رقم طراز ہیں " اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اگر حنفی کسی مسئلہ میں کسی قولی دلیل کی بناء پر اپنے امام کے مذہب کو ترک کردے تو اس کی وجہ سے وہ تقلید کی قید سے آزاد نہیں ہوجاتا بلکہ ترک تقلید کی صورت میں یہ عین تقلید ہے، کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ عصام بن یوسف نے رفع یدین کے مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو ترک کردیا اس کے باوجود اس کا شمار احناف ہی میں ہوتا ہے ؎۳

اجتہاد کے سلسلے میں مولانا کے افکار و نظریات دوسرے علماء سے مختلف ہیں، مولانا کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ نہ کبھی بند ہوا تھا اور نہ کبھی بند ہوگا، آپ نے مجتہد کی تین قسمیں بتائی ہیں (۱) مجتہد مطلق مستقل (۲) مجتہد مطلق منتسب (۳) مجتہد فی المذہب، النافع الکبیر میں اجتہاد پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ "جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اجتہاد مطلق مستقل کا مرتبہ ائمہ اربعہ پر ایسا منقطع ہوگیا کہ اب واپس نہیں آسکتا تو اس نے غلط دعویٰ کیا کیونکہ اجتہاد اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اور اللہ کی رحمت کسی زمانہ یا انسان کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی، اور جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کا سلسلہ عملاً منقطع ہوگیا اگرچہ ہر زمانہ میں اس کا وجود ممکن ہے تو اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی ایسا مجتہد پیدا ہی نہیں ہوا جس کے اجتہاد پر جمہور کا اتفاق ہوا ہو اور انھوں نے اس کی مستقل اجتہادی حیثیت کو اسی طرح تسلیم کیا ہو جس طرح ائمہ اربعہ کے اجتہاد پر ان کا اتفاق ہے تو یہ مسلّم ہے، ورنہ ائمہ اربعہ کے بعد بھی ارباب اجتہاد مستقل پیدا ہوئے ہیں۔

مولانا کے نزدیک علماء و فقہاء کے درمیان اختلافات رحمت ہیں لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے اختلافات اپنے درمیان محدود رکھیں اور جزئی اختلافات کو عوام کے سامنے بیان کرنے

سے احتراز کریں، مولانا کا خیال تھا کہ جن مسائل میں صحابۂ کرام کے زمانے سے اختلاف چلا آرہا ہے، ان میں جس کی بھی اقتدار کرلی جائے درست ہے، کیونکہ تمام صحابہ ہدایت یافتہ تھے، مولانا کے الفاظ میں یہ تو گویا بہتی ہوئی نہریں ہیں جو سرچشمۂ نبوت سے پھوٹ کر نکلی ہیں، جس نہر سے بھی کوئی پانی پی لے گا وہ سیراب اور کامیاب ہوجائے گا، اس لئے اختلافی مسائل میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ملامت نہیں کرنی چاہئے اور نہ کسی کی تغلیط کرنی چاہئے۔[۱]

۳۹ سال کی قلیل مدت میں مولانا عبدالحئ فرنگی محل نے سو سے زیادہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، آپ کے قلم کا اصل جولان گاہ حدیث و فقہ اور تاریخ و تذکرہ کے میدان ہیں، حدیث و فقہ کے موضوع پر آپ کی چھوٹی بڑی تمام تصانیف کی تعداد ساٹھ سے متجاوز ہے، تاریخ و تذکرہ میں تقریباً بیس کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کے علاوہ نحو و صرف، منطق و فلسفہ وغیرہ پر بھی کچھ نہ کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ ذیل میں آپ کی چند کتب کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) الآثار المرفوعۃ فی اخبار الموضوعۃ۔

حدیث کے موضوع پر یہ کتاب مولانا کی اہم ترین تصنیف ہے، اس میں ان موضوع حدیثوں کو آپ نے بیان کیا ہے جن کے اندر سال کے مختلف دنوں اور راتوں میں کچھ مخصوص قسم کی نمازوں اور ان کے اجر و ثواب کا ذکر آیا ہے، اس میں نماز عاشورہ کے موضوع پر اس مکالمے کا تذکرہ بھی ہے جو آپ نے اپنے بعض اعزہ و احباب کے ساتھ کیا تھا، مقدمہ میں حدیث وضع کرنے اور موضوع حدیث کی روایت کرنے کے احکام چند دیگر مضامین کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف ۱۳۰۳ھ میں مکمل ہوئی۔

(۲) احکام النفائس فی اداء الاذکار بلسان الفارس۔

یہ مولانا کی شاہکار کتابوں میں سے ہے، اس میں فارسی زبان میں اذان و اقامت کہنا، فارسی میں نماز کے اندر قرآن پڑھنا، فارسی میں تشہد اور دعائے قنوت پڑھنا، فارسی میں جمعہ کا خطبہ پڑھنا، اور فارسی میں لکھا ہوا قرآن بغیر طہارت کے ہاتھ سے چھونا وغیرہ وغیرہ جیسے اہم مسائل پر آپ نے بحث کی ہے، ہر مسئلہ کے تحت آپ نے فقہاء و علماء کے اقوال درج کئے ہیں، پھر اپنی تحقیق پیش کی ہے، اور اس کو عقلی و نقلی دلائل سے مزین کیا ہے، آپ نے اس کتاب کو

جمادی الاخری سنہ ۱۲۹۲ھ میں مکمل کیا تھا، اس کی طباعت مطبع یوسفی لکھنؤ سے ۱۳۱۳ھ میں ہوئی۔

(۳) الآیات البینات علی وجود الانبیاء فی الطبقات۔

یہ مولانا کی اہم ترین تصنیف ہے، دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سارے انبیاء کے وجود کے متعلق چند علماء نے شبہات پیش کئے ہیں، مولانا نے اس رسالے میں ان شبہات کا مکمل جواب دیا ہے، یہ رسالہ آپ نے سنہ ۱۲۸۹ھ میں مکمل کیا تھا مگر ابھی تک یہ رسالہ شائع نہیں ہو سکا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔

(۴) احکام القنطرۃ فی احکام البسملۃ۔

اس میں تسمیہ کے متعلق متفرق مسائل جمع کئے گئے ہیں، بسم اللہ کے فضائل، بسم اللہ کا جزو قرآن ہونے کے متعلق فقہاء کے اختلافات، وضو کے شروع میں اور نماز میں بسم اللہ پڑھنے کی بحث اس کتاب کے خاص موضوع ہیں، اس کی تالیف سنہ ۱۲۸۹ھ میں مکمل ہوئی، اور سنہ ۱۳۲۵ھ میں مکتبہ یوسفی لکھنؤ سے طبع ہوئی۔

(۵) افادۃ الخیر فی الاستیاک بسواک الغیر۔

مولانا سے کئی لوگوں نے پوچھا کہ کیا دوسروں کے مسواک کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں تو مولانا نے اس فتوی کا جواب جواز میں دیا، اس کے بعد لوگوں کی آسانی کے لئے اس کے متعلق جو آثار و اخبار منقول تھے ان سب کو اکٹھا کر دیا، مسواک کے ضمن میں دوسرے شخص کی کنگھی اور سلائی کو بھی استعمال کرنے کا بھی ذکر تفصیل سے منقول ہے، اس رسالے کو مولانا نے سنہ ۱۲۸۶ھ میں ایک نشست میں مکمل کیا تھا، سنہ ۱۳۲۵ھ میں مطبع یوسفی سے طبع ہو کر شائع ہوا۔

(۶) امام الکلام فی ما یتعلق بالقرأۃ خلف الامام۔

یہ کتاب تین ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، پہلے باب میں قرأت خلف الامام کے متعلق صحابہ اور بعد کے علماء و فقہاء کے اختلافات درج ہیں، دوسرے باب میں فقہاء کے دلائل ہیں، تیسرے باب میں فقہاء کے بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی گئی ہے اور خاتمہ نماز جنازہ میں قرأت فاتحہ کی بحث پر مشتمل ہے۔

(۷) تحفۃ الاخیار فی احیاء سنۃ سید الابرار۔

یہ کتاب بھی تین ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ان اخبار و آثار کا بیان ہے جن میں خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام کی اقتدار کا ذکر ہے، دوسرے باب میں ان عبارتوں سے بحث کی گئی ہے جن کو فقہاء نے سنت کی تعریف میں استعمال کیا ہے، تیسرے باب میں سنت مؤکدہ کے ترک کرنے کا حکم تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور خاتمہ تراویح کی رکعتوں کی تعداد کے بارے میں ہے، اس کتاب کو آپ نے ۱۲۸۸ھ میں مکمل کیا، ۱۳۲۵ھ میں مطبع یوسفی سے طبع ہوکر منظر عام پر آئی

(۸) **التحقیق العجیب فی التثویب**:۔ اس رسالہ میں آپ نے پہلے تثویب کے لغوی اور اصطلاحی معنی درج کئے ہیں اس کے بعد تثویب سے متعلق فقہاء کے اقوال کو نقل کیا ہے، اس کے بعد عہد صحابہ سے متاخرین کے زمانہ تک تثویب کے جو طریقے رائج تھے اور اس کے متعلق فقہاء کی جو مختلف رائیں تھیں، ان سب کا ذکر کیا ہے، آخر میں بدعت کے اقسام بیان کئے ہیں۔

(۹) **ترویح الجنان بتشریح حکم شرب الدخان**:۔

اس رسالے میں آپ نے بیڑی سگریٹ پینے کی ابتدا کب ہوئی اور کس طرح ہوئی اس کے نفع و نقصان کیا ہیں، اس کی ممانعت اور اباحت سے متعلق فقہاء کی رائیں، ممانعت اور اباحت کے وجوہ مع دلائل روزہ کی حالت میں حقہ پینے کا حکم، حلت و حرمت سے متعلق مختلف مفید باتوں کا ذکر، تمباکو کی زراعت اور قہوہ پینے کا حکم بیان کیا ہے، مولانا نے اس رسالہ کو ۲۵ر رمضان ۱۲۹۲ھ کو مکمل کیا تھا اور ۱۳۳۷ھ کو مطبع یوسفی سے طبع ہوکر منظر عام پر آیا۔

(۱۰) **ردع الاخوان عن محدثات آخر جمعۃ رمضان**:۔

اس رسالے میں جمعۃ الوداع کے کچھ ایسے اعمال کا ذکر ہے جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، سب سے پہلے آپ نے قضاء عمری کے مسئلے کو بیان کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے آخری جمعہ کو اگر کوئی شخص چار رکعت نفل نماز ایک مخصوص طریقے سے پڑھ لے تو یہ نماز اس کی عمر بھر کی تمام قضا نمازوں کا کفارہ ہو جائے گی، اس کے بعد ایک اور بدعت کا بیان ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چند مخصوص کلمات کو رمضان کے آخری جمعہ کو لکھ کر رکھنے سے چوری وغیرہ تمام آفات سے حفاظت رہتی ہے، آخر میں رمضان کے آخری جمعہ کو جمعۃ الوداع

کہنے، اس کے خطبہ میں فارسی و ہندی اشعار پڑھنے اور اس میں ماہ رمضان کے اختتام پر حسرت و افسوس کے اظہار کرنے کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس رسالے کو آپ نے ۲۷ صفر ۱۲۹۶ھ کو مکمل کیا اور ۱۳۳۶ھ میں مطبع یوسفی لکھنؤ سے اس کی طباعت ہوئی۔

(۱۱) السعایۃ فی کشف مافی شرح الوقایہ :-

یہ شرح وقایہ کی نہایت مفصل و مدلل شرح ہے، اس میں شرح وقایہ کے شرح سے باب المسح علی الخفین کے ابتدائی حصہ تک کی شرح ہے، اس میں مولانا نے ہر مسئلہ کے متعلق صحابہ و تابعین اور فقہاء و ائمہ مجتہدین کے اقوال کو جمع کر دیا ہے اور ان کے عقلی و نقلی دلائل پر بڑے شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس کی تالیف مولانا نے ۱۲۸۶ھ میں شروع کی تھی اور اس کی ایک ہی جلد مکمل کرسکے تھے کہ اچانک مولانا کی وفات ہوگئی اور یہ عظیم الشان کام پایہ تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔

(۱۲) عمدۃ الرعایۃ فی حل شرح الوقایہ۔

اس کتاب میں ائمہ احناف کے اختلافات اور کتاب وسنت اور آثار صحابہ سے احکام فقہیہ کے دلائل بیان کئے گئے ہیں، یہ اصلاً شرح وقایہ کا حاشیہ ہے، جو کافی ضخیم اور مفصل ہے، جلد اول کا حاشیہ ۱۳۰۱ھ میں اور جلد ثانی کا حاشیہ ۱۳۰۳ھ میں مکمل ہوا تھا مختلف مطابع سے متعدد بار اس کی اشاعت ہوچکی ہے۔

(۱۳) مقدمۃ التعلیق الممجد علی موطاء الامام محمدؒ :-

مولانا نے اس کتاب میں حدیث کی کتابت اور اس کے تدوین کی ابتدائی تاریخ اور مؤطا کے فضائل وغیرہ بیان کئے ہیں، امام مالکؒ، امام محمدؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور جن لوگوں نے مؤطا پر کوئی حاشیہ یا اس کی شرح لکھی ہے ان سب کے تراجم و احوال کا تذکرہ ہے، یہ مقدمہ نہایت مفید اور پرمغز معلومات کا حامل ہے، اس مقدمہ کو اس قدر قبول عام حاصل ہوا کہ اس کے بعد سے ہندوستان میں عام طور پر مؤطا امام محمد اسی مقدمہ کے ساتھ چھپتی ہے۔

ان کے علاوہ حدیث و فقہ میں "الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ"، "الافصاح عن

شہادۃ المرأۃ فی الارضاع، امام الکلام فی ما یتعلق بالقراءۃ خلف الامام، الانصاف فی حکم الاعتکاف، تبصرۃ البصائر فی معرفۃ الاواخر، تحفۃ الثقات فی تفاضل اللغات، تحفۃ الطلبۃ فی تحقیق مسح الرقبۃ، تحفۃ الکملۃ علی حواشی تحفۃ الطلبۃ، تحفۃ النبلاء فی جماعۃ النساء، تدویر الفلک فی حصول الجماعۃ بالجن والملک، التعلیق علی القول الجازم، حاشیۃ الجامع الصغیر، خیر الخبر فی اذان خیر البشر، رافع الوسواس فی اثر ابن عباسؓ، الرسالۃ فی احادیث الموضوعۃ۔

منطق وحکمت میں الافادۃ الخطیرۃ فی مبحث نسبۃ سبع شعیرہ، التعلیق العجیب لحل حاشیۃ الجلال علی منطق التہذیب، تکملۃ حل النفیسی، حل المغلق فی بحث المجہول المطلق،

تاریخ وتذکرہ میں تذکرۃ الراشد برد تبصرۃ الناقد، حسرۃ العالم بوفاۃ مرجع العالم، خیر العمل بذکر تراجم علماء فرنگی محل، مقدمہ عمدۃ الرعایۃ فی حل شرح الوقایہ، مقدمۃ الہدایہ۔

علم الصرف میں امتحان الطلبۃ فی صیغ المشکلۃ، التبیان فی شرح میزان، چہار گل، علم النحو میں ازالۃ الجمد عن اعراب اکمل الحمد، خیر الکلام فی تصحیح کلام الملوک ملوک الکلام، علم المناظرہ میں حاشیۃ الرشیدیۃ شرح الشریفیۃ، الہدایۃ المختاریۃ، شرح رسالۃ العضدیۃ وغیرہ کافی مشہور ومتداول ہیں۔

تعلیقات وحواشی

(۱) الحسنی، سید عبدالحیٔ، نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر، دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء ج ۸ ص ۲۳۵

(۲) نفس مصدر ج ۸، ص ۱۹۳۔

(۳) فرنگی محلی، عبدالحی، مقدمۃ السعایۃ فی کشف ما فی شرح الوقایہ، مطبع مصطفائی ۱۳۰۷ھ ص ۱۳۔

(۴) عنایت اللہ محمد، تذکرہ علمائے فرنگی محل، برقی پریس فرنگی محل لکھنؤ ۱۳۴۹ھ، ص ۱۳۱۔

(۵) نفس مصدر، ص ۱۳۲، ۲۹ ربیع الاول کو صبح ہی سے مولانا کی طبیعت کچھ ناساز تھی اسی دن صاحب تذکرہ علمائے فرنگی محل کے والد کے مکان پر ذکر ولادت شریف کی تقریب بھی تھی مولانا نے خوشی خوشی اسمیں شرکت فرمائی اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف رہے اور پھر رات میں حسب معمول گھر والوں سے باتیں بھی کرتے رہے اسکے بعد آرام فرمانے کیلئے تشریف لے گئے نصف شب کے قریب صرع کا دورہ پڑا اور پھر تھوڑی دیر میں افاقہ ہو گیا لیکن دوبارہ پھر دورہ پڑا، اور کچھ دیر کے بعد پھر رفع ہو گیا اس کے بعد تیسری بار جو دورہ پڑا وہ مہلک ثابت ہوا، شروع میں لوگوں کو سکتہ کا شبہ رہا لیکن پھر ڈاکٹروں اور حکیموں نے دیکھ کر موت کا قطعی فیصلہ کر دیا (عنایت اللہ محمد، حوالہ بالا، ص ۱۳۲) (۶) فرنگی محلی، عبدالحی، حوالہ بالا۔

(۷) فرنگی محلی، عبدالحی، النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر، مطبع یوسفی لکھنؤ، ۱۳۲۳ھ ص ۱۳۲۔ (۸) نفس مصدر ص [illegible]

(۹) فرنگی محلی، عبدالحی، الفوائد البہیۃ، مکتبہ ندوۃ المعارف بنارس ۱۹۶۷ء، ص ۹۸-۹۹۔

(۱۰) فرنگی محلی، عبدالحی، امام الکلام فی ما یتعلق بالقراءۃ خلف الامام، مطبع علوی لکھنؤ ۱۳۰۴ھ ص [illegible]۔

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

خاصانِ خدا کی دعائے سحرگاہی کا ثمرہ، علمائے حق کے جذبۂ ایثار و قربانی کا مظہر، اربابِ عزیمت کے عزم و استقلال کی لازوال علامت، مجاہدینِ ملتِ بیضا کے جہد و عمل کی تابناک نشانی، علم و آگہی اور شریعت و طریقت کا دلکش سنگم، اسلامیانِ ہند کی حیات ملی کا صراطِ مستقیم، لامذہبیت کے اس دور میں اسلامی تہذیب و ثقافت اور دینی شعائر و آثار کا علمبردار، تاریخ اسلامی کی اولین درسگاہ صفہ کی یادگار و عکس جمیل اور ہر باطل کے خلاف نبرد آزمائی کیلئے عظیم چھاؤنی اور تربیت گاہِ حریت۔

اکابر دارالعلوم کیا تھے؟

اس کا مختصر لفظوں میں جواب یہ ہے کہ وہ خیر القرون کی یادگار تھے، سلف صالحین کا نمونہ تھے، اسلامی مزاج و مذاق کی جیتی جاگتی تصویر تھے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی خصوصیات و امتیازات کو لفظوں میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے اسلئے کہ ان کی خصوصیات کا تعلق درحقیقت اس مزاج و مذاق سے ہے جو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرتوں اور ان کے طرزِ حیات سے مستفاد و مستنیر تھا اور مذاق و مزاج وہ چیز ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن لفظوں کے ذریعہ پورے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا، جس طرح گلاب کی خوشبو کو سونگھا تو جا سکتا ہے لیکن اس کی کیفیت کو الفاظ میں ڈھالنا ممکن نہیں ہے اسی طرح ان اکابر رحمہم اللہ کے مذاق و مزاج اور ان کی خصوصیات و امتیازات کو ان صحبتوں اور ان کے حالات و واقعات سے سمجھا تو جا سکتا ہے مگر اس کی منطقی تعبیر ناممکن ہے۔

دیوبندیت کیا ہے؟

دارالعلوم دیوبند کسی جدید مکتبِ فکر کا بانی نہیں ہے اور نہ اکابر دارالعلوم کے مسلک کی تاریخ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے بلکہ اکابر دیوبند انھی عقائد و افکار کے پابند رہے جو قرونِ ثلثہ مشہود لہا بالخیر "ما انا علیہ و اصحابی" کی صدیوں پاکیزہ روایت کے طور پر چلے آرہے تھے ــــ دیوبندیت کسی جدید و مستقل مکتبِ فکر کا نام نہیں ہے بلکہ سلف صالحین، اہلِ تحقیق کی کامل اتباع اور اسی کی تعلیم و اشاعت دارالعلوم اور اس کے اکابر کا طرۂ امتیاز ہے جسے آج عرفِ عام میں دیوبندیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ ہے مختصر لفظوں میں دارالعلوم دیوبند، اکابر دارالعلوم، اور دیوبندیت کا تعارف۔

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین ومخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ وروغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھا لیا گیا، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کارخیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقربا کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب وآلام سے محفوظ رکھے، آمین۔

پتہ

ڈرافٹ وچیک کیلئے۔ " دارالعلوم دیوبند " اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے۔ (حضرت مولانا) مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پن کوڈ نمبر 247554

PHONE: 22429
CODE: 01336
دار العلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دار العلوم
جلد نمبر ۷۹
شمارہ نمبر ۵
ماہ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۴ء
فی شمارہ ۶/=
سالانہ ۶۰/=
نگران
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند
مدیر
مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
استاذ دار العلوم دیوبند
سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۳۰۰/= روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/=
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/=
ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دار العلوم دیوبند، سہارنپور (یوپی)

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس اختر سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

اپنے آپ کو دانشور اور روشن خیال کہلانے والوں کی اکثریت اسلامی آثار وروایات کے مقابلہ میں مغربی تہذیب واقدار کی ترجمانی اور نمائندگی کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتی ہے، اس جماعت کی جانب سے تحقیق وریسرچ کے عنوان سے جو چیزیں سامنے آرہی ہیں ان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ لوگ حالات اور تقاضے کی آڑ لے کر اسلامی معاشرہ کو مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں، ان کی یہ بھی خواہش ہے کہ جو دینی تصورات اور مذہبی روایات ماڈرن تہذیب سے متصادم ہوں انھیں کاٹ چھانٹ کر یورپ سے برآمد کی ہوئی اس جدید تہذیب سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ عصر جدید کے آخر وہ کون سے تقاضے ہیں کہ اسلام اپنی اصلی وحقیقی شکل میں رہتے ہوئے ان کا ساتھ نہیں دے سکتا، اگر مسئلہ جدید اکتشافات وایجادات کا ہے کہ آج کا انسان دال روٹی کے بجائے کیک، ٹوسٹ اور سینڈوچ کھانے لگا ہے اونٹ اور بیل گاڑیوں پر سواری کی جگہ خلائی طیاروں اور ہوائی جہازوں پر اڑنے لگا ہے۔ دست کاری اور گھریلو صنعتوں کے مقابلے میں بڑے بڑے مشینی کارخانے قائم کرلئے ہیں، قدیم مواصلاتی ذرائع کے بالمقابل جدید نظام مواصلات دریافت کرلیے ہیں، تیر وتلوار کی جگہ کلاسنکوف، رائفل اور میزائل وایٹم بم کے استعمال پر قادر ہوگیا ہے۔ قدیم طرز علاج کے بجائے طرح طرح کے جدید طریقۂ علاج ایجاد کرلیے ہیں تو بتایا

جائے کہ آخر مذہب کا ان ایجادات سے کیا تصادم ہے ؟ آخر مذہب اسلام کا وہ کون سا اصول وقانون ہے جو ان تبدیلیوں کی نفی کرتا اور ان ایجادات واکتشافات پر قدغن لگاتا ہے ؟۔

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سائنسی تجربات واکتشافات اسلام کی صداقت وحقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں مثال کے طور پر اسلام آخرت کے سلسلہ میں یہ نظریہ اور اعتقاد پیش کرتا ہے کہ قیامت کے دن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ انسان کے اعضاء وجوارح اپنے اپنے اعمال وافعال کی شہادت دیں گے، اسلام سے بے بہرہ عقل ومادہ کے پجاری اسلام کے اس عقیدہ کو ماننے پر تیار نہ تھے مگر آج کے گراموفون اور ٹیپ ریکارڈر نے بندگان مشاہدہ کو اس کے ماننے پر مجبور کر دیا کہ اگر لوہا اور سیاہ رنگ کا فیتہ بول سکتا ہے تو جس خدا نے زبان کو گویائی عطا کی ہے وہ بدن کے دیگر اجزاء کو بھی گویا کر سکتا ہے، ملت اسلامیہ کے عقیدۂ معراج جسمانی سے مادہ پرستوں کی عقل انکار کرتی رہی لیکن آج کے خلائی اور سیاراتی نظام نے تصور معراج کو تجربہ ومشاہدہ کی حدود میں لاکھڑا کر دیا ہے ۔ قیامت کے دن وزن اعمال کے مسئلہ کو بھی سائنس نے تجربہ ومشاہدہ کی شکل میں دنیا کے روبرو کر دیا ہے، آج سائنسی ترازوؤں کے ذریعہ حرارت وبرودت اور ہوا تک کو تولا جا رہا ہے ۔

الغرض سائنسی ایجادات واکتشافات تو اسلام کے پیش کردہ غیبی امور وحقائق کو تسلیم کرنے پر دنیا کو مجبور کر رہے ہیں، اس لئے اسلام کا ان سے کوئی تصادم نہیں ہے ۔

ہاں اگر عصری ضروریات اور جدید تقاضوں سے مراد علم وسائنس ہی نہیں بلکہ وہ پوری تہذیب ومعاشرت ہے جس کے زہریلے اثرات سے آج مغربی دنیا تڑپ رہی ہے مثلاً شراب، جوا، سود کا بے محابا رواج، مرد اور عورت کا آزادانہ میل ملاپ، کلبوں کی انسانیت کش زندگی، حیوانیت کی حد تک جنسی بے راہ روی، تہذیب وثقافت کے نام پر اخلاقی انارکی، سیول میرج، گرل اور بوائے فرینڈ جیسی حیاسوز رسمیں جس نے یورپ کو ایک ایسے چوراہے پر لاکھڑا کر دیا ہے جس کے ہر چہار جانب حیوانیت، درندگی، حرص وشہوت خود غرضی، بے چینی، مایوسی اور تاریکی نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔

یہ بدقسمتی ہی کی بات ہے کہ عصری ضروریات اور جدید تقاضوں کا نام لیکر یورپ کی اسی تباہ کن اور موت بکنار تہذیب کو معاشرے پر لادنے کی ناروا کوشش کی جارہی ہے چونکہ اسلام آج سے چودہ سو سال پہلے ہی اس تہذیب کو "تبرج جاہلیۃ" کہہ کر یکسر رد کرچکا ہے اس لئے آج کے روشن خیال اور تاریک دل دانشور اس جاہلی تہذیب کو صالح اور مہذب بنانے کی بجائے اسلامی آثار و روایات کو فرسودہ اور از کار رفتہ قرار دے کر اس کو مسخ کرنے کے لئے اپنی ہر امکانی کوشش صرف کررہے ہیں یہ ایک ایسا خطرناک رویہ ہے جس کا عبرت ناک انجام ترکی کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہے تہذیب مغرب کے پرستار مسلمانوں کی فلاح وبہبود کا نام لے کر یہی تاریخ ہندوستان میں بھی دہرانا چاہتے ہیں، اس سازش میں یہ پہلو کس قدر خطرناک ہے کہ بعض وہ افراد واشخاص جو ملک میں علمائے دین کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں انھیں یہ گروہ اپنا آلۂ کار بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے، جن کی وساطت سے اسلامی احکامات میں کتر بیونت کا سلسلہ شروع کردیا گیا، اور قرآن وحدیث وفقہ اسلامی کے حوالے سے قرآن وحدیث کے محرمات کو حلال وجائز گرداننے کی جسارت کی جارہی ہے، یہ ایک ایسی خطرناک سازش ہے کہ اگر اس کا پردہ چاک نہیں کیا گیا تو مرض سرطان کی طرح غیر محسوس طور پر اس کی جڑیں پھیل جائیں گی اور پھر اس کا مداوا مشکل ہی سے ہوسکے گا، ارباب علم ودین کب تک خاموش تماشائی بنے اسلامی احکام وہدایت کے خلاف اس کھلواڑ کو خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہیں گے۔ ؏ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔
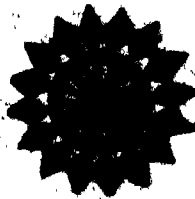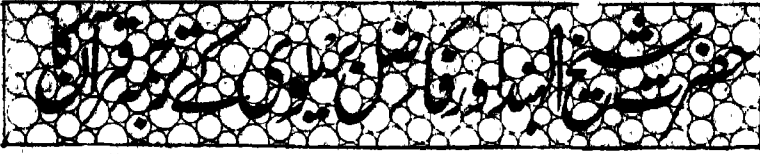
تقابلی جائزہ

حضرت مولانا قاری عبدالرشید صاحب رحمۃ اللہ علیہ استاذ حدیث و تفسیر جامعہ مدنیہ لاہور

کچھ عرصہ سے بریلوی حضرات کی طرف سے احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ قرآن "کنز الایمان" کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں، چنانچہ مرکزی مجلس رضا لاہور کی جانب سے ایک رسالہ "محاسن کنز الایمان" کے نام سے شائع کیا گیا ہے جس کے پیش لفظ میں "کنز الایمان" کے محاسن بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

> امام رازی اگر اسے دیکھ پاتے تو بے اختیار آفریں کہتے۔ ابن عطاء اور جبائی کے سامنے یہ ترجمہ ہوتا تو شاید اعتزال سے توبہ کر لیتے، خامۂ تصوف سے جس طرح اعلیٰ حضرت نے آیات کے بطن کو ترجمہ میں ڈھالا ہے غزالی ہوتے تو اسے دیکھ کر وجد کرتے، ابن عربی شاد کام ہوتے اور سہروردی دعائیں دیتے، ترجمہ کے ضمن میں جو فقہی نگینے لائے ہیں اگر امام اعظم پر پیش کئے جاتے تو یقیناً مرحبا کہتے، اور اگر ابن عابدین اور سید طحطاوی کے سامنے یہ فقہی آبگینے ہوتے تو اعلیٰ حضرت سے تلمذ کی آرزو کرتے،
>
> قرآن مجید کے علوم و فنون، اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی تاویل و تفسیر پر جو شخص نگاہ رکھتا ہو وہ جب اس ترجمہ کو پڑھے گا تو یقیناً سوچے گا کہ اگر قرآن اردو میں اترا ہوتا تو یہ عبارت اس کے قریب تر ہوتی اور جو فصاحتِ زبان سے آشنا ہو اسے کہنا پڑے گا کہ اس ترجمہ میں زبان و بیان کی بلاغت اعجاز کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔[1]

---

[1] محاسن کنز الایمان ص ۹، ۱۰ طبع بار سوم۔

ایک اور صاحب "کنزالایمان" کی تعریف و توصیف میں مزید آگے بڑھ کر یہاں تک لکھتے ہیں کہ
"اور اس کی مثال نہ عربی زبان میں ہے نہ فارسی میں اور نہ ہی اردو میں"
نیز دیگر مترجمین کو "بصیرتِ ایمانی سے محروم، تائید ربانی سے محروم نادار مترجمین، گمراہ مترجمین، مطلق العنان مترجمین اور بے حیا و بے شرم لیسے القابات سے نوازنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا اس لئے ضرورت تھی کہ کنزالایمان کا تحقیقی جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان بلند بانگ دعووں میں کہاں تک صداقت ہے، زیرنظر مضمون میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور فاضل بریلوی کے ترجمہ سورۂ فاتحہ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے، جس سے قارئین کنزالایمان کے متعلق ان دعووں کی حقیقت خود سمجھ سکتے ہیں۔

(۱) حمد کے معنی ہیں "الثناء باللسان" یعنی زبان سے تعریف کرنا، چونکہ حمد کے معنی تعریف کرنے کے ہیں اس لئے مفسرین ذکر کرتے ہیں کہ "حمد" کے پائے جانے کے لئے پانچ امور کا پایا جانا ضروری ہے (۱) محمود بہ (۲) محمود علیہ (۳) حامد (۴) محمود (۵) وہ الفاظ جن کے ذریعہ حمد کی جائے، مثلاً زید نے عمرو کو کچھ رقم ہبہ کی، جواباً عمرو نے زید کی تعریف میں کہا کہ "زید بہت بڑا عالم ہے" اس میں عمرو حامد ہے زید محمود ہے اور وہ رقم جو باعث حمد بنی ہے محمود علیہ ہے اور زید کی صفت علم جس کا اظہار کیا گیا ہے وہ محمود بہ ہے، اور یہ جملہ کہ "زید بہت بڑا عالم ہے الفاظ حمد ہیں۔ بہرحال ثابت ہو گیا کہ حمد کے معنی خوبی نہیں خوبی پر تعریف کرنے کے ہیں، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ "صاحب کنزالایمان" حمد کا ترجمہ "تعریف" کی بجائے "خوبی" کر رہے ہیں حالانکہ معمولی فہم والا شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ تعریف اور خوبی ایک چیز نہیں ہے، خوبی "حمد" نہیں محمود بہ ہوتی ہے لیکن صاحب کنزالایمان نے الحمد کا ترجمہ سب خوبیاں کر دیا۔

اس کا اس مقام پر بہتر ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نوراللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے، یعنی "سب تعریفیں" واضح ہو کہ اگرچہ مجازاً حمد کا معنٰی "خوبی" سے بھی کیا جا سکتا ہے لیکن بلاوجہ حقیقی معنیٰ سے عدول مستحسن نہیں۔

(۲) لفظ "لِلّٰہ" کا ترجمہ صاحب کنزالایمان نے کیا ہے "اللہ کو" عربی میں "ل" حرف ہے جس کے معنی "لئے" اور "واسطے" کے ہوتے ہیں، اس لئے جدید فصیح اردو میں "الحمدللہ" کا

ترجمہ یہ نہیں ہے جو صاحب کنز الایمان نے کیا ہے کہ "سب خوبیاں اللہ کو" بلکہ اس کا فصیح اردو ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، یعنی "سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں" لفظ للحمد للہ میں لام جارہ کا ترجمہ لفظ "کو" سے کرنا اردو کی فصاحت کو بٹہ لگاتا ہے۔

(۳) لفظ رب "تربیت" سے مشتق ہے اور اس کے حقیقی معنی "پالنے والے" اور "پروردگار" کے ہیں، اس کے علاوہ یہ لفظ اور متعدد معانی میں مجازاً استعمال ہوتا ہے جن میں سے ایک مجازی معنی "مالک" بھی ہیں۔ کسی لفظ کے حقیقی معنی ترک کر کے بلاوجہ معنی مجازی مراد لینا بہتر نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ صاحب "روح المعانی" نے رب کے معنی "پروردگار" اور "پالنے والا" کو بہ نسبت "مالک" کے راجح قرار دیا ہے۔[۱] امام رازیؒ نے بھی اس کو تربیت اور پالنے ہی کے معنی میں لیا ہے۔[۲] اور "روح البیان" میں بھی رب کو تربیت اور اصلاح ہی کے معنی میں لیا گیا ہے، نیز "تفسیر بیضاوی" اور "ابوالسعود" میں[۳] اس کے اصل معنی "تربیت" ہی کے لکھے ہیں، لیکن اس کے برعکس صاحب "کشاف" علامہ زمخشری معتزلی نے "رب" کے معنی "مالک" بتائے ہیں جو معنی حقیقی سے بلاوجہ معنی مجازی کی طرف رجوع کے باعث مرجوح ہیں، بعد کے مفسرین نے زمخشری معتزلی کے اتباع میں رب کے معنی "مالک" کئے ہیں لیکن اس موقع پر حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ معتزلہ کے مقابلہ میں اہل سنت کے مشہور زمانہ دکیل امام المتکلمین امام رازیؒ کے نقش قدم پر ہیں، جب کہ صاحب کنز الایمان جناب احمد رضا خاں صاحب علامہ زمخشری معتزلی کے راستہ پر، حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا۔"

(۴) "عالم" کی مراد بیان کرتے ہوئے مفسرین نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کے ماسوا جو کچھ بھی ہے اس کو "عالم" کہتے ہیں، لیکن چونکہ اس کے ماتحت متعدد اجناس و انواع ہیں، ان کے اعتبار سے اس مقام پر لفظ "عالم" کو جمع استعمال فرمایا گیا ہے، تقریباً تمام مفسرین کے نزدیک "عالم" سے مراد اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام موجودات ہیں اور اسی کو وہ اصح قرار دیتے ہیں، اور "عالم" کے اس معنی کے علاوہ باقی معانی کو ضعیف قرار دیتے ہوئے یا تذکرہ ہی نہیں کرتے

---

[۱] روح المعانی ص ۱۵ ج ۱، [۲] ایضاً، [۳] تفسیر کبیر مع ابی السعود ص ۱۸ ج ۱

اور یا پھر بصیغہ تمریض ذکر کرتے ہیں۔

"عالم" کے جن معانی کو مفسرین ضعیف قرار دیتے ہیں وہ کئی ہیں مثلاً ایک یہ ہے کہ "عالم" سے مراد اہل علم اور اہل عقل ہیں جو تین گروہ ہیں (۱) انسان (۲) ملائکہ (۳) جن، بعض نے شیاطین کو بھی اس میں شامل کیا ہے، دوسرے یہ کہ "عالم" سے مراد صرف انسان ہیں، تیسرے یہ کہ "عالم" سے مراد جنات اور انسان ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جمہور اہل سنت مفسرین کے نزدیک عالم سے سارا جہان مراد ہے جب کہ علامہ زمخشری معتزلی صاحب "کشاف" کے نزدیک اہل علم وعقل یعنی فرشتے، جنات اور انسان مراد ہیں۔

صاحب "کنز الایمان" (احمد رضا خاں صاحب نے) العالمین کا ترجمہ "جہان والے" کرکے زمخشری معتزلی کے پسندیدہ معنی کو اختیار کرکے جمہور اہل سنت مفسرین کا راستہ ترک کردیا ہے، احمد رضا خان صاحب کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے جمہور اہل سنت مفسرین کی تفسیر کے مطابق ترجمہ فرمایا ہے، چنانچہ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کا ترجمہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں "جو پالنے والا سارے جہان کا"

رہی یہ بات کہ صاحب "کنز الایمان" کے ترجمہ "جہان والے" سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ "جہان والوں" سے علامہ زمخشری کی طرح اہل علم وعقل مراد لے رہے ہیں۔

تو گزارش ہے کہ "جہان والے" کے دو ہی مطلب بن سکتے ہیں ایک جہان کی ملکیت رکھنے والے، جیسے کہا جاتا ہے زمین والے، مکان والے، کارخانے والے وغیرہ، دوسرے جہان میں رہنے والے، اور یہ دونوں ہی ذوی العقول کے اوصاف ہیں کیونکہ غیر ذوی العقول نہ تو کسی چیز کے مالک ہوسکتے ہیں اور نہ ان کی طرف بلا قرینہ کسی جگہ رہنے کی نسبت کی جاسکتی ہے مثلاً کسی درخت کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ فلاں جگہ رہتا ہے یا فلاں مسجد فلاں جگہ رہتی ہے

بہرحال اس بیان سے معلوم ہوگیا کہ صاحب کنز الایمان نے "العالمین" کے ترجمہ میں معتزلہ کا قول اختیار کیا ہے اور حضرت شیخ الہند نے جمہور اہلسنت کا۔

آیت (۳) الرحمٰن الرحیم، ان دونوں لفظوں کے ترجمہ میں وہی نقائص ہیں جو ہم نے تسمیہ کے ترجمے کے ذیل میں ذکر کردیے ہیں۔

آیت ۳ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ کا ترجمہ خان صاحب نے یہ کیا ہے "روز جزا کا مالک" یہ

ترجمہ عبارت قرآنی کی ترتیب کے موافق نہیں، جب کہ حضرت شیخ الہند رح نے صحت ترجمہ کے ساتھ ساتھ الفاظ کی قرآنی ترتیب کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا، وہ فرماتے ہیں۔ "مالک روز جزا کا"۔ اس ترجمہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت شیخ الہند رح ترجمہ میں الفاظ کی قرآنی ترتیب کو بھی بحدا مکان ملحوظ رکھتے ہیں۔

آیت ۵: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، اس آیت کا ترجمہ خاں صاحب نے یہ کیا ہے کہ "ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں۔" یہ ترجمہ بھی محل نظر ہے

(۱) اس لئے کہ ایاك نعبد اور ایاك نستعین دونوں جملہ خبریہ ہیں، لیکن ان کا ترجمہ جو خاں صاحب نے کیا ہے وہ آج کل کی فصیح اردو کے لحاظ سے جملہ استفہامیہ انشائیہ بن جاتا ہے، مثلاً جانے یا آنے والا شخص اجازت لیتے ہوئے کہتا ہے "میں جاؤں" یا "میں آؤں"۔ گویا خاں صاحب اللہ تعالیٰ سے پوچھ رہے ہیں کہ "ہم تجھی کو پوجیں؟ تجھی سے مدد چاہیں؟ یعنی ہم اے خدا تجھی کو پوجیں یا اوروں کو بھی پوج سکتے ہیں؟ اور اے خدا ہم تجھی سے مدد مانگیں یا اوروں سے مدد مانگ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ ترجمہ انتہائی غلط اور گمراہ کن ہے۔

حضرت شیخ الہند رح کا ترجمہ یہ ہے "تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں"۔ اس ترجمہ سے کوئی غلط اور گمراہ کن ایہام نہیں ہوتا۔

(۲) ہندی کا لفظ "پوجنا" "پوجا" کا مصدر ہے اور "پوجا" بھی ہندی کا لفظ ہے جس کا ایک معنی "ہندوؤں کی عبادت کا طریقہ" بھی ہے [1]

اس لئے "پوجا" کے لفظ سے ذہن پنڈتوں، مہنتوں، پروہتوں، جوگیوں اور بھگتوں کے طریقہ عبادت کی طرف منتقل ہو جانا کچھ بعید نہیں، حالانکہ ہندوؤں کا تصور عبادت اہل اسلام کے تصور عبادت سے یکسر مختلف ہے، اس لئے "عبادت" کا ترجمہ کسی ایسے لفظ سے کرنا زیادہ موزوں اور بہتر ہوگا جس سے غیر مسلموں کے تصور عبادت کی بو نہ آتی ہو، اس نقص و عیب سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے یعنی "تیری ہی ہم

---

[1] فرہنگ آصفیہ ص۵۳۸ ج۱، مطبوعہ مکتبہ حسن سہیل لاہور۔

بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں"۔ احمد رضا خاں صاحب کا ذہن نارسا ان باریک امور کا لحاظ نہ رکھ سکا۔

آیت (۵) اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۔ اس کا ترجمہ خاں صاحب نے یہ کیا ہے "ہم کو سیدھا راستہ چلا"۔

(ا) ہدایت کے اصل معنی دلالت و رہنمائی کے ہیں، چنانچہ "خاں صاحب" نے متعدد مقامات پر "ہدایت" کا ترجمہ "راہ دکھانے" سے کیا ہے، مثلاً (الف) سورۂ انعام میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے متعدد انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کرکے فرمایا ہے وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ [1] (ترجمہ خاں صاحب) اور ہم نے انھیں چن لیا اور سیدھی راہ دکھائی۔

(ب) حضرت موسیٰ و ہارون علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ [2] (ترجمہ خاں صاحب) اور ان کو سیدھی راہ دکھائی

(ج) حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب کرتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا [3] (ترجمہ خاں صاحب) اور تمھیں سیدھی راہ دکھاوے۔

یہ بات معلوم کر لینے کے بعد کہ ہدایت کے اصل معنی راہ دکھانے کے ہیں، یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جس طرح محض راہ دیکھ لینا شریعت کی نگاہ میں قابل اعتبار نہیں جب تک اس پر چلا نہ جائے اور عمل نہ کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے علم رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے گمراہ قرار دیا ہے کہ علم حاصل ہونے کے بعد وہ اس پر عمل پیرا نہ ہوئے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ [4] (ترجمہ خاں صاحب) اور اللہ نے اسے باوصف علم کے گمراہ کیا۔

اور اسی طرح اس "عمل" کا شرعاً اعتبار نہیں جس کی پشت پر علم صحیح نہ ہو، ارشاد خداوندی ہے وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ [5] یعنی اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوگا جو اللہ کی رہنمائی کے بغیر اپنی خواہش کا اتباع کرے۔

بہرحال ثابت ہوگیا کہ جس طرح سیدھی راہ دیکھ لینا بغیر اس پر چلنے کے کافی نہیں، اسی طرح بغیر علم صحیح کے اس پر چلنا بھی معتبر نہیں۔

---

[1] الانعام: ۸۷ ـ [2] الصافات: ۱۱۸ ـ [3] سورۂ فتح: ۲ ـ [4] الجاثیہ: ۲۳ ـ [5] القصص: ۵۰ ـ

اس تمام تفصیل کے بعد معلوم ہوگیا کہ آیت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کا ترجمہ اگر "سیدھا راستہ چلانے" سے کیا جائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ سیدھے راستے پر ایسا چلانا جو سیدھے راستہ کے علم صحیح پر مبنی ہو، اور اگر اس کا ترجمہ "بتلا ہم کو راہ سیدھی" سے کیا جائے تو بھی اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اسی طرح سیدھی راہ بتلانا جو اس پر چلنے کو بھی مستلزم ہو۔

یہاں سے ثابت ہوگیا کہ اس آیت میں "راستہ چلانا" اور "راستہ بتلانا" دونوں طرح ترجمہ کرنا درست ہے، اور ہر ترجمہ اپنی مکمل تصحیح میں دوسرے کا محتاج (یعنی چلانا بتلانے کا اور بتلانا چلانے کا) احمد رضا خاں صاحب "راستہ چلانا" سے ترجمہ کرتے ہیں اور حضرت شیخ الہند "راستہ بتلانا" سے اب دیکھنا یہ ہے کہ باوجودیکہ حضرت شیخ الہند کے سامنے "راستہ چلا" والا ترجمہ موجود تھا، پھر آپ نے اس کا ترجمہ "راستہ چلا" کی بجائے "راستہ بتلا" کیوں کردیا، اور آپ کے نکتہ رس ذہن نے اس میں کون سا نکتہ محسوس فرمایا جس کے باعث آپ نے پہلے ترجمہ کی بجائے دوسرا ترجمہ اختیار فرمایا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء کرام نے سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے باہمی ربط کی ایک بڑی اور اہم وجہ ربط یہ ذکر فرمائی ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جو دعاء ہدایت کی گئی ہے اس کا جواب ابتداء سورۂ بقرہ سے آخر قرآن تک ہے، یعنی ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ الآیۃ، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ (الآیۃ) اب اس ہماری دعا اور اس کے جواب میں مطابقت اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب حضرت شیخ الہند والا ترجمہ کیا جائے، ورنہ سوال و دعا اور اس کے جواب میں مطابقت مفقود ہوجاتی ہے، حضرت شیخ الہند سورۂ فاتحہ کی آیت دعاء کا ترجمہ فرماتے ہیں "بتلا ہم کو راہ سیدھی" اور اس کے جواب کا ترجمہ بایں الفاظ فرماتے ہیں: "اس کتاب میں کچھ شک نہیں، راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو" نیز حضرت شیخ الہند نے حاشیہ میں "فائدہ نمبر۲" کے ذیل میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "یہاں سے اخیر قرآن تک جواب ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کا جو سوال بندوں کی طرف سے ہوا تھا"

اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ شیخ الہند نے "اِھْدِنَا" کا ترجمہ بتلا فرماکر کس طرح سورۂ فاتحہ کا

اپنے ما بعد کے ساتھ اور ما بعد کا سورۂ فاتحہ کے ساتھ ربط و تعلق واضح فرما دیا۔ لیکن اس کے برعکس احمد رضا خاں صاحب کے ترجمہ کے مطابق یہ ربط واضح نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں دُعا کے اندر تو ذکر ہوا صراطِ مستقیم پر چلانے کا اور جواب ملا کہ قرآن کتاب ہدایت ہے جو راستہ دکھاتی ہے یہاں سے حضرت شیخ الہند کی دقتِ نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) احمد رضا خان صاحب نے الفاظ قرآنی کی ترتیب کو بھی اس ترجمہ میں مدنظر نہیں رکھا، لکھتے ہیں "اور ہم کو سیدھا راستہ چلا"۔ جب کہ حضرت شیخ الہند نے یہ ترجمہ فرمایا ہے "بتلا ہم کو سیدھی راہ"۔ یعنی اِهْدِ کا ترجمہ "بتلا"۔ اور "نا" کا ترجمہ "ہم کو"۔ اور "الصِّرَاطَ" کا "راہ" اور الْمُسْتَقِيمَ کا "سیدھی" یہاں سے بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت شیخ الہند الفاظ کی قرآنی ترتیب کو بھی تا بحد امکان ملحوظ رکھتے ہیں۔

آیت (۶) صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ خان صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے "راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا، نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا"

یہ ترجمہ بھی متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

(۱) اس لئے کہ الَّذِينَ اسم موصول ہے جو ذوی العقول کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن خان صاحب نے ترجمہ میں اس کا قطعاً خیال نہیں رکھا جس کے باعث ذہن غیر ذوی العقول کے راستوں کی طرف بھی منتقل ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا احسان کوئی ایسی چیز نہیں جو صرف ذوی العقول کے ساتھ ہی خاص ہو بلکہ اس کے احسانات تو ساری مخلوق کو محیط ہیں اس لئے اس کا زیادہ صحیح ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے یعنی "راہ ان لوگوں کی"

(۲) لفظ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا ترجمہ خان صاحب نے "احسان" سے فرمایا ہے، اگر وہ ذرا بھی تدبر سے کام لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ "انعام" اور "احسان" کے استعمال میں بڑا فرق ہے "احسان" تو کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ اچھا سلوک کچھ دے کر ہو یا کچھ دیئے بغیر، اس کے برعکس "انعام" کا اطلاق کچھ دینے کی صورت میں ہوگا، چنانچہ "مفردات امام راغب" میں ہے: والاحسان اعم من الانعام۔ یعنی احسان عام ہے انعام سے۔

احمد رضا خاں صاحب کے ترجمہ کے برعکس شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کا ترجمہ اس سقم سے بالکل پاک ہے وہ فرماتے ہیں۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا .... بلکہ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ میں ایک اور لطافت ہے جو اس آیت پر نظر کرنے کے بعد معلوم ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام کردہ لوگوں کا ذکر فرمایا ہے وہ آیت مبارکہ یہ ہے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا [1]

(ترجمہ خاں صاحب)" اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور نیک لوگ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ کافی ہے جاننے والا"

اس آیت مبارکہ کو دیکھ کر ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود اس کو اپنا فضل قرار دیتے ہیں، دوسرے یہ کہ خود خانصاحب نے اس مقام پر لفظ اَنْعَمَ کا ترجمہ اسی مناسبت کی بناء پر "فضل" سے کیا ہے لیکن افسوس کہ احمد رضا خاں صاحب کو سورۂ فاتحہ کا ترجمہ کرتے وقت یہ آیت مدنظر نہ رہی، اور یہیں سے حضرت شیخ الہند کی دور بینی بھی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ کسی آیت کے ترجمہ کے وقت اس سے متعلقہ دیگر قرآنی آیات کو کس طرح ملحوظ خاطر رکھتے ہیں، سچ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۳) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ ترکیب میں اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی "صفت" یا اس سے "بدل" واقع ہے، اور "بدل" بھی "بدل الکل" [2] اور ظاہر ہے کہ صفت موصوف کا مصداق اور مدلول نیز بدل الکل اور مبدل منہ کا مصداق، ایک ہوتا ہے اس لئے اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کا مصداق اور مدلول ایک ہی ہوگا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب یا تو اس آیت مبارکہ کی ترکیب سے بالکل ناواقف ہیں اور یا پھر علم نحو کے اس ابتدائی مسئلہ سے آگاہ نہیں ہیں کہ بدل کا

[1] النساء: ۶۹ ۔ [2] روح المعانی، ص ۹۴، ج ۱

وصولی چندہ کے منفرد انداز

چندہ اور سفر کے اخراجات :-

مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کیلئے سفر کرسکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں (!)

ڈیپوٹیشن جو چندہ کرنے کے لئے دورہ کرتا ہے، یا مجھے خود چندہ کرنے کیلئے کسی جگہ جانا ہو، تو کل اخراجات سفر ہم اپنے پاس سے ادا کرتے ہیں۔ اور جو کچھ چندہ وصول ہوتا ہے

• رقم کی فراہمی کے سلسلے میں سرسید نے مختلف مواقع پر جو منفرد انداز اختیار کئے ہیں ان میں سے چند اد قابل ذکر ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

"چندہ کے علاوہ جب کبھی ان کو دوستوں سے کچھ اچک لینے کا موقع ملا انھوں نے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "خانۂ دوستاں بروب و در دشمناں مکوب" ایک روز مسٹر تھیوڈور بیک کے والد جو سیاحت کیلئے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے، ایک خاص سکہ کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اس کو لینے سے انکار کرتے تھے، آخر دونوں صاحب سرسید کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا، سرسید نے بہت بدمزہ ہوکر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بد اخلاقی کی بات ہے انھوں نے وہ اشرفی لے لی، سرسید نے کہا، دیکھوں کس سکہ کی اشرفی ہے؟ اور ان سے لے کر مدرسہ کے کھاتہ میں جمع کردی۔

اسی طرح ایک دن سید محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط بدی اور یہ ٹھہرا کر جو ہارے [illegible]

بے کم و کاست مدرسہ میں جمع کر دیتے ہیں(۲)

مہمان داری کی رقوم چندہ میں:-

میں نے ایک نیا طریقہ دوستوں سے اختیار کیا ہے، کسی دوست کے پاس نہیں ٹھہرتا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) سے کہا کہ پچاس روپیہ دیجئے اور نوٹ لیجئے۔ انھوں نے کہا، وہ تو ہنسی کی بات تھی کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟ دوسرے شرط بدنا جائز بھی نہیں ہے۔ سرسید بھی وہیں موجود تھے، جب انھوں نے دیکھا روپیہ مدرسہ میں آتا ہے، فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ جائز ہے، اور فوراً بکس میں سے پچاس روپے نکال کر سید محمود کو دے دیئے اور نوٹ لے لیا (حیات جاوید حصہ اول ص ۲۱۰ - ۲۱۱)۔

سرسید اپنے مخالفوں سے بھی چندہ وصول کرنے کا ایسا ہی عزم رکھتے تھے، ایک جگہ اپنے بہت بڑے مخالف سید امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کان پور کے بارے میں دلچسپ انداز میں یوں تحریر فرماتے ہیں: لوگ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ جناب مولوی حاجی سید امداد العلی صاحب خان بہادر سی ایس آئی ہمارے بڑے مخالف ہیں، مگر ان کو جاننا چاہیئے کہ باوصف اس قدر اختلاف خیالات کے وہ ہمارے ویسے ہی دوست ہیں جیسے ایک مدت دراز سے تھے، ہمارے خیالات کے وہ کیسے ہی مخالف ہوں مگر مدرستہ العلوم کے قیام کو نہایت عمدہ سمجھتے ہیں، افسوس ہے کہ کئی دفعہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ادھر ادھر بہت دیکھا کہیں روپیہ کی تھیلی نظر نہیں پڑی، اب کی دفعہ ایسے وقت پر جائیں گے جب کہ چپراسی تنخواہ خزانہ سے لاتا ہوگا، اور لوگوں کو دکھادیں گے کہ کس طرح ان کی پوری تنخواہ مدرستہ العلوم کے چندہ میں داخل ہوئی (برگ گل کراچی سرسید نمبر، نقش ثانی ص ۳۴۸)

حالی لکھتے ہیں، مارچ ۱۸۹۰ء میں جب کہ سر شیر محمد خان بہادر رئیس پالن پور کالج کے ملاحظہ کو علی گڑھ میں آئے اور ٹرسٹیوں کی طرف سے سرسید نے ان کو ایڈریس دیا اس وقت کالج کی خیر خواہی کے جوش میں سرسید نے ایک ایسا کام کیا جس کو سن کر ہر شخص تعجب کرے گا۔ رئیس ممدوح نے چلتے وقت پچاس روپیہ سرسید کے پوتے سید مسعود کو اور پچاس محمد بشیر کو، جو نواب محسن الملک کا عزیز ہے اور پچاس پچاس دونوں صاحبوں کے ملازموں کو علاوہ پانچ سو روپیہ چندہ کالج کو دیئے تھے، دونوں بچوں نے تو خوشی سے کہہ دیا کہ ہم دونوں کے سو روپے کالج کے مسجد کی تعمیر میں صرف کئے جائیں مگر سرسید نے نوکروں کا بھی لینا چاہا، نواب محسن الملک نے تو اپنے نوکروں کے انعام کو ان سے لینا ہرگز پسند نہ کیا اور پچاس روپے انھی کو دیدیئے۔ مگر سرسید نے حجت شرعی تمام کرنے کو نوکروں سے کہا کہ اگر تمکو ہماری نوکری ہے تو جو انعام نواب صاحب نے تمکو دیا ہے وہ کالج میں دے دو ورنہ اپنا حساب کر لو۔ (باقی حاشیہ اگلے

ڈاک بنگلہ میں ٹھہرتا ہوں اور سب دوستوں سے کہتا ہوں کہ جو کچھ آپ میری مہمان داری یا دعوت میں خرچ کرتے وہ از راہ عنایت نقد مرحمت فرمادیں، اس میں ایک اور خوبی یہ ہے کہ امیر و غریب سب دعوت کرسکتے ہیں، ایک دوست نے ایک دفعہ ایک روپیہ باب دعوت مجھے عنایت کیا، نہایت خوش ہوا کہ مدرسۃ العلوم کے آٹھ دس مزدوروں کی مزدوری ملی وہ دوست بھی خوش ہوئے کہ دعوت نیک لگی (۳)

خوشی کی تقریبات میں چندہ بطور رسم :-

سردار محمد حیات خاں بہادر سی ایس آئی میرے پرانے اور نہایت عزیز دوست ہیں، یہاں تک کہ ان کو میں تحریرات میں کوئی القاب بھی نہیں لکھتا، صرف "مائی ڈیر حیات" لکھتا ہوں، انھوں نے مدرسۃ العلوم میں بھی ہزاروں روپیہ سے مدد کی ہے، میرے عزیز محمد اسلم حیات کی، جو ہمارے کالج کے ایک طالب علم ہیں اور خدا کی عنایت سے اب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں اور جناب سردار صاحب کے فرزند ہیں، شادی کتخدائی تھی، سردار محمد حیات خاں نے بہ تقریب تہنیت اس شادی کے دوسو روپیہ مدرسۃ العلوم میں بھیجے، آپ کو معلوم ہے کہ موقع پر ڈوم ڈھاڑی میراثی ہٹ کیا کرتے ہیں کہ اتنا نہیں لیتے اور زیادہ دو ـــــ میں نے بھی ہٹ کی اور کہا کہ پانچ سو روپیہ دو اور مدرسۃ العلوم کے سنٹرل ہال میں اس مبارک شادی کی یادگار کندہ کرادو (۴)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ بے چارے نوکری کیونکر چھوڑ سکتے تھے ؟ انھوں نے مجبوراً پچاس روپے سرسید کو دے دیئے اور سرسید نے بے تکلف ان سے روپیہ لیکر کالج کے فنڈ میں جمع کرلیا (حیات جاوید، حصہ دوم حاشیہ ص ۱۷)

علی گڑھ کے ایک انگریز پروفیسر اپنی بیوی کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔ بوڑھے سید کالج کی نمازوں میں شریک ہونے لگے ہیں جس سے بہت ہلچل ہوئی ہے کیونکہ انھیں ہمیشہ کافر کہا جاتا تھا، کمیٹی کے ایک رکن نے انھیں ہر حاضری کے بدلے ایک روپیہ کی پیش کش کی ہے، ان (سرسید) کا بیان ہے کہ وہ اس سے ایک لڑکے کے وظیفہ جتنی رقم کما سکتے ہیں، وہ اپنی تمام گذشتہ نمازوں کے علاوہ مستقبل کی نمازیں بھی فروخت کرنے کو بے تاب ہیں، گذشتہ کیلئے وہ جو قیمت طلب کرتے ہیں وہ چار آنے یا ساڑھے چار پنس ہے:

(دی لیٹرز آف سرواٹر ریلے ص ۵۳)

کالج کی مخالفت

مذہبی اتہامات :-

جس زمانہ میں اس کالج کی تدبیریں شروع ہوئیں تو ہر جگہ کے لوگوں نے اس کو پسند کیا، اور حصہ ملک سے اس کی تائید ہوئی۔ مگر بعض مذہبی مسائل جو میں نے بیان کئے ان کے لحاظ سے البتہ لوگوں کو کچھ کچھ شبہ ہوا اور فتور پڑا۔(۵)

مولوی سید امداد العلی خان بہادر، جو فضل الٰہی سے ہماری قوم میں ایک بہت بڑے اعلیٰ افسر رئیس ہیں اور ہمارے بہت بڑے شفیق دوست ہیں، مدرستہ العلوم میں ان کے شریک نہ ہونے سے ہم کو نہایت رنج ہے اور نیز قوم کی بھلائی میں نقصان ہے اور ہم جب ان سے ملتے ہیں مدرستہ العلوم میں شریک ہونے کی التجا کرتے ہیں، دربار دہلی میں بھی ہم نے ان سے التجا کی، انھوں نے فرمایا کہ دو شرط سے ہم شریک ہوں گے، اول یہ کہ تہذیب الاخلاق چھاپنا بند کر دیا اس میں کوئی مضمون متعلق مذہب مت لکھو۔ دوسرے یہ کہ اپنے عقائد و اقوال سے جو برخلاف علمائے متقدمین ہیں، توبہ کرو۔(۶)

خود ہماری ہی قوم میں بعض لوگوں نے اس قومی فائدہ کے کام میں مخالفت اختیار کی اور مذہبی مخالفت کا جھوٹا حیلہ بنا کر اس قومی بھلائی کے کام کو برباد کرنا چاہا۔(۷)

ان کو اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے بجز اس کے کہ مذہبی تعلیم کی نسبت جھوٹے اتہام مشہور کیا کریں اور کوئی بہتر طریقہ نہ تھا اور ان اتہامات کو بعض لوگوں نے سچ سمجھا ہوگا، اور بعض شبہ میں پڑے ہوں گے لیکن ہماری کمیٹی کی اس سچی اور نیک نیت کارروائی نے جو مذہبی تعلیم کے باب میں ہوئی تمام دنیا پر ظاہر کر دیا کہ ان قومی بھلائی کے مخالفوں کے اتہامات کیسے اعلانیہ جھوٹے اور بے اصل تھے، کمیٹی خزنتہ البضاعتہ نے مذہبی تعلیم کا رشتہ بالکل اپنے سے علیحدہ کر دیا اور ایسے دین دار اور خدا پرستوں کے ہاتھ میں سپرد کیا جن کی نیکی اور دین داری پر ہمارے مخالفوں

حالی لکھتے ہیں۔ مدرستہ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رعب ہونے کے علوم وغیرہ سے بھی آشنا تھے ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور اور دوسرے۔ مولوی [illegible]

کو بھی اقرار ہے۔ (۸)

لعنتیوں کا طوق:

ہمارے دوستوں کا یہ خیال کہ ان کے اتہامات اور فحش سے مدرسۃ العلوم کو نقصان پہونچے گا میری رائے میں درست نہیں ہے، مدرسۃ العلوم چل نکلا اور چلے گا، تمام اتقیاء اور رؤسا نے دیکھا اور تجربہ کیا، اب وہ کسی بدگوئی اور فحش اتہامات سے رک نہیں سکتا ہاں جس کسی کو لعنتی کا طوق پہننا خوش آتا ہو وہ جو چاہے کہہ لے اور کر لے (۹)

جہاں تک مجھ سے ہو سکے میں اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کروں گا اور ضرور کرونگا اور لوگوں کو جو وہ بکنا چاہیں بکنے دوں گا، کون سی بات ہے جو لوگوں نے میری نسبت نہیں کی اور میں نہایت خوش ہوں گا کہ جو کچھ ان کو کہنا باقی رہ گیا ہو وہ بھی اب کہہ لیں۔ (۱۰)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اگرچہ دونوں صاحب مذہبی خیال و عقائد کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد حقیقی تھے یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی، اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق محال عادی معلوم ہوتا تھا باوجودیکہ اس کے مدرسۃ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہم زبان اور متفق الکلمہ تھے، یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع انہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔

(حیات جاوید، حصہ دوم، ص ۲۷۷)

پہلے مخالف کے خیالات تو آپ نے سرسید ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائے، اب دوسرے بڑے مخالف مولوی علی بخش خاں کی مخالفت کا جواز نواب وقار الملک کے حوالے سے تحریر ہے، مولوی علی بخش خاں نے کہا، میں صرف اس وجہ سے اب تک مدرسۃ العلوم میں شریک نہیں ہوا کہ مجھ کو اس کے طالب علموں کی مذہبی تعلیم کی طرف سے کبھی اطمینان نہیں ہوا اور ہمیشہ اس بات کا خوف رہا کہ جس قسم کے عقائد سید احمد خاں صاحب کے ہیں ویسے عقائد کی تعلیم اس مدرسہ میں طالب علموں کو بھی ہوگی (تہذیب الاخلاق، جلد چہارم ص ۶۷)

اسی طرح مولوی علی بخش خاں نے نواب محسن الملک کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کیا۔ ہماری قوم میں سید احمد خاں صاحب ایک شخص لائق اور ناصحا در معزز اور ذی عقل پیدا ہوئے اور ترقی قومی پر آمادہ ہوا ان کا ارادہ ظاہر کیا گیا مگر اپنی خودرائی سے مذہبی وحشت انداز و انقلاب دین ایسا ان کی طبیعت میں [illegible] گیا کہ اصلی غرض فوت ہو گئی اور تمام قوم کو ان سے نفرت پیدا ہو گئی ہے، مجھ کو بھی جس قدر مخالفت ہے ان کے [illegible] ان کی ذات خاص یا تعلیم علوم جدیدہ سے۔ (مقالات سرسید حصہ دہم ص ۲۴)

خبیث النفس، بدباطن، حساد، بے تمیز، یہود ہذہ الامت

ہم نے سات قسم کے لوگوں کو دارالعلوم مسلمانان کے مخالف پایا:

اول خبیث النفس اور بدباطن (۱۱) دوم حاسد۔ (۱۲)

سوم بعض متعصب وہابی جن کو میں "یہود ہذہ الامت" سمجھتا ہوں (۱۳)

چہارم خود غرض یا خود پرست (۱۴) پنجم ٹٹ پونجئے اخبار نویس (۱۵)

ششم بے تمیز (۱۶) ساتویں نادان مسلمان جن کے دل میں پہلی پانچ قسم کے بزرگوں نے وسوسہ ڈالا ہے۔ (۱۷)

غدار ایڈیٹر:-

ہمارے ملک کے بعض اخباروں نے بھی (خصوصاً جن کے ایڈیٹر مسلمان تھے) اور جن کا فرض اپنی قومی ترقی میں کوشش کرنا تھا) اس مدرستہ العلوم کی کافی مخالفت کی ہے، گو اس کا کچھ اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر انھوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے ایک ٹریٹر ہونے میں بلاشبہ بلند نامی حاصل کی ہے۔ (۱۸)

سید محمود کی جانشینی کا مسئلہ

موزوں یورپین ہیڈ ماسٹر کے تقرر میں واسطہ:-

جب اسکول جاری ہوا ہم کو یورپین مگر ایک جنٹلمین ہیڈ ماسٹر کا ملنا مشکل تھا، حالانکہ یورپ سے بلانا نہ تھا بلکہ ہندوستان ہی میں سے تلاش کرنا تھا، اس کے بعد کالج کو ایسی ترقی ہو گئی تھی کہ اس کے لئے پرنسپل یا پروفیسر کا ہندوستان میں تلاش کرنا فعل عبث تھا اور بغیر اس کے کہ ولایت سے اور ولایت کی یونیورسٹیوں کے گریجویٹ کو بلائیں کام ہی نہیں چل سکتا تھا ہمارا مقصد پورا ہونے کو صرف گریجویٹ ہی ہونا کافی نہ تھا بلکہ ایک معزز خاندان کا اور ایک اچھے

جنٹلمین مزاج کا ہونا بھی ضرور تھا جو ہم سے دوستانہ یا برادرانہ برتاؤ اور ہماری قوم کے بچوں پر پدرانہ شفقت رکھنے کے لائق ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر سید محمود اس کام کو اپنے ذمہ نہ لیتے اور اس کا انجام نہ کرتے تو ایک شخص بھی ہم کو ولایت سے میسر نہ آتا، جو لوگ ولایت سے آئے صرف سید محمود کی دوستی پر طمانیت کرکے اور سید محمود کے سبب سے مجھ پر طمانیت کرکے اور اس یقین پر کہ ان کو صرف ان ہی دو شخصوں سے سروکار رہے گا، بلا کسی شرط اور بلا کسی اگریمنٹ کے ہمارے کالج میں آئے، ایک جنٹلمین یورپین نے جس نے ہمارے کالج میں آنے کا ارادہ کیا تھا، ولایت میں سرجان اسٹریچی سے پوچھا کہ مجھ کو کن شرطوں پر جانا مناسب ہوگا، سرجان نے جواب دیا کہ کالج سید احمد کے ہاتھ میں ہے، اس پر پوری طمانیت رکھنا سب سے عمدہ شرط ہے۔ میرا یہ دلی یقین ہے کہ اگر آئندہ ہم کو کسی یورپین پروفیسر کا ولایت سے بلانا ہو اور سید محمود واسطہ نہ ہوں اور نیز موجودہ یورپین افسر اس شخص کو ہمارے برتاؤ سے، جو ہم کالج کے یورپین افسروں کے ساتھ رکھتے ہیں مطمئن نہ کریں تو محالات سے ہے کہ کوئی شخص بھی ولایت سے آئے۔ (۱۹)

یورپین دوستوں کا مشورہ

یورپین افسر جب ہمارے کالج میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک کمیٹی کالج پر حکومت کرتی ہے جس میں مختلف مزاج، مختلف طبیعت اور مختلف سوسائیٹی کے لوگ شامل ہیں اور پانچ آدمی جو نہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ انگریزوں کی ضروریات و حالات سے واقف ہیں ہر ایک امر کا فیصلہ کر دیتے ہیں، بلاشبہ ان کو تردد ہوا کہ موجودہ سکریٹری کے بعد کون سکریٹری ہوگا اور اس کے ساتھ ہم مل کر کالج کا کام بہ طمانیت کرسکیں گے یا نہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ان کا یہ خیال کچھ ناواجب نہ تھا، اسی کے ساتھ بدبختی سے ایسے امور پیش آئے جس سے ان کو عدم طمانیت کا خیال زیادہ پختہ ہوگیا بلکہ درجہ یقین کو پہونچ گیا، کسی کے یہ کہہ دینے سے کہ ان کے یہ خیالات صرف توہمات ہیں ان کے دل کو طمانیت نہیں ہوسکتی، ان کی یہ خواہش نہ تھی، نہ وہ اس میں مداخلت

کرنا چاہتے تھے کہ موجودہ سکریٹری کے بعد کون سکریٹری ہو مگر بلا شبہ ان کی خواہش یہ تھی کہ یہ بات معلوم ہوجائے اور ابھی اس کا تصفیہ ہو جائے کہ موجودہ سکریٹری کے بعد کون سکریٹری ہوگا اس کے بعد وہ اپنے حال کا خود تصفیہ کریں گے، اگر وہ سمجھیں گے کہ اس کے ساتھ وہ ملکر کالج کا کام بہ طمانیت کرسکتے ہیں، کریں گے ورنہ خدا حافظ کہہ کر اپنے لئے کوئی اور راستہ اختیار کریں گے، بے شک ان کا یہ خیال کہ اگر سید محمود آئندہ سکریٹری ہوں تو وہ بہ طمانیت جب تک خدا چاہے کالج کا کام کرسکیں گے، انھوں نے اپنے اس خیال کو پوشیدہ نہیں رکھا، اس ضلع کے یورپین دوستوں اور ان یورپین دوستوں سے جو ہمارے کالج کے بے انتہا دوست اور ہمارے کالج کے ہر گونہ ترقی کے خواہاں ہیں، سب پر ظاہر کیا، میرے کل یورپین دوستوں نے صلاح دی کہ کالج کی بہتری کیلئے نہایت ضرور ہے کہ یورپین اسٹاف کو کافی طمانیت سے رکھا جائے اور تم کو بہ نظر بہتری کالج کے ضرور ہے کہ بہت جلد اس بات کا تصفیہ کردو کہ تمھارے بعد سید محمود کالج کے لائق سکریٹری ہوں گے۔ (۲۰)

اہلیت بطور سکریٹری:۔

اس خاص معاملہ میں یورپین دوستوں کی رائے و مصلحت کو بہ نسبت کسی ہندوستانی دوست کے زیادہ وقعت کی سمجھتا ہوں اور بے شک ان کی مصلحت کو کالج کی آئندہ حالت کے لئے زیادہ مفید سمجھتا تھا، لیکن اس سبب سے کہ سید محمود میرے فرزند ہیں اس میں مجھ کو تامل ہوجاتا تھا، علاوہ اس کے میرا یہ فرض بھی تھا کہ میں اس بات کی بھی فکر کروں کہ میرے بعد میرے کالج کا کیا حال ہوگا؟ یہ کہہ دینا کہ خدا پر چھوڑ دو بڑے بڑے دین داروں کا کام ہے، میں تو دنیا کا ایک آدمی ہوں اور دنیا کے انتظام کی پابندی سے آئندہ کے انتظام کا خیال ایک قدرتی امر ہے جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے، کالج اب ایک اسکول نہیں رہا ہے جس کا کام ہما شما چلالیں، اب خدا کے فضل سے وہ اعلیٰ درجے تک ترقی کرگیا ہے، ایم اے کلاس تک اس میں پڑھائی ہوتی ہے۔ ایسے کالج کا کام چلانے کے لئے ایسے شخص کا سکریٹری ہونا لازم ہے جو خود انگریزی علوم اور یورپین سائنس و لٹریچر سے کما حقہ واقف ہو اور انگریزی

تعلیم کو سمجھتا ہو، تعلیم کے معاملہ میں پرنسپل کے ساتھ صلاح ومشورہ میں شریک ہو سکتا ہو، خود اس بات کو جان سکے کہ کالج میں تعلیم کی کیا حالت ہے اگر کچھ نقص ہوں تو اس کو سمجھنے اور اصلاح کرنے پر قدرت رکھتا ہو، کالج کے معاملات میں تمام خط وکتابت جو ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن سے گورنمنٹ سے، گورنمنٹ آف انڈیا سے تعلیم کی نسبت اور بالتخصیص مسلمانوں کی تعلیم کی نسبت ہوتی ہیں ان کو انجام دے سکے۔ میں خود اقرار کرتا ہوں کہ مجھ میں ان تمام کاموں کے انجام دینے کی لیاقت نہیں ہے صرف سید محمود کی امداد سے وہ انجام پاتے ہیں۔ امداد کا لفظ بھی صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ان سب کو سید محمود انجام دیتے ہیں، پرنسپل صاحب کالج کے تعلیمی معاملات میں سید محمود سے مشورہ کرتے ہیں، یونیورسٹی کے معاملات میں سید محمود سے مشورہ کرتے ہیں، ہمارے دفتر کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ تمام اپوائنٹمنٹ چٹھیاں متعلق کالج ان کی لکھی یا لکھوائی ہوئی موجود ہیں مدرسہ کے بورڈنگ ہاؤس کی اور تعلیم کے طریقے کی، جس پر اس وقت مدرسہ چل رہا ہے اور جس پر آئندہ چلے گا ان کی نسبت یہ کہنا کہ میں ان کا تجویز کرنے والا اور قرار دینے والا تھا ایک ناانصافی ہوگی بلکہ صاف صاف کہنا چاہیئے کہ اس کا بہت بڑا حصہ سید محمود کا تجویز کیا ہوا تھا جو انھوں نے اپنی واقفیت اور اپنے نہایت لائق دوستوں سے صلاح وگفتگو کے بعد قرار دیا تھا۔ (۲۲)

ایک اور امر ہے جس کو میں بہت بڑا عظیم الشان سمجھتا ہوں، گو اور لوگ اس کو حقیر سمجھیں کہ یہ کالج جس مقصد اور جس پالیسی سے میں نے قائم کیا ہے اور جس نتیجہ قومی ترقی پر میں نے اس پر محنت کی ہے میرے بعد بھی اسی طرح اور اسی نتیجہ پر یہ کالج چلے، سید محمود ابتدا سے آج تک ان تمام صلاحوں میں شریک غالب رہے ہیں اور مجھ کو اس بات کا یقین کامل ہے کہ سوائے سید محمود کے اور کوئی شخص کالج کو اس طریقہ پر نہیں چلا سکتا۔ (۲۳)

جو ضرورت کالج میں انگریزی تعلیم اور ولایت سے پروفیسر اور لائق آدمیوں کے بہم پہونچانے کی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی، سوائے سید محمود کے کون انجام دے سکتا ہے؟ اگر سید محمود میری مدد نہ کرتے نہایت کوشش سے پروفیسروں کے انتخاب میں اپنا ذاتی روپیہ خرچ نہ کرتے تو ایک پروفیسر بھی ہم کو میسر نہ آتا۔ اگر آج سید محمود مدرسے کی مدد سے دست کش ہو جائیں تو میری زندگی ہی

میں مدرسہ چل نہیں سکتا، مولوی سمیع اللہ خان مع حمید اللہ خان اور دو چار سمیت اگر ایک پروفیسر بھی خصوصاً میرے مرنے کے بعد بلوا سکیں تو اگر میں زندہ ہوں تو میری ڈاڑھی منڈوا ڈالنا اور مر جاؤں تو قبر پر جا کر جوتے مارنا اور لعنت بھیجنا۔ (۲۴)

ٹرسٹی بل کی مخالفت:-

ان تمام واقعات واقعی اور امورات حالی اور حالات وجدانی نے مجھ کو آمادہ کیا کہ میں مسودہ مجوزہ میں سید محمود کو اپنی زندگی تک جائنٹ سکریٹری، جس کا درحقیقت ابتدا سے وہ کام کرتے ہیں اور اپنے بعد لائف آنریری سکریٹری مقرر کردوں، میں سمجھتا تھا کہ ایسا کرنے میں لوگ مجھ کو ہر طرح کے طعنے دیں گے اور کوئی بدگمانی اور کوئی اتہام ایسا نہ ہوگا جو مجھ پر نہ کریں گے، میں نے کہا کہ اگر میں قوم کی اور کالج کی بہتری اس میں سمجھتا ہوں اور اس پر یقین کرتا ہوں اور صرف اپنی طعنہ زنی کے خوف سے اس کو نہ کروں تو مجھ سے زیادہ کوئی بد دیانت اور دغاباز اور قوم کا دشمن نہ ہوگا، پس میں نے کیا جو میں نے کیا اور لومۃ لائم کا خوف نہیں کیا۔ (۲۵)

جس طرف سے اس تجویز کی مخالفت کی ہوا چلی مجھ کو ہرگز یقین نہ تھا کہ اس طرف سے یہ ہوا چلے گی، تمام لوگ جو کالج کی محنتوں میں میرے سکریٹری ہونے کی حالت میں شریک تھے وہ اس وقت بھی شریک رہ سکتے تھے اور مدد کر سکتے تھے جب کہ سید محمود سکریٹری ہوتے، مگر افسوس کہ مخالفت ہوئی اور ایسی بری طرح پر جس نے نہ اشخاص کو بلکہ قوم کو بدنام کیا، مخالفت رائے سے نہ رہی بلکہ عداوت اور ذاتیات تک نوبت پہونچ گئی، رسالے چھپے، اخباروں میں آرٹیکل چھپے، انگریزی میں پمفلٹ چھاپ چھاپ کر ہندوستان میں تقسیم ہوئے اور کوئی درجہ مخالفت کا باقی نہیں چھوڑا، اور بقول "پایونیر" کے ثابت ہوگیا کہ مسلمانوں میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ کوئی بڑا کام اتفاق سے کرسکیں۔ ان ہی تحریرات پر قناعت نہیں کی بلکہ ایک گروہ مخالفین کا قائم کیا اور ایک میٹنگ کی اور جائز و ناجائز طریقہ سے اس میں لوگوں کو شریک کیا اس ناجائز کمیٹی کی روئداد یں چھاپ کر مشتہر کیں اور چند ریزولیوشن پاس کئے۔ (۲۶)

مولوی محمد سمیع اللہ خاں، جو مدرسۃ العلوم کے بانیوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اس مخالفت میں [illegible]

ایسے وقت میں جو کالج کی تکمیل کے لیے ہر ایک فرد قوم کو متفق ہوکر کوشش کرنی تھی ...۔ ایک امر کے سبب سے، فرض کرو کہ وہ میرا ہی قصور اور میری ہی بد دیانتی اور میری ہی خود غرضی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) پیش پیش تھے، نواب وقار الملک کے نام سرسید کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب جنھوں نے سرسید کے بہترین دوست اور ان کی ذات سے انتہائی مخلص ہونے کے باوجود اس معاملہ میں فریق مخالف سے تعاون کیا، ان کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس موضوع پر اصولی مباحث کے ساتھ انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے، ٹرسٹی بل پاس ہوجانے کے بعد نواب صاحب نے اکثریت کی رائے کو قبول کرکے اپنا تعاون جاری رکھنے کی پیش کش کی اور سرسید بھی، جنھوں نے اپنے خطوط میں ان سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا تھا، پہلی سی محبت و الفت کے اظہار کے ساتھ پھر ان سے مراسلت کرنے لگے اور بالآخر ان کے گذشتہ مخالفانہ رویہ کو فراموش کردیا، آہستہ آہستہ سرسید اپنے حق میں سازگار فضا کی اس روشنی میں آزادی کے ساتھ ایسے اقدامات کرنے لگے جس سے متعدد ممبروں کو دکھ ہوا مگر وہ ان کی پر اثر شخصیت کے سامنے بے بس تھے، چند سال بعد نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ سرسید کے قریبی ساتھی بھی ان کی کارروائیوں سے غیر مطمئن دکھائی دینے لگے، اندرون خانہ اس صورت حال پر جس قسم کی کش مکش نے جنم لینا شروع کیا اس کی ایک جھلک نواب وقار الملک کے نام نواب محسن الملک کے خط میں ملاحظہ فرمایئے، وہ لکھتے ہیں "میں جب تک علی گڑھ رہا کالج کے معاملات سے درحقیقت غفلت نہیں کی مگر کیا کیجئے کوئی بات نہ چلی اور کسی بات کو سید صاحب نے نہ مانا، دو تین مرتبہ تو ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے بھی سخت رنج ہوا اور سید صاحب کو بھی نہایت غصہ آیا اور میں نے ٹرسٹی ہونے سے استعفیٰ دینے کا ارادہ ظاہر کردیا، مگر سید صاحب کی ذاتی حالت نے مجھے پھر اس ارادہ سے باز رکھا۔ اگر ان کی یہ خاص حالت نہ ہوتی تو آپ یقین کیجئے کہ میں ایک روز کے واسطے بھی ٹرسٹی رہنا گوارہ نہ کرتا، ان کی رائے اس درجہ میری رائے کے مخالف ہے کہ گویا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں"۔ بحوالہ تذکرہ سرسید، ص ۳۶۲۔)

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ چند نمایاں شخصیتوں نے مل کر اپنے اختلافات کے اعلانیہ اظہار کا فیصلہ کرلیا، نواب وقار الملک اس حقیقت سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں۔

"ان معاملات کو دیکھ کر وہ لوگ، جن کو قوم کا زیادہ درد تھا، بہت فکر میں پڑ گئے تھے اور باہم سرگوشیاں ہونے لگی تھیں اور بالآخر باوجود سرسید مرحوم و مغفور کے ان اقتدارات اعظم اور عظمت و جلال کے، جس کی دوسری نظیر شاید مدت تک نہ ملے گی، بعض ٹرسٹیوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب ہم کو صرف اپنی قوم کی بہبودی کا خیال دنظر چاہئے اور جناب مرحوم و مغفور کی مروت کو قوم کے مقابلہ میں بالائے طاق رکھنا چاہیے، مضامین کا ایک سلسلہ روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں چھاپنا تجویز ہوا تھا جو گمنام نہ ہوتا تھا بلکہ اس پر ایسے لوگوں کے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ہو۔ اس قدر اختلاف کرنا اور اس کو اس قدر طول دینا نہایت افسوس کے قابل ہے۔(۲۸)

ایک قدرتی اور نیچرل بات ہے کہ اگر مدرسہ کے کاموں کے انجام میں مجھ سے اس قسم کی مخالفت کی جائے خود میرا شوق اور میری کوشش اس میں باقی نہیں رہ سکتی، اگر میں چاہوں بھی تو مجھ سے نہیں ہو سکتی اور اس کا لازمی نتیجہ مدرسہ کی بربادی ہے، اگر بدبختی سے امر متنازعہ کی طرف مجارٹی ہو جاتی تو یقیناً مجھ کو مدرسہ سے علیحدہ ہونا پڑتا، میرا دل ہی اس کام پر نہ رہتا بلکہ ایسے واقعات پیش آتے کہ مجھ سے مدرسہ کو قائم رکھنا محالات سے ہوتا۔(۲۹)

مولوی سمیع اللہ خاں کا استعفیٰ :-

مولوی سمیع اللہ خاں صاحب۔ اس کے بعد جب وہ مجھ سے ملنے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ خاں صاحب میری عادت کسی سے منافقانہ ملنے کی نہیں ہے، آپ رئیس ہیں، جب کہیں ملاقات ہوگی میں آپ کی تعظیم کروں گا، آپ ممبر کمیٹی کے ہیں، جب اجلاس میں آپ تشریف لائیں گے آپ کا ادب کروں گا، لیکن میں آپ سے دوستانہ جو ملاقات تھی وہ راہ رسم رکھنی نہیں چاہتا، بس دوستانہ طریقہ ملاقات و راہ و رسم مجھ سے اور آپ سے نہیں ہے، یہ بھی میں نے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) دستخط ثبت ہوتے جیسے کہ نواب محسن الملک اور شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین حالی، اور ایک یہ خاکسار مشتاق حسین اور مجھ کو اس وقت اچھی طرح یاد نہیں رہا غالباً آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خان بہادر کے دستخطوں کا بھی ان مضامین پر ثبت ہونا تجویز ہو گیا تھا، ان مضامین کے ذریعہ سے یہ بات ثابت کرنی مقصود تھی کہ کالج کے قیام سے جو اصل مقصد تھا اب جناب مرحوم و مغفور اپنے ہاتھ سے اس کو برباد کر رہے ہیں اور ٹرسٹیوں اور قوم کو چاہیئے کہ وہ جناب مرحوم کی اس خود مختاری کو رد کرکے اور کالج کو تباہی سے بچائے۔

پہلا نمبر اس سلسلہ مضامین کا میں نے اپنے قلم سے لکھا تھا اور نواب محسن الملک اور شمس العلماء مولوی حالی صاحب کی خدمت میں جو غالباً اس وقت علی گڑھ ہی میں تشریف رکھتے تھے، دستخطوں کیلئے بھیجا گیا تھا کہ دفعتاً جناب مرحوم و مغفور کی رحلت کی خبر پہونچی اور میں نے فوراً نواب محسن الملک کو تار دیا کہ وہ مضمون واپس کر دیں کیونکہ اب ہمارے دلوں میں جناب ممدوح کی خوبیوں اور بے نظیر عمدہ اوصاف کے سوا اور کوئی خیال باقی نہیں ہے چنانچہ اسی وقت سے ان مضامین کا سلسلہ ترک کر دیا گیا بلکہ دلوں سے بھی اس شکایت کو نکال دیا گیا

(بحوالہ تذکرہ وقار، ص ۱۵۳-۱۵۴)

کہا کہ کمیٹی کی بدنصیبی ہے جو اس کے ایسے ممبر ہیں میں نے ان سے کہا کہ آٹھ برس ہوئے آپ کے نام کا بورڈنگ ہاؤس تیار ہوگیا مگر اس کا روپیہ آپ نے اب تک بیباق نہیں کیا، تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے، انھوں نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔(۲۹)

مخالف ممبران کے نام سرسید کے حربی چیلنج کا نمونہ:۔

ہمارے ایک دوست پوچھتے ہیں کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا کام آپ کی رائے کے مطابق چلے تو کمیٹی مقرر کرنے سے کیا فائدہ ہے، مگر ہم کو افسوس ہے کہ ہمارے دوست نے نہ کبھی کچھ دیکھا ہے اور نہ سمجھا ہے، جب کوئی شخص ایک کام قومی فائدے کے لئے شروع کرتا ہے اور اپنی جان محنت میں ڈالتا ہے تو کمیٹی اس واسطے مقرر ہوتی ہے کہ اس کی امداد کرے، اس کی محنت میں شریک ہو، اس کے ارادوں کو تقویت دے تاکہ وہ کام پورا ہو، نہ یہ کہ اس کی رائے سے اور اس کے کام سے مخالفت کرکے اس کام کے پورا ہونے میں خلل انداز ہو۔(۳۰)

کمیٹیوں کے ناسمجھ اور نادان ممبروں پر "نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان" کی مثل صادق آتی ہے، ممبر ہوئے اور یہ جانا کہ ہم کو رائے دینا ہمارا فرض ہے مگر اس فرض کو مطلق نہیں سمجھا، ان کا فرض یہ تھا کہ اس کام کرنے والے کی مدد کرتے اور اس کے انجام میں شریک ہوتے، نہ یہ کہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا کر اس کام کو برباد کرتے، اگر تم میں خود اس کام کو کرنے اور اس کو اپنی رائے کے مطابق انجام دینے کی قابلیت تھی تو تم آج تک کہاں چھپے بیٹھے تھے

اسی قسم کے عزم کا اظہار سرسید نے نواب وقار الملک کے نام ایک مکتوب میں کیا، انھوں نے لکھا کہ اگر آپ کا خیال ہو کہ کسی طرح سلسلۂ جانشینی سید محمود کو چھوڑ دیا جائے تو اس خیال کو دور کر دیجئے اگر ووٹ کثرت سے برخلاف اس کے فرض کرو، ہوں تو میں مدرسہ کو چھوڑ دوں گا (خطوط سرسید ص ۱۳۰)

دوسری جانب کا ردعمل یوں ہوا کہ: باوجودیکہ مسودہ ممبران کمیٹی کے بھرے جلسہ میں بھاری کی رو سے پاس ہو گیا مگر ان کی مخالفت رفع نہ ہوئی، چنانچہ مولوی سمیع اللہ خاں اور تقریباً ان کی تمام پارٹی کالج سے بے تعلق ہو گئی۔ (حالی، حیات جاوید حصہ اول ص ۲۴۰)

اور کیوں نہیں اس کام کو خود تم نے شروع کیا۔ کوئی مثال، چھوٹی یا بڑی، آج تک دنیا میں موجود نہیں ہے کہ وہ بجز اس شخص کی رائے کے جو اس کا بانی ہوا ہے اور کسی مداخلت سے انجام پائی ہو۔ بے شک وہ اپنی مدد اور اعانت کے لئے اور لوگوں کو اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہے جو قانون قدرت کے مطابق ہے، بس جو لوگ اس کو اور اس کے کام کو پسند کرتے ہیں وہ شریک ہوں اور جو نہیں پسند کرتے وہ علیحدہ ہو جائیں(۳۱)۔

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جو کسی کام کا بانی ہوتا ہے وہ ان مشکلات کو اول سمجھ لیتا ہے اور ان کی مداخلت پر بھی خوب مستعد ہوتا ہے وہ کام پورا ہو یا برباد ہو جائے، یہ خدا کی مرضی ہے مگر وہ اپنے قصد مصمم سے ہرگز منحرف نہیں ہوتا، اگر کسی میں جان ہو تو جان بازی کو بھی حاضر ہے اور اگر نچا پن اختیار کرنا ہو تو جوتی پیزار کو بھی حاضر ہے، اگر ہم نے ایک دوست کو لکھا کہ اگر ہماری رائے پر مدرستہ العلوم نہ چلے تو نہیں چلنے کا، اس میں ہم نے کیا غلط لکھا؟ اور اگر ہم نے یہ لکھا کہ اگر ہم سے اختلافات کیا جاتا ہے تو ہم سکریٹری ہونا چھوڑ دیں گے اور کالج کو لیا میٹ کر دیں گے تو اس سے ممبروں کو کیوں خوف ہو اور ہمارے دوست نے کیوں سمجھا کہ ہم ممبروں کو خوف دلاتے ہیں کہ وہ ہماری رائے سے نسبت تقرر سید محمود کے اختلاف نہ کریں، اگر کسی میں اس بوجھ کے اٹھانے کی اور اس قومی کام کے انجام دینے کی طاقت و لیاقت تھی تو وہ خم ٹھونک کر سامنے آیا ہوتا کہ ہم انجام دیں گے، خوف زدہ ہونے کے کیا معنی ہیں؟ (۳۲)

سن لو اے دور و نزدیک کے دوستو! سن لو اے دکن اور اتر کے دوستو! سن لو اے پورب اور پچھم کے دوستو! سن لو اے آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والو! سن لو وہ بھی جو مادر زاد بہرے ہیں کہ بے شک یہ کام جو میں نے کیا وہ قومی کام ہے، قوم کی بھلائی اور بہتری کے لئے کیا ہے مگر میں نے کیا ہے اور میں ہی انشاءاللہ انجام تک پہنچاؤں گا۔ اے مخالفو ہوشیار رہو، رنڈیوں کی طرح کانا پھوسی کرنے اور نہایت بزدلوں کی طرح فرضی اور جھوٹے ناموں سے آرٹیکل چھپوانے سے کام نہیں چلتا، خود تمھارا جھوٹ، جو تم نے جھوٹا نام اختیار کرنے سے اپنے اوپر ثابت کیا ہے خود تم کو شرماتا ہوگا، اگر مرد ہو چلو فرانس کی عملداری میں، اگر سچے ہو اور اپنی راستبازی اور سچائی پر بھروسہ کرتے ہو تو چلو پیرس میں جو دنیا کا فردوس ہے اور ایک آن میں ہماری اور اپنی

قسمت کا فیصلہ کرلو، ان نالائق باتوں اور قوتوں میں کیا نقص ہے۔ میں ان لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو کہتے ہیں کہ ہم علی گڑھ میں نہ کہ مدرسے میں فساد ڈالیں گے تاکہ لوگ دیکھیں کہ وہ اور ہم دونوں کوٹھیوں میں رہتے ہیں یا جیل خانہ کی کوٹھڑیوں میں، خوب سمجھ لو کہ کس درجہ کے نتیجے تک ہم مستعد ہیں، جس مدرسہ کو ہم نے جان بیچ کر بنایا ہے اس کی بربادی بے جان جانے امکان سے خارج ہے۔ آگ کو مت پھونکو اگر پھونکتے ہو تو اس کے شعلوں کا بھی اندازہ کرلو۔ (۱۴)

اسی قسم کے خیالات کا اظہار سرسید نے نواب وقار الملک کے نام ایک خط میں کیا، انھوں نے مولوی سمیع اللہ خان کی نسبت لکھا، اگر کسی مجلس میں وہ اور میں جمع ہوجائیں گے تو آپ سن لیں گے کہ وہ معاملات پیش آتے جو باجی سے باجی اور شہدوں سے شہدوں میں بھی نہیں ہوں، اور کیا عجب ہے کہ دونوں فوجداری کی حوالات میں تشریف لیجائیں۔

(خطوط سرسید، ص ۱۳۰)

سرسید کے ایک انگریز دوست جے کینیڈی سابق کمشنر سرسید کی وفات پر ایک مضمون میں ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "انھوں نے مسلمانوں کو ابھارنے کیلئے اپنی پوری طاقت صرف کردی، لیکن جو کچھ انھوں نے کیا اس میں ان کا طریقہ مطلق العنانی کا تھا، وہ کہتے تھے کہ یہ طریقہ مشرقی مزاج کے عین مطابق ہے، میری جوانی کے زمانے میں ایک صوبے دار سے لے کر چودھری تک ہر حاکم مطلق العنان ہوتا تھا، اگرچہ وہ ایک عقلمند اور فیض رساں حاکم تھے اور سب کا خیال رکھتے تھے مگر تحکم پسند اور مطلق العنان طبیعت کے مالک تھے وہ مداخلت برداشت کرتے تھے نہ مخالفت، آخر عمر میں ان کے مزاج میں چڑچڑاپن بھی پیدا ہوگیا تھا، ایک دفعہ سے زیادہ مجھے بعض ایسے جھگڑوں میں صلح کرانی پڑی جن میں راستی تمام و کمال سید صاحب کی طرف نہ ہوتی تھی، جوانوں کی غلطیوں کو وہ آسانی کے ساتھ معاف کردیتے تھے مگر اپنے بہت سے پرانے دوستوں سے جن کے مشوروں کی کبھی ان کے دل میں بڑی قدر تھی بالکل بگڑ جاتے تھے" (تذکرہ سرسید، ص ۲۴۴)

سرسید کے غیض و غضب کا مذکورہ نمونہ جے کینیڈی کے تجزیہ کی تائید کرتا ہے۔

حوالہ جات

(۱) حیات جاوید حصہ اول ص ۲۰۵
(۲) خطوط سرسید، ص ۲۸۴
(۳) مکاتیب سرسید احمد خاں ص ۹۷
(۴) مکمل مجموعہ لیکچرز ... ص ۳۲ ... ۳۰
(۵) [illegible]
(۶) تہذیب الاخلاق جلد دوم، ص ۵۵
(۷) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۸ مئی ۱۸۹۵ء ضمیمہ [illegible]
(۸) ایضاً ص ۸
(۹) مکاتیب سرسید احمد خاں، ص ۱۲۴
(۱۰) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۲۸
(باقی حوالہ جات ... صفحہ پر)

حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی قدس سرہٗ

از یکے خلفاء حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ
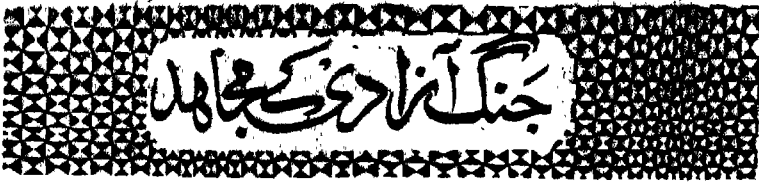
پروفیسر ماجد علی خاں صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

نام، خاندان وولادت

آپ کا اسم گرامی محمد اسمٰعیل ہے، اور وطن یوپی کا مشہور تاریخی شہر سنبھل ضلع مرادآباد ہے، جس کے محلہ دیپا سرائے میں جنوری ۱۹۰۱ء[1] میں آپ کی ولادت ہوئی، آپ کا تعلق ترک برادری کے خاندان "سرور والے" سے ہے، والد صاحب کا نام کفایت اللہ ہے جو اپنے دور میں ترک برادری کے پڑھے لکھے لوگوں میں شمار ہوتے تھے، اور "منشی جی" کے نام سے مشہور رہے، والدہ صاحبہ کا نام "ربُّ الکبریٰ" ہے، وہ اپنی دینداری اور ذہانت کی وجہ سے پورے محلہ میں مشہور تھیں۔

آپ کے دادا کا نام سرور حسین تھا جو موضع مونڈھا کے رہنے والے تھے بعد میں سنبھل سکونت اختیار کرلی تھی، آپ کا خاندان آپ کے دادا کی طرف منسوب ہوکر "سرور والے" کے نام سے موسوم تھا آپ کے نانا پنج خلیفہ کے نام سے مشہور رہے، اور بڑے پکّے دیوبندی تھے، آپ نماز بھی گھر سے دور ایک صحیح العقیدہ امام کے پیچھے محلہ سرائے کی مسجد میں پڑھتے تھے۔

ابتدائی تعلیم

دارالعلوم المحمدیہ دیپا سرائے میں اس وقت ایک استاذ حافظ نصیر احمد صاحب ساکن میاں سرائے تھے، آپ فارسی کے مشہور استاذ تھے، وہی آپ کے

---

[1] حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب قدس سرہٗ کے ان حالات کا بیشتر حصہ آپ کے داماد مولانا سجاد الاسلام صاحب مدظلہ کی فراہم کردہ معلومات پر مشتمل ہے۔ راقم السطور (ماجد)۔ [2] مطابق شوال ۱۳۱۸ھ

ابتدائی اساتذہ میں تھے بعد میں آپ نے مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خاں میاں سرائے اور مدرسہ سراج العلوم ہلالی سرائے سنبھل میں تعلیم حاصل کی، ان مدرسوں میں اس وقت کے بلند پایہ اور مشہور ذی علم اساتذہ تھے ان میں معروف یہ حضرات تھے، حضرت مولانا عبدالمجید صاحبؒ حضرت مولانا کریم بخش صاحب اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا عبدالمجید صاحبؒ کے تبحر علم کا یہ عالم تھا کہ حضرت مرحوم کے پاس زمین تھی گیہوں کٹنے کے دنوں میں حضرت مرحوم جنگل میں رہتے تھے اور طلبہ کو وہاں ہی بلا لیتے تھے تاکہ نقصان نہ ہو، حضرت مولانا دائیں چلاتے وقت بیلوں کے پیچھے پیچھے چلتے تھے، طلبہ ایک جگہ کتاب لے کر بیٹھ جاتے اور قاضی مبارک اور شمس بازغہ جیسی اہم اور مشکل کتابوں کے اسباق کی تقریر اسی چلتے ہوئے حال میں فرماتے تھے بالکل زبانی۔

اعلیٰ تعلیم

تعلیم کی تکمیل کے لئے آخر میں آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لےگئے اور وہاں جلیل القدر علماء سے کسب فیض کیا، حدیث آپ نے اس صدی کے مشہور محدث حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے پڑھی، دارالعلوم میں حضرت مولانا کا قیام دو سال رہا اور ۱۹۲۴ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی۔

ابتدائی ملازمت

جس سال آپ نے فراغت حاصل کی، اسی سال یعنی ۱۹۲۴ء میں ہی جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں مدرس مقرر ہوگئے،

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۶ء تک مدرسہ شاہی مرادآباد میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا، اور مسلم شریف وغیرہ کتابیں زیر درس رہیں، دراصل مدرسہ شاہی میں آپ کی ملازمت ۱۹۴۷ء تک رہی لیکن بیچ بیچ میں تحریک آزادی کے سلسلہ میں جیل جاتے رہے۔

تحریک آزادی میں شرکت

درس و تدریس کے ساتھ ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اندر حریت وطن کا جذبہ بھی تھا اس لئے آزادی کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے تقریر و خطابت کا ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ بقول مولانا اشتیاق حسین صاحب مرحوم اگر لاہور میں تقریر کا اعلان ہوتا تھا تو مرادآباد تک کے لوگ تقریر سننے کے لئے لاہور جاتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں الیکشن ہوئے تو بزرگوں کے ایماء پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ اسمبلی کے الیکشن میں کھڑے ہوگئے، مقابلہ پر ضلع کی غیر معمولی اہم اور مقبول و معروف شخصیت تھی مگر حضرت کی تقریروں نے کایا پلٹ دی اور حضرت کامیاب ہوئے۔

۱۹۴۰ء میں انگریزوں نے گرفتار کرکے جیل بھیج دیا، کچھ دنوں کے بعد رہا کر دیا گیا، پھر ۱۹۴۲ء میں دوبارہ جیل بھیج دیا گیا مگر کچھ دن بعد پھر رہا کر دیئے گئے۔

۱۹۴۲ء کے بعد کے حالات

رہا ہونے کے بعد پھر مدرسہ شاہی مراد آباد میں درس تدریس کی خدمت انجام دینے لگے اور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک یہ مشغلہ رہا۔ ۱۹۴۶ء میں پھر الیکشن میں کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے ۱۹۵۲ء تک ایم ایل اے (M. L. A) رہے، ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم رہے۔

شیخ الحدیث کے منصب پر

۱۹۵۸ء میں آپ مدرسہ چلّہ امروہہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے ا ۱۹۶۲ء تک وہاں شیخ الحدیث رہے، اس دوران آپ نے بخاری شریف کا درس د ۱۹۶۲ء میں آپ مدرسہ امدادیہ، مراد آباد میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور ۱۹۶۴ء تک وہا آپ درس بخاری دیتے رہے۔

۱۹۶۴ء میں آپ گجرات کی مشہور درسگاہ مدرسہ تعلیم الاسلام آنند میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے اور ۱۹۷۱ء تک وہاں پر شیخ الحدیث رہے اور بخاری شریف درس دیتے رہے۔

۱۹۷۱ء میں آپ مونگیر (بہار) کے مشہور مدرسہ میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے جہا آپ نے ایک سال درس بخاری دیا۔

۱۹۷۲ء میں آپ بنارس کے دارالعلوم (جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس (انڈیا) میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے جہاں آپ ۱۹۷۴ء تک درس بخاری دیتے ر ۱۹۷۴ء میں آپ نے ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا تھا لیکن مولانا ضلع میرٹھ کے باشندہ

کے بے حد اصرار پر آپ وہاں تشریف لے گئے اور تقریباً آٹھ ماہ وہاں قیام فرمایا، آپ نے وہاں قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر کی خدمت انجام دی۔

بیعت وخلافت

۱۹۳۵ء میں آپ نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے بیعت کی، ۱۹۴۲ء میں جب آپ مراد آباد جیل میں تھے تو جیل ہی میں حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ نے آپ کو اجازت بیعت وخلافت سے سرفراز فرمایا اپنے کچھ حالات حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب قدس سرہٗ نے اپنی کتاب "مقامات تصوف" کے شروع میں عرض حال کے ذیل میں مختصراً تحریر فرمائے ہیں جو زیادہ تر تعلیم اور سلوک وخلافت سے متعلق ہیں۔ اور درج ذیل ہیں۔

بطور اظہار تشکر وتحدیث نعمت عرض ہے کہ بحمد اللہ راقم السطور کو شروع سے دینی حلقوں اور صحبتوں کی سعادت حاصل رہی۔ مروجہ دینی نصاب تعلیم کی تکمیل مرکز علوم وفضائل "دار العلوم دیوبند" میں اس زمانے میں ہوئی جبکہ دار العلوم کی فضائیں علماء وفضلائے امت اور شیوخ وقت کی ضو فشانیوں سے جگمگا رہی تھیں اور جو بھی خوش نصیب ذرّات اپنے عہد کے ان آفتاب وماہتاب کے سامنے آگئے ان میں بھی ایسی چمک پیدا ہوگئی جو ان بے بساط ذرّوں کے لئے معراج کمال ہی کہی جا سکتی ہے۔

ان ہی فضاؤں میں راقم السطور نے خاتم المحدثین حضرت الاستاذ علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ العزیز کے سایۂ فیض وشفقت میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اور جب اپنے مستقبل کے بارے میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ سے رجوع کیا تو حضرت موصوف نے خدمت درس وتدریس کی ہدایت اور ساتھ ہی ذکر وشغل کے سلسلہ میں پاس انفاس کی تلقین سے دستگیری فرمائی، حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا کرم بالائے کرم یہ ہوا کہ سن فراغ ۱۳۴۳ھ میں خود ہی ہندوستان کی ایک مشہور ومعروف درسگاہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں خدمت تدریس پر مامور اور متعین فرمادیا اور درحقیقت یہ حضرت اقدس ہی کی خصوصی توجہ اور فیض رسانی کا اثر اور ثمرہ تھا کہ میں اس وقت سے مسلسل اٹھائیس سال تک مدرسہ شاہی میں خدمت درس کی سعادت سے بہرہ مند رہا۔

اسی کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ کی کرم فرمائیوں نے اور بھی یوں دستگیری فرمائی کہ دا
اور مدرسہ شاہی کے تعلق سے جلد ہی آستانۂ مدنی زبدۃ السلف وقدوۃ الخلف مولائی و مرشدی
حضرت الحاج الحافظ الشیخ مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز حنفی چشتی صابری
نظامی نقشبندی قادری سہروردی میں نہ صرف شرف باریابی حاصل ہوئی بلکہ بیعت طریقت
وارشاد کا دامن بھی ہاتھ آیا اور حضرت اقدس کی شفقتوں اور عنایتوں نے مسلسل اس
نوازا جو اپنی استعداد و اہلیت سے کہیں زیادہ محض حضرتِ اقدس کی عنایت خاصہ اور
عالیہ کا کرم تھا کہ متعدد بار سلہٹ میں ماہ رمضان المبارک حضرت کی صحبت میں گزار
نیز ۱۹۳۹ء میں سفر حج بیت اللہ میں خدمت و معیت کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۹۴۲ء
کم و بیش چھ ماہ تک مرادآباد جیل میں کفش برداری اور خدمت گزاری کا زریں موقعہ
احقر کے جیل پہنچتے ہی حضرت نے تمام رفقاء جیل کے کھانے پینے کے انتظامات پر مامور فر
اور فرمایا کہ مالٹا میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ یہ خدمت میں خود انجام دیتا تھا
یہاں تجھے انجام دینی ہے۔

۱۹ محرم الحرام ۶۲ھ کو حضرت اقدس کا تبادلہ مرادآباد جیل سے الٰہ آباد کیلئے ہو
اسی روز علی الصبح جبکہ میں حسب معمول رفقاء اسیری کے لئے چائے ناشتہ کی تیاری میں مشغ
تھا کرم و عنایت کی ایک اور بارش ہوئی اور حضرت اقدس نے ہر چہار طریق تصوف میں
بیعت و ارشاد کا قرطاس اجازت مرحمت فرمایا۔ یہ ایک بڑی سعادت تھی اور ساتھ
بوجھل ذمہ داری بھی، جس نے عقیدت و ارادت کے رشتوں کو اور بھی مستحکم کر دیا۔ یوں
نے تقریباً تیس سال مسلسل خلوت و جلوت اور سفر و حضر میں حضرت اقدس کے سائۂ شفقت
میں گزارے۔ اس طویل عرصہ میں بارہا تصوف و سلوک کے اسرار و مطالب پر حضرت اقد
کے ارشادات سننے کا موقعہ بھی ملا معمولات کا مشاہدہ بھی کیا اور وقتاً فوقتاً مختلف شکو
و شبہات پر حضرت سے رجوع بھی کیا۔ ایک طرف مرشد وقت سے یہ مسلسل تعلق اور دوسری
طرف اپنے رجحانات اور ذہنی تقاضوں کی بناء پر اس راہ کے اکابر متقدمین و متاخرین
احوال و اقوال کا مطالعہ جاری رہا۔ بالخصوص حضرت امام غزالیؒ، حضرت امام ربانی مجدد

الف ثانیؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ
حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وغیرہ کے اقوال و ارشادات
کے مطالعات اور پھر کتاب و سنت میں غور و فکر نے اس موضوع مبارک سے طبیعت کو ایک
ایسا لگاؤ بخشا کہ یہی موضوع ذہن و فکر کی توجہ کا خاص مرکز بن کر رہ گیا۔ [۱]

ارشاد تلقین اور خلفاء حضرت مدنی قدس سرہٗ کی وفات کے بعد آپ نے دوسروں کو بیعت کرنے اور ارشاد و تلقین کا سلسلہ شروع کیا۔
راقم السطور کے علم میں آپ کے دو خلفاء آسکے ہیں۔ ○ صوفی عبدالرزاق صاحب، جو موانہ میں تھے اور صاحب کشف و کرامات تھے اور مستجاب الدعوات کی حیثیت سے مشہور تھے۔
○ حضرت مولانا شاہ عبداللطیف صاحب تلہیڑوی مظاہری دامت برکاتہم آپ ضلع سہارنپور میں تلہیڑہ (تحصیل دیوبند) کے رہنے والے ہیں۔ مظاہر علوم سے فارغ ہیں اور حضرت مولانا محمد سعد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے خلیفہ ہیں۔ آج کل لال مسجد، لال کنواں دہلی میں امام و خطیب ہیں۔

اولاد حضرت رحمۃ اللہ کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھیں۔ لڑکوں کے نام ہیں۔ محمد عزیز ڈاکٹر محمد شعیب اور مولوی محمد سہیل۔ صاحبزادی کا نام ہے ظفیرہ بیگم۔ تادمِ تحریر یہ سب حضرات بقیدِ حیات ہیں۔ صاحبزادی جناب ظفیرہ بیگم صاحبہ، مولانا معاذ الاسلام صاحب کی رفیقۂ حیات ہیں اور ان کے اس وقت چار لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔
حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ ہاجرہ بیگم بھی تادمِ تحریر بقیدِ حیات ہیں، مگر کئی سال سے صاحب فراش ہیں۔

چند خصوصیات اور حالاتِ وفات [۲] حضرت رحمۃ اللہ کے بارے میں مشہور رہے کہ وہ کبھی کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے اور اگر کسی نے ان کی ذات پر کوئی حملہ کیا یا عیب جوئی کی تو اس کا نہ کبھی جواب دیا اور نہ اس کو برا کہا اور نہ اس سے قطع تعلق یا اس کی طرف سے کبھی کسی کدورت کا اظہار فرمایا۔ بلکہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ سکوت اور خاموشی اختیار کی۔ بارہا اس کا مشاہدہ کیا گیا کہ کسی نے آکر

---

[۱] مقالات تصوف، ایجنسی تاج کمپنی بمبئی، ص ۹-۱۰ [۲] یہ حالات حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے داماد جو مولانا معاذ الاسلام کی ... [illegible]

کہا کہ فلاں آپ کو ایسا ایسا کہہ رہا تھا تو سکوت ہی اختیار فرمایا، جواب میں کبھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔

اہل بمبئی کی خواہش و اصرار پر آخری عمر کے کئی سال رمضان المبارک بمبئی میں گذارتے تھے اور تراویح کے بعد قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر بیان فرماتے تھے، آخری رمضان آیا تو طبیعت خراب چل رہی تھی، بیماری کی وجہ سے سنبھل ہی رمضان گذارنے کا ارادہ فرمالیا تھا، مگر بمبئی سے مسلسل خطوط اور ٹیلیگرام آنے شروع ہوئے۔ فرمانے لگے میں اپنے کو سفر کے قابل نہیں پا رہا ہوں مگر اہل تعلق کا اصرار ہے کیا کیا جائے، اہل خانہ کی رائے بھی نہیں تھی کہ اس ضعف اور علالت کی حالت میں سفر کیا جائے۔

بہر حال اہل بمبئی کا اصرار غالب آیا اور بادل نخواستہ بمبئی تشریف لے گئے۔ رمضان وہاں گذارا اور ترجمہ و تفسیر کا سلسلہ پورے رمضان جاری رہا، واپسی میں فرمایا کہ میں اپنے کو اس قابل بالکل نہیں پاتا کہ کچھ کہہ سکوں گا مگر قرآن پاک کی برکت تھی اور اہل بمبئی بندہ نوازی کہ افطار کے بعد وہ پچاس روپیہ کا انجکشن لگواتے تھے اس کے اثر سے اتنی قوت محسوس ہوتی تھی کہ میں حسب معمول ترجمہ اور تفسیر بیان کرتا تھا، پورے رمضان یہی سلسلہ رہا سنبھل واپس آنے کے بعد مرض نے شدت اختیار کرلی۔ علاج ہوتا رہا، ایک دن ہاتھ سیدھے کرکے اس طرح لیٹ گئے جیسے انتقال کے بعد مردہ ہوتا ہے اور فرمایا کہ بس ہم تو اس پر سب اہل خانہ آبدیدہ اور رنجیدہ ہوئے، ایک حکیم صاحب کو بلاکر دکھایا، مرض جب شدید ہوا تو مرادآباد سرکاری ہسپتال میں داخل کردیا گیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی شہرت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے علاج پر بڑی توجہ کی، شہر و بیرون شہر دور دور سے ہر طبقہ کے لوگ عیادت کیلئے آتے تھے، بیک وقت کئی کئی ڈاکٹر آتے اور اپنی پوری جدوجہد کرتے۔ ایک سابق وزیر دادو دیال کھنہ چند رفقاء کے ساتھ سی، ایم، او کو لے کر آئے، بہرحال مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

ایک دن برتن میں پیشاب کیا تو وہ سرخ تھا جیسے خون کی آمیزش ہو، اس پیشاب کو خطرہ کی گھنٹی سمجھا گیا۔ بار بار تقاضا فرماتے کہ گھر لے چلو، مگر اقرباء و اعزاء علاج کی غرض

کے پیش نظر نہیں چاہتے تھے، جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو محسوس کیا تو ایک دن حافظ محمد صدیق صاحب[1] کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ مجھے اپنی گاڑی میں سنبھل لے چلو، مگر اعزا نے پھر رخ بدلا، حضرت رہ کے چھوٹے صاحبزادے محمد سہیل صاحب کسی کام سے سنبھل میں تھے، ان کو سنبھل سے بلایا گیا۔ اعزا نے سوچا معلوم نہیں کیا بات کریں گے لیکن جب وہ تشریف لائے تو حضرت رہ نے ان سے بھی یہی فرمایا کہ مجھے سنبھل لے چلو آپ لوگ سمجھ نہیں رہے ہیں۔

دہلی سے مولانا محفوظ الحسن صاحب تشریف لائے تو ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کنپٹیوں پر پھیرا، ضعف کی وجہ سے گفتگو پر قدرت نہیں رہی تھی، اشاروں سے ہی کچھ فرماتے تھے مشہور ہے کہ آخری وقت میں کنپٹیوں پر گڈھے پڑ جاتے ہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اسی طرف اشارہ تھا، حضرت رہ بار بار اپنی کنپٹیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے، غنودگی اور مسلسل غفلت شروع ہوگئی اور وقت موعود قریب آپہونچا، ڈاکٹروں نے کہا کہ آکسیجن دیتے ہیں، جس سے حضرت سنبھل تک جاسکیں گے، چنانچہ کار میں سنبھل لے جایا گیا، پاس میں بیٹھے ہوئے حضرات یٰسٓ شریف پڑھتے رہے اور کلمہ کا ورد کرتے رہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ مسلسل غفلت اور بے ہوشی کے عالم میں تھے کہ نصف راستے میں اچانک آسمان کی طرف بڑی عجلت سے داہنا ہاتھ اٹھایا اور زور سے کہا لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ جس کو کار میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں نے سنا، کلمہ شریف پڑھنے کا وہی لہجہ اور انداز تھا جس طرح تقریر میں پڑھا کرتے تھے، بہرحال بیس پچیس منٹ میں مکان پر پہونچے اور اس کے آدھ گھنٹے کے بعد تقریباً ڈیڑھ بجے دوپہر بروز اتوار (یکشنبہ) ۲۳ر نومبر ۱۹۷۵ء (مطابق ۱۸ر ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ[2]) کو جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

تصنیفات و تعلیمات

حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب قدس سرہٗ کی تصنیفات میں سے ایک کتاب "مقامات تصوف" دستیاب ہے، اس پر قاضی اطہر مبارکپوری صاحب کا پیش لفظ ہے، پیش لفظ لیلۃ القدر ۱۳۸۳ھ

---

[1] حافظ محمد صدیق صاحب مرادآباد کے اہل ثروت واہل خیر حضرات میں سے ہیں، ایم پی بھی رہ چکے ہیں
[2] ہجری تاریخ تقویم سے نکالی گئی ہے۔ راقم السطور۔

میں لکھا گیا ہے اور خود حضرت مولانا کا عرض حال بھی ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصنیف ۱۳۸۳ھ میں لکھی گئی ہے اس کے ناشر محی الدین منیری صاحب ہیں اور اس کو ایجنسی تاج کمپنی ۲ا مسجد اسٹریٹ ممبئی ۳ نے چھاپا ہے۔

"مقامات تصوف" تصوف پر ایک بلند پایہ تصنیف ہے، اس میں لفظ تصوف پر ایک بلند پایہ تصنیف ہے، اس میں لفظ تصوف کا اشتقاق، حقیقت تصوف، طریق تصوف کی ضرورت وصول الی اللہ کا طریقہ، شیخ کامل کی شناخت معرفت کی حقیقت، توکل و رضا کی حقیقت، ولایت کا اثبات، حقوق پیر و آداب مرید، ہندوستان میں رائج مشہور سلسلے، ذکر اور اس کی حقیقت و طریقہ، مراقبہ اور اس کی حقیقت، اخلاق مذمومہ، اخلاق محمودہ جیسے عنوانات سے بحث کی گئی ہے، آخر میں چند جلیل القدر مشائخ کے احوال و اقوال نقل کئے گئے ہیں۔

حقیقت تصوف پر بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ "لفظ تصوف کے اشتقاق کی بہ نسبت اس کی حقیقت میں اور بھی زیادہ اختلاف ہے، کیونکہ حقیقت تصوف کے بہت سے ارکان، شرائط، آداب اور لوازم ہیں، کسی نے اس کے کسی جز اعظم کو مد نظر رکھ کر تعریف کی ہے، کسی نے اس کے شرائط کو اور کسی نے اس کے آداب و لوازم کو بطور تعریف لفظی کے ظاہر کر دیا ہے، مگر ان تمام تعریفات پر جو مختلف مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ سے منقول ہیں غور کرنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ مقصود سب کا ایک ہی ہے، عبارت ذیل ملاحظہ فرمائیے۔

التصوف الخروج من کل خلق دنی والدخول فی کل خلق سنی۔	تصوف تمام اخلاق رذیلہ سے الگ ہونے اور تمام اخلاق فاضلہ سے متصف ہونے کو کہتے ہیں۔

یعنی صحیح عقیدہ اور فرائض و سنن کی پابندی کے بعد تصوف حاصل ہو سکتا ہے اس لئے کوئی کافر یا بدعتی مسلمان ایسے اخلاق سے متصف نہیں ہو سکتا۔"[1]

طریق تصوف شریعت سے الگ نہیں ہے، پر بحث کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] مقامات تصوف، ص ۴۳۔

"مرتبہ حقیقت و معرفت جو درحقیقت تصوف کی غرض و غایت ہے وہ بجز تزکیہ و تصفیہ نفس کے حاصل نہیں ہو سکتا اور تصفیہ و تزکیہ شریعت کی پابندی کے بغیر غیر ممکن ہے یعنی آدمی ورع و تقویٰ میں یہاں تک استقامت پیدا کرے کہ رخصت سے تجاوز کر جائے، سالک جب اس مرتبہ کو حاصل کر لیتا ہے تو اس پر اسرار و احوال منکشف ہونے لگتے ہیں، اور یہ طریق عین منشا شریعت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ایک بزرگ عارف کہتے ہیں۔

کل طریقۃ تخالف الشریعۃ فھی کفر و کل حقیقۃ لایشھدہ الکتاب والسنۃ فھی الحاد و زندقۃ۔	جو بھی طریقہ شریعت کے خلاف ہے وہ کفر ہے، اور جس حقیقت پر کتاب و سنت گواہ نہیں وہ الحاد و زندقہ ہے۔

یعنی طالب صادق کو سب سے پہلے شریعت کے اوامر و مناہی سے آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے، پھر تقویٰ و طہارت کی پابندی جس کو طریقت کہتے ہیں، اور ان مراتب کے بعد وصول الی اللہ یعنی نور تجلی کا مشاہدہ حاصل ہونا جس کا نام حقیقت ہے، در اصل یہ تینوں شریعت ہی کے کمال پابندی کا نتیجہ ہیں[1]

طریق تصوف کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "بعض حضرات کا خیال ہے کہ صرف شریعت کے اوامر و مناہی کا پابند ہونا نفس کے تزکیہ و تصفیہ کے واسطے کافی ہے، اور کسی شیخ کامل کی بیعت میں آنا ضروری نہیں، اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ قرآن و سنت کی پابندی سے انسان اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک ترقی کر سکتا ہے، اور جس نے جو کچھ بھی پایا ہے اسی کی پابندی سے پایا ہے، مگر گفتگو اس میں ہے کہ مقامات عالیہ مثلاً اخلاص، زہد، اتقاء، ورع، توکل، صبر و رضا اور تسلیم وغیرہ کی حقیقت نہ تو فقط صرف و تفسیر کے پڑھ لینے سے حاصل ہوتی ہے اور نہ رسمی طور پر امر و نہی کی پابندی سے دور کیوں جاتے ہو جن علمائے شریعت نے کسی شیخ کامل کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، اور ذکر و مجاہدہ کی منزلیں طے نہیں کیں ان کو مذکورہ بالا مقامات میں امتحان کر کے دیکھ لو کہ آیات و احادیث میں تو بال کی کھال اتار کر دکھا دیں گے مگر روحانیت سے نفس

---

[1] مقامات تصوف، ص ۴۳، ۴۴۔

کچھ بھی علاقہ نہ ہوگا، غرور، نخوت، عجب، حرص، شہوت اور طلب جاہ وغیرہ امراض مہلکہ میں اس طرح مبتلا ہوں گے جس طرح دوسرے اہل دنیا مبتلا ہوتے ہیں، اس سے یہ بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ ہر شخص جو برائے نام کسی شیخ وقت سے بیعت کرے تو وہ مقامات عالیہ کو یوں ہی طے کرلیتا ہے بلکہ ہزاروں بیعت کنندگان کو دیکھا گیا ہے کہ مقامات تو درکنار وہ بے چارے ظاہری شریعت کی پابندی سے بھی گئے گذرے ہوتے ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ شیخ کامل سے صرف وہی شخص فیض حاصل کرسکتا ہے جو تمام آداب سلوک کا عملی طور پر پابند ہو اور مجاہدہ و ریاضت میں اپنی عمر کا ایک حصہ صرف کرے ورنہ ظاہری احکام شریعت کی پابندی جس کا اثر باطن پر کچھ نہ ہو محض رسم و عادت ہے جس کی اہل حقیقت کے نزدیک کچھ بھی قدر و منزلت نہیں [1]

دنیا کی حقیقت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں " لذت نفسانی اور حظ شہوانی میں اس قدر مشغول ہونا کہ آخرت کا ضرر حاصل ہو اور لذات و حظوظ نفسانی ذکر الٰہی اور فکر آخرت سے غافل کردیں درحقیقت اس کا نام " دنیا " ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن [2]

معرفت کی حقیقت اس طرح تحریر فرماتے ہیں " معرفت نام ہے دنیا کی قدر کا دل میں نہ ہونا طالب صادق دنیا سے قلب کو بالکل خالی اور علیحدہ رکھے بلا ضرورت دنیا کا سامان نہ کرے

چیست تقویٰ ترک شبہات و حرام ۔ از لباس و از شراب و از طعام
ہرچہ افزون است اگر باشد حلال ۔ نزد اصحاب ورع باشد وبال [3]

درجۂ فنا کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں " محبت کے اعلیٰ درجہ کو درجۂ فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی جملہ تعلقات غیر اللہ اس قدر مغلوب ہو جائیں کہ نہ کوئی خدا کے معبود ہونے میں شریک رہے جو لاالٰہ الا اللہ کا مآل ہے اور نہ اس کے مقصود ہونے میں حائل ہو جو فلیعمل عملاً صالحاً ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً کا حاصل ہے، اور نہ ہی

---

[1] مقامات تصوف، ص ۴۵۔ [2] ایضاً، ص ۴۴۔ [3] ایضاً، ص ۴۴۔

سالک کی نظر میں اس کے موجود ہونے میں شریک رہے جو کل شئ ھالک الا وجھہ کا حاصل ہے[1]

مشاہدہ کی اقسام کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔ مشاہدہ کی دو قسمیں ہیں، اول مشاہدۂ تام یعنی حق سبحانہ وتعالیٰ کی رویت سو یہ جنت میں حاصل ہوگی دنیا میں یہ رویت غیر ممکن ہے، دوسرے مشاہدۂ ناقص یا استحضار تام، یہ اس دنیا میں ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت بندہ کو گاہ بگاہ ہوتی ہے ہمیشہ نہیں رہتی اور نہ رہ سکتی ہے[2]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ "مقامات تصوف" ایک بلند پایہ تصنیف ہے جس میں تصوف کی اہمیت اور اس کی حقیقت ومقامات کو تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ گو کہ یہ تصنیف اسی دور کی ہے لیکن مضامین اور مباحث کے اعتبار سے یہ متقدمین کی تصوف پر تحریر کردہ تصانیف میں سے ایک معلوم دیتی ہے۔

---

[1] مقامات تصوف، ص ۴۴۔ [2] ایضاً ص ۴۴۔

بقیہ ص ۱۴ تقابلی جائزہ

اور اس کے مبدل منہ کا مصداق ومدلول نیز صفت وموصوف کا مصداق ومدلول ایک ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کا مصداق علیحدہ علیحدہ قرار دے کر یہ ترجمہ فرماتے ہیں۔ "راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا" اس کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ ان تمام فنی امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ ترجمہ فرماتے ہیں۔ "راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔"

(۴) خاں صاحب نے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کا ترجمہ کرتے وقت اس آیت کو مدنظر نہ رکھا جو سورۂ آل عمران میں یہود پر غضب سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ الآیۃ یعنی۔ "اور غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے" خاں صاحب کا ترجمہ دیکھ کر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس مقام پر جو غضب ہے اس سے کس کا غضب مراد ہے [illegible] لیکن حضرت شیخ الہند کا ترجمہ اس سقم سے پاک ہے وہ فرماتے ہیں۔ "جن پر تیرا غصہ ہوا ..." [illegible]

احکامِ عیدِ اضحیٰ و قربانی

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے عشرۂ ذی الحجہ سے بہتر کوئی زمانہ نہیں، ان میں ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر اور ایک رات میں عبادت کرنا شب قدر کی عبادت کے برابر ہے (ترمذی و ابن ماجہ)

قرآن مجید کے سورۂ والفجر میں اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کی قسم کھائی ہے، وہ دس راتیں جمہور کے قول میں یہی عشرۂ ذی الحجہ کی راتیں ہیں، خصوصاً نویں تاریخ یعنی عرفہ کے دن، اور عرفہ اور عید کی درمیانی رات ان تمام ایام میں بھی خاص فضیلت رکھتے ہیں، عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ کا کفارہ ہے اور عید کی رات میں بیدار رہ کر عبادت میں مشغول رہنا بہت بڑی فضیلت اور ثواب کا موجب ہے۔

تکبیر تشریق

اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔ یعنی نویں تاریخ کی صبح سے تیرہویں تاریخ کی عصر تک ہر نماز کے بعد بآواز بلند ایک مرتبہ یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے، فتویٰ اس پر ہے کہ باجماعت نماز پڑھنے والے اور تنہا پڑھنے والے اس میں برابر ہیں، اسی طرح مرد و عورت دونوں پر واجب ہے البتہ عورت بآواز بلند تکبیر نہ کہے آہستہ کہے (شامی)

تنبیہ

اس تکبیر کا متوسط بلند آواز سے کہنا ضروری ہے، بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں پڑھتے ہی نہیں؟ یا آہستہ پڑھ لیتے ہیں اس کی اصلاح ضروری ہے۔

نماز عید

عیدالاضحیٰ کے روز یہ چیزیں مسنون ہیں، صبح کو سویرے اٹھنا، غسل و مسواک کرنا، پاک و صاف، عمدہ کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، عید کی نماز سے پہلے کچھ نہ

کھانا، عیدگاہ کو جاتے ہوئے تکبیر مذکور الصدر بآواز بلند پڑھنا، نماز عید دو رکعت ہیں، مثل دوسری نمازوں کے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ہر رکعت کے اندر تین تین تکبیریں زائد ہیں۔

پہلی رکعت میں سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ الخ پڑھنے کے بعد قرأت سے پہلے اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع سے پہلے، ان زائد تکبیروں میں کانوں تک ہاتھ اٹھانا چاہئے، پہلی رکعت میں دو تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دیں، تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں، دوسری رکعت میں تینوں تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں، چوتھی تکبیر کے ساتھ رکوع میں چلے جائیں، نماز عید کے بعد خطبہ سننا سنت ہے۔

قربانی قربانی ایک اہم عبادت ہے اور شعائر اسلام میں سے ہے، زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کو عبادت سمجھا جاتا تھا مگر بتوں کے نام پر قربانی کرتے تھے اسی طرح آج تک بھی دوسرے مذاہب میں قربانی مذہبی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے، بتوں کے نام پر یا مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں، سورۂ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جس طرح نماز اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہوسکتی قربانی بھی اسی کے نام پر ہونی چاہئے، (فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ) کا یہی مفہوم ہے، دوسری ایک آیت میں اسی مفہوم کو دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد ہجرت دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا، ہر سال برابر قربانی کرتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ قربانی صرف مکہ معظمہ کیلئے مخصوص نہیں ہے، ہر شخص پر ہر شہر میں بعد تحقق شرائط واجب ہے (ترمذی) اور مسلمانوں کو اس کی تاکید فرماتے تھے اسی لئے جمہور اسلام کے نزدیک قربانی واجب ہے (شامی)

قربانی کس پر واجب ہوتی ہے؟ قربانی ہر مسلمان عاقل، بالغ، مقیم پر واجب ہوتی ہے جس کی ملک میں ساڑھے باون تولہ چاندی، یا اس کی قیمت کا مال اس کی حاجات اصلیہ سے زائد موجود ہو، یہ مال خواہ سونا چاندی یا اسکے زیورات ہوں یا مالِ تجارت یا ضرورت سے زائد گھریلو سامان یا مسکونہ مکان سے زائد کوئی مکان

وغیرہ ہو (شامی)

قربانی کے معاملہ میں اس مال پر سال بھر گذرنا بھی شرط نہیں، بچہ اور مجنون کی ملک میں اگر اتنا مال ہو تو بھی اس پر اس کی طرف سے اس کے ولی پر قربانی واجب نہیں، اسی طرح جو شخص شرعی قاعدے کے موافق مسافر ہو اس پر بھی قربانی لازم نہیں (شامی)

مسئلہ:۔ جس شخص پر قربانی واجب نہ تھی اگر اس نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خرید لیا تو اس کی قربانی واجب ہو گئی۔ (شامی)

قربانی کے دن

قربانی کی عبادت صرف تین دن کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے دنوں میں قربانی کی کوئی عبادت نہیں، قربانی کے دن ذی الحجہ کی دسویں گیارہویں اور بارہویں تاریخیں ہیں اس میں جب چاہے قربانی کر سکتا ہے البتہ پہلے دن کرنا افضل ہے

قربانی کے بدلے میں صدقہ وخیرات

اگر قربانی کے دن گذر گئے اور ناواقفیت یا غفلت یا کسی عذر سے قربانی نہیں کر سکا تو قربانی کی قیمت فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے، لیکن قربانی کے تین دنوں میں جانوروں کی قیمت صدقہ کر دینے سے یہ واجب ادا نہ ہوگا ہمیشہ گنہ گار رہے گا، کیونکہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے جیسے نماز پڑھنے سے روزہ اور روزہ رکھنے سے نماز ادا نہیں ہوتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے حج ادا نہیں ہوتا ایسے ہی صدقہ وخیرات کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور تعامل اور پھر تعامل صحابہ اس پر شاہد ہیں۔

قربانی کا وقت

جن بستیوں یا شہروں میں نماز جمعہ وعیدین جائز ہے وہاں نماز عید سے پہلے قربانی جائز نہیں، اگر کسی نے نماز عید سے پہلے قربانی کر دی تو اس پر دوبارہ قربانی لازم ہے، البتہ چھوٹے گاؤں جہاں جمعہ وعیدین کی نمازیں نہیں ہوتیں یہ لوگ دسویں تاریخ کی صبح صادق کے بعد قربانی کر سکتے ہیں، ایسے ہی اگر کسی عذر کی وجہ سے نماز عید پہلے دن نہ ہو سکے تو نماز عید کا وقت گذر جانے کے بعد قربانی درست ہے (درمختار)

مسئلہ:۔ رات کو قربانی جائز ہے مگر بہتر نہیں (شامی)

قربانی کے جانور

بکرا، دنبہ، بھیڑ، ایک ہی شخص کی طرف سے قربانی کیا جا سکتا ہے

گائے، بیل، بھینس، اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ایک کافی ہے بشرطیکہ سب کی نیت ثواب کی ہو، کسی کی نیت محض گوشت کھانے کی نہ ہو۔

مسئلہ:۔ بکرا بکری ایک سال کا پورا ہونا ضروری ہے، بھیڑ اور دنبہ اگر اتنا فربہ اور تیار ہو کہ دیکھنے میں سال بھر کا معلوم ہو تو وہ بھی جائز ہے، گائے، بیل، بھینس دو سال کی، اونٹ پانچ سال کا ہونا ضروری ہے، ان عمروں سے کم کے جانور قربانی کے لئے کافی نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر جانوروں کا فروخت کرنے والا پوری عمر بتاتا ہے اور ظاہری حالات سے اسکے بیان کی تکذیب نہیں ہوتی تو اس پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

مسئلہ:۔ جس جانور کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہوں یا بیچ میں سے ٹوٹ گیا ہو اس کی قربانی جائز ہے، ہاں سینگ جڑ سے اکھڑ گیا ہو جس کا اثر دماغ پر ہونا لازم ہے تو اس کی قربانی درست نہیں (شامی)

مسئلہ:۔ خصی (بدھیا) بکرے کی قربانی جائز بلکہ افضل ہے (شامی)

مسئلہ:۔ اندھے، کانے، لنگڑے جانور کی قربانی درست نہیں، اسی طرح ایسا مریض اور لاغر جانور جو قربانی کی جگہ تک اپنے پیروں سے نہ جا سکے اس کی قربانی بھی جائز نہیں ہے۔

مسئلہ:۔ جس جانور کا تہائی سے زیادہ کان یا دم وغیرہ کٹی ہوئی ہو اس کی قربانی جائز نہیں (شامی)

مسئلہ:۔ جس جانور کے دانت بالکل نہ ہوں یا اکثر نہ ہوں اس کی قربانی جائز نہیں (شامی و درمختار) اسی طرح جس جانور کے کان پیدائشی طور پر بالکل نہ ہوں اس کی قربانی درست نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر جانور صحیح سالم خریدا تھا پھر اس میں کوئی عیب مانع قربانی پیدا ہو گیا تو اگر خریدنے والا غنی صاحب نصاب نہیں ہے تو اس کیلئے اس عیب دار جانور کی قربانی جائز ہے، اور اگر یہ شخص غنی صاحب نصاب ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس جانور کے بدلے دوسرے جانور کی قربانی کرے (درمختار وغیرہ)

قربانی کا مسنون طریقہ

اپنی قربانی خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے، اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے ذبح کرا سکتا ہے مگر ذبح کے وقت وہاں خود بھی حاضر رہنا افضل ہے۔

مسئلہ:۔ قربانی کی نیت صرف دل سے کرنا کافی ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں البتہ

ذبح کرنے کے وقت بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا ضروری ہے، سنت ہے کہ جب جانور کو ذبح کرنے کے لئے رو بہ قبلہ لٹائے تو یہ آیت پڑھے اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۰ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْہُ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ وَخَلِیْلِکَ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْھِمَا السَّلَامُ۔

آداب قربانی قربانی کے جانور کو چند روز پہلے سے پالنا افضل ہے

مسئلہ:۔ قربانی کے جانور کا دودھ نکالنا یا اس کے بال کاٹنا جائز نہیں، اگر کسی نے ایسا کرلیا تو دودھ اور بال یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے (بدائع)

مسئلہ:۔ قربانی سے پہلے چھری کو خوب تیز کرے اور ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کرے، اور ذبح کے بعد کھال اتارنے اور گوشت کے ٹکڑے کرنے میں جلدی نہ کرے جب تک پوری طرح جانور ٹھنڈا نہ ہو جائے۔

متفرق مسائل

عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں، لیکن جس شہر میں کئی جگہ نماز عید ہوتی ہو تو شہر میں کسی جگہ بھی نماز عید ہوگئی تو پورے شہر میں قربانی جائز ہو جاتی ہے (بدائع)

مسئلہ:۔ قربانی کے جانور کے اگر ذبح سے پہلے بچہ پیدا ہوگیا یا ذبح کے بعد اس کے پیٹ سے زندہ بچہ نکل آیا تو اس کو بھی ذبح کر دینا چاہئے۔ (بدائع)

جس شخص پر قربانی واجب تھی اگر اس نے قربانی کا جانور خرید لیا پھر وہ گم ہوگیا یا چوری ہوگیا یا مرگیا تو واجب ہے کہ اس کی جگہ دوسری قربانی کرے، اگر دوسری قربانی کے بعد پہلا جانور مل جائے تو بہتر یہ ہے کہ اس کی بھی قربانی کر دے لیکن اس کی قربانی اس پر واجب نہیں۔ اگر یہ شخص غریب ہے جس پر پہلے سے قربانی واجب نہ تھی، نفلی طور پر اس نے قربانی کے لئے جانور خرید لیا پھر وہ مرگیا یا گم ہوگیا تو اس کے ذمہ دوسری قربانی واجب نہیں ہاں اگر گمشدہ جانور قربانی کے دنوں میں مل جائے تو اسکی قربانی کرنا واجب ہے اور ایام

قربانی کے بدلے تو اس جانور یا اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے (بدائع)

قربانی کا گوشت

(۱) جس جانور میں کئی حصہ دار ہوں تو گوشت وزن کرکے تقسیم کیا جائے، اندازہ سے تقسیم نہ کریں۔

(۲) افضل یہ ہے کہ قربانی کا گوشت تین حصے کرکے ایک حصہ اپنے اہل وعیال کے لئے رکھے ایک حصہ احباب واعزہ میں تقسیم کرے ایک حصہ فقراء ومساکین میں تقسیم کرے اور جس شخص کا عیال زیادہ ہو وہ تمام گوشت خود بھی رکھ سکتا ہے۔

(۳) قربانی کا گوشت فروخت کرنا حرام ہے۔

(۴) ذبح کرنے والے کی اجرت میں گوشت یا کھال دینا جائز نہیں، اجرت علیٰحدہ دینی چاہیئے۔

قربانی کی کھال

(۱) قربانی کی کھال کو اپنے استعمال میں لانا، مثلاً مصلّٰی بنالیا جائے یا چمڑے کی کوئی چیز ڈول وغیرہ بنوالیا جائے، یہ جائز ہے، لیکن اگر اس کو فروخت کیا تو اس کی قیمت اپنے خرچ میں لانا جائز نہیں بلکہ صدقہ کرنا اس کا واجب ہے اور قربانی کی کھال کو فروخت کرنا بدون نیت صدقہ کے جائز بھی نہیں (عالمگیری)

(۲) قربانی کی کھال کسی خدمت کے معاوضے میں دینا جائز نہیں اسی لئے مسجد کے مؤذن یا امام وغیرہ کے حق الخدمت کے طور پر ان کو کھال دینا درست نہیں۔

(۳) مدارس اسلامیہ کے غریب اور نادار طلباء ان کھالوں کا بہترین مصرف ہیں کہ اس میں صدقہ کا ثواب بھی ہے، احیائے علم دین کی خدمت بھی، مگر مدرسین وملازمین کی تنخواہ اس سے دینا جائز نہیں۔
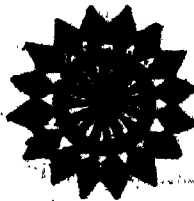
آہ حضرت مولانا احرار الحق صاحب
(رحمۃ اللہ علیہ فیض آبادی)

مولوی محمد ارشد قاسمی رفیق شعبۂ تنظیم و ترقی دارالعلوم دیوبند

نام محمد احرار الحق ابن فخر الدین صاحب۔

ولادت باسعادت ۸ رمارچ ۱۹۳۲ء بروز منگل بمقام بکری رسول پور پوسٹ التفات گنج ضلع فیض آباد، یوپی۔

آغاز تعلیم ابتدائی تعلیم مدرسہ مصباح العلوم علن پور میں حاصل کی، اس کے بعد والد محترم کے اشارہ پر تلاش معاش کی غرض سے بمبئی چلے گئے۔

وہاں مختلف کام کئے۔ ایک مرتبہ بمبئی شہر میں حضرت مولانا محمد یونس صاحب بگھروی (مظفر نگر) مدظلہ العالی کی تقریر تھی، مولانا بھی ان کی تقریر سننے چلے گئے، وہاں مولانا کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے، اور یہ فیصلہ کیا کہ انشاء اللہ تعلیم ضرور حاصل کروں گا، چنانچہ دن میں مدرسہ امدادیہ دوٹانکی میں تعلیم حاصل کرتے (مدرسہ امدادیہ اب جوناپھٹی میں چلتا ہے) اور رات میں کافی چائے بیچتے جس سے اپنا خرچ چلاتے، اس طرح کچھ مختصر سی تعلیم بمبئی میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند چلے آئے اور ۱۳۷۲ھ میں یہاں داخلہ لیا، لیکن مولانا فرماتے تھے کہ مجھے کتابیں کم سمجھ میں آتی تھیں، تو میں نے یہ سوچا کہ طلبہ کو تکرار کراؤں، شاید اس سے کتاب آسانی سے سمجھ میں آنے لگے چنانچہ طبیعت پر جبر کرکے بنام خدا طلبہ کو صرف ونحو کی تکرار کرانے لگا۔ الحمد للہ کچھ ہی دنوں میں کتابیں سمجھ میں آنے لگیں، یہ زمانہ نہایت تنگی اور پریشانی کا تھا، مولانا فرماتے تھے کہ میں نے بہت ہی تنگدستی کی حالت میں تعلیم حاصل کی ہے، یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند کی زندگی میں تقریباً سات سال تک ناشتہ کرنے کی نوبت تک نہیں آئی اور صرف مطبخ کی خوراک پر ہی زندگی گذارتا اور تعلیم حاصل کرتا رہا۔

مولانا مرحوم کے دارالعلوم کے ساتھیوں میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا ریاست علی صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند، اور مولانا نعمان الحق مرحوم سابق مدرس دارالعلوم اور مولانا رشید الدین صاحب مہتمم مدرسہ شاہی اور مولانا رشید الوحیدی و مولانا محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ دارالرشاد بارہ بنکی وغیرہم ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ سے اصلاحی تعلق

۱۳۷۷ھ میں مولانا کا پہلا عقد ہوا، اور اسی سال غالباً جمادی الثانی کے مہینہ میں بروز جمعہ قبل نماز جمعہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے، مولانا مرحوم کی پہلی اہلیہ ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ میں انتقال کر گئیں تو دوسرا عقد ۱۳۸۸ھ ماہ رمضان المبارک میں کیا یہ دوسری اہلیہ بحمداللہ بقید حیات ہیں، ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء یعنی جس سال حضرت اقدس مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، اس سال مولانا مرحوم موقوف علیہ میں زیر تعلیم تھے، پھر ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں حضرت مولانا فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری پڑھی اور اس کے اگلے سال دارالعلوم ہی سے افتاء کیا اور مختلف فنون میں دو سال وقت لگایا۔

تدریس کی ابتدا

۱۳۸۱ھ میں سب سے پہلے مدرس کی حیثیت سے مدرسہ حسینیہ تاؤلی میں تقرر ہوا، یہ تقرر ایک مدرس کی خالی جگہ پر ہوا تھا جو اس سال حج بیت اللہ کیلئے جارہے تھے، اسی وجہ سے مولانا مرحوم صرف ایک سال تاؤلی میں رہے، اسی سال مولانا مرحوم نے ایک مسجد کی سنگ بنیاد بھی رکھی جو تاؤلی میں موجود ہے اور مسجد احراری کے نام سے موسوم ہے۔

اس کے بعد کولہاپور مہاراشٹر تشریف لے گئے اور ایک مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے، اتفاق سے اچانک مولانا کی اہلیہ سخت بیمار ہوگئیں اور وہ بغرض علاج بمبئی لائی گئیں، چنانچہ مولانا مرحوم اپنی اہلیہ کی دیکھ بھال کی غرض سے کولہاپور سے بمبئی آگئے، اسی دوران کچھ مخلصین نے مشورہ دیا کہ آپ عارضی طور سے مدرسہ امدادیہ چونابھٹی میں درس کا سلسلہ شروع کردیں اور ساتھ ہی اہلیہ کا علاج بھی کراتے رہیں تاکہ مصارف نکلتے رہیں، اسی وجہ سے مولانا مرحوم نے تقریباً ۷ ماہ مدرسہ امدادیہ بمبئی میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر باضابطہ مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم بانسکنڈی آسام تشریف لے گئے وہاں مسلسل تین سال تک تدریسی امور انجام دیتے رہے لیکن بعض حالات

اور وطن سے دوری کی وجہ سے مولانا کی یہ خواہش تھی کہ اگر وطن کے قریب کہیں کوئی جگہ مل جائے تو بہتر ہو

نور العلوم بہرائچ میں تدریسی خدمات

ادھر بشکل امداد غیبی مدرسہ نور العلوم بہرائچ والوں نے آمادگی ظاہر کی کہ آپ بہرائچ تشریف لے آئیں چنانچہ وہاں کے لوگوں کی خواہش پر حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کرنے کے بعد نور العلوم بہرائچ تشریف لے آئے اور تدریسی خدمات میں مشغول ہوگئے

مدرسہ کنز العلوم ٹانڈہ میں بحیثیت مدرس تقرر

کچھ دنوں کے بعد مولانا مرحوم کے خسر حضرت مولانا مفتی وکیل الدین صاحب نے مولانا کو مدرسہ کنز العلوم ٹانڈہ میں بلالیا تاکہ گھر سے بالکل قریب ہوجائیں اور بال بچوں کی دیکھ بھال و تربیت کرسکیں۔

مولانا کے خسر حضرت مولانا مفتی وکیل الدین صاحب ضلع فیض آباد کے ایک جید الاستعداد عالم تھے، اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے، حضرت مفتی صاحب نے اپنے زمانہ میں کنز العلوم کو اتنا عروج دیا کہ عربی سال ہفتم تک تعلیم ہونے لگی تھی، اور پورے دیار میں اس وقت اتنا بڑا اور اچھا مدرسہ کوئی نہیں تھا، حضرت مفتی صاحب کا انتقال حضرت مولانا ابرار الحق صاحب کے انتقال کے ٹھیک بارہ دن کے بعد بروز عید ۱۴۱۴ھ کو ہوا، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

مولانا مرحوم مفتی صاحب کے دعوت پر مدرسہ کنز العلوم تشریف لے آئے اور درس و افادہ میں مشغول ہوگئے، کچھ دنوں کے بعد مدرسہ کنز العلوم والوں نے مولانا کو دارالاقامہ کا نگراں نامزد کردیا تھا جس کی وجہ سے مولانا مرحوم طلبہ پر خصوصی نگاہ رکھتے تھے اور ہر طالب علم کے وضع قطع ڈاڑھی پر خصوصی توجہ کے ساتھ ساتھ نماز باجماعت کی تاکید کرتے تھے، یہ سختی وہاں کے مقیم طلبہ کو کچھ ناگوار گذری، انھوں نے دیگر اساتذہ سے مولانا کی شکایت شروع کردی حتی کہ مدرسین بھی مولانا سے کہنے لگے کہ مولانا آپ طلبہ پر اس قدر شدت نہ کریں، جس کی وجہ سے مولانا کی طبیعت وہاں سے مکدر ہوگئی اور مولانا نے کچھ مخلصوں اور خیر خواہوں سے مشورہ کیا، چنانچہ سب نے یہی رائے دی کہ مولانا جب آپ کی نگرانی و تربیت سے طلبہ وانتظامیہ وغیرہ نالاں رہتے ہیں تو

آپ یا تو نرمی برتیں یا اللہ کا نام لے کر کسی دوسری جگہ کا انتخاب فرمائیں

دوبارہ نور العلوم بہرائچ میں تدریسی خدمات

یہ بات کسی طرح سے مولانا کلیم اللہ صاحب مہتمم مدرسہ نور العلوم بہرائچ کو معلوم ہوگئی کہ مولانا کنز العلوم ٹانڈہ سے بددل ہیں اور کسی دوسری درسگاہ کا انتخاب کرنا چاہ رہے ہیں تو فوراً مولانا کلیم اللہ صاحب نے اپنے صاحبزادہ محترم جناب مولانا حیات اللہ صاحب قاسمی کو بھیج کر دوبارہ نور العلوم بہرائچ کے لئے مولانا کو آمادہ کرلیا، اور پھر دوبارہ مدرسہ نور العلوم بہرائچ بحیثیت مدرس کے تشریف لے گئے اور وہاں مولانا نے بڑی محنت و لگن سے تقریباً پانچ سال دینی خدمات انجام دیں اور حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے فیض کو لوگوں میں پہونچا کر شہر بہرائچ میں بہت سے لوگوں کی ظاہری و باطنی اصلاح کی، چنانچہ ہر سال مولانا مرحوم رمضان المبارک میں بہرائچ شہر کی جامع مسجد میں اپنے مریدین کے ساتھ اعتکاف فرماتے رہے اور بہت سے لوگوں کو اپنے سلسلۃ الذہب میں جوڑ کر ان کی آخرت سنوارتے رہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم کے مریدین کی ایک بڑی تعداد بہرائچ میں موجود ہے۔

دار العلوم دیوبند سے تدریسی تعلق اور طلبہ پر شفقت

اسی زمانے میں حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب ابن شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کو سہارنپور بلوایا کہ آپ حضرت شیخ کے زمانہ میں رمضان المبارک شیخ کے ساتھ ہی سہارنپور میں گذارتے تھے، اس لئے آپ اس سال تشریف لے آئیں اور رمضان المبارک یہیں گذاریں، مولانا مرحوم نے پیرزادہ محترم کی دعوت پر لبیک کہا اور رمضان المبارک میں سہارنپور تشریف لے آئے، اسی ماہ مبارک میں مولانا نے سہارنپور سے دیوبند کا سفر فرمایا، یہاں پہونچ کر حضرت مہتمم صاحب و مولانا معراج الحق صاحب وغیرہم سے ملاقاتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ دار العلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد نے آپ کا دار العلوم میں تدریسی خدمات کیلئے انتخاب کیا ہے، نیز حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ آپ شوال میں تشریف لے آئیں چنانچہ شوال ۱۴۰۵ھ سے آپ کا دار العلوم میں تدریسی خدمات کے لئے تقرر ہوگیا۔

حضرت مولانا مرحوم زمانہ تدریس میں طلبہ کے ساتھ نہایت شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے بعض دفعہ اگر کسی طالب علم کو ڈانٹ دیا تو اس کو تنہائی میں بلا کر معذرت کرتے اور فرماتے کہ بھائی آپ کو ڈانٹنے کا مقصد اصلاح ہے، آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے طلباء مولانا مرحوم کے گرویدہ تھے۔

مولانا بہت منکسر المزاج، سادہ لوح، سنجیدہ طبیعت، اور نہایت متین تھے اسی وجہ سے ہر چھوٹا اور بڑا اُن سے براہ راست گفتگو کرلیتا اور ملاقات میں جھجک محسوس نہ کرتا۔

حضرت شیخ سے اجازت خلافت

مولانا مرحوم کا اصلاحی تعلق حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ۱۳۸۰ھ میں قائم ہو گیا تھا، وہ حضرت شیخ کے اتنے گرویدہ اور عاشق تھے کہ ہر سال رمضان المبارک شیخ کے پاس سہارنپور ہی میں گذارتے تھے، چنانچہ حضرت شیخ رح نے رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ میں ستائیسویں شب میں اجازت مرحمت فرمائی، جس شب کو عوام شب قدر کہتے ہیں، ایک مصلیٰ بھی عطا فرمایا، اور حضرت شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ

> مولوی احرار پیارے! جس نسبت کو حاصل کرنے کیلئے تم نے اس ناکارہ سے حُسن ظن رکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے وہ تمھیں مرحمت فرمائی ہے، میں تم کو حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی طرف سے بیعت کی اجازت دیتا ہوں، اس کے بعد فرمایا: میں تمکو اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو، اور اہل سنت والجماعت سے وابستہ رہو، اور بدعت و معاصی سے بچو اور غالباً یہ بھی فرمایا کہ
>
> اس کی بہت حفاظت کیجیو (حضرت شیخ الحدیث اور ان کے خلفاء ص ۲۱۱/۲۲)

مولانا محمد طلحہ صاحب و مولانا محمد یونس صاحب سے قلبی تعلق

مولانا مرحوم دیوبند میں قیام تدریس کے زمانہ میں بھی صاحبزادۂ محترم بھائی محمد طلحہ صاحب و حضرت مولانا محمد یونس صاحب وغیرہ سے بغرض ملاقات

کثرت سے سہارنپور جایا کرتے تھے اور ان کو ان دونوں بزرگوں سے بہت گہرا تعلق اور قلبی لگاؤ تھا، میں نے اکثر دیکھا کہ جب مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم، دیوبند تشریف لاتے تو ان کا قیام دیوبند میں فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب زید مجدہم کے پاس رہتا اور جب تک دیوبند میں ٹھہرتے مولانا مرحوم ضرور مولانا یونس صاحب کے پاس رہتے، دونوں میں غایت درجہ بے تکلفی تھی، اسی وجہ سے بعض دفعہ تو مولانا مرحوم انھیں سہارنپور تک پہونچانے کے لئے چلے جاتے اس طرح کی محبت لوگوں میں میں نے عموماً کم دیکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم کے انتقال پر حضرت مولانا محمد یونس صاحب کو بھی کافی صدمہ ہوا اور اس جدائی کا بہت گہرا اثر رہا۔

مرض الموت اور ابتداء سفر آخرت

مولانا مرحوم نے ۲۱ شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ تعطیل کلاں میں سیتاپور کا سفر کیا، وہیں مولانا مرحوم کو دل میں ہلکا سا درد محسوس ہوا، معمولی ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لے لیا اور بہرائچ چلے گئے۔ وہاں بھی دل میں درد محسوس ہوا اس مرتبہ تکلیف کچھ زیادہ ہی تھی، وہاں کے ڈاکٹروں نے چیک اپ کرکے بتایا کہ یہ ہارٹ کا درد ہے آپ آرام فرمائیں، پھر کچھ لوگوں کے مشورہ سے بہرائچ اسپتال میں داخل کردیا گیا، مگر کچھ آرام نہ ہوا تو لوگوں نے لکھنؤ لے جانے کی رائے دی، چنانچہ، رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ کو لکھنؤ لے جایا گیا، وہاں لاری کارڈیالوجی سینٹر میں زیر علاج رہے، پھر چھبیس گھنٹے کے درمیان دو جھٹکے لگے، پھر کچھ طبیعت سنبھلی۔ احقر ۱۷ رمضان المبارک کو حضرت سے ملاقات کی غرض سے لکھنؤ گیا، دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ تمھارے آجانے سے مجھے کافی سکون محسوس ہوا، یہ تمھارے تعلق کی بات ہے، میں آج تم کو تین دن سے مسلسل یاد کررہا ہوں، پھر فرمایا کہ مجھ سے معانقہ کرو، چنانچہ مولانا بستر ہی پر لیٹے تھے میں نے معانقہ کیا اور تھوڑی سی گفتگو کی، اس وقت آواز میں کافی نقاہت تھی اور آواز بالکل آہستہ نکل رہی تھی پھر میں نے مولانا کے صاحبزادے مفتی مولوی محبوب الرحمن وعزیزم مخلص الرحمن سے پوچھا، ان لوگوں نے بتایا کہ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ مولانا کا دل ستر فیصد کام نہیں کررہا ہے صرف تیس فیصد کام کررہا ہے۔

اتنے میں ڈاکٹر قریشی صاحب (مسٹر نرسنگ ہوم) تشریف لے آئے، ان کے ہمراہ مولانا محمد زکریا

صاحب استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی تھے، انھوں نے بھی یہی بات بتائی، ان کے علاوہ مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی و مولانا عتیق الرحمٰن صاحب بستوی و حافظ عبدالتواب صاحب اساتذۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و دیگر بہت سے لوگ عیادت کیلئے تشریف لاتے رہے، آخرالذکر دونوں اساتذہ مولانا مرحوم کے شاگرد بھی ہیں۔

احقر سے دو چار روز قبل حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہ العالی بھی لکھنؤ تشریف لاکر حضرت مولانا کی عیادت کر چکے تھے، حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب مدظلہ کے ہمراہ اور لوگ بھی تھے، ان میں بھائی محمد طلحہ صاحب ابن حاجی فقیر محمد تمباکو والے بھی تھے چنانچہ بھائی طلحہ صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ میرا مکان آپ کے اسپتال سے قریب ہی ہے آپ میرے مکان پر آرام فرمائیں وہاں ہر طرح کی سہولت ہے اور ہم لوگوں کو زیادہ خدمت کا موقع بھی، چنانچہ ۱۸ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ کو دوپہر کے وقت حضرت مولانا کو اسپتال سے بھائی محمد طلحہ صاحب کے مکان پر منتقل کر دیا گیا، یہاں پر مولانا پورے دن بخیر و عافیت رہے، پھر اچانک رات ساڑھے دس بجے کے قریب ایک جھٹکا لگا، یہ پانچواں اٹیک تھا جو بہت سخت تھا، حضرت مولانا اس کی شدت برداشت نہ کر سکے، اور بہت زور سے یا اللہ کہا پھر چہرہ قبلہ رو کر کے اپنے تمام اعزاء و اقارب اور اہل دنیا کو خیرباد کہہ کر راہی ملک بقا ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون

آخری آرام گاہ

جنازہ وطن لے جانے کی تیاری شروع ہو گئی اور فوراً فیض آباد، بہرائچ، بمبئی، دیوبند سب جگہوں پر فون سے اطلاع دی گئی اور بذریعہ بس مولانا مرحوم کا جنازہ وطن لایا گیا، راستہ میں شہر فیض آباد میں تھوڑی دیر سحری کے وقت روکا گیا، وہیں سے ہم لوگ مولانا مرحوم کے جنازہ کے ہمراہ ان کے آبائی گاؤں بکری رسولپور گئے۔ ۱۹ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ بروز جمعرات بعد نماز ظہر آبائی قبرستان کے میدان میں صاحبزادۂ محترم مولانا مفتی محبوب الرحمٰن صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس خزانۂ خوبی کو ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کر دیا گیا۔ ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پسماندگان

حضرت مولانا مرحوم کے پسماندگان میں پانچ بھائی ہیں جن میں ایک مولانا مرحوم سے بڑے اور چار چھوٹے ہیں اور الحمد للہ سب بقید حیات ہیں، مولانا مرحوم کی پہلی اہلیہ مرحومہ سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں، جس میں سے لڑکا دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر مفتی کا کورس کرکے اب تدریسی خدمات میں مصروف ہے اور مولانا مفتی محبوب الرحمٰن کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا مرحوم کی دوسری اہلیہ صاحبہ موجود ہیں ان سے دو لڑکے اور سات لڑکیاں ہیں جن میں ایک لڑکا عزیزم مخلص الرحمٰن دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم ہے۔

دعا و اختتام

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائیں اور ہر طرح کی آخرت کی نعمتوں اور راحتوں سے نوازیں، اور جمیع پسماندگان و متعلقین و منتسبین کو صبر جمیل عطا فرمائیں اور ان کے گھر والوں کو ہر طرح کے شرور و آفات سے بچائیں اور خصوصی مدد فرمائیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

بقیہ ص ۲۹ **حوالجات تحریک علی گڑھ**

(۱۱) مقالات سرسید حصہ دہم ص ۱۹۵
(۱۲) ایضاً ص ۱۹۸
(۱۳) ایضاً ص ۱۹۸
(۱۴) ایضاً ص ۲۰۰
(۱۵) ایضاً ص ۲۰۱
(۱۶) "
(۱۷) "
(۱۸) تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۳۳۲
(۱۹) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص ۴۱۸ - ۴۱۹
(۲۰) ایضاً ص ۴۱۹ - ۴۲۰
(۲۱) ایضاً ص ۴۲۰ - ۴۲۱
(۲۲) ایضاً ص ۴۰۲
(۲۳) ایضاً ص ۴۲۱
(۲۴) مکتوبات سرسید جلد دوم، ص ۳۰۹
(۲۵) مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص ۴۲۱
(۲۶) ایضاً ص ۴۲۲
(۲۷) ایضاً ص ۴۳۵
(۲۸) خطوط سرسید، ص ۱۳۵
(۲۹) ایضاً، ص ۲۶۹
(۳۰) مقالات سرسید حصہ دہم، ص ۱۷۹
(۳۱) ایضاً ص ۱۸۰ - ۱۸۱
(۳۲) ایضاً ص ۱۸۱
(۳۳) ایضاً ص ۱۸۲

دار العلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوتے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو. دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جا رہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھا لیا گیا، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقربا کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے، آمین۔

پتہ

ڈرافٹ و چیک کیلئے :- دارالعلوم دیوبند — اکاؤنٹ نمبر 30016 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے :- حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند — پن کوڈ نمبر 247554

PHONE: 22429
CODE: 01336

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد نمبر ۷۹ — شمارہ نمبر ۶

ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۹۴ء

فی شمارہ ۶/- — سالانہ ۶۰/-

نگران
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ	۳۰۰/-	روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم	۱۰۰/-	”
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم	۸۰/-	”

ترسیل زر کا پتہ :- دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کر دیں
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس اختر سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

عصر حاضر کو تحقیق و ترقی اور تہذیب و تمدن کا دور کہا جاتا ہے، نت نئی ایجادات و اکتشافات نے آج کے انسان کے حوصلے بہت بلند کر دیئے ہیں، اور وہ زمین کی پہنائیوں اور سمندر کی گہرائیوں کو ناپنے کے بعد آفتاب و ماہتاب پر کمندیں ڈالنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، علم و فن کے ذریعہ دھات کے بے جان پرزوں سے انسانی دماغ کا کام لیا جا رہا ہے، مہینوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کر لینا ایک معمولی بات ہے، ابلاغ و ارسال کے ایسے کامیاب ذرائع مہیا کر لئے گئے ہیں کہ چند لمحوں میں اپنی بات پوری دنیا میں پھیلائی جا سکتی ہے، آرام و آسائش اور تزئین و آرائش کے ایسے ایسے سامان تیار ہو گئے ہیں کہ ایک صدی پہلے کا انسان ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اور اب تو تمدن کا معیار اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں اور ہواؤں کا پرکرتی ہر سیڈیز کاریں اپنا عروج اور وقار کھوتی جا رہی ہیں ماکولات و ملبوسات کی اتنی قسمیں بنالی گئی ہیں کہ انھیں شمار میں لانا بھی مشکل ہے، غرضیکہ آرام و راحت، اطمینان و سکون تہذیب و تزئین اور زیبائش و آرائش کے اسباب کی اس درجہ فراوانی اور کثرت کہ آج کے کورده اور پسماندہ دیہات بھی پہلے کے قصبات اور شہروں سے کہیں زیادہ پرتکلف اور بارونق نظر آتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس مادی عروج و ترقی، ظاہری چمک دمک اور سامانِ راحت کی اس کثرت سے انسان کو چین و سکون اور امن و اطمینان حاصل ہوگیا ہے؟ قلب کو تسکین اور روح کو آسودگی مل گئی ہے؟ اور کیا واقعی تہذیب و تمدن کے ان پُرشور نعروں کی بدولت آج کا انسان پہلے سے شائستہ اور مہذب ہوگیا ہے؟ اگر آج کی متمدن اور ترقی یافتہ دنیا کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو ان سارے سوالوں کا جواب آپ کو مایوس کن نفی میں ملے گا، اور مشاہدہ و تجربہ گواہ ہیں کہ آرام و راحت کے یہ اسباب جس قدر بڑھتے جا رہے ہیں، قلب کے اضطراب اور روح کی بے چینی میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور فریب تمدن کے دام صد رنگ میں گرفتار انسانیت تڑپ رہی ہے اور تلاش سکون میں در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہے، مگر یہ متاع گمشدہ کہیں سے ہاتھ نہیں لگ رہی ہے عدل و امانت، صبر و قناعت، عفت و حیا، صدق و صفا، اخلاص و محبت، شرافت و مروّت، لحاظ و پاسداری، سیر چشمی و خودداری وغیرہ اعلیٰ قدریں جن سے انسانیت عبارت تھی ایک ایک کرکے رخصت ہوگئی ہیں اور انسان اندر سے بالکل بے مایہ اور کھوکھلا ہو کر رہ گیا ہے

علم و فن تحقیق و جستجو اور عروج و ترقی کے اس دور میں آخر انسانیت کیوں تباہ ہو رہی ہے، اس کی خلش روز بروز کیوں بڑھتی جا رہی ہے اور اس کے اضطراب و انتشار میں آئے دن کیوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اگر حقیقۃً ہمیں سچے سکون کی طلب ہے اور ہم روح کی آسودگی اور قلب کے چین کے متلاشی ہیں تو ہمیں ان اسباب و عوامل کی کھوج لگانی چاہئے۔ جن کے ذریعہ یہ جنس گرانمایہ حاصل کی جا سکتی ہے، ہم نے ایک طویل عرصہ تک دھات و بھاپ پر محنت کرکے دیکھ لیا، زمین کے پوشیدہ خزانوں کی تحقیق کر ڈالی، آفتاب کی کرنوں اور بجلی کی لہروں کو بھی آزما چکے ہیں۔ ان سب کے دامن اس گوہر نایاب سے خالی ہیں، ہم نے استعماریت و اشتراکیت کا بھی تجربہ کرلیا ہے مگر ان آستانوں سے بھی یہ متاع عزیز ہمیں دستیاب نہیں ہوسکی۔

مگر ان مسلسل محرومیوں اور تجربات کی پیہم ناکامیوں سے مایوس ہو کر ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں، ہمیں ابھی ایک تجربہ اور کرنا چاہئے، حاضر کے ان پُرفریب و پُرشور نعروں کے

درمیان حق وصداقت کی ایک مدہم سی آواز بھی سنائی دے رہی ہے، آیئے کان لگا کر سنیں ممکن ہے روح کو تسکین اور قلب کو آرام کا سامان یہیں فراہم ہوجائے، قرآن حکیم بھٹکی ہوئی انسانیت کو دعوت دے رہا ہے کہ اے گم کردہ راہ انسانوں دنیا کے ان گورکھ دھندوں میں پھنس کر اپنے آپ کو ضائع مت کرو اگر تمھیں سکون قلب کی تلاش ہے تو آؤ میرے پاس آؤ تمھارے گوہر مقصود کا پتہ میں اور صرف میں ہی بتا سکتا ہوں کیونکہ اس بیش بہا امانت کا امین و محافظ میں ہی ہوں، کان کھول کر غور سے سن لو "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" اللہ تعالیٰ ہی کی یاد سے قلوب چین پائیں گے، یعنی دولت وحکومت، منصب وجاگیر، مادی ایجادات واکتشافات، ظاہری عروج وترقی، اسباب راحت کی فراوانی، ان میں سے کوئی چیز بھی انسان کو حقیقی سکون واطمینان سے ہم آغوش نہیں کرسکتی، صرف یاد الٰہی اور ذکر اللہ کا نور ہی دلوں سے ہر طرح کی وحشت گھبراہٹ اور اضطراب وانتشار کو دور کرسکتا ہے۔

یہ اس کتاب مقدس کا اعلان ہے جس کی صداقت اور سچائی کو چودہ سو سال کی طویل مدت گذر جانے کے باوجود آج تک چیلنج نہیں کیا جاسکا ہے، ابتدائے نزول سے آج تک اس کا ہر اعلان اور ہر پیشین گوئی حرف بحرف درست ہوتی رہی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ایک بار صدق دلی سے اس کا بھی تجربہ کرلیا جائے۔
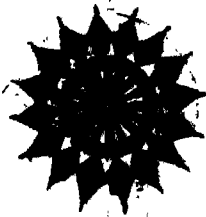
حکمت رسالت کی وسعتوں میں

مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی (مانچسٹر برطانیہ)
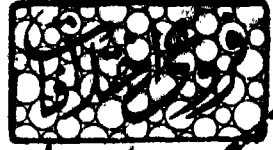
الحمد للّٰہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ اما بعد

اس جہاں کی اساس ذوق اختلاف پر ہوئی ہے، ان اختلافات کی اجتماعیت سے ہی اس جہاں کی رونقیں ہیں سہ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے ۔

یہ اختلاف ذوق انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے، حالات میں تبدیلیاں، شرائع میں تبدیلیاں، اور قوموں کی تبدیلیاں سب اسی ذوق کی ترجمان ہیں، تاہم ایک امت کے لئے یہ ضروری ہوا کہ وہ عقیدۂ تصورِ آخرت اور زندگی کے نصب العین میں ایک ہو کر رہے، ورنہ وہ ایک قوم نہیں انسانوں کی ایک بھیڑ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن خطوط پر اس امت کی تربیت کی اس میں ایک نکتہ باقی رکھا گیا کہ انسانوں کے اس اختلاف ذوق کو یکسر مٹانے کے بجائے اس کا امالہ بندگی کی مختلف اداؤں کی طرف کر دیا جائے، جس طرح تکوینًا رنگوں اور زبانوں کا اختلاف برداشت کرنا پڑتا ہے ایک امت اپنے اس ذوق اختلاف کو عبادت کے مختلف پیمانوں میں ڈھال لے، فرض نماز میں یک نیت اور ایک جماعت ہو تو سنن و نوافل اپنے اپنے طور پر ادا کئے جائیں، عبادات میں اجتماعیت کے ساتھ ساتھ انفرادیت بھی قائم رکھی گئی، سو امت میں فروعات کا اختلاف انسان کے اسی ذوق اختلاف کی ایک تکمیل ہے، یہ اختلاف امت کے لئے ایک وسعت عمل ہے وحشت عمل نہیں، اعاذنا اللہ منہا۔

ان اختلافات کو سمجھنے اور نکھارنے میں علمی تربیت اور ذہنی تشحیذ ہے، اور ذہانت کے یہی وہ اصول ہیں جن سے کسی انسانی معاشرے میں خوشبو پیدا ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنی امت کی تربیت میں انسان کے اس ذوق اختلاف کو قرار واقعی جگہ دی اور یہ حضرات صحابہ کا ظرف وسیع تھا کہ وہ ان تمام اختلافات کو اپنے میں اتار کر بھی ایک امت رہے اور یہ فروعی اختلافات انھیں ایک امت کے دائرہ سے باہر نہ دھکیل سکے۔

اکابر علماء دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ نے فروعی اختلافات کو ہمیشہ رسالت کے وسعت عمل میں جگہ دی ہے انھیں لڑنے کا میدان نہیں بنایا نہ یہ صحابہ کی سوچ تھی، ان کے یہ اختلافات محض وسعت عمل کے مختلف پیمانے تھے، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) سے لے کر حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ (۱۱۷۶ھ) تک آپ کو اس موضوع پر یہی آواز سنائی دے گی

اکابر امت کی ان تحریرات نے احقر کو یہ حوصلہ دیا کہ وہ ائمہ عظام کے فروعی اختلافات کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسعت عمل میں لاکر مسلمانوں کو افراط وتفریط سے بچنے کی تلقین کرے، تفریط یہ ہے کہ ہم ائمہ کے نفعی اور فروعی اختلافات کو بھی برداشت نہ کرسکیں انھیں حق وباطل کی آماجگاہ بنا کر رکھ دیں اور افراط یہ ہے کہ اختلافات بڑھاتے بڑھاتے خود عقائد بھی مختلف فیہ کر دیئے جائیں۔ افراط وتفریط کی یہ دونوں راہیں درست نہیں، اکابر علماء دیوبند ان اختلافات میں ہمیشہ صحابہ کی راہ پر چلے ہیں کہ امت میں عقائد میں صلابت اور فروعی اختلافات میں برداشت کی قوت پیدا کی جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کی تربیت میں وسعت عمل کو بہت جگہ دی ہے۔

خدا کرے کہ ہم اپنے قارئین کے دلوں تک اپنے یہ جذبات اخوت اتارنے میں کامیاب ہوں۔
پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر ؎ مرد ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیمانۂ تربیت میں وسعت عمل :۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اعمال سے حضرات صحابۂ کرام میں بھی رائے کا اختلاف چلا اور راہ عمل کی مختلف صورتیں ان حضرات میں راہ پاگئیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پتہ تھا کہ ان مختلف اعمال سے حضرات صحابۂ کرام میں بھی اختلاف ہوگا اور آپ کے مختلف اعمال صحابۂ کرام کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوں گے، بعض روایات کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

اللہ تعالیٰ سے صحابہ کرام کے آپس کے اختلافات کے بارے میں سوال فرمایا۔ حضرت عمر فاروقؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

سئالت ربی عن اختلاف اصحابی من بعدی فاوحی الی یا محمد ان اصحابك بمنزلة النجوم فی السماء بعضها اقوی من بعض ولکل نور فمن اخذ بشئ مما هم علیه من اختلافهم فهو عندی علی هدی (مشکوٰۃ ص۵۵۴)

(ترجمہ) میں نے اللہ سے صحابہ کے اختلاف کے بارہ میں پوچھا جو میرے بعد واقع ہوگا، اللہ نے میری طرف وحی فرمائی کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے نزدیک آپ کے صحابہ ستاروں کے مرتبہ میں ہیں، بعض ان ستاروں میں سے بعض سے قوی تر ہیں اور ہر ایک کیلئے نور ہے ان کے مختلف طریقوں میں سے جس پر بھی کوئی عمل کرلے وہ میرے نزدیک ہدایت اور راہ صواب پر ہے

اس قسم کی روایات سے اسناداً تو کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن معناً نہیں کیونکہ اسکے گرد اس کی تصدیق کے اتنے شواہد موجود ہیں کہ ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا، محدثین عظام نے صحابہ کرام کے اتنے اختلاف پیش کئے ہیں کہ ان کی قدر مشترک ہمیں اس یقین پر مجبور کرتی ہے کہ واقعی صحابہ کرام کے وسعت عمل کی اصل خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی بحر فیض تھا اور آپ انسان کے ذوق اختلاف کا دھارا وسعت عمل کی طرف موڑنا چاہتے تھے۔

فروعات میں صحابہ کا اختلاف

اہل علم اس سے بخوبی واقف ہیں کہ دین کے بیشمار مسائل میں حضرات صحابہ کرام کا طریق عمل باہم مختلف تھا، حضرت امام ترمذی (۲۷۹ھ) جامع ترمذی میں تقریباً ہر صفحے پر صحابہ کرام کے اختلاف کو کھل کر بیان کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ بعض صحابہ کرام یہ فرماتے ہیں اور بعض صحابہ اس سے اختلاف کرکے دوسری راہ عمل تجویز کرتے ہیں، تیمم ہی کے مسئلے کو لیجئے، امام ترمذی اس باب میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں اور اسکے بعد لکھتے ہیں۔

عمار وابن عباس وغیر واحد من التابعین منهم الشعبی وعطاء و مکحول قالوا التیمم ضربة للوجه والکفین وبه یقول احمد واسحاق وقال بعض العلم منهم ابن عمر وجابر وابراهیم والحسن التیمم ضربة

للوجه وضربة لليدين الى المرفقين ، وبه يقول سفيان الثوري ومالك و
ابن المبارك والشافعي (جامع ترمذی جلد ۱ ص۲۱)

اب دیکھئے ایک طرف حضرت عمارؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں تو دوسری طرف حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت جابرؓ ہیں۔ تابعین میں ایک طرف علامہ شعبیؒ، حضرت عطاءؒ اور امام مکحولؒ ہیں تو دوسری طرف امام ابراہیم نخعیؒ اور حضرت حسن بصریؒ ہیں، آگے چلئے تو ایک طرف امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ ہیں تو دوسری طرف امام سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ، امام عبداللہ بن المبارکؒ اور امام شافعیؒ ہیں۔

لیکن اس اختلاف کے باوجود کبھی ایک صحابی نے دوسرے صحابی کو منکر حدیث نہیں بتلایا کبھی ایک تابعی نے دوسرے تابعی کو مخالف رسول نہیں کہا، کبھی ایک امام نے دوسرے امام کو مخالف شریعت کے فتوے سے نہیں نوازا، بلکہ ہر ایک نے اسے وسعت عمل پر محمول کیا یا زیادہ سے زیادہ راجح، مرجوح اور افضل مفضول کی بات کی۔

امام ترمذی کا بیان

اب دیکھئے نماز میں ہاتھ کہاں رکھے جائیں تحت السرہ یا فوق السرہ، دونوں طرف دلائل اور دونوں طرف صحابۂ کرام تھے، امام ترمذی لکھتے ہیں۔

والعمل على هذا عند اهل العلم من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم والتابعين ومن بعدهم يرون ان يضع الرجل يمينه على شماله في الصلوة ورأى بعضهم ان يضعها فوق السرة ورأى بعضهم ان يضعها تحت السرة وكل ذلك واسع عندهم (جامع ترمذی ج ۱ ص۳۵)

دیکھئے تحت السرہ پر عمل کرنے والوں میں بھی صحابۂ کرام ہیں اور فوق السرہ والوں میں بھی لیکن ان میں سے کسی نے دوسرے کے مسلک کو قابل طعن و تشنیع نہیں قرار دیا اور نہ یہ کہا کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث چھوڑ کر اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں وسعت تھی، صحابۂ کرام نے آپ کے اعمال کو وسعت پر ہی محمول کیا اور اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اس پر عمل کیا۔

حضرت قاسم بن محمد کا ارشاد

قرأت خلف الامام ہو یا نہ ہو، اسامہ بن زید نے حضرت قاسم بن محمد سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا۔

ان قرأت خلف فی رجال من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسوۃ

واذا لم تقرأ خلف فی رجال من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسوۃ

(جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۹۸)

اب دیکھیے امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والوں میں بھی صحابہ کرام کی ایک تعداد موجود ہے، لیکن کسی صحابی نے انھیں یہ نہیں کہا کہ تمھاری نماز نہیں ہوئی، کیونکہ تم نے قرأت خلف الامام نہیں کیا۔

اس وقت ہم مسائل کی تحقیق نہیں کر رہے ہیں، بتلانا صرف یہ ہے کہ سلف صالحین میں دونوں طرح کے عمل جاری تھے اور راہ عمل کی مختلف صورتیں موجود تھیں تاہم انھوں نے اسے مخالفت کا موضوع نہیں بنایا، نہ ہی کوئی علیحدہ گروہ بندی پیدا کی، اور نہ اس سے امت میں کوئی انتشار پیدا ہوا۔

حضرت امام نوویؒ (۶۷۶ھ) نے صحیح مسلم کی شرح میں بے شمار مقامات پر صحابہ کرام کے اختلاف کو بیان کیا اور تابعین سے مختلف راہ عمل کی صورتیں نقل کیں ہیں اور فرمایا کہ یہ فلاں فلاں صحابہ کا مذہب ہے اور یہ فلاں فلاں کا۔ تابعین میں یہ مذہب فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین نے فروعی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کو کبھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ سب نے اسے وسعت عمل پر محمول کیا۔

حافظ ابن تیمیہؒ کا بیان

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) لکھتے ہیں۔

فان السلف فعلوا ھذا وھذا وکان کلا الفعلین مشہوراً بینھم کانوا یصلون علی الجنازۃ بقرأۃ وبغیر قرأۃ کما کانوا یصلون تارۃ بالجھر بالبسملۃ وتارۃ بغیر جھر وتارۃ باستفتاح وتارۃ بغیر استفتاح وتارۃ برفع الیدین فی المواطن الثلاثۃ وتارۃ بغیر رفع وتارۃ یسلمون تسلیمتین وتارۃ تسلیمۃ واحدۃ وتارۃ یقرأون خلف الامام بالسر وتارۃ لایقرأون وتارۃ یکبرون علی الجنازۃ سبعا وتارۃ

خمسًا وتارةً اربعًا كان فيهم من يفعل هذا وفيهم من يحمل هذا كل هذا ثابت عن الصحابة (ماخوذ از الانصاف لرفع الاختلاف ملا مصنفہ مولانا عبدالحق سیالکوٹی مطبوعہ ۱۹۱۰)

ترجمہ:- سلف صالحین نے دونوں طرح عمل کیا ہے اور دونوں فعل ان میں مشہور و معروف رہے ہیں، بعض سلف نماز جنازہ میں قرأت کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے، جیسے کبھی بسم اللہ نماز میں اونچی پڑھ لیتے تھے اور کبھی بسم اللہ بغیر جہر کے پڑھتے تھے، کبھی افتتاح والی دعا پڑھ لیتے اور کبھی نہ پڑھتے، کبھی رکوع کو جاتے، رکوع سے اٹھتے اور تیسری رکعت شروع کرتے وقت رفع یدین کر لیا اور کبھی ان تینوں موقعوں پر رفع یدین نہ کرتے، نماز پوری ہونے پر کبھی دونوں طرف سلام پھیرتے کبھی ایک طرف، کبھی امام کے پیچھے قرأت کر لیتے اور کبھی نہ کرتے، نماز جنازہ پر کبھی سات تکبیریں کہتے کبھی پانچ اور کبھی چار، سلف میں ان میں سے ہر طریقے پر عمل کرنے والے تھے، اور یہ سب اقسام عمل صحابہ سے ثابت ہیں (ماخوذ از آثار الحدیث جلد ۱ ص ۹۳ از حضرت علامہ خالد محمود صاحب مدظلہ)

امام شعرانی کا بیان

حضرت علامہ سید عبدالوہاب شعرانی (۹۷۶ھ) ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بعض صحابہ اور تابعین کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ مٹی سے استنجاء جائز نہیں، حالانکہ بعض صحابہؓ نے اس کو جائز کہا ہے" (میزان کبریٰ جلد ۱ ص ۲۰ ترجمہ)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ جو شخص جنابت کے غسل میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا چھوڑ دے تو وہ نماز کا اعادہ کرے، حالانکہ حضرت حسن کا یہ قول ہے کہ اعادہ نہ کرے (ایضاً ص ۲۱)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

تیمم کرنے والا وضو کرنے والوں کا امام نہ بنے، حضرت علی المرتضیٰؓ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اسے مکروہ سمجھتے تھے، حالانکہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے تیمم کر کے صحابہ کی ایک جماعت کو نماز پڑھائی حضرت سعید بن جبیر، حضرت حسن، حضرت عطاء، حضرت زہری اس کے جواز کے قائل ہیں (ایضاً ص ۲۱۳)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا بیان

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ

(۷) اس میں صحابۂ کرام کے مابین اختلاف مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ،

وقد كان في الصحابة والتابعين ومن بعدهم من يقرأ البسملة ومنهم من لا يقرأها ومنهم من يجهر بها ومنهم لا يجهر بها وكان منهم من يقنت في الفجر ومنهم من يتوضأ من الحجامة والرعاف والقيء ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ من مس الذكر ومس النساء بشهوة ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ مما مسته النار ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ من اكل لحم الابل ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومع هذا فكان بعضهم يصلي خلف بعض۔ (حجة الله البالغة جلد ۱ ص ۳۸۸)

صحابہ اور تابعین میں اور ان کے بعد زمانہ میں بعض ایسے تھے جو نماز میں بسم اللہ جہراً پڑھتے تھے اور بعض جہراً نہیں پڑھتے تھے، بعض نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھتے تھے اور بعض نہیں پڑھتے تھے بعض نکسیر پھوٹنے سے، پچھنے لگانے اور قے کرنے کی وجہ سے وضو کرتے تھے، اور بعض نہیں کرتے تھے اور اس کو ناقض وضو نہیں سمجھتے تھے، بعض ذکر کو چھونے اور عورتوں کو شہوت سے ہاتھ لگانے کو ناقض وضو سمجھ کر وضو کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے، بعض آگ سے پکی ہوئی چیزوں کے کھانے کے بعد وضو کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے، بعض اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ ان سب اختلافات کے باوجود ہر شخص ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ اس سے قبل یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ۔

مسلم نے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ غسل کے وقت عورتوں کو حکم کیا کرتے تھے کہ سر کے بالوں کو کھول لیا کریں، حضرت عائشہؓ نے یہ سنکر فرمایا عبداللہ بن عمر سے تعجب ہے عورتوں کو وہ سر کے بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں ان کو سر منڈوانے کا کیوں حکم نہیں دیتے یقیناً میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے نہایا کرتے تھے اور میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتی تھی کہ سر پر تین بار پانی بہالیا کرتی تھی (ایضاً ص ۳۲۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کرنے کے بعد مقام ابطح میں قیام فرمایا اس سے حضرت

ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ ابن عمر کا مذہب یہ ہے کہ ثواب کے طور پر آپ نے قیام فرمایا تھا اس لئے مقام ابطح میں قیام کرنا ان کے نزدیک حج کی سنتوں میں سے ہے جبکہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ محض اتفاقی امر تھا حج کی سنتوں میں یہاں ٹھہرنا داخل نہیں ہے۔

طواف میں رمل کرنے کی بابت آپ لکھتے ہیں کہ:

جمہور صحابہ رض کا مذہب یہ ہے کہ طواف میں رمل کرنا سنت ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس رض کا مذہب یہ ہے کہ اسے چونکہ حضور ﷺ نے ایک امر عارض کی وجہ سے کیا تھا اور وہ یہ کہ مشرکین نے کہا تھا کہ مدینہ کے بخار نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ہے اس لئے یہ محض اتفاقی تھا سنت نہیں ہے (ایضاً ۳۴۸)

حضرت شیخ الحدیث مہاجر مدنی کا بیان

شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ مسائل میں صحابہ کرام کے باہمی اختلاف کی چند مثالیں بیان فرماتے ہیں کہ:

شرمگاہ چھونے سے حضرت عمر رض کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت علی رض اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رض کے نزدیک نہیں ٹوٹتا، سمندر کے پانی سے وضو کرنا جمہور صحابہ رض کے نزدیک جائز ہے، حضرت ابن عمر رض کے نزدیک مکروہ ہے، جمعہ کے دن خوشبو کا استعمال جمہور صحابہ کے نزدیک مستحب ہے، حضرت ابو ہریرہ رض کے نزدیک واجب ہے، حضرت عمر رض اور ابن عمر رض کے نزدیک زندوں کے رونے سے مردے کو عذاب ہوتا ہے حضرت عائشہ رض سختی سے اس کا انکار کرتی ہیں .... حضرت ابن عمر رض کا مذہب یہ ہے کہ تیمم میں کہنیوں تک ہاتھ پھیرنا ضروری ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مذہب ہے کہ پہنچوں تک کافی ہے، حضرت ابن عمر رض حضرت انس رض کا مذہب ہے کہ نمازی کے سامنے سے گدھا گذر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے، حضرت عثمان رض اور حضرت علی رض کہتے ہیں کہ نہیں ٹوٹتی

(الاعتدال فی مراتب الرجال ۳۳)

اس وقت ان مسائل پر گفتگو مقصود نہیں، بتلانا صرف یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رض میں فروعات میں اختلاف رہا، اور تمام صحابہ اپنے قول و عمل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی ترجمان تھے۔ صحابہ کرام کے

فروعی اختلافات کو گمراہی قرار دینا اور اسے باطل بتلانا صرف اہل باطل و اہل ضلال ہی کا نصیب ہوگا، اہل حق اور اہل سنت صحابہ کرام کے فروعی اختلاف کو وسعت عمل پر محمول کرتے ہیں اسے حق و باطل کا معرکہ نہیں قرار دیتے۔

امام مالک رح کا ارشاد خلیفہ ہارون رشید نے جب امام مالک رح سے کہا کہ موطا (امام مالک) کو خانہ کعبہ میں لٹکایا جائے اور اس کے مطابق لوگ عمل کریں تاکہ ایک ہی طریقہ رائج ہو جائے، امام مالک رح نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

لا تفعل فان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اختلفوا فی الفروع وتفرقوا فی البلدان وکل مصیب (عقود الجمان ص۱۰)

امام مالک رح نے فرمایا کہ ایسا نہ کیا جائے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا فروعات میں اختلاف رہا ہے اور صحابہ مختلف شہروں میں گئے ہیں ان میں سے ہر ایک راستی پر ہے۔

حضرات صحابہ کرام کے باہمی اختلاف کی اس کثرت کے باوجود آپ نے کبھی یہ نہیں پڑھا اور سنا ہوگا کہ کسی صحابی نے کسی دوسرے صحابی کو اس لئے مخالف رسول کہا کہ وہ صحابی قرأت خلف الامام کا قائل نہ تھا۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ تحت السرہ ہاتھ باندھنے والے حدیث کے منکر ہیں، کبھی یہ نہیں کہا کہ رکوع کے وقت رفع یدین نہ کرنے والے حدیث کے بجائے اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں علامہ ابن عبدالبر رح (۴۶۳ھ) سلف کے باہمی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے، یحییٰ بن سعید رح کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ ایک شخص غیر منصوص احکام میں کسی چیز کو جائز کہتے ہیں تو دوسرے اسے ناجائز کہتے ہیں لیکن۔

فلا یری المحرم ان المحل ھلک لتحلیله ولا یری المحل ان المحرم ھلک لتحریمه

(جامع بیان العلم جلد ۲ ص۹۰)

ترجمہ:۔ کسی چیز کو حرام ٹھہرانے والا یہ نہ سمجھتا تھا کہ جس نے اسے حلال قرار دیا ہے وہ اسے حلال کہنے کے باعث ہلاک ہوا۔ اور نہ کسی چیز کو حلال قرار دینے والا یہ سمجھتا تھا کہ جس نے اسے حرام قرار دیا ہے وہ اسے حرام کہنے کے باعث ہلاک ہوگیا۔

حضرت امام سیوطی رح (۹۱۱ھ) بھی فرماتے ہیں

ہم نے آج تک یہ نہیں سنا کہ کسی صحابی کو اپنے مخالف القول صحابی سے مخاصمت یا دشمنی کی نوبت آئی ہو اور ایک نے دوسرے کو مخطی یا قصور وار بتلایا ہو (میزان للشعرانی جلد۱ ص۱۱)

حضرت علامہ محمد بن یوسف صالحی دمشقی (۹۴۲ھ) لکھتے ہیں۔

وقد وقع الاختلاف فی الفروع بین الصحابة رضی اللہ عنھم وھم خیر الامة فما خاصم احد منھم احداً ولا عادیٰ احد احداً ولا نسب احد احداً الیٰ خطأ ولا قصور (عقود الجمان ص۱۰)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین فروعات میں اختلاف واقع ہوا درانحالیکہ یہ حضرات خیر الامم تھے لیکن ان میں سے کسی کی کسی کے ساتھ مخاصمت اور دشمنی نہیں پیدا ہوئی اور نہ ہی ایک نے دوسرے کو غلط کار ٹھہرایا۔

صحابہ کا فروعات میں اختلاف رحمت ہے

ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص جامع ترمذی کا بغور مطالعہ کرے گا تو اس پر یہ بات کھل جائے گی کہ حضرات صحابہ نے کئی مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اعمال کو وسعت عمل کے دائرے میں رکھکر اپنی اپنی صواب دید اور اپنے اجتہاد کے مطابق کسی عمل کو ترجیح دی اور ان میں سے ہر ایک کا عمل اپنی جگہ حق ہے اور یہ اختلاف امتی رحمة ہی کی ایک تصویر تھی، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث روایت کرتے ہیں جس میں یہ بھی آپ نے ارشاد فرمایا۔

اختلاف اصحابی لکم رحمة، میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے (جزیل المواہب فی اختلاف المذاہب للسیوطی" ماخوذ از عقود الجمان، ص۱۱)

فقیہ مدینہ حضرت قاسم بن محمد (۱۰۷ھ) فرماتے ہیں کان اختلاف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمة للناس، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اختلاف لوگوں کے لئے رحمت کا باعث تھا۔

آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ

لقد نفع اللہ باختلاف اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اعمالھم العمل

العامل بعمل رجل منهم الا رأى انه فى سعة ورأى انه خير منه قد عمله -

(جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۸۰)

اللہ نے صحابہ کے فروعات کے اختلافات سے امت کو بڑا فائدہ پہونچایا ہے، جب کوئی آدمی کسی صحابی کے عمل کی پیروی کرتا ہے تو اس خیال سے مطمئن رہتا ہے کہ اس میں وسعت ہے اور یہ کہ یہ عمل مجھ سے بہتر آدمی کا ہے۔

مجدد اول حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۱۰۱ھ) کا ارشاد ملاحظہ فرمائیے۔

ما احب ان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يختلفوا لانه لو كانوا قولاً واحداً كان الناس فى ضيق وانهم ائمة يقتدىٰ بهم فلو اخذ رجل بقول احدهم كان فى سعة (جامع بيان العلم لابن عبدالبر جلد ۲ ص ۸۰)

(ترجمہ:۔ میں کبھی پسند نہیں کرتا کہ صحابہ میں اختلاف نہ ہوا ہوتا کیونکہ اگر ہر مسئلے میں ایک ہی قول ہوتا تو لوگوں کو بہت تکلیف ہوجاتی بے شک صحابہ ایسے امام ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے، پس اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کے قول کو لیا تو اس میں وسعت تھی۔

بلکہ آپ نے اپنی سلطنت میں یہ احکام بھیج دیئے کہ ہر قوم اس کے موافق عمل کرے جو وہاں کے علماء کا فتویٰ ہو (الاعتدال ص ۱۹۸)

غیر مقلد علماء کا اعتراف

یہ بات ہم ہی نہیں کہتے کہ صحابۂ کرام کا فروعات میں اختلاف رہا اور اس اختلاف کے باوجود کبھی ایک دوسرے کے درمیان مخالفت اور مخاصمت کی نوبت نہیں آئی تھی بلکہ غیر مقلد علماء بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے

"یہ اختلاف سلف صالح سے چلا آیا ہے اور صحابۂ کرام اور مجتہدین عظام میں فروعی مسائل میں اختلاف رہا ہے لیکن باوجود اختلاف کے ان حضرات میں بغض و عناد اور فساد نہ تھا ایک دوسرے کو خارج اہل سنت والجماعت نہ سمجھتا تھا اور آپس میں محبت و اتحاد تھا۔ .... جن مسائل مختلف فیہ میں اختلاف ہے وہ یہ ہیں، نجاست آب، آمین بالجہر فی الصلوٰۃ، رفع الیدین فی الصلوٰۃ، رفع السبابہ الخ (ترجمان وہابیہ ص ۱)

بعض غیر مقلدوں کا غلط بیان

ہمیں افسوس ہے کہ اب غیر مقلدوں کے بعض علماء

نے ان اختلافات کو راجح مرجوح، افضل مفضول کے بجائے حق و باطل کا عنوان دے دیا ہے اور دوسرے عمل کو وحشت عمل قرار دے کر اپنے مخالفین کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے، وہ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ صحابۂ کرام میں ہر راہ عمل کی مختلف صورتیں تھیں، اور صحابۂ کرام ہمیشہ حق ہی کے ساتھ تھے اور ان سب کے اعمال حق ہی کے دائرے میں تھے، باطل کا گذر وہاں کہاں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں معیار حق ٹھہرایا ہے، آسمان ہدایت کے ستارے قرار دیکر ان کے اتباع کی تاکید فرمائی ہے، اگر صحابۂ کرام میں ہی حق و باطل کے معرکے دکھائیں جائیں تو پھر اس دین کا خدا ہی حافظ ہے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ اگر ان کی ایک جانب صحیح ہے تو دوسری یقیناً غلط مثلاً قرأت خلف الامام میں حنفی مذہب اگر صحیح ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنا چاہئے تو شافعیہ کا مذہب غلط ہے کہ ضرور پڑھنا چاہئے، اب جو ہم ان دونوں باتوں کو صحیح سمجھیں تو اصول مذکورہ کے خلاف حق و باطل کی حقیقت کو ہم نے واقعے سے ہٹا کر اپنے خیالات کے تابع کر دیا جو کسی طرح جائز نہیں، پس یا تو اصول مذکورہ کو چھوڑیئے یا اس خیال کو ترک کیجئے کہ سارے مذہب حق پر ہیں (فتاوی ثنائیہ جلد ۱ ص ۲۶۴)

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم کا ان اختلافات کو حق و باطل کا معرکہ قرار دینا کسی صورت میں درست نہیں ہے، آپ ہی سوچیں کہ جن صحابۂ کرام نے فاتحہ خلف الامام کے بغیر نماز درست بتلائی کیا ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حق پر نہ تھے ؟ اگر ان اختلافات کے باوجود انھیں حق پر سمجھا جاتا ہے اور یقیناً وہ حق پر ہی تھے تو پھر انہی اختلافات کے ائمہ کرام میں بھی راہ عمل کا اختلاف رہا تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مذاہب اربعہ باطل پر تھے انا للہ وانا الیہ راجعون

سو صحابۂ کرام کا باہمی اختلاف حق و باطل کا اختلاف نہیں تھا بلکہ اس لئے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں وسعت تھی، کسی صحابیؓ نے آپ کے ایک عمل کو دیکھا، سو انھوں نے اسی عمل کو آگے بیان کیا اور اس پر عمل کیا، جب کہ دوسرے صحابی نے آپ سے اس کے برعکس ایک عمل کو پایا تو انھوں نے اس پر عمل کیا۔ پھر ان میں سے بعض اصحاب وہ ہیں جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے عمل کی خبر ہو گئی، انہوں نے اسی عمل کو جسے پہلے آپ سے دیکھ چکے تھے اپنا لیا مگر دوسرے حضرات نے دوسرے عمل کو بھی دیکھا اور اپنا نقشہ عمل ترتیب دیا، یاد رکھئے صحابہ کرام کے اختلاف کو حق و باطل کا اختلاف کہنا

از:- محمد بدیع الزماں صاحب، ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ہارون نگر، فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف
پٹنہ ۸۰۱۵۰۵

اقبال کے نزدیک عشق ہی جملہ کمالات کا منبع اور تمام فیوض و برکات کا سرچشمہ ہے، کیونکہ بقول ان کے: "عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں"۔ ان کے فلسفہ میں عشق کائنات کے جملہ اقسام کی حرکت اور ان کے عمل کی روح رواں ہے اور اسی کے دم قدم سے زندگی کی ساری رنگینی ہے، مٹی کے پتلے میں جو تابناکی، چمک دمک، روشنی اور روحانیت نظر آتی ہے یہ سب عشق ہی کا کرشمہ ہے، یہ قلندر یا فقیر یا مردِ مومن اور انسانِ کامل کی تخلیقی فعلیت کا محرک ہے۔ "بال جبریل" کی نظم "مسجد قرطبہ" کے دوسرے بند میں اِس نکتہ کو اقبال اس طرح ذہن نشین کراتے ہیں۔ ؎

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گُل تابناک ÷ عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

"کاس الکرام" سے مے نوشی کا وہ پیالہ مراد ہے جس سے دوسرے بھی سیراب ہوتے ہیں، اقبال کی یہ ترکیب عربی کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

شَرِبْنَا وَصَبَبْنَا عَلَى الْاَرْضِ جُرْعَةً ÷ فَلِلْاَرْضِ مِنْ كَاْسِ الْكِرَامِ نَصِيْبٌ

کاس الکرام کے لغوی معنی فراخدلی اور سخی کے ہیں اس لئے اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے شراب پی تو اس کا ایک گھونٹ زمین پر بھی بہادیا، پس ثابت ہوا کہ سخی کے پیالہ میں زمین یعنی دوسروں کا بھی حصہ ہے، اقبال کہتے ہیں کہ عشق وہ شراب ہے جس کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے، اور یہ وہ پیالہ ہے جس سے ہر شخص کو فیض پہونچتا ہے، یعنی عاشق کا وجود دنیا والوں کے حق میں باعثِ رحمت ہوتا ہے۔

اس عشق کے جوش کی بدولت مذہب میں انہماک، خلوص اور پختگی آتی ہے اور قلب و نظر کو مسلمانی ملتی ہے ورنہ زبان سے لا الٰہ کا اقرار بے معنی ہے کیونکہ اگر مذہب میں انہماک، خلوص اور پختگی

نہیں آئی تو مذہب اپنی تمام کاملیت کے باوجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے، انہی نکتوں کو اقبال نے بطور کلیہ "بال جبریل" کی نظم "ذوق و شوق" کے دوسرے بند کے درج ذیل شعر میں اس طرح پیش کیا ہے ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق ÷ عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

اس شعر میں اقبال اس امت محمدیؐ کو جس عشق کی تلقین کرتے ہیں وہ کوئی ان کی ایجاد نہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ انھوں نے پورے قرآن کی روح کو ان دو مصرعوں میں لاکر رکھ دیا ہے کیونکہ شرع اور دین کو صرف قرآنی معنوں ہی میں سمجھا جاسکتا ہے، اس شعر کے پہلے مصرعہ کے اس فقرے "مرشدِ اولیں ہے عشق" کو گرفت میں لانے کے لئے اگر ہم سورۂ آل عمران ۳ کی درج ذیل آیات ۳۱ اور ۳۲ کو پیش نظر رکھیں تو دوسرے مصرعہ کے نکتے خود بخود واضح ہوجاتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے۔

"اے نبی لوگوں سے کہہ دو کہ: اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمھاری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔" ان سے کہو کہ: اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرو۔ پھر اگر وہ تمھاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اسکے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔"

اس شعر میں شریعت سے ارکانِ اسلام اور دین سے ضوابط و عقائدِ اسلام کی بجاآوری اور اُن عقائد پر ایمانِ محکم رکھنا مراد ہے، جن کی طرف رغبت اور گرویدگی صرف عشقِ رسولؐ میں گرویدگی ہی پیدا کرسکتی ہے، اس عشق کی بدولت اس میں جہاد کا جذبہ اور یقین کا رنگ پیدا ہوسکتا ہے، بالفاظِ دیگر اگر مسلمان کے اندر عشقِ رسولؐ نہ ہو تو شریعت اور دین دونوں کی حیثیت باوجود اپنی ساری کاملیت کے چند تصورات کے مجموعے کے اور کچھ نہیں رہ جائے گی، کیونکہ یہ امر مسلّم ہے کہ تصورات اور توہمات انسان کو عمل کی جانب راغب نہیں کرسکتے، قرآن کی رو سے عشقِ رسولؐ سے بیگانگی اسلام کی روح سے بیگانگی کے مترادف ہے اور بقول اقبال جیسا انھوں نے "بال جبریل" کی مثنوی "ساقی نامہ" کے دوسرے بند میں کہا ہے کہ اسی بیگانگی کی بنا پر امت خرافات میں پڑکر راکھ کا ڈھیر ہوگئی ہے ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ÷ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبال نے "ذوق وشوق" کے مندرج بالا زیر تجزیہ شعر میں عشق کا جو کلیہ مرتب کیا ہے اس کا اطلاق مثال کے طور پر، انھوں نے اس کے بعد ہی کے شعر میں اس طرح کیا ہے کہ ؎

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

پہلے مصرعہ میں اقبال نے اگر حضرت ابراہیمؑ کے معاملہ میں سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۶۵ کے "اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہ" کے نکتہ کو ذہن نشین کرلیا ہے تو عشقِ رسول میں گرویدگی ہی کا کرشمہ میدان کربلا میں حضرت حسینؓ کے صبر ورضا کی صورت میں ظاہر ہوا، سورۃ النحل ۱۶ کی آیت ۹۶ اور سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت میں عشق کے انھیں ثمرات کو بیان کیا گیا ہے، اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں بدر وحنین سے وہ مخصوص غزوات مراد نہیں ہیں جو علی الترتیب ۲ھ اور ۸ھ میں رسول اللہؐ کی قیادت میں لڑے گئے بلکہ معرکۂ وجود میں ان سے کامیابی مراد ہے، اور معرکۂ وجود سے حق وباطل میں وہ آویزش مراد ہے جو ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہے۔

عشق اقبال کے نزدیک ایک بنیادی جذبۂ حیات ہے انسانی خودی حیات کی اعلیٰ سطحوں پر خودیٔ مطلق سے ملنے اور قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتی ہے، اس کا یہ اضطراب، یہ تڑپ اور یہ بے چینی ہی جذبۂ عشق ہے، خودی کا سوز وساز اور کیف ومستی ہی اسے پائیدار بناتی ہے جب خودی محبت سے مستحکم ہوجاتی ہے تو اپنی اس طاقت سے کائنات پر حکمرانی کرتی ہے۔

اقبال کے فلسفہ میں انسان میں دو قوتیں ہیں علم اور عشق، یہ دونوں ضروری ہیں لیکن عشق کو علم پر تفوق حاصل ہے، عشق ایک ایسی طاقت ہے جو عناصر پر حکمرانی کرتی ہے، زمان وزمین، مکان ومکین سب عشق ہی کی بدولت اپنی اپنی جگہ قائم ہیں، عشق سے ظن وتخمین کا ازالہ ہوکر یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ عشق کے ان مضمرات کو اقبال نے "ضرب کلیم" کی نظم "علم وعشق" میں مختلف طریقوں سے ذہن نشین کرایا ہے، اور آخری بند میں لب لباب یہ نکالا ہے کہ

علم ہے ابن الکتاب ٭ عشق ہے اُمّ الکتاب

دین کی تکمیل بغیر عشق کے نہیں ہوسکتی، حیات کا میکانکی تصور قرب الٰہی کا باعث نہیں بن سکتا عشق وہ جذبہ ہے جس کے ذریعے "مرد مومن" غم حیات اور مشکلات کے احساس کو کند کرکے ہر گھڑی

تازہ دم رہتا ہے۔

اقبال کے نزدیک عشق شریعتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا محافظ اور شارح اور مجاہدوں کے فوج کا سردار ہے کیونکہ یہ عشق ہی کا کرشمہ ہے جو مومنوں کے دل میں جذبۂ جہاد پیدا کرتا ہے۔ "مسجد قرطبہ" کے دوسرے بند میں اقبال کہتے ہیں۔ ؎

عشق فقیہ حرم عشق امیرِ جنود ٭ عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

مردِ مومن خدا تک پہونچنے کی سعی سے زیادہ خود تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے اور عشق اس کی خودی کو خدا کا راستہ بتاتا ہے، یہ تمام دھارے ایک ساتھ مل کر بہتے ہیں، اسے اگر بھروسا ہوتا ہے تو صرف اپنی ذات پر، اپنی انانیت پر، اپنی قوتِ بازو پر۔ اگر وہ عاشق ہوتا ہے تو محض اپنے ہی جلال اور جمال کا، گرچہ اسے اپنی قاہری عزیز ہوتی ہے، خودی سے قاہری تو پیدا ہو جاتی ہے مگر وہ دلبری سے خالی ہوتی ہے، اس میں دلبری پیدا کرنے کے لئے عشق کی ضرورت ہے، خودی کے دو واضح پہلوؤں یعنی نارِ خودی اور نورِ خودی میں اسی وقت ہم آہنگی ممکن ہے جب قاہری اور دلبری، جلال وجمال کو ایک ہی ظرف حیات میں شیر وشکر کر دیا جائے۔ جلال شخصیت کا ایک پہلو ہے اور جمال دوسرا، مردِ مومن چونکہ صاحبِ عشق ہوتا ہے اسلئے وہ جلال وجمال دونوں کا جامع ہوتا ہے خودی عشق کے بغیر ایک اندھی قوت ہے۔ "انا" کو عشق ہی سے جلا ملتی ہے اور اسی کے فیض سے مردِ مومن کے اندر سوز وگداز کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں، اس نکتہ کی تشریح اقبال نے "اسرارِ خودی" میں اس طرح کی ہے۔

"انا" کا استحکام عشق سے ہوتا ہے یہ لفظ (اس موقع پر) بہت ہی وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، اس کے معنی ہیں جذب کر لینے اور اپنے آپ میں سمو لینے کی خواہش اس کی سب سے اعلیٰ صورت قدروں اور نصب العینوں کی تخلیق اور ان کو ایک واقعیت بنا لینے کی کوشش ہے، عشق، عاشق اور معشوق دونوں کو منفرد بنا دیتا ہے، سب سے زیادہ یکتا شخصیت کی واقعیت کو مان لینے کی کوشش طالب کو منفرد بنا دیتی ہے۔ انا کے استحکام کے لئے ہمیں "عشق" یعنی جذب کر لینے والے عمل کی طاقت کو نشوونما دینا چاہئے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت میں جذب کر لینے والے عمل کا سبق موجود ہے اور خصوصاً ایک مسلمان کے لئے۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں اقبال نے عشق کو "انا" کے استحکام کا ایک وسیلہ بتایا ہے جو اپنے اندر جذب کی لامحدود امکانی صورتیں پوشیدہ رکھتا ہے، قدروں اور نصب العینوں کی تخلیق عشق ہی کے ذریعہ ممکن ہے، حقیقت کا عرفان عشق کے بغیر نہیں ہوسکتا، عقل کے "تخمین وظن" سے اگر سیدنا حضرت ابراہیم نہ نکلتے تو پھر آتش نمرود کے جہنم زار سے گل بداماں واپس کیوں کر آتے؟ عشق ہی وہ صفت ہے جو جان جوکھوں میں ڈالنے کے عزائم پیدا کرتا ہے۔

عشق کی ایک صفت اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ یہ زمانِ مسلسل سے بالاتر اور حیات بستہ سے آزاد ہوتا ہے، اس صفت کو انھوں نے "مسجدِ قرطبہ" کے دوسرے بند کے ان اشعار میں اس طرح ذہن نشین کرایا ہے۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو　　عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا　　اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

اقبال کے نزدیک عشق کوئی مادی یا دُنیوی شئی نہیں بلکہ نہایت پاکیزہ اور روحانی بلکہ آسمانی جوہر ہے، اس کی اس عظمت و رفعت، پاکیزگی، طہارت اور روحانیت کے اظہار کے لئے اقبال نے "مسجد قرطبہ" کے دوسرے بند کے درج ذیل شعر میں خدا کے رسول کو "دلِ مصطفٰی" اور خدا کے کلام کو "دمِ جبرئیل" سے تعبیر کرتے ہوئے عشقِ رسول کی ماہیت اس طرح بیان فرمائی ہے جس سے بہتر تعبیر شاید دوسرے سے ممکن نہ ہو۔

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفٰی　؎　عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

اقبال کے فلسفۂ عشق میں عشقِ رسولؐ کی بدولت ہی انسان کے اندر صفاتِ رسول کا رنگ پیدا ہوسکتا ہے، بلکہ اتباع اگر کامل ہو تو انسان خود کامل ہوجاتا ہے، جب کہ اس کے برعکس اگر آپؐ کی غلامی اختیار نہ کی جائے تو وہ "بولہب" کے مترادف قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ بولہبی کو شرع و دین سے کوئی رابطہ یا سروکار نہیں ہوتا، یہ تقابلی جائزہ اقبال نے نظم "ذوق و شوق" کے آخری بند میں پیش کیا ہے

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا　؎　عشق تمام مصطفٰی، عقل تمام بولہب

عشق کی ان ساری صفات اور ماہیت کو اقبال صرف اشعار کا جامہ پہنا کر نہیں رہ جاتے بلکہ

اس کے مختلف روپ اور اس کی فتوحات بھی بطور مثال پیش کرتے ہیں، اقبال کے یہاں عشق کے بہت سے روپ ہیں یعنی عاشقوں کے متعدد انواع و اقسام ہیں، ان کے کئی روپ مثال کے طور پر "بالِ جبریل" کی درجِ ذیل رباعیوں میں پیش کئے گئے ہیں جن کی تفصیلات سے روایات اور اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق ؛ کبھی شاہ شہاں نوشیروان عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش ؛ کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق
کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق ؛ کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر ؛ کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اقبال کے فلسفہ میں ایک مرد مومن لَا اِلٰہَ کا بھرپور یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ دل جو دُنیا کا عظیم ترین بتکدہ ہے، کو لَا کی لاٹھی سے منہدم کر کے اِلَّا اللّٰہ کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے، اسی "لَا" اور "اِلَّا اللّٰہ" کے بین بین عشق ابھرتا اور "محمدؐ" تک پہونچ کر اپنی منزل پا لیتا ہے، جب عاشق اس منزل پر پہونچ جاتا ہے تو جلال اور جمال کی شاہین اپنے مرتبۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے۔ عشق کے جلال اور جمال کے نکتوں کو اقبال نے "بالِ جبریل" کی ایک درجِ ذیل رباعی میں اس طرح پیش کیا ہے۔

جمالِ عشق و مستی نَے نوازی ؛ جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ ؛ زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

اس رُباعی کے تیسرے مصرعہ میں اگر اقبال نے عشق و مستی کے کمال میں حضرت علیؓ کو مثالی طور پر پیش کیا ہے تو اس کے تقابل میں اس عشق و مستی کا زوال حرفِ رازی میں بتایا ہے امام فخرالدین رازی (۵۴۳-۶۰۶ھ) منطق، فلسفہ اور کلام تینوں علوم میں اپنے زمانہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، اگرچہ اقبال ان کے تبحر علمی کے قائل تھے اور اس کا اعتراف بھی انھوں نے اپنے کلام میں کیا ہے مگر وہ ان کے فلسفہ سے متاثر نہ تھے، اس لئے کہ ان کی تصانیف سے "ضعفِ یقین" کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے نزدیک رازی کے مطالعہ سے پیچ و تاب کی کیفیت تو پیدا ہو سکتی ہے مگر سوز و گداز کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا، چنانچہ "بالِ جبریل" کی غزل

(دوم) میں اقبال رازی سے متاثر نہ ہوتے ہوئے درج ذیل شعر میں یہ وجہ بتاتے ہیں ؎

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا ٭ غریب گرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

اقبال کے عشق کی اس وقعت و عظمت کا تصور صوفیائے متقدمین کے یہاں بھی ملتا ہے اور رومی تو اس معاملے میں ان کے استاذ اور پیر و مرشد ہی ہیں، لیکن اقبال نے جدید تقاضوں کا لحاظ کرکے اسے بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اقبال کا مدت العمر یہ وظیفہ رہا ہے کہ عشق رسول میں قیام دکھایا جائے یعنی اسباب و عوامل اور نتائج و عواقب اور خوف و رجا کے سلسلہ میں اس طرح عمل پیرا ہوا جائے جس طرح نبی کریمؐ نے عمل پیرا ہوکر اتمام حجت فرمادی ہے، جب یہ احساس دل کی گہرائیوں میں قوی ہوجائے تو اس مردِ کامل سے کاملیت کے طلبگار کو عشق ہوجانا ضروری ہے اور قلب کی گہرائیوں میں آپ سے محبت کا احساس پانا ہی ایمان کی تکمیل اور یہی معراجِ انسانیت ہے ورنہ تمام تگ و دو بولہبی ہے، اگر عشق نہ ہوتا تو زندگی کی ساز سے کوئی نغمہ برآمد نہ ہوتا۔ ولولۂ حیات کچھ کرلینے کی تمنا، بے خوف و خطر ہوکر اپنے کام میں مصروف رہنا، انسانیت کا احترام اور اپنے مسلک کی بقا کیلئے تن، من، دھن کی بازی لگادینا اور بے نیازی کے عالم میں کسی کو خاطر میں نہ لانا اور عمل میں دوامی مصروفیت یہ تمام اسی عشق کے جذبے کی بدولت میسر آتے ہیں، ان نکتوں کو اقبال نے "مسجد قرطبہ" کے دوسرے بند میں اس طرح سمویا ہے ؎

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اب اس کو کیا کہئے کہ اگر اقبال نے مختلف طریقوں سے اپنے کلام میں اس عشق کی تلقین کی ہے جو شرائع اسلامیہ کے اصل الاصول ہیں اور جن پر پورے شرع و دین کی عمارت کھڑی کی گئی ہے وہیں دوسری طرف ہم میں جناب کلیم الدین احمد صاحب بھی ہیں، جنھوں نے اقبال کے اس تصورِ عشق کا اپنی کتاب "اقبال، ایک مطالعہ" میں مذاق اڑایا ہے، اس موضوع پر موصوف کا ذکر اس لئے لانا ضروری ہے کیونکہ کچھ لوگ انھیں اردو ادب کے چوٹی کے ناقدوں میں شمار کرتے ہیں اور دوسرے بدقسمتی سے یہ کتاب بہار کی سبھی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے جو کتاب

کفر و الحاد سے بھری پڑی ہے۔ موصوف کی پھبتیاں ملاحظہ ہوں جو انھوں نے ملٹن، دانتے گوئٹے، شیلی اور شیکسپیر سے تقابلی جائزہ پیش کر کے لکھا ہے۔

" اقبال عشق کی باتیں کرتے ہیں لیکن یہ باتیں ہی باتیں ہیں جو بظاہر دیکھنے میں بہت تہ دار معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ محض دل خوش کن باتیں ہیں، اصل بات یہ ہے کہ اقبال میں جو نظام خیالات ہے وہ بالکل ARBITRARY ہے .... مسلمان جو سراپا عشق تھا اب (اقبال کے نزدیک) خاک کا ایک ڈھیر ہے، پھر وہ سراپا عشق ہو جائے اس معجزہ کے لئے ضروری ہے کہ "ساقی" اقبال کو عشق کے پر لگا کر اڑائے یا ان کی خاک کو جگنو بنا کر اڑا لے۔ ان کی نظموں میں عشق کا ذکر بار بار آتا ہے یہ ان کا PET THEME ہے اور انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ تکرار ناگوار ہوتی یا ہو سکتی ہے .... پھر ہر جگہ عشق عشق چلانے سے کیا فائدہ ہے، اقبال عشق عشق کا نعرہ لگا کر جذبات کو بھڑکانا چاہتے ہیں "

اقبال اور جناب کلیم الدین احمد دونوں کو ڈگریاں کیمبرج یونیورسٹی سے ملی تھیں بلکہ اقبال کو تو اور بہت ساری غیر ملکی ڈگریاں حاصل تھیں جو کلیم صاحب کے پاس نہ تھیں، مگر فرق دین کی رسی کو مضبوط پکڑنے کا ہے۔ شاید اقبال کے ذہن میں ایسا ہی کوئی "افرنگ زدہ" رہا ہو جس کے متعلق انھوں نے "ضرب کلیم" کی نظم "افرنگ زدہ" میں یہ کہا ہے ؎

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

(از جناب عبدالمالک ندوی صاحب، ریسرچ فیلو شعبۂ عربی (ایم اے) ، ایم ، یو علی گڑھ)

وہ علماء جن کی شخصیت مسلمانوں کی علمی تاریخ کی روشنی میں بڑی جامع سمجھی جاتی ہے ، جنھیں علوم وفنون میں عالمانہ بصیرت اور بالغ نظری حاصل تھی ، جنھوں نے بیشتر علوم وفنون پر مجتہدانہ کتابیں لکھی ہیں ، جن کی کتابوں کو عربی زبان وادب میں مصدر اور اساس کی حیثیت حاصل ہے ، ان میں مغنی اللبیب کے مصنف ابن ہشام[1] بھی ہیں جنھوں نے اپنی اس کتاب اور اس طرح کی دوسری تصنیفات کی بنا پر ابن خلدون کو اپنی شہرۂ آفاق مقدمہ میں " انحی من سیبویہ " کہنے پر مجبور کردیا علامہ بدرالدین دامینی نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ابن خلدون کا صاحب کتاب سے غیر معمولی تاثر کا اندازہ ہوتا ہے ، وہ لکھتے ہیں کہ " میں ایک دن اپنے شیخ قاضی القضاۃ ولی الدین ابن خلدون کی مجلس میں تھا اور وہ بڑی وارفتگی کے عالم میں ابن ہشام کی تعریف کر رہے تھے ، اتفاق سے اس مجلس میں ابن ہشام کے صاحبزادے شیخ محب الدین بھی موجود تھے ، ابن خلدون نے ان سے کہا کہ آج اگر سیبویہ زندہ ہوتے تو ان کے لئے تمھارے والد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا ، شیخ محب الدین نے جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ اگر میرے والد نے سیبویہ کی " الکتاب " کو سمجھ لیا ہے تو یہی ان کے لئے باعث شرف ہے[2]

---

[1] ان کی علمی وادبی شخصیت پر خاکسار کا مقالہ " علم نحو کا امام ابن ہشام " ماہنامہ دارالعلوم ماہ اگست ۱۹۹۱ء کے شمارے میں ملاحظہ کیجئے ۔ [2] شرح الامیر ۲/۲۶

ابن ہشام کثیر التصانیف علماء میں سے ہیں، کثرت تصنیف اور حسن تصنیف دونوں ان کی اہم خصوصیات ہیں، ان کی تصنیفات میں متعدد کتابیں اس کی مستحق ہیں کہ ان کا مفصل تعارف کرایا جائے اور ان کے مضامین اور فوائد کی تلخیص کی جائے لیکن اس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے ہم یہاں تعارف وتبصرہ کے لئے ان کی جلیل القدر تصنیف " مغنی اللبیب عن کتب الأعاریب " کا انتخاب کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کی تصنیفات میں علمی حیثیت سے یہ تصنیف اس کی مستحق ہے کہ اس کا مفصل تعارف اور تبصرہ پیش کیا جائے، یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، طہران میں سب سے پہلے ۱۲۷۴ھ میں اور پھر مصر سے ۱۳۰۵ھ، ۱۳۰۷ھ اور ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوئی، پھر شیخ محمد محی الدین عبد الحمید نے اس کتاب کو ایڈٹ کیا، دوبارہ مازن المبارک اور علی حمد اللہ نے سعید الافغانی کے زیر نگرانی اس کو ایڈٹ کیا اور ۱۳۹۴ھ میں بیروت سے زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی۔

جس چیز نے ابن ہشام کو اس کتاب کی تصنیف پر آمادہ کیا وہ ان کی کتاب " الاعراب عن قواعد الاعراب " کی غیر معمولی مقبولیت ہے جس کو ابن ہشام نے مغنی کے انداز پر پہلی مرتبہ ۷۴۹ھ میں مکہ مکرمہ میں تصنیف کی تھی، مگر پھر سفر مصر کے دوران وہ کتاب کھو گئی، چنانچہ ابن ہشام جب دوبارہ مکہ مکرمہ کی زیارت سے بہرہ ور ہوئے تو اس دوران ۷۵۶ھ میں دوبارہ اس کتاب کی تصنیف کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ کہتے ہیں قد کنت فی عام ۷۴۹ انشأت بمکة کتابًا فی الاعراب، ثم اننی اصبت بہٖ وبغیرہ فی منصرفی الی مصر، ولما من اللہ علی فی عام ۷۵٦ بمعاودة حرم اللہ والمجاورة فی خیر بلاد اللہ شمرت عن ساعد الاجتہاد ثانیًا، واستأنفت العمل لا کسلا ولا متوانیا، ووضعت ہذا التصنیف، وتتبعت فیہ مقفلات مسائل الاعراب فافتتحتہا، ومعضلات یستشکلہا الطلاب فاوضحتہا ونقحتہا واغلاطا وقعت لجماعة من المعربین وغیرہم فنبہت علیہا واصلحتہا [۶]

یہ کتاب حروف (ادوات) کے معانی جملہ اور شبہ جملہ کی حالت، احکام اعراب کی توضیح و تشریح اور نحویوں کے درمیان مروجہ غلطیوں کی تصحیح پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

مغنی اللبیب کے مشتملات :۔ ابن ہشام نے اپنی کتاب (مذکور) کو آٹھ قسموں،

میں تقسیم کیا ہے، پہلی قسم میں انھوں نے مفردات کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے دی ہے پہلے
حرف کو دوسرے پھر تیسرے حرف سے مرکب کرکے اور ایسے ہی ہر حرف کا علیحدہ علیحدہ ذکر، اس
کے معنی استعمال کے مختلف وجوہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ آیات، احادیث، اشعار اور کلام عرب
سے دلیلیں پیش کرتے ہوئے اس کے متعلق علمار فن کی آرار بھی زیر بحث لاتے ہیں اور پوری دیانت
داری کے ساتھ ہر رائے کی نسبت صاحب رائے کی طرف کرتے ہیں، وہ صرف علمار کے منقولات
اور ان کے اقوال ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ خود ان کی بھی ایک رائے ہوتی ہے جس کو وہ پیش
کرتے وقت اس کی صحت پر دلیلیں قائم کرتے ہیں، اور اس رائے سے تعارض کرنے والے کوفہ
و بصرہ کے نحویوں کی رایوں کا معقول جواب دیتے ہوئے ان کی غلطی ثابت کرتے ہیں۔

علامہ موصوف کی شخصیت اس وقت اور زیادہ مشہور و معروف ہوگئی جب انھوں نے
ابوحیان کی تفسیر پر تنقید کی اور زمخشری کی تفسیر کا رد اس انداز سے کیا کہ اپنی حجت قاطعہ
سے ان کی رایوں کو باطل کر دیا، اس کو علامہ کی بیباکی اور جرأت نہیں تو اور کیا کہا جائے گا کہ جس
طرح انھوں نے ابن عصفور، ابن السراج، ابن مالک، ابن خروف اور اخفش جیسے نحویوں کی
کو بے سند بتایا ہے اسی طرح انھوں نے ابن خالویہ کو بھی معمولی درجہ کے نحویوں میں شمار
کیا ہے، قسم اول میں مفردات کی یہ خاص بحث نصف سے زائد کتاب تک پھیلی ہوئی ہے۔

دوسری قسم:۔ اس میں خصوصیت سے جملوں سے بحث کی گئی ہے، جس میں جملوں کی
تفسیر اور صغریٰ و کبریٰ میں اس کی تقسیم کا ذکر ہے، پھر ایسے سات جملوں کا ذکر ہے جن پر اعراب
نہیں آتے یا وہ محل اعراب نہیں ہوتے، اور دوسرے خاص طرح کے ایسے سات جملے جو محل اعراب
ہوتے ہیں زیر بحث لائے گئے ہیں اور آخر میں معرفہ و نکرہ کے احوال بتانے کے بعد جملے کے
احکام بتائے گئے ہیں۔

تیسری قسم:۔ اس میں ان احکامات کا ذکر ہے جو جملہ سے کسی درجہ مشابہ ہوتے ہیں
جیسے ظرف جار، مجرور اور ان سے متعلق احکامات۔

چوتھی قسم:۔ اس چیز کے بیان میں ہے جس کے ذریعہ اسم اور خبر، فاعل و مفعول عطف
بیان اور بدل، اسم فاعل اور صفت مشبہ، حال اور غیر کی صحیح پہچان اور ان کے درمیان فرق اور

امتیاز کا علم حاصل ہوتا ہے، نیز حال کے اقسام، اسمائے شرط و استفہام کے اعراب، ابتدا با لنکرہ کی خصوصیات، عطف کے اقسام، عطف الخبر علی الانشاء، جملہ اسمیہ کا عطف جملہ فعلیہ پر، جملہ فعلیہ کا عطف اسمیہ پر، دو عامل کا عطف دو معمولوں پر، نیز ان مواضع کا ذکر جن میں ضمیر کا لوٹنا لفظاً اور رتبۃً متاخر ہو اور ان ضمیروں کا حال جن کو بطور فصل متعین کیا گیا ہو، جملہ کے روابط، اس کی ضمیر کے ساتھ، اور اسم کے وہ امور جو اضافت سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ امور جن کے ساتھ صرف فعل ہی لازم آتا ہے، اور ایسے ہی وہ امور جن سے فعل لازم کو متعدی بنایا جاتا ہے۔ یہ تمام مباحث پوری تفصیل کے ساتھ اس قسم میں مذکور ہیں۔

پانچویں قسم :- یہ قسم ان مباحث پر مشتمل ہے کہ کہاں کہاں مقتضیٰ ظاہر اور صحت معنی کی رعایت ملحوظ ہوگی، ایسے اس چیز کی عدم تخریج جس کا ثبوت عربی قواعد وضوابط سے نہ ہوتا ہو یا وہ امور بعیدہ کی تخریج یا ابتدا کے ابواب میں بعض محتمل الفاظ کا عدم استعمال، کان اور اس کی جگہ استعمال ہونے والے افعال، مشابہ منصوبات یا وہ منصوبات جو مصدر یا مفعول، ظرف یا مفعول بننے کا احتمال رکھتے ہوں، اور وہ مفعول بہ، مفعول معہ جو استثناء بننے کا احتمال رکھتے ہوں اور ایسے ہی وہ حال جو تمیز بننے کا اور وہ فاعل اور مفعول جو حال بننے کا احتمال رکھتے ہوں، فعل اسم موصول، توابع اور حروف جر وغیرہ کا اعراب، پھر مفرد مسائل کا ذکر کرتے ہوئے ان شرطوں کا بیان ہے جو کہیں تو لازم آتا ہے اور کہیں اس کے برعکس۔

چھٹی قسم :- یہ باب نحویوں کے درمیان رائج غلطیوں اور اس کی حقیقت کی جانب نشاندہی کرتی ہے۔

ساتویں قسم :- اعراب کی کیفیت سے متعلق ہے۔

آٹھویں قسم :- جو کتاب کا آخری باب ہے، اس میں ایسے کلیات کا ذکر ہے جن سے بیشمار جزئیات کا اخراج کیا جاسکتا ہے، اس باب میں گیارہ قواعد کلیہ مذکور ہیں، اور ہر قاعدے میں بیشمار مثالیں اور شواہد بیان کئے گئے ہیں۔

مغنی اللبیب کی امتیازی خصوصیات

مغنی اللبیب کی تصنیف ایک بالکل نئے انداز کی ہے، اس کی ترتیب ان تمام کتابوں کی

ترتیب سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو عربی زبان میں فن نحو پر لکھی گئیں اور انھیں امہات کتب کہا گیا، اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر بات کو بہت ہی واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے عربی زبان و بیان کے تمام مسائل نیز اعراب کا علم شامل کتاب ہے، بایں ہمہ کتاب ایسے تکرار سے پاک ہے جو سقم و عیب کا باعث ہونے کے ساتھ قاری کی طبیعت میں انقباض و تکدر پیدا کرتے ہیں ابن ہشام کہتے ہیں کہ "جب میں نے کتب اعراب کو ذرا غور سے دیکھا تو وہ اسباب جو ان کی طوالت کے مقتضی ہوئے نہیں تھے (۱) کثرت تکرار ہے جس کی وضع قوانین کلیہ کی افادیت کے لئے نہیں بلکہ جزئی صورتوں پر کلام کرنے کے لئے ہوتی ہے، لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ لوگ (ان کتابوں کے مصنفین) کسی خاص ترکیب پر کلام کرتے ہیں پھر جہاں اس جیسی ترکیبیں دوبارہ آئیں وہاں انھوں نے پھر اسی بات کا اعادہ کیا[1]

(۲) مغنی اللبیب کی تبویب و ترتیب میں ابن ہشام کی ذاتی خود اعتمادی صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے جو ان کے علاوہ متقدمین نحویوں کے یہاں تقریبًا مفقود ہے، اور مغنی اللبیب کی تالیف میں ان کا انداز نگارش گویا اپنے پیش رو نحویوں کی خامیوں، تحریر کی غلطیوں سے بچنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

(۳) ابن ہشام نے اپنی کتاب میں اپنے موقف کی وضاحت کے لئے قرآن کریم اور حدیث نبوی سے کثرت سے استشہاد کیا ہے، انھوں نے خود مغنی کے مقدمہ میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کا مقصد اس کتاب کی تالیف سے کلام اللہ اور حدیث نبوی کے افہام و تفہیم میں آسانی پیدا کرنا ہے۔

(۴) اسی طرح انھوں نے اشعار سے بھی استدلال کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ سیوطی نے مغنی کے اشعار کی شرح کے لئے الگ ایک کتاب "شرح شواہد المغنی" تصنیف کی جو زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔

اسی طرح قرآنی آیات اور ادبی شہ پاروں سے استشہاد کی کثرت کی وجہ سے کتاب کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اور وہ نحو اور اس کے قواعد میں جو روکھا پن پایا جاتا ہے

---

(۱) مغنی اللبیب ص ۲۵ (مقدمۃ المؤلف)

اس میں تخفیف ہے، چنانچہ جہاں مغنی اعرابی نکات کی توضیح وتشریح پر ایک جامع کتاب ہے وہیں اس کو ادب عالیہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے، میرے خیال میں شیخ احمد المعروف بالکاتب نے مغنی کے اختصار کا نام "قراضۃ الذھب فی علمی النحو والادب" رکھ کر اسی حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

(۵) اس کتاب میں ابن ہشام کا پرشکوہ انداز نگارش ان کی دوسری کتابوں کے طرز نگارش سے یکسر مختلف ہے، اس کتاب کے اسلوب تحریر کو علمی اسلوب کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے جہاں متانت وسنجیدگی بھی ہے اور گیرائی وگہرائی بھی، جو ان کی نثر میں تخلیقی عناصر کی شمولیت کا پتہ دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قاری کو اس کتاب سے مستفید ہونے کے لئے کافی غور وخوض سے کام لینا پڑتا ہے۔

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اس کتاب کو مصنف کے زمانہ سے اب تک عالم اسلام کے علمی حلقوں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

مغنی اللبیب کی شرحیں:-

ابن ہشام کی تصنیف مغنی اللبیب سے عربی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والا شاید ہی کوئی شخص ناواقف ہو، کسی بھی تصنیف کی مقبولیت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس پر شارحین ومحشین کی ایک بڑی جماعت نے کام کیا ہو، اس اعتبار سے "مغنی اللبیب" کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ تقریباً پچیس علماء کبار نے اس کی شرح وتعلیق اور دیگر خدمات انجام دی ہیں، ان میں ابوالعباس احمد بن محمد الشمنی، بدر الدمامینی، شمس الدین المالکی، علامہ جلال الدین السیوطی وغیرہ پایہ کے علماء وادباء قابل ذکر ہیں۔

مغنی اللبیب کے متعدد قلمی نسخے دنیا کے مختلف ملکوں مصر، ترکی، عراق، حجاز، یمن کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، زمانہ تالیف پر کئی صدیاں گذر جانے کے بعد بھی لوگوں کی طلب اور توجہ میں کمی نہیں آئی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کے دور میں بھی وہ علماء اور طلباء کے درمیان اسی طرح مقبول ہے۔

مغنی اللبیب کی علماء وطلبہ کے درمیان عظمت ومقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابن ہشام کے نزدیک اس کتاب کی تالیف کا مقصد کسی امیر کی رضا وخوشنودی یا بادشاہ کی قربت

دنیوی جاہ و منصب کا حصول، عطیۂ سلطان، خلعتِ شاہانہ یا انعام و اکرام حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ وہ یہ احساس کرتے ہوئے کہ فہم قرآن و تشریح حدیث کی ایک بنیادی ضرورت اعراب کا علم ہے اور مسلمان دینی اعتبار سے اس علم کے حاجت مند ہیں، مغنی کی تصنیف پر آمادہ ہوئے، یہ مقصد مصنف کی اس عبارت سے صاف واضح ہے۔ فان اولی ما تقترحہ القرائح و اعلی ما تجنح الی تحصیلہ الجوانح ما تیسر بہ فہم کتاب المنزل، ویتضح بہ معنی حدیث نبیہ المرسل فانھما الوسیلۃ الی السعادۃ الابدیۃ والذریعۃ الی تحصیل المصالح الدینیۃ والدنیویۃ واصل ذٰلک علم الاعراب الھادی الی صوب الصواب

ذیل میں ہم ان کاوشوں کا مختصر سا جائزہ پیش کرتے ہیں جو زمانۂ تالیف سے لے کر آج تک اس پر کیا گیا ہے۔

(۱) شیخ تقی الدین ابی العباس احمد بن محمد الشمنی نے "المنصف من الکلام علی مغنی ابن ھشام" کے نام سے اس کتاب کی شرح لکھی۔

(۲) شیخ شمس الدین بن الصائغ الحنفی نے اس پر تعلیق تحریر کی اور اس کا نام "تنزیہ السلف عن تمویہ الخلف" رکھا۔

(۳) علامہ بدرالدین الدمامینی نے ۸۲۸ھ نے اس پر تعلیق لکھی۔

(۴) علامہ بدرالدین الدمامینی المصری نے ایک اور شرح لکھی جس کا نام "تحفۃ الغریب بشرح مغنی اللبیب" ہے جو ۸۱۱ھ میں مکمل ہوئی۔

(۵) بدرالدین الدمامینی نے ایک دوسری شرح "ایضاح المغنی" کے نام سے لکھنی شروع کی جس میں حرف فا تک پہونچ پائے اور اسے مکمل نہیں کر سکے۔

(۶) شمس الدین المالکی النحوی نے "کافی المغنی" کے نام سے تین جلدوں میں اس کی شرح لکھی۔

(۷) علامہ سیوطی نے ایک حاشیہ بھی لکھا اور اس کا نام "الفتح القریب فی حواشی مغنی اللبیب" رکھا۔

(۸) علامہ سیوطی نے مغنی اللبیب اور مغنی کے ان اشعار کی شرح کی جو انھوں نے بطور استشہاد

پیش کئے ہیں۔

(۹) احمد بن محمد الحلبی المعروف بابن الملا نے ایک شرح لکھی۔

(۱۰) شمس الدین محمد بن عبدالرحمن الزمردی (سنہ [illegible]ھ) نے مغنی پر حاشیہ تحریر کیا۔

(۱۱) مولی مصطفی بن پیر محمد المعروف بعزمی زادہ (سنہ [illegible]ھ) نے بھی مغنی پر حاشیہ لکھا۔

(۱۲) دمی زادہ رومی (سنہ [illegible]ھ) نے چھ جلدوں میں مغنی کی شرح لکھی جس کا نام "مواہب الادیب" رکھا

(۱۳) قاضی مصطفی انطاکی (سنہ ۱۱۰۰ھ) نے شرح لکھی۔

(۱۴) ابو نجا مصری نے "نظم المغنی" کے نام سے ایک کتاب لکھی اور پھر اس کی شرح لکھی

(۱۵) نورالدین العلی المصری نے ایک شرح لکھی۔

(۱۶) شیخ محمد بن عبدالمجید الشافعی الس[illegible]ی نے "دیوان الادیب فی مختصر مغنی اللبیب" کے نام سے اس کتاب کا اختصار پیش کیا جو سنہ ۹۶۰ھ میں مکمل ہوئی۔

(۱۷) البیجوری (سنہ ۸۶۳ھ) نے مختصر لکھی۔

(۱۸) شیخ احمد المعروف بالکاتب نے "قراضۃ الذہب فی علمی النحو والادب" کے نام سے اس کی مختصر لکھی اور صرف بد تک ہی لکھ پائے۔

(۱۹) رضی الدین حنبلی حلبی نے "مغنی الحبیب علی مغنی اللبیب" کے نام سے ایک شرح لکھی۔

(۲۰) احمد بن محمد الرومی المعروف بآسیہ ملا المفوض (سنہ ۱۱۰۱ھ) نے اس کی شرح لکھی۔

(۲۱) نعمت امام الجزائری نے ایک شرح تحریر کی۔

(۲۲) سید ابراہیم بن احمد بن محمد العیالی الیمنی (سنہ ۱۱۱۱ھ) نے مغنی پر حاشیہ تحریر کیا۔

اس کثرت سے اس کتاب پر حواشی اور شروحات کا لکھا جانا اس کتاب کی اہمیت و مقبولیت اور اثر اندازی کی روشن دلیل ہے۔

مغنی اللبیب کی مقبولیت اور ماہرین فن کا اعتراف

ابن ہشام کے موافق و مخالف علماء نے جس کثرت سے کتاب پر شروح و حواشی تحریر کئے ہیں وہ اس امر کا زندہ ثبوت ہیں کہ یہ اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے، چنانچہ ان کے معاصر علماء نے ان

کے اس کارنامے کی عظمت کا بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا ہے، ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب " العبر و دیوان المبتداء والخبر" میں علم نحو پر کلام کرتے ہوئے اس کتاب کی عمدگی اور مصنف کی مہارت فن کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے: " اب جبکہ اسلامی دنیا کی آبادی روبزوال ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صنائع و علوم بھی روبہ تنزل ہیں، تو علم نحو بھی ختم ہوتا جارہا ہے، اس زمانہ میں ایک فاضل مصنف جمال الدین بن ہشام مصری کی المغنی نامی ایک تصنیف ہمارے ہاتھ لگی ہے، اس میں احکام اعراب مجمل و مفصل سب درج ہیں اور فاضل مصنف نے حروف مفردات اور جمل پر اچھی بحثیں کی ہیں، اور تکرار شدہ باتوں کو اکثر ابواب نحو سے قلم زد کر دیا ہے، اور اعراب قرآن کے نکتے ابواب و فصول کی شکل میں زیر بحث لاتے ہیں، اور تمام قواعد علمیہ کو نظم و ترتیب سے ضبط کیا ہے، غرض اس کتاب سے زبردست ذخیرۂ علمی ہمارے ہاتھ لگا ہے، اور اس سے اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اس علم میں فاضل مصنف کا مرتبہ کس قدر بلند ہے "۔ خلاصہ یہ کہ ان کی یہ تصنیف ان کا ایک عجیب کارنامہ ہے اور ان کی بے پناہ قابلیت اور علمی مہارت کی صحیح ترجمانی ہے۔

طاش کبریٰ زادہ نے اس کتاب کو فن نحو پر ایک مبسوط کتاب شمار کیا ہے، جس میں ابن ہشام نے حسب ضرورت اختصار اور تفصیل سے کام لیتے ہوئے اعراب کے احکام کا احاطہ کیا ہے۔

بدرالدین الدمامینی نے کتاب سے متعلق اپنا تاثر ان اشعار میں بیان کیا ہے

ألا انما مغنی اللبیب مصنف — جلیل بہ النحوی یحوی امانیہ

وما ھو الا جنۃ قد تزخرفت — اما تنظروا الابواب فیہ ثمانیہ

(ترجمہ:۔ مغنی اللبیب ایک ایسی تصنیف ہے جس سے کبار نحویین کی امیدیں وابستہ ہیں وہ تو آراستہ و مزین جنت ہے جس کے آٹھ دروازے ہیں)

شہاب الخفاجی نے بھی مغنی اللبیب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

مغنی اللبیب جنۃ — ابوابھا ثمانیۃ

اما تراھا وھی لا — تسمع فیھا لاغیۃ

(ترجمہ) مغنی اللبیب تو ایک جنت ہے جس کے آٹھ دروازے ہیں، ارے دیکھو تو وہ ایک ایسی کتاب ہے جہاں کوئی بے ہودہ بات سننے میں نہیں آئے گی۔

علامہ بہار الدین قرامطی نے ان اشعار کے ذریعہ مغنی اللبیب کی مدح سرائی کی ہے۔

جلا ابن هشام من اعاربه لنا ؛ عروسا علیها خیرة الدهر لا یبنی

وابدی لاصحاب اللسان مصنفا ؛ یفدی لعین کلما حل فی اذنی

ولقبه مغنی اللبیب فاصبحوا ؛ وما منهم الا فقیر الی المغنی

(ترجمہ) ابن ہشام نے اعراب کے موضوع سے متعلق اپنی کتابوں کے ذریعہ ہمارے سامنے ایک ایسی نوعروس کو پیش کیا ہے جس کا اہل ان کے علاوہ کوئی اور شخص نہیں ہو سکتا، وہ اہل زبان کے لئے ایسی تصنیف منظر عام پر لائے ہیں جس کے لئے جب بھی اس کا تذکرہ کیا جائے آنکھیں بچھائی جائیں گی، اس کا نام انھوں نے مغنی اللبیب رکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تمام لوگ اس کے محتاج اور ضرورت مند ہیں۔
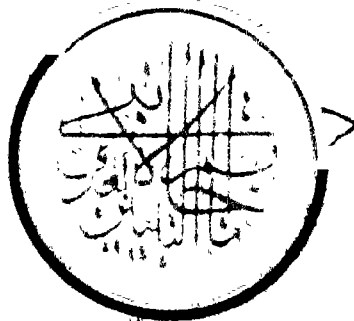
پس منظر طریقۂ عمل مقاصد

یورپین سٹاف کے متعلق اعتراضات

تیسری قسط

اخراجات کی زیادتی کا سوال:-

سب سے زیادہ مشکل کام جو بالفعل کالج میں ہے، وہ یورپین اسٹاف کا ولایت سے بلانا اور کالج میں رکھنا ہے ...... کالج ان کو اس قدر تنخواہ نہیں دے سکتا جس قدر کہ اسی حیثیت کے یورپین افسروں کو گورنمنٹ سے یا موجودہ ایڈ کالجوں سے اسی حیثیت کے پرنسپل یا پروفیسر کو ملتی ہے(۱)۔

ہمارے دوست بعوض اسکے کہ ان مشکلات کے حل کرنے اور اس کا سامان مہیا کرنے پر کوشش کریں، ان سب مشکلات کا الزام بھی مجھ پر رکھتے ہیں، کوئی تو کہتا ہے کہ کالج میں یورپین اسٹاف کا خرچ بہت بڑھا دیا ہے، تعلیم یافتہ بنگالی تھوڑی تنخواہ پر آسکتے ہیں، اور بخوبی پڑھا سکتے ہیں اور طالب علموں کو یونیورسٹیوں کی ڈگریاں پاس کرا دیں گے اور کیا چاہئے؟ دیکھو فلاں کالج میں صرف بنگالی ہیں ایک انگریز نہیں ہے اور کس قدر طالب علم ہر سال ایف اے اور بی اے میں پاس ہوتے ہیں، بعض دوست کہتے ہیں کہ نہیں یورپین اسٹاف کا ہونا ضرور ہے میں اس کے مخالف نہیں مگر نالائق سکریٹری نے یورپین سٹاف کی تنخواہیں زیادہ کر دی ہیں، اس سے کم تنخواہ پر یورپین پروفیسر بآسانی مل سکتے ہیں ...... میں کہتا ہوں کہ جس اسکیل

پر اور جس نتیجہ کی امید پر ہم نے کالج قائم کیا ہے اگر اس نتیجہ کے حاصل ہونے کی ہم کو امید نہ ہو یا اس نتیجہ کے مخالف آثار قائم ہوں تو کالج کا قائم رکھنا اور ہم کو اس قدر محنت و جانکاہی کا برداشت کرنا محض فضول ہے، ممکن نہیں ہے کہ بغیر عمدہ اور معزز جنٹلمین سٹاف کے ہم اپنی قوم کو جنٹلمین بنا سکیں؟

ہمارے کالج میں تو ایسے یورپین جنٹلمین افسروں کی ضرورت ہے جو تعلیم سے خود شوق رکھتے ہوں اور ان کے دل میں اس بات کا خود شوق ہو کر ایک درماندہ قوم کو جو کسی زمانہ میں علم و فضل میں بھی بلند نام تھی، پستی کی حالت سے نکال کر علم کی ترقی کے درجہ تک پہونچائے بلاشبہ ایسے لوگ ملنے نہایت مشکل ہیں مگر میں نہایت خوشی اور فخر سے کہتا ہوں کہ کل موجودہ یورپین اسٹاف بھی یہی فیلنگ رکھتا ہے؟

بورڈنگ ھاؤس کی نگرانی کا مسئلہ:-

پرنسپل کو بحیثیت پرنسپلی بورڈنگ ہاؤس میں ڈسپلن قائم رکھنے اور قصورات کی نسبت جو سزائیں مقرر ہوں ان کو دینے کا اختیار دیا گیا ہے، جن لوگوں نے ہر ایک امر میں اختلاف کرنے کا ارادہ کر لیا ہے وہ ان صاف صاف باتوں سے بھی اختلاف کرتے ہیں اور رائے دیتے ہیں کہ — بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی بجز مسلمان ممبر کے اور کسی کو نہ دی جائے ...... یورپ میں، ایشیا میں ہندوستان میں، امریکہ میں کہیں کوئی کالج ایسا ہے کہ اس کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس ہو اور پرنسپل کو بورڈروں پر ویسی ہی حکومت نہ ہو جیسی کہ اس کو کالج میں ہو؟ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کو جدا سمجھنا ایسا ہے جیسا کہ انسان کو اور اس کی روح کو جدا سمجھنا؟

میرا سب سے بڑا مقصد کالج کے قائم کرنے سے یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور انگریزوں میں دوستانہ راہ و رسم پیدا ہو اور آپس کا تعصب و نفرت دور ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بہت بڑی کامیابی ہوئی ہے اور اس کامیابی کا اصل سبب ہمارے کالج کے یورپین افسر ہیں جو طلباء سے پدرانہ شفقت اور دوستانہ محبت رکھتے ہیں، کسی دوسرے ضلع کا کوئی افسر جب علی گڑھ میں آجاتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ہمارے ضلع کی تمام لیڈیاں اور یورپین حکام ہمارے کالج کے

طالب علموں کے ساتھ اور ہمارے کالج کے طالب علم ان کے ساتھ کیسا سچا اور دوستانہ برتاؤ رکھتے ہیں، کھیلوں میں شریک ہوتے ہیں، ڈنروں میں شریک ہوتے ہیں، بورڈنگ ہاؤس کی ڈنروں میں آتے ہیں، میچ کے دنوں میں ہمارے ضلع کی لیڈیاں طالب علموں کو لنچ دیتی ہیں اور سب لیڈیاں اور جنٹلمین یورپین اور ہمارے طالب علم ایک میز پر بیٹھ کر کھاتے ہیں اور بے تکلف دوستانہ مگر باادب میل جول رکھتے ہیں تو وہ حیران ہوجاتا ہے اور علی گڈھ کو ایک نئی دنیا سمجھتا ہے ..... ہمارے کالج کے افسر اور بورڈر آپس میں دوستانہ ملتے ہیں اور صرف ان یورپین افسران کالج کے سبب سے یہ خوبی ہمارے طالب علموں میں اور یہ عزت ہمارے بورڈنگ ہاؤس کو ہوئی ہے اور میرا وہ مقصد جس پر میں نے کالج کی بنیاد ڈالی ہے کسی قدر حاصل ہوا ہے پس اس باب میں جو مخالفین مخالفت کرتے ہیں اس کی ذرہ بھر بھی وقعت نہیں کرسکتا اور نہ میں بورڈنگ ہاؤس کو اس حالت میں رکھنا چاہتا ہوں جو وہ پسند کرتے ہیں اگر میرا مقصد اس کالج سے حاصل نہ ہو تو کالج کو آج غارت کردینا اسکے قائم رکھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے (۵)

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب سے میرے دوست مسٹر بیک پرنسپل نے اپنی مہربانی سے بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی اپنے ذمہ لی ہے بورڈنگ ہاؤس کا ایسا عمدہ انتظام ہے کہ کسی وقت میں نہ تھا ہر ایک کام میں ڈسپلن قائم ہوگیا ہے اور اس کے سبب سے طالب علموں میں نماز کی پابندی بہت زیادہ ہوگئی ہے جو کسی زمانہ میں نہ تھی (۶) ●

● ریٹائرڈ کمشنر جے کینیڈی لکھتے ہیں: "سید صاحب میں کاروباری صلاحیت کا فقدان تھا، کالج کے نظار کی مجلس مستقل نظم وضبط کے معاملات میں مداخلت کرتی تھی اور میں نے سنا ہے کہ اندرونی طور پر کالج میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، رفتہ رفتہ مسٹر بیک نے قابل اور ہمدرد انگریز نوجوانوں کا سٹاف اپنے چاروں طرف جمع کرلیا نظم وضبط قائم کیا دفتری نظام درست کیا اور طلبہ کو روزانہ نماز پابندی کے ساتھ ادا کرنے پر مجبور کیا اگرچہ جس منشی نے پہلے پہل اس حکم پر عمل کرانے کی کوشش کی تھی طلبہ کا ہجوم اس پر چڑھ دوڑا تھا، مسٹر بیک انگریزوں میں بھی سید صاحب کے سب سے بڑے ترجمان کی حیثیت اختیار کرگئے، غرض اس تجربے کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی ابھارنے میں مسٹر بیک نے سید صاحب کی خاص مدد کی، اگر کالج کی بنا کا خیال خود سرسید کا ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بعد میں اس کی کامیابی سید صاحب کے بعد خاص طور پر مسٹر بیک کی رہینِ منت ہے۔" (تذکرہ سرسید، ص ۲۳۱)

کالج کے اہم مقاصد

مسلمانوں کو باعتبار مذاق اور رائے و فہم انگریز بنانا۔

اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں (۷)●

آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کی نقل میں اسلامی یونیورسٹی قائم کرنا

ہم اس مدرسۃ العلوم کو محمڈن یونیورسٹی یعنی دارالعلوم مسلمانی بنانا اور بالکل آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹی کی (جس کو ہم دیکھ آئے ہیں) نقل اتارنا چاہتے ہیں (۸)

کیمبرج اور آکسفورڈ کی دو یونیورسٹیاں ہماری ہدایت کے لئے موجود ہیں بس ہمیشہ ہم کو ان کی ہی تقلید اور پیروی سے سلسلۂ کتب درسیہ کا معین کرنا اور اسی طریق پر تعلیم دینا کافی ہوگا۔ (۹)

آکسفورڈ اور کیمبرج کے قاعدہ کے مطابق مدرسۃ العلوم کے قائم ہونے سے طالب علموں کے دلوں میں ایک نئی روح بھر جائے گی اور اعلیٰ درجے کے مسلمانوں کو بھی اپنی طرف راغب کریگی (۱۰)

کالج نے اپنے وجود کے بیس سال کے عرصہ میں تعداد طلبہ میں، عمارات میں اور شہرت میں اس قدر ترقی کی ہے کہ ہم کو اس کی توقع نہ تھی مگر پھر بھی آخری مقصود ابھی بہت دور ہے اور ہم کو توقع نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں وہ حاصل ہو اور وہ مقصد ہندوستان میں کیمبرج و آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے نمونے پر ہندوستان کے مسلمانوں کے واسطے اسلامی یونیورسٹی قائم ہو جانا ہے (۱۱)

● اسی قسم کا انداز میکالے نے اپنی تاریخی یادداشت ۱۸۳۵ء میں اختیار کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ہمیں اس وقت بس ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہئے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے جن پر ہم اس وقت حکمراں ہیں...... ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرز فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے انگریز ہو (میکالے کا نظریۂ تعلیم، ص ۲۲)

مسلمانوں کو ذریعۂ معاش کمانے کے قابل بنانا:۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون میں ایسی تعلیم پا جائیں کہ بلا ذریعہ نوکری خود اپنے قوت بازو سے اپنی معاش پیدا کریں[۱۲]

محض ضروری مسائل و عقائد کی دینی تعلیم مہیا کرنا:۔

اس کالج کا مقصد مسلمانوں کو انگریزی علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا اور مذہبی تعلیم کا صرف بقدر عقائد و مسائل روزمرہ نماز روزے سے ہے۔[۱۳]

مذہبی تعلیم کالج اور اسکول میں جو دینی قرار پائی ہے اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ مسلمان طالبعلم ضروری مسائل عقائد مذہبی اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، وراثت، ہبہ اور وصیت سے واقف ہو جائیں، مذہبی تعلیم کو اس قدر بڑھانا جس سے تعلیم انگریزی میں ہرج اور مشکل پیش آئے مقصود نہیں ہے اور اسی لئے ہفتے میں صرف ایک دن مذہبی تعلیم کا ہے، اگر کتب مذہبی تعلیم کا سلسلہ عمدہ طرح سے قائم کیا جائے تو اس مدت میں جس قدر میں کہ انگریزی تعلیم ختم ہوتی ہے، مذہبی تعلیم میں بخوبی دست گاہ حاصل ہو سکتی ہے، لیکن اگر سلسلہ تعلیم خراب طور پر ہو جیسا کہ اب ہے، تو بجز اوقات ضائع کرنے کے اور کوئی معتد بہ فائدہ متصور نہیں۔ بعض گرم جوش مذہبی ممبروں نے مذہبی تعلیم کے نتائج امتحان پر کچھ اسکالرشپیں اور خاص مذہبی انعام دینے تجویز کئے تھے مگر چند روز گرم جوشی کے بعد بالکل سرد مہری ہو گئی۔ ...... مینجنگ کمیٹی کا نسبت مذہبی تعلیم کے صرف یہ کام ہے کہ تمام بورڈروں کو پانچوں وقت نماز پڑھنے پر تاکید رکھتی ہے چنانچہ سب بورڈر پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور جس قدر کہ انھوں نے مذہبی کتابیں پڑھی ہوتی ہیں، ان میں ہر سال امتحان لے کر ہر ایک امتحان کے نمبر بتا دیتی ہے جو اکثر افسوس کے لائق ہوتے ہیں۔[۱۴]●

● محمد علی جوہر لکھتے ہیں "علی گڈھ نے بہت سی چیزوں میں مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج پیدا کیا اور مغربی سائنس اور لٹریچر میں اس کی ترقی کے باوجود اس نے اپنا جداگانہ تفخر برقرار رکھا جو اس کے فاضلین کے حق میں ایک موثر محرک کے طور پر کارگر ہوتا تھا مگر اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اس نے (باقی بر صفحہ آئندہ)

ذریعہ قومی ترقی ..... ہندو مسلم دونوں کیلئے

مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے، یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے..... ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے، پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پائیں، ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پائیں

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

انھیں ان کے اعتقادی علم کے معاملہ میں قیمتی ساز و سامان سے آراستہ نہیں کیا، وہ کافی ترقی پسند تھے مسلمان ہونا ان کے لئے وجہ افتخار تھا مگر افسوس کہ وہ مذہبی معلومات سے کوسوں دور تھے..... (مذہبی) دینی کتب میں زیادہ تر رسمی طور پر طہارت اور نمازوں کے مسائل کا ذکر ہوتا تھا یا پھر بڑی جماعتوں کے طلبہ کے لئے اسلام کے چند اہم مسائل متعلقہ شادی جہیز اور طلاق شامل ہوتے تھے، قرآن حکیم ہمارے لئے عملی طور پر ایک بند کتاب رہا اور سنتِ رسول ایک نام سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی، کالج کی چند جماعتیں صرف ایک محدود وقت کے لئے حضور اکرمؐ کی حیات مبارکہ کے متعلق ایک ابتدائی قاعدہ پڑھتی تھیں جس کے صفحات بیس سے زائد نہیں تھے..... ہفتے میں ایک بار مسلم نوجوانوں کو اس گھنٹے میں ان کے مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی جو دوسرے دنوں میں ثانوی زبان کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دینیات کا گھنٹہ تفریح کے گھنٹے سے بھی زیادہ لطف اندوز تھا (مائی لائف اے فریگمنٹ ص ۲۲، ۲۳، ترجمہ)

اس کے علاوہ انھوں نے ایک موقع پر علی گڑھ میں اپنے تجربات کو یوں بیان کیا، افسوس کہ جو تعلیم دینیات ان بچوں کو وہاں دی جاتی تھی وہ محض ناکافی تھی، مختصر میں عبادات کے چند ابتدائی مسائل کے سوا کچھ وہاں کچھ نہ پڑھایا گیا، خدا بھلا کرے مولانا شبلی مرحوم کا کہ کچھ عرصہ تک کالج کی جماعتوں کو ابتدائی نصف گھنٹہ میں کچھ ترجمۃ القرآن سنا دیا جاتا تھا اور ایک مختصر سا رسالہ سیرت رسول اور اسلام کی ابتدائی تاریخ کے متعلق کالج کی جماعتوں کے درس میں داخل تھا اور نہ ہمیں مطالب قرآن سے کوئی واسطہ تھا نہ حدیث نبوی سے اور نہ عقائد کے متعلق ہمیں کوئی تعلیم دی جاتی تھی۔ (اوراق گم گشتہ، ص [illegible])

محسن الملک بیان کرتے ہیں کہ یہاں کی مذہبی تعلیم تعصب سے پاک ہے [illegible] غیر مذہب والوں سے اتحاد اور دوستی رکھنے کی تعلیم دیتی ہے، گورنمنٹ کی اطاعت اور سچی خیر خواہی کو جزو ایمان بتاتی ہے۔ ([illegible])

ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لئے موجود نہ کئے جائیں ہماری عزت نہیں ہوسکتی۔ مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا۔"(۱۵)

مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے ...... میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں، کالج کے تمام حقوق، جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے، بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں، جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں، صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کرسکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے، اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں۔"(۱۶)

اپنی تعلیم پر خود مستعد ہونا:

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ جس میں ہندو مسلمان سب تعلیم پاتے ہیں عام پبلک کے فائدے کے لئے اور اس امر کے شائع کرنے کے لئے کہ رعایا کو خود اپنی تعلیم پر مستعد ہونا چاہئے جو عین خواہش گورنمنٹ کی ہے، قائم کیا گیا ہے۔"(۱۷)

مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد پیدا کرنا۔

اس کالج کا بڑا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد ہو اور وہ ایک دوسرے کے اغراض میں یک جان دو قالب ہوکر شریک رہیں۔"(۱۸) •

• حالی لکھتے ہیں: ان کا مقصد محمڈن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدم مقصد جو ۷۰ برس سے کر آخر دم تک ان کے پیش نظر رہا یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں یک جہتی، میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اسی لئے انہوں نے یورپین اسٹاف کالج کا جزو لاینفک قرار دیا تھا۔

(حیات جاوید حصہ اول ص ۲۴۴)

مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کا قدرشناس بنانا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کے لائق وکار آمد رعایا بنانا اور ان طبیعتوں میں اس قسم کی خیر خواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی برکتوں کی اصل قدرشناسی سے پیدا ہوتی ہے (۱۹)●

● کالج کے ٹرسٹیوں نے ایک موقع پر یہ اعلان ضروری سمجھا کہ "من جملہ کالج کے مقاصد اہم کے یہ مقصد نہایت اہم ہے کہ یہاں کے طلبہ کے دلوں میں حکومت برطانیہ کی برکات کا سچا اعتراف اور انگلش کیرکٹر کا نقش پیدا ہو اور اس سے خفیف سا انحراف بھی حق امانت سے انحراف کے مترادف ہے (تذکرہ وقار ص ۲۲)۔
حالی سرسید کی توصیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وہ اپنی قوم میں وفاداری، اخلاص اور اطاعت کے ہمیشہ کے لئے بیج بو گیا ہے، وہ ان کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسا بار آور درخت لگا گیا ہے جس کا پھل انگلش نیشن کی محبت اور انگلش گورنمنٹ کی وفاداری و فرماں برداری ہے
(مقالات حالی حصہ دوم ص ۴۸)
بورڈنگ ہاؤس میں خصوصی تربیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری جو ہر قوم کا اور خاص کر محکوم قوم کا زیور ہے، اس کی عادت ڈلوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اس بورڈنگ ہاؤس میں موجود ہیں ظاہراً ہندوستان کے کسی انسٹی ٹیوشن میں موجود نہیں ہیں۔"
(حیات جاوید حصہ دوم، ص ۹۲)
اسی قسم کے چند خیالات کا اظہار نواب محسن الملک یوں بیان کرتے ہیں: "ایک جو ڈر جو مدرسۃ العلوم کی چار دیواری میں قدم رکھتا ہے اپنے تئیں نئی آب و ہوا اور ایک نئی زندگی میں پاتا ہے اور اپنے گرد و پیش کی تمام چیزوں میں زندہ دلی اور شگفتگی اور حرکت اور جوش دیکھتا ہے، اس کے کانوں میں ہر طرف سے ہمدردی اور گورنمنٹ کی بھی خیر خواہی کی آوازیں آتی ہیں (مجموعہ لیکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک، ص ۳۲۶)
ایک اور موقع پر اس مدرسے سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں: "اس کا بیج بویا تھا سرسید نے، اب جب یہ پھلے پھولے گا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو تہذیب شائستگی علمی قابلیت اور گورنمنٹ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے آپ اپنا مثل ہوں گے تو اس وقت گورنمنٹ انگریزی کی برکتوں اور آزادی کی بشارت دیتے پھریں گے۔
(ایضاً ص ۳۸۲)

کالج میں غبن

گیارہ برس میں ایک لاکھ روپے کا تصرف :-

دفتر مدرسۃ العلوم کے ہیڈ کلرک نے بذریعہ جعلی چیکوں کے ایک زر خطیر زر امانت مدرسۃ العلوم میں سے، جو بینک میں جمع تھا غبن و تصرف کر لیا جس کے سبب سے نقصان کثیر زر امانت مدرسۃ العلوم میں ہو گیا۔(۳۱)

زر مجتمع میں اکیاون ہزار روپیہ غبن المال ہوا، علاوہ اس کے بیالیس تینتالیس ہزار روپیہ بینک کا فاضل ہو گیا، بس گیارہ برس کے عرصہ میں قریب ایک لاکھ روپیہ کے غبن ہوا۔

وہ جعلی چیکیں وقتاً فوقتاً جاری کر کے روپیہ نکالتا رہا۔(۳۲)

اس قدر مدت تک غبن کا حال نہ دریافت ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ جو انگریزی حساب بینک سے آتا تھا اس کا مقابلہ اردو حساب سے شام بہاری لال کے ذمہ تھا۔ اور وہ بے ایمانی سے کہہ دیتا تھا کہ سب ٹھیک ہے۔(۳۳) ●

شام بہاری لال ضلع گورداسپور میں داروغہ جیل خانہ تھا اور تغلب غبن و تصرف از سرکاری اس کو برس یا دو برس کی قید ہوئی تھی۔(۳۴) ✱

ذاتی صدمہ کی کیفیت :-

چند روز تک تو میری حالت ایسی خراب تھی کہ مجھے کسی بیماری شدید کے لاحق ہونے کا اندیشہ رہا

● حالی لکھتے ہیں، "شام بہاری لال جون ۱۸۸۳ء سے جولائی ۱۸۹۵ء تک ان کے دفتر میں رہا، اس عرصہ میں کبھی اس نے یہ نہیں جانا کہ مجھ سے کوئی باز پرس کرنے والا ہے یا نہیں۔" (حیات جاوید حصہ اول ص ۳۹۹)

✱ حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے اس کو ایک اشراف خاندان کا آدمی سمجھ کر اپنے انگریزی دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر کیا تھا اگرچہ سرسید کو اس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد جتایا گیا کہ پنجاب میں سرکاری ملازم تھا اور وہاں سرکاری روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزائے قید پا چکا ہے مگر سرسید اس خیال سے کہ اول تو یہاں اس کی تحویل میں کچھ روپیہ نہیں رہتا جس میں غبن کا احتمال ہو، دوسرے اشراف آدمی ایک دفعہ ٹھوکر کھا کر پھر ویسی خطا نہیں کرتا اس کو بدستور اس کے عہدہ پر بحال رکھا (حیات جاوید حصہ اول ص [illegible])

ـــــ تین روز تک مطابق کھانا کھایا نہیں گیا اور طبیعت کی عجیب کیفیت تھی (۳۵)

اس صدمے سے تین چار مہینے تک ایسا حال ہوگیا تھا کہ لوگوں کو یقین تھا کہ میں کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو جاؤں گا مگر رفتہ رفتہ وہ حالت بدل گئی اور میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ جو امر واقع ہوگیا گو کسی سبب سے ہوا ہو۔ اس پر رنج کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں بلکہ دل کو مضبوط کر کے جہاں تک ممکن ہے اس کی تلافی میں کوشش کرنی چاہئے (۳۶)

زندگی میں ہی راز کھل جانے پر خدا کا شکر:-

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہوگئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ ایک دن میں مر جاؤں گا، اور جو کچھ اس نے جعل سازی اور فریب کی ہے وہ سب تلپٹ ہو جائے گی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اس کی جعل سازی اور فریب کھل گیا۔ ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپیہ میں تصرف کیا ہے، پس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی یہ راز کھل گیا۔ بعض لوگ اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضہ میں تھا، حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے، قانون ٹرسٹیاں میں حکم ہے کہ روپیہ بینک میں جمع کیا جائے، چنانچہ کل روپیہ بینک میں جمع تھا اور بینک کے خزانے سے بذریعہ جعلی چیکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چیکوں کو روکنا جب تک ان کا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں (۳۷)

مدرسہ کا کام بدستور چلا جاتا ہے، جو کچھ کہ مجھ کو افسوس ہے اس غبن کا ہے جو شام بہاری لال نے کیا، جس کا کبھی خیال بھی نہ تھا۔ (۳۸)

فـ[illegible]

میرے بعد کون؟

تمام مات دن اس غم میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے، خصوصاً مجھ سے آدمی کا جس نے بہت بڑا حصہ اپنی زندگی کا طے کر لیا ہے اور کچھ باقی ہے تو بہت

قلیل باقی ہے۔ جب میرے کوچ کا وقت آن پہونچے گا تو کون شخص اس تمام کام کو اٹھائے گا، اور کون شخص اس کام کو انجام تک پہونچائے گا۔(۲۹)

دوستوں کے پرانے خیالات پر افسوس :-

ہم نے سنا ہے کہ ہمارے چند دوست ایک جگہ جمع تھے اور قومی ہمدردی کے سبب سے اس بات پر غور کرتے تھے کہ سرسید کے بعد مدرستہ العلوم کا کیا حال ہوگا، ایک دوست نے کہا کہ کچھ اندیشے کی بات نہیں ہے، تعلیم کی ضرورت پر اب ہر ایک شخص کو یقین ہوگیا ہے، اور مدرستہ العلوم اب تیار ہوگیا ہے، بنی بنائی چیز کا ہاتھ میں لینا ہر ایک شخص پسند کرے گا، آمدنی بھی اس قدر ہے کہ موجودہ حالت قائم رہ سکتی ہے، اور سرسید احمد خاں کے مرنے کے بعد اس میں کچھ نقصان نہیں ہوسکتا، کیونکہ بظاہر وہ آمدنی مستقل ہے، دوسرے دوست نے فرمایا کہ ہاں، سچ ہے، کچھ شک نہیں ہے کہ سید احمد خاں کے بعد یعنی ان کے مرجانے پر، بورڈنگ ہاؤس میں اس قدر اخراجات نہیں ہونگے اور طالب علم زیادہ آئیں گے کالج و سکول میں بھی سید احمد خاں نے بہت زیادہ خرچ بڑھا رکھا ہے کم تنخواہ کے لوگ مقرر ہو کر بہت تخفیف سے کام چل سکے گا، اور ان کے مرجانے پر جو اور چند رکاوٹیں ہیں وہ بھی جاتی رہیں گی۔(۳۰)

افسوس ہے کہ ہمارے دوستوں کے اب تک وہی پرانے خیالات ہیں وہ بورڈنگ ہاؤس کو ایسے ہی لوگوں سے بھرنا چاہتے ہیں، جو مسجدوں میں مردوں کی فاتحوں کی روٹیاں کھانے پر بسر اوقات کرتے ہیں، افسوس کہ ان کو تعلیم کی ابھی قدر نہیں ہوئی، تھوڑی تنخواہ کے ٹیچر اور پروفیسر کیا تعلیم دے سکتے ہیں؟ انھوں نے کبھی چار روپوں سے زیادہ تنخواہ کا میاں جی دیکھا ہی نہیں، بلا ایک میاں جی کو پانچ سو اور سات سو روپے ملنا ان کو متعجب کرنا ہوگا۔ اگر ہمارے بعد مدرستہ العلوم کا یہی حال ہونا ہے جس کی دور اندیشی ہمارے دوست کرتے ہیں تو ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ قبل اس کے کہ مدرستہ العلوم کا یہ حال ہو ایک شدید بھونچال آئے اور ہمارا پیارا مدرستہ العلوم زمین میں دھنس جائے، آمین۔(۳۱)

وصیت...... مدرسہ قوم کے ہاتھ سے نہ نکلے:-

میں اپنے دوستوں کو کئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرستہ العلوم کا جو کچھ حال ہو سو ہو مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکل کر اور لوگوں کے قبضہ میں چلا جائے بری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کو چلانے والی ہو۔ (۳۲)

میری زندگی کا واحد مقصد:-

عمر کے اس مقام پر یہ محسوس کرتے ہوئے مجھے بڑی راحت ہوتی ہے کہ بہت سالوں سے میرا جو عزم رہا ہے اور جواب میری زندگی کا واحد مقصد ہے اس نے جہاں ایک جانب میرے ہم وطنوں کی استعداد کو ابھارا ہے وہاں دوسری طرف انھیں انگریز رعایا سے ہمیشہ حاصل ہوئی ہے اور اپنے حاکموں کا تعاون حاصل ہوا ہے، نتیجۃً جب میری زندگی کے جو چند سال باقی ہیں ختم ہو جائیں گے، اور میں تمھارے درمیان موجود نہیں ہوں گا، کالج پھر دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے گا اور میرے ہم وطنوں کو یہ سکھانے میں کامیاب ہوگا کہ اپنے ملک کے لئے ان کے وہی احساسات ہوں، برطانوی حاکمیت کے لئے وفاداری کے وہی جذبات رکھیں، اس کی برکات کی اسی طرح قدر کریں، انگریز رعایا کے ساتھ دوستی کے اسی خلوص سے کام لیں جو کہ میری زندگی کا مطمح نظر رہا ہے۔ (۳۳)

روئیداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس نہم مطبوعہ ۱۸۹۵ء سے سرسید کے خطاب ۳۰ دسمبر ۱۸۹۴ء کا عکس ؛

اے کالج کے طالب علمو! تم یقین جانو کہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے، اس کی اطاعت اور فرمانبرداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی جس کے سایۂ عاطفت میں ہم امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہیں خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔

میری یہ رائے آج کی نہیں ہے بلکہ پچاس ساٹھ برس سے میں اسی رائے پر قائم اور مستقل ہوں، گورنمنٹ انگریزی اور قوم انگریز مسلمانوں کے ساتھ روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

اے مسلمانو! اگر تم بھی سچے خلوص اور سچی محبت اور سچی وفاداری اور سچی نمک حلالی سے گورنمنٹ انگریزی کے مطیع اور فرمانبردار رہوگے، تو خدانے جو اپنے حاکم کی اطاعت کا فرض تم پر کیا ہے اس کو بھی ادا کروگے۔ اور اگر تم اپنے میں اور انگلش قوم میں کچھ دوری سمجھتے ہو اس کو بھی دور کردوگے، کیونکہ سرکار انگریزی کی خیرخواہی جو ہم پر حکومت کرتی ہے سب سے پہلا ہمارا فرض ہے۔

سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم جب لندن میں آئے تھے تو ان کی دعوت اور مہانداری کے لئے ایک شاندار محل سجایا گیا تھا، میں جب لندن میں گیا تو میں نے اس محل کو دیکھا تھا اس میں جابجا در و دیوار پر کریسنٹ اور کراس یعنی ہلال اور صلیب کے نشان آپس میں ملے ہوئے بنے تھے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ انگریزوں اور مسلمانوں کے اتحاد اور اتفاق کی یادگاری کی مبارک علامت ہے۔

اے دوستو! یہی نشان میں نے اپنے کالج کے لئے بھی اختیار کیا ہے، مجھے امید ہے کہ تم اس نشان کو اپنے دلوں میں بھی نقش کروگے اور یاد رکھوگے کہ اس کالج کا بڑا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد ہو اور وہ ایک دوسرے کے اغراض میں یک جان و دو قالب ہو کر جیسا کہ اس نشان میں کریسنٹ اور کراس یک جان و دو قالب ہیں شریک رہیں گے، اور میں خدا سے دعاء کرتا ہوں کہ میری یہ آرزو پوری ہو

حوالہ جات

(۱) مکمل مجموعہ لیکچرز سر سید ص ۴۱۷-۴۱۸
(۲) ایضاً ص ۴۱۶
(۳) ایضاً ص ۴۱۸
(۴) ایضاً ص ۴۲۹
(۵) ایضاً ص ۴۳۰-۴۳۱
(۶) ایضاً ص ۴۳۱-
(۷) بحوالہ ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم او کالج دیباچہ ص ۴ -
(۸) مقالات سر سید حصہ دہم، ص ۱۵۴
(۹) تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۵۰۶
(۱۰) مقالات سر سید حصہ دہم، ص ۲۲۸
(۱۱) بحوالہ مجموعہ لیکچرز محسن الملک ص ۲۲۳
(۱۲) مکتوبات سر سید جلد اول ص ۳۱۰
(۱۳) مکتوبات سر سید جلد دوم ص ۱۳۱
(۱۴) خطبات سر سید جلد دوم ص ۴۶۱-۴۶۲
(۱۵) سفرنامہ پنجاب ص ۸۶ -
(۱۶) ایضاً ص ۱۲۶-۱۲۷ -
(۱۷) مکتوبات سر سید جلد دوم ص ۴۲۶
(۱۸) رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس نہم ص ۱۷
(۱۹) دی لائف اینڈ ورک آف سر سید ص ۱۷۹
(۲۰) مکتوبات سر سید، ص ۵۷۷ -
(۲۱) خطوط سر سید، ص ۳۳۵
(۲۲) ایضاً ص ۳۰۳
(۲۳) ایضاً، ص ۱۵۳
(۲۴) ایضاً، ص ۳۰۴
(۲۵) ایضاً، ص ۱۲۸
(۲۶) ایضاً، ص ۲۰۰
(۲۷) مکتوبات سر سید، ص ۳۱۷
(۲۸) خطوط سر سید، ص ۲۵۸
(۲۹) مکمل مجموعہ لیکچرز سر سید، ص ۱۳۹
(۳۰) مکتوبات سر سید، جلد اول، ص ۲۰۱
(۳۱) ایضاً، ص ۲۰۲
(۳۲) مکتوبات سر سید، ص ۳۷۶
(۳۳) بحوالہ دی لائف اینڈ ورک سر سید احمد خاں ص ۱۸۹ -

(از حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب سکھروی)

علمائے دیوبند کی فنائیت اور دنیا سے بے رغبتی

ایک واقعہ

مدینہ منورہ کے مہاجر اور میرے ایک ہم سبق دوست مولوی مغیث الدین صاحب یوپی کے رہنے والے تھے اور پھر وہ یہاں سے عراق چلے گئے، ایک زمانہ دراز تک عراق میں رہے اور پھر وہاں سے مدینہ طیبہ ہجرت کر کے وہاں گمنامی کے ساتھ ٹھہر گئے، تیس پینتیس سال سے مدینہ طیبہ میں ہیں، جب میں آخری مرتبہ مدینہ طیبہ حاضر ہوا تھا اس وقت وہ حیات تھے اور ان سے ملاقات ہوئی تھی، خدا کرے اب بھی حیات ہوں، ان کی عمر میری عمر جیسی تھی، انھوں نے مجھے دیوبند میں ایک واقعہ سنایا تھا، لیکن وہ ایسا عجیب وغریب واقعہ تھا کہ مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں اس میں کوئی مبالغہ تو نہیں ہے، میری یاد میں تو کوئی غلطی نہیں ہوگئی، چنانچہ اب کی مرتبہ جب مدینہ طیبہ میری حاضری ہوئی تو ان سے ملاقات کے وقت میں نے ان سے کہا کہ میاں تمھاری روایت سے میں نے یہ واقعہ سنا تھا، میں آگے اس کو بیان کرتے ہوئے ڈرتا ہوں اس لئے کہ مجھے اس میں شبہ ہے کہ کہیں غلطی تو نہیں ہوگئی یا کوئی مبالغہ تو نہیں ہوگیا اس لئے وہ پورا واقعہ دوبارہ سنادو، چنانچہ انھوں نے پھر وہ واقعہ سنایا۔

یہ مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے، جو اجمیر کے بہت بڑے عالم ہیں جن کا مدرسہ بھی مدرسہ معینیہ کے نام سے قائم ہے، اجمیر ہی کے رہنے والے تھے، بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا، مگر دیوبند کے بزرگوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا ان کا تعلیم کا سلسلہ دوسرا تھا، ایک مرتبہ ان کو خیال آیا کہ یہ دیوبند کے مولوی دنیا میں بہت مشہور ہیں چلو ان کو دیکھ کر آئیں کہ کیسے ہوتے ہیں، چنانچہ صرف اس مقصد کے لئے سفر کیا کہ دیوبند کے مولوی دیکھیں گے وہ کیسے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ریل گاڑی میں سفر کر کے دیوبند کے اسٹیشن پر پہنچ

گئے، اب کسی کو خبر نہیں کہ یہ آرہے ہیں، اور نہ انھوں نے کبھی دیوبند دیکھا تھا، چنانچہ سامان اٹھاکر اسٹیشن سے باہر آگئے اور ایک تانگے والے سے کہا کہ بھائی یہاں کا جو سب سے بڑا عالم ہو مجھے وہاں لے چلو، تانگے والے نے کہا کہ ایک صاحب دیوبند میں ہیں جو بڑے مولوی صاحب کہلاتے ہیں اور اسی نام سے مشہور ہیں اور ان کا مکان بھی اسی نام سے مشہور ہے یعنی بڑے مولوی صاحب کا مکان، انھوں نے فرمایا کہ بس مجھے انھیں کے گھر پہنچا دو، وہ بڑے مولوی صاحب تھے حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہم سب انھیں بڑے مولوی صاحب کہا کرتے تھے، اس سے زیادہ لمبا چوڑا کوئی لقب نہیں تھا، دیوبند کے تانگے والے سب ان کو اسی نام سے جانتے تھے، جس کو جانا ہوتا بس وہ یہ کہہ دیتا کہ بڑے مولوی صاحب کے گھر پہنچا دو اور مدرسے میں اسی نام سے جانے جاتے تھے، نہ مولانا نہ شیخ وغیرہ، کوئی دوسرا لقب نہیں تھا، آج کل کے القاب کی حقیقت یہ ہے کہ جب ہمارے اندر کچھ نہ رہا تو ہمارے القاب لمبے چوڑے ہوگئے۔

بہرحال تانگے والے نے ان کو بڑے مولوی صاحب کے گھر پہونچا دیا، یہ وہاں اتر گئے وہاں انھوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ گرمی کی وجہ سے تہہ بند باندھے ہوئے کھڑا ہے اور کرتا اتارے ہوئے ہے، ننگا بدن ہے، وہ یہ سمجھے کہ یہ بڑے مولوی صاحب کا کوئی نوکر ہے چنانچہ انھوں نے ان سے کہا کہ میرا یہ سامان رکھو اور بڑے مولوی صاحب کو میرے آنے کی اطلاع کردو، میں ملنے کیلئے آیا ہوں، وہ خود حضرت شیخ الہند تھے، آپ سمجھ گئے چنانچہ انھوں نے کہا کہ بہت اچھا آپ تشریف لائیے، چنانچہ ان کو اندر بٹھایا، گرمی کا زمانہ تھا اس لئے پنکھا جھلنے کے لئے کھڑے ہوگئے اور ٹھنڈا پانی پلایا، انھوں نے پھر کہا کہ میں بڑے مولوی صاحب سے ملنے کیلئے آیا ہوں ان کو اطلاع کردو۔

جواب میں فرمایا کہ گرمی کا موسم ہے آپ تھوڑا سا آرام فرمالیں، میں ابھی اطلاع کردیتا ہوں اب حضرت والا گھر کے اندر سے ٹھنڈا پانی اور شربت لے کر آئے اور آکر فرمایا کہ ہاں بڑے مولوی صاحب کو اطلاع ہوگئی ہے، ان شاء اللہ آپ کی ان سے ملاقات ہوجائے گی، پھر جب کھانے کا وقت آیا تو کھانا خود لاکر کھلایا، جب کھانا بھی کھالیا تو پھر پوچھا کہ بڑے مولوی صاحب

کہاں ہیں، انھوں نے کہا، آپ فکر نہ کریں ملاقات ہو جائے گی، گرمی کا موسم تھا، اس کو کھانا کھلا کر بستر پر لٹا دیا اور خود پنکھا جھلنا شروع کر دیا، وہ بیچارے تھکے ماندے تھے انھیں نیند آ گئی حضرت والا دوپہر بھر پنکھا جھلتے رہے، جب دوپہر کی اذان ہوئی تو اس وقت ان کی آنکھ کھلی، تو اب وہ بہت پریشان ہوئے اس لئے کہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ بڑے مولوی صاحب سے ملاقات کر کے ظہر کے بعد کی گاڑی سے واپس ہو جائیں گے، اب وہ ناراض ہو گئے کہ تمھیں اتنی دیر سے کہہ رہے ہیں کہ بڑے مولوی صاحب کو خبر کر دو، تم نے ان کو اب تک اطلاع نہیں کی، مجھے تو اب واپس جانا ہے اب حضرت نے فرمایا کہ یہاں کوئی بڑے مولوی صاحب تو رہتے نہیں ہیں، البتہ بندہ محمود تو میرا ہی نام ہے، تب حقیقت کھلی اور وہ پیروں میں پڑ گئے، فرمایا کہ آپ نے غضب کر دیا پہلے سے نہیں بتایا، بہرحال پہلے پہل دیوبند کا ایک ہی مولوی دیکھا جو اس شان کا دیکھا، چنانچہ عمر بھر یہ کہتے رہے کہ علماء دیوبند تو واقعی علماء دیوبند ہیں۔

حضرت تھانوی کی فنائیت

حقیقت یہ ہے کہ علماء دیوبند کا جو خاص امتیاز تھا وہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو مٹانا، اپنے کو کچھ نہ سمجھنا، جب میں تھانہ بھون میں حاضر ہوا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک شان جلال اور ایک رعب اور وجاہت عطا فرمائی تھی، چہرۂ مبارک بڑا وجیہ تھا اگر وہ اپنی وجاہت کو چھپانا بھی چاہیں تو نہیں چھپا سکتے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود طالب علموں اور دوسرے لوگوں میں ملے جلے رہتے تھے، ایک مرتبہ میں نے مغرب کے بعد دیکھا کہ ایک صاحب کرتا اتارے حوض کے پاس چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور پاس طلبہ بھی لیٹے ہیں، بعد میں پتہ چلا کہ حضرت لیٹے ہوئے ہیں، اس طرح ان حضرات کی خاص شان تھی، یہ چیز دنیا میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے، یہ خصوصی وصف اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کو دیا تھا، افسوس اب ہمارے پاس بزرگوں کی صحبت حاصل نہیں رہی، صرف مدرسے اور کتابیں رہ گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے اندر بھی یہ وصف پیدا فرمادے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی النبی الکریم محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

مخدومی مکرمی دامت برکاتہم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،۔

اس سے قبل کے عریضہ میں حاضری جلسہ سے جو مانع طبعی تھا اس کی اطلاع کی تھی جس کا مشاہدہ مکرمی مولوی . . . . صاحب نے بچشم خود فرمایا ہے اور ممکن ہے کہ وقت جلسہ تک یہ مانع مرتفع ہوجائے، اب بعض موانع شرعیہ کو محض استشارۃً پیش کرنا چاہتا ہوں، ہر چند کہ علماء کی خدمت میں ایسی جرأت کرنا خالی از سوئے ادب نہیں، مگر ایک طرف خیر خواہی کا جزو دین دمامور بہ ہونا پیش نظر، دوسری طرف آپ کی عنایات و الطاف پر اعتماد، پھر اس کے ساتھ ہی اپنی رائے کی غلطی کے نکل جانے کی امید، ان سب امور نے اجازت دی کہ بے تکلف اپنے خیالات کو ظاہر کردوں، اگر واقعی میری رائے غلط ہے تو میں دل سے خواہاں ہوں کہ اسکی اصلاح فرمادی جائے۔ حاصل ان موانع شرعیہ کا یہ ہے کہ جہاں تک غور کرکے اور تجربہ کی شہادت سے دیکھا جاتا ہے، بڑی غرض ان جلسوں کے انعقاد کی دو امر معلوم ہوتے ہیں فراہمی چندہ اور اپنی کارگذاری کی شہرت یا یوں کہئے کہ مدرسہ کی وقعت و رفعت، جس کا حاصل حب مال وحب جاہ نکلتا ہے جس سے نصوص کثیرہ میں نہی فرمائی گئی ہے۔

ہر چند کہ مال وجاہ اگر دین کے لئے مقصود ہوں تو مذموم نہیں، مگر کلام اسی میں ہے کہ ایسے مواقع پر یہ امور دین کے لئے مقصود ہیں یا دنیا کے لئے، سو گو نفس تاویل کرکے دین ہی کے لئے بتلاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ہر قصد کے لئے ایک خاص معیار بتایا ہے جس سے صحت یا

فساد قصد معلوم ہوجاتا ہے، سو ان مواقع میں جہاں تک غور کیا جاتا ہے علامت طلب دنیا کی غالب معلوم ہوتی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر دین مقصود ہوتا تو اس کے اسباب و طرق میں بھی کوئی امر خلاف رضائے حق تعالیٰ اختیار نہ کیا جاتا، اور جب ایسے امور اختیار کئے جاتے ہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مقصود ہے اور ان امور میں سے بعضے بطور انموذج یہ ہیں۔

(۱) چندہ کے حاصل کرنے میں قواعد شرعیہ کی رعایت نہیں کی جاتی، کیونکہ حکم شرعی ہے لا یحل مال امرئ الا بطیب نفسہ (بدون خوش دلی کے مسلمان کا مال لینا حلال نہیں) چندہ میں سوچ سوچ کردہ طریق اختیار کئے جاتے ہیں جس سے مخاطب کے قلب پر اثر پڑے گو وہ اثر دباؤ یا شرم و لحاظ سے کیوں نہ ہو ایسے لوگوں کو واسطہ بنایا جاتا ہے، مجمع میں ان کے روبرو فہرست بھی پیش کی جاتی ہے، شرکت جلسہ میں اصرار کیا جاتا ہے اور یقیناً معلوم ہے کہ بڑے آدمیوں کو خالی ہاتھ آنے میں سبکی و کم وقعتی کا اندیشہ ہوتا ہے بقایا کو مشتہر کرتے ہیں جس سے ان کو اپنی بدنامی کا خوف ہوتا ہے

(۲) حکم شرعی ہے کہ ریا حرام ہے اور اکثر ایسے مواقع پر دینے والوں کے دل میں ریا ہوتی ہے، اور ریا کا سبب بن جانا بھی معصیت ہے

(۳) اکثر اوقات علماء کا امراء کے دروازوں پر جانا اور ان سے تملق کی باتیں کرنا۔

(۴) جن اموال کو حلال نہیں کہتے اگر وہ بھی حاصل ہوں ہرگز انکار نہیں کیا جاتا، ممکن ہے یا واقع ہے کہ کسی غالب سود یا رشوت والے نے کچھ دیا ہو اور اس کو جلوت یا خلوت میں واپس کر دیا ہو۔

(۵) اپنے مدرسہ کو اصلی حالت سے اکثر زیادہ ظاہر کیا جاتا ہے تصریحاً یا ایہاماً جس کا حاصل کذب و خداع ہے

(۶) اگر کوئی شخص مدرسہ پر کسی قسم کا اعتراض کرے اور وہ حق بھی ہو تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے درپے ہو کر رد کرنے کی کوشش ہوتی ہے، گو دل میں اس کو حق سمجھتے ہیں، جس کا حاصل بطر حق ہے

(۷) اگر کوئی اور مدرسہ مقابلہ میں ہوجائے اور گو اس کی حالت واقع میں اچھی ہو مگر وہ ہمیشہ مثل خار نظر آتا ہے اور دل سے اسکے انہدام و انعدام کے متمنی رہتے ہیں، ورنہ خوش ہونے کی بات تھی کہ دین کا کام کسی جگہ ہو رہا ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ اس کی شہرت نہ ہوجائے اس میں چندہ کی بیشی اور اس میں کمی نہ ہوجائے ناگواری ہوتی ہے۔

(۸) کارروائی میں کارگذاری کا اظہار، اپنی مدح، اپنے مدرسہ کی ترجیح، اپنے کام کی خوبی وکثرت دکھلانا اور اس کی وجہ سے تعلیم کی کمیت کا کیفیت سے زیادہ اہتمام کرنا اور کتابیں بلا استعداد گھسیٹنا کہ کارروائی دکھلا سکیں، خواہ طالب علموں کو آئے یا نہ آئے، ان علامات میں سے اول چار حب مال لغیر الدین کی علامتیں ہیں اور مؤخر کی چار حب جاہ لغیر الدین کی علامات ہیں، اور فساد و منشار کی وجہ سے آثار بھی ایسے ہی مرتب ہوتے ہیں۔

(۹) اکثر ایسے جلسوں میں اسراف ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو بلانے کی ضرورت نہیں ان کے اور ان کے رفقاء و خدام کے کرایہ میں بہت سے روپے جاتے ہیں، بعض اوقات طعام وغیرہ کا بھی مدرسہ سے اہتمام ہوتا ہے جس میں تکلفات ہوتے ہیں اور ساتھ میں غیر اضیاف بھی کھاتے ہیں، اور غالباً بلکہ یقیناً روپئے والوں سے اذن نہیں لیا جاتا، اور دلالت اذن کا بھی دعویٰ مشکل ہے کیونکہ اہل عطار خود ایسے مصارف کی مذمت کیا کرتے ہیں۔

(۱۰) بعض جگہ مسجد میں ایسے جلسے ہوتے ہیں اور مسجد کے ساتھ بیٹھک کا سا برتاؤ ہوتا ہے، شور و شغب، دنیا کی باتیں، اشعار مذمومہ، اور بہت سے منکرات جو مشاہدہ سے متعلق ہیں، جب مسجد میں وہ امور مباحہ بھی ناجائز ہیں جن کے لئے موضوع نہیں، تا بہ منکرات چہ رسد۔

(۱۱) ایسی کارروائیوں سے بجائے وقعت و عزت مقصودہ کے اہل علم کی ذلت و حقارت اہل دنیا کی نظر میں ہوتی ہے، کیونکہ اصل عزت استغنار ہے اور اس تحقیر کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی اولاد کیلئے علم دین کو پسند نہیں کرتے، یہی انجام ان کا ہوگا، گویا یہ حالت صناعت للغیر کا ایک شعبہ ہے

(۱۲) تکثیر سواد طلبہ و مخلصین کے دکھلانے کو نا اہلوں کو اہل دکھلایا جاتا ہے وقس علی ہذا، اگر یہ خیالات قابل اصلاح ہوں تو اصلاح فرما دیجئے، ورنہ میں عمل اور قبول کرنے پر جبر نہیں کرتا مگر اتنی مدد میری غیر حاضری کیلئے ان کو وجہ وجیہ قرار دیا جائے اور معاف فرمایا جائے۔ فقط والسلام

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق
تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی
حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جا رہا ہے، یہ کام چونکہ اہم
بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ
و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی
احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھا لیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات
معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح
بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی
مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں
نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ
بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس
کار خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی
ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے، آمین۔

پتہ

ڈرافٹ و چیک کیلئے: دارالعلوم دیوبند — اکاونٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند
منی آرڈر کے لئے: (حضرت مولانا) مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند — پن کوڈ نمبر 247554

جلد نمبر ۷۹
شمارہ نمبر ۷

ماہ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۴ء

فی شمارہ ۶/=
سالانہ ۶۰/=

نگران
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ	۳۰۰/۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم	۱۰۰/=
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم	۸۰/=

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند۔ سہارنپور، یو پی

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق [illegible] قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں

مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

برصغیر میں خود کفیل مدارس دینیہ کے قیام کی ایک تاریخ ہے اس لئے ان مدارس کے بارے میں ان کے تاریخی تناظر سے آنکھ بند کرکے کوئی فیصلہ نہ صرف ان مدارس کے ساتھ ناانصافی ہوگی بلکہ فیصلہ کرنے والوں کی کم نظری اور بے بصیرتی کا ثبوت ہوگا، ہمارے ملک کا جدید عنصر جو تہذیب مغرب کے قدموں پر اپنے تمام تاریخی ورثہ کو نچھاور کرنے کے لئے تیار ہے، اور اسلامی تہذیب کو فنا کرنے میں خود اہل مغرب سے زیادہ سرگرم عمل ہے، مشرقی تہذیب سے بیزار یہ عنصر مدارس اسلامیہ کو ان کے منہاج اور اصول سے ہٹاکر انھیں مغربی تہذیب کی ترویج کے لئے بطور ایک آلۂ کار استعمال کرنا چاہتا ہے، یہ طبقہ اپنے کام میں اس قدر مستعد ہے کہ آئے دن اخباروں میں آرٹیکل اور مضامین لکھتا رہتا ہے اور بڑے بڑے سیمناروں کا انتظام واہتمام بھی کرتا ہے، جن کے ذریعہ یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ان مدارس کا نظام تعلیم فرسودہ، نصاب درس از کار رفتہ اور طریق تربیت ناقص ومہمل ہے اس لئے ان مدارس کے فضلاء پڑھنے لکھنے کے باوجود ان پڑھ اور راجڈ ہوتے ہیں، چنانچہ اس جماعت کے ایک رکن نے چند مہینے پہلے قومی آواز دہلی کے ایک شمارہ میں مسلمانوں کا تعلیمی جائزہ لیتے ہوئے صاف لفظوں میں مدارس کے فارغ التحصیل فضلاء کو ان پڑھوں کی فہرست میں شمار کیا تھا۔

خود مسلمانوں کے ایک طبقہ کا اسلامی درسگاہوں کے ساتھ یہ رویہ ہے، دوسری جانب حکومت کی مشینری اور ریاستوں کے ذمہ دار مدارس کے خلاف بے بنیاد بیانات اور بے جا احکامات جاری کرکے مشکلات کھڑی کرتے رہتے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ اہل مدارس سر جوڑ کر بیٹھیں

اور مدارس کی کارکردگی کا جائزہ لے کر اس سلسلے میں مناسب فیصلے اور اقدام کریں، چنانچہ دارالعلوم دیوبند نے جو برصغیر میں ام المدارس کی حیثیت رکھتا ہے پیش قدمی کرتے ہوئے ارباب مدارس کو دعوت دی کہ وہ یکجا ہو کر ماضی کی تاریخ اور حال کے نتائج کی روشنی میں مستقبل کے بارے میں لائحہ عمل مرتب کریں۔

بحمداللہ ارباب مدارس دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تاریخ مقررہ پر جمع ہوگئے اور پوری گرم جوشی کے ساتھ اجتماع کے سارے پروگراموں میں شرکت کی اور بالغ نظری کے ساتھ متفقہ قرار دادیں منظور کیں اگر یکجہتی و مستعدی کے ساتھ ان قراردادوں کو روبعمل لایا گیا تو ان شاءاللہ مدارس دینیہ میں نئی زندگی بیدار ہوجائے گی، تجاویز کا متن حسب ذیل ہے۔

تجویز ۱: نصاب تعلیم

مدارس اسلامیہ کا یہ نمائندہ اجتماع اتفاق رائے سے نام نہاد دانشوروں کی ان تمام دخل اندازیوں کو رد کرتا ہے جو موقع بموقع مدارس کے نصاب کو بدلنے اور ان کی روح کو مجروح کرنے کے سلسلہ میں کی جاتی رہتی ہیں، اور اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ مدارس اسلامیہ کا اصل مقصد ایسے مخلص رجال کار کی تیاری ہے جو خالص دینی مزاج رکھتے ہوئے اسلامی علوم کی نشر واشاعت اور اصلاحِ امت کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ دشمنان اسلام اور فرق باطلہ کی سازشوں کا دفاع بھی کرسکیں، ان اداروں سے معاشی تکفل کی صلاحیت پیدا کرنا اصلاً مقصود نہیں ہے کہ اس کے لئے کسی دنیوی علم وفن کی تحصیل ضروری ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنے اس مقصد اصلی کی تکمیل کے لئے مدارس کا موجودہ نصاب تعلیم مفید اور پورے طور پر نتیجہ خیز ہے، اس لئے یہ اجتماع نصاب تعلیم میں کسی بنیادی تبدیلی کو مدارس کے مقاصد اصلیہ کے لئے شدید مضرت رساں بلکہ ان کی روح کو ختم کرنے کے مرادف سمجھتا ہے البتہ نصاب کی افادیت بڑھانے کے لئے جس طرح ماضی میں ضروریات کے پیش نظر جزوی اصلاحات ہوتی رہی ہیں، اسی طرح یہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ اس وقت بھی صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ جزوی اصلاحات کی جائیں۔

یہ نمائندہ اجتماع ارباب دارالعلوم سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ایک نمائندہ نصاب

کمیٹی تشکیل دیں جو مجوزہ نصاب پر نمائندوں کی پیش کردہ ترمیمات و اضافات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک جامع مفصل نصاب کا خاکہ تیار کرے اور اسے آئندہ تعلیمی کانفرنس میں پیش کرے تاکہ یکساں نصاب تعلیم تمام دینی مدارس میں جاری کرنے کی راہ ہموار ہو سکے۔

تجویز ۲ :- طریقۂ تعلیم

مدارس اسلامیہ کا یہ نمائندہ اجتماع اس بات کو شدت سے محسوس کرتا ہے کہ آج علمی صلاحیتوں کے فقدان کی اصل وجہ ہمارے طلبہ و اساتذہ میں محنت کی کمی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے اور بعض موقعوں پر ضرورت سے زیادہ تقریروں سے بھی طلبہ کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوپاتا، اس لیے طویل غور و خوض کے بعد یہ اجتماع اس نتیجہ پر پہونچا کہ استاد کو ابتدائی درجات میں کتابوں کی تفہیم کے لئے خارجی مقالوں اور تمرین و اجراء کا اہتمام کرنا چاہئے، اور متوسط درجوں میں بھی طلبہ کی استعدادوں کے مطابق بقدر ضرورت تفصیل کرنی چاہئے، البتہ درجات عالیہ میں حسب موقع بسط و شرح سے کام لیا جائے، اسی طرح یہ نمائندہ اجتماع مناسب سمجھتا ہے کہ طرز تدریس کی تربیت کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

نیز یہ اجتماع دارالعلوم سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی کمیٹی تشکیل دے جو غور و خوض کے بعد ارباب انتظام، اساتذہ اور طلبہ کیلئے جامع ضابطہ ہدایات مرتب کرے۔

تجویز ۳ :- نظام تربیت

مدارس اسلامیہ کا یہ نمائندہ اجتماع اس طرف توجہ دلانا بھی ضروری خیال کرتا ہے کہ ہمارے مدارس سے اس وقت تک پوری طرح مفید اثرات نہیں نکل سکتے جب تک کہ تربیت کا بہتر اور مربوط نظم نہ ہو، اور تزکیۂ باطن کی طرف مکمل توجہ نہ دی جائے، اس لئے یہ اجتماع تجویز کرتا ہے کہ اہل مدارس اپنے طلبہ اور کارکنان میں خاص طور پر مخلصانہ جذبات اور للّٰہیت پیدا کرنے کے لئے مفید اور بار آور اقدامات کی طرف بھرپور توجہ دیں اور انھیں صاحب نسبت بزرگوں سے استفادہ کی ترغیب دیں، اسی طرح دیوبندی فکر، اکابر و اسلاف کے مشن اور ان کے کارناموں سے بھی موقع بموقع روشناس کراتے رہیں ــ یہ نمائندہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ تربیت کا فریضہ انجام دینا ارباب انتظام اور حضرات اساتذہ کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

تجویز ۴ :- متحدہ نظام

مدارس اسلامیہ کا یہ نمائندہ اجتماع مدارس کی داخلی و خارجی مشکلات کے حل اور تعلیمی معیار کی بلندی کے لئے اس ضرورت کا شدت سے احساس کرتا ہے کہ دار العلوم کے فکر سے وابستہ تمام مدارس کا ایک مربوط اور متحدہ نظام قائم ہو، جس کے ذریعہ متحدہ طور پر مشکلات کو رفع کرنے کی جدوجہد کی جاتی رہے، لیکن چونکہ یہ مسئلہ اہمیت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر نہایت نزاکت اور پیچیدگی بھی رکھتا ہے، اس لئے اس بارے میں فی الوقت کوئی آخری فیصلہ کرنے کے بجائے ایک نمائندہ کمیٹی تشکیل دینا مناسب ہوگا جو اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے ایسا جامع لائحہ عمل تیار کرے جو سبھی مدارس کے لئے قابل قبول ہو اور نفع بخش ثابت ہو سکے۔

تاہم ابتدائی مرحلہ میں اجتماع مناسب سمجھتا ہے کہ دار العلوم میں ایک ایسا رابطہ کا دفتر قائم کیا جائے جو اپنے سے منتسب دینی اداروں سے تعلیمی رپورٹوں کے حصول کی جدوجہد کرے، اور ضرورت کے وقت مدارس کے جائزہ کے لئے مشاہدین کے دوروں کا بھی نظم کرے، تمام مدارس کو بھی چاہئے کہ وہ ہر سال اپنی تعلیمی کارکردگی کی رپورٹیں رابطہ دفتر کو ارسال کرتے رہیں۔

تجویز ۵ :- مدارس کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈوں کی مذمت

مدارس اسلامیہ کا یہ نمائندہ اجتماع وزیر داخلہ ہند اور وزیر اعلیٰ مہاراشٹر کے ان بے بنیاد بیانات کو غیر ذمہ دارانہ خیال کرتا ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ "پاکستان کی خفیہ تنظیم آئی ایس آئی نے منصوبہ بنایا کہ وہ اپنے افراد کو ہندوستان کے مساجد و مدارس میں پھیلائے "

اسی طرح یہ اجتماع ہفت روزہ سنڈے میل مدراس (۲۶ جون ۲ جولائی ۱۹۹۳ء) میں شائع شدہ اشونی بھٹناگر کے اس بے بنیاد مضمون کی سخت مذمت کرتا ہے جس میں "دیوبندی مکتب خیال اور عقائد کے حامی افراد اور ان کے مدارس کو کشمیر میں شورش پیدا کرنے کے نئے پاکستانی منصوبہ کی اعانت کرنے کا مجرم گردانا گیا ہے" درحقیقت یہ مضمون مدارس اسلامیہ کے پاکیزہ کردار کو مجروح کرنے کے سلسلے کی ایک منظم اور مجرمانہ سازش ہے۔

یہ اجتماع پورے وثوق کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ ان مدارس کا اس قسم کی وطن دشمن تخریب کاری سے کسی قسم کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

از: پروفیسر ماجد علی خاں، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

اس صدی میں (یعنی چودہویں صدی ہجری یا بیسویں صدی عیسوی) میں اللہ تعالیٰ نے تصوف کے احیاء کا اور قرآن و سنّت کے مطابق تزکیۂ نفوس کا جو کام علماء دیوبند سے لیا ہے وہ اس طرح کسی اور طبقہ سے نہیں لیا گیا۔ یہاں علماء دیوبند سے صرف دارالعلوم دیوبند کے فارغ فضلاء مراد نہیں ہیں بلکہ قاری محمد طیّب صاحب قدس سرہٗ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) کے الفاظ میں:

"علماء دیوبند سے صرف وہ حلقہ مراد نہیں جو دارالعلوم دیوبند میں تعلیم و تدریس یا افتاء و قضاء یا تبلیغ و موعظت یا تصنیف و تالیف وغیرہ کے سلسلہ میں مقیم ہے بلکہ وہ تمام علماء مراد ہیں جن کا ذہن و فکر حضرت اقدس مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے فکر و نظر سے چل کر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت سے جڑا ہوا اور بانیان دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ قدس اللہ اسرارہم کے ذوق و مشرب سے وابستہ ہے خواہ وہ علمائے دارالعلوم دیوبند ہوں یا علمائے مظاہر علوم سہارنپور، علمائے مدرسہ شاہی و امدادیہ و حیات العلوم و جامع الہدیٰ مرادآباد ہوں یا علمائے مدرسہ جامع مسجد و جلّہ امروہہ، علمائے مدرسہ امینیہ و عبدالرب و فتحپوری دہلی ہوں یا علمائے مدرسہ کاشف العلوم بستی حضرت نظام الدین، علمائے مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد، مدرسہ نورالاسلام و مدرسہ دارالعلوم[1] و مدرسہ امدادیہ چھاؤنی میرٹھ ہوں۔ یا علمائے مدارس مئو اعظم گڑھ، علمائے جامعہ رحمانیہ مونگیر و دیگر مدارس بہار ہوں یا علمائے جامعہ

[1] احقر راقم السطور (ماجد علی خاں) کو اسی مدرسہ سے دورۂ حدیث کرنے و دیگر کتب پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اشرفیہ وحسینیہ راندیر یا دیگر مدارس گجرات، علمائے مدراس وآسام ہوں یا دیگر صوبجات واضلاع ہند کے سینکڑوں مدارس کے علماء، خواہ وہ تعلیمی سلسلوں میں مصروف کار ہوں یا تمدن وسیاست اور اجتماعیات کی لائنوں میں کام کر رہے ہوں یا تبلیغی سلسلہ سے دنیا کے ممالک میں پھیلے ہوئے ہوں یا تصنیفی سلسلوں میں مشغول ہوں، پھر وہ یورپ وایشیا میں ہوں یا افریقہ وامریکہ میں، سب کے سب علمائے دیوبند کے عنوان کے نیچے آئے ہوئے ہیں، اور علمائے دیوبند ہی کہلاتے ہیں "[1]

قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ اس سلسلہ میں مزید تحریر فرماتے ہیں۔

" علمائے دیوبند یا جماعت دیوبند کی یہ نسبت دیوبندیت یا قاسمیت کوئی وطنی یا قومی یا فرقہ داری نسبت نہیں بلکہ صرف ایک تعلیمی نسبت ہے جو مقام تعلیم (دیوبند) یا مدار روایت شخصیت (حضرت قاسم العلوم) کی نسبت سے معروف ہوگئی ہے، جس سے اس جماعت کا تعلیمی انتساب اور اس کی روایت ودرایت کا استناد واضح ہوتا ہے اس لئے یہ کسی پارٹی یا فرقہ کا لیبل اور عنوان نہیں .... علمائے دیوبند اپنے دینی رخ اور مسلکی مزاج کے لحاظ سے کلیۃً اہل السنت والجماعت ہیں، نہ وہ کوئی نیا فرقہ ہے، نہ نئے عقائد کی کوئی جماعت ہے جسے وقت اور ماحول نے پیدا کردیا ہو.........."[2]

علمائے دیوبند کے مسلک کا خلاصہ قاری صاحب قدس سرہٗ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

" اس لئے علمائے دیوبند کے مسلکی مزاج کا خلاصہ حسب منشاء حدیث نبوی مختصر الفاظ میں " اتباع سنت بتوسط اہل الانابت" یا تعمیل دین بہ تربیت اہل یقین یا اتباع دین ودیانت بہ تربیت اہل السنۃ یا انصباغ قلوب بصبغۃ علام الغیوب یا اتباع اوامر اللہ بصحبت اولیاء اللہ " نکل آیا۔"[3]

---

[1] قاری محمد طیب صاحب ۔ علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج، مکتبہ ملت دیوبند (تاریخ طباعت درج نہیں غالباً ۱۹۸۰ء وغیرہ میں طبع ہوئی ۔ ص ۲۲

[2] مولانا قاری محمد طیب صاحب، حوالہ مذکورہ ص ۲۲ و ۲۳

[3] " " ص ۱۹۳ ۔

ایک اور مقام پر حضرت قاری مولانا محمد طیب صاحب قدس سرۂ تحریر فرماتے ہیں۔

" علمائے دیوبند کے اس دینی رخ اور مسلکی مزاج کی نسبتوں سے اگر انھیں پہچنوایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ دیناً مسلم ہیں، فرقۃً اہل سنت والجماعت ہیں، مذہباً حنفی ہیں، کلاماً ماتریدی واشعری ہیں، مشرباً صوفی ہیں، سلوکاً چشتی ہیں، بلکہ جامع سلاسل ہیں، فکراً ولی اللّٰہی ہیں، اصولاً قاسمی ہیں فروعاً رشیدی ہیں، بیاناً یعقوبی ہیں اور نسبتاً دیوبندی ہیں۔ والحمدللہ علی ہذہ الجامعیۃ" [۵]

حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کا اس سلسلہ میں آخری اقتباس ملاحظہ ہو۔

" اس طرح دین کے مختلف شعبوں کی ظاہری اور باطنی نسبتیں مختلف ارباب نسبت اہل اللہ کی توجہات وتصرفات سے انھیں حاصل ہوئیں جنھوں نے مل کر اور یک جا ہو کر ایک مجموعی اور معتدل مزاج پیدا کرلیا جسے دارالعلوم دیوبند نے سنبھال رکھا ہے مسلک علمائے دیوبند کے اسی جامع اور معتدل مزاج کو دیکھ کر شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے "دیوبندیت" کے بارہ میں ایک جامع بلیغ جملہ استعمال کیا تھا، جب ان سے کسی نے پوچھا کہ یہ دیوبندی کیا کوئی مذہب خاص ہے یا کوئی فرقہ ہے؟

" کہا: نہیں، ہر معقول پسند دیندار کا نام دیوبندی ہے"

بہرحال اسی جامعیت اصول وشخصیت کے امتزاج سے پیدا شدہ مسلک کا نام دیوبندیت اور قاسمیت ہے محض درس نظامی کی کتابیں پڑھنے پڑھانے کا ہی نام دیوبندیت نہیں ہے .... " [۶]

مختصراً "علمائے دیوبند" کوئی ایسا فرقہ یا جماعت نہیں ہے جس نے جمہور امت سے ہٹ کر فکر وعمل کی کوئی الگ راہ نکالی ہو [۷] بلکہ دیوبندی مسلک افراط وتفریط سے الگ اعتدال کا مسلک

---

[۵] قاری مولانا محمد طیب صاحب، حوالہ مذکورہ بالا، ص ۱۹۳۔

(نوٹ۔ احقر راقم السطور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ان اکابر کو بھی جو مسلک دیوبند پر ہیں دیوبندیوں میں ہی شمار کرتا ہے)

[۶] قاری مولانا محمد طیب صاحب، حوالہ مذکورہ ص ۱۹۳ و ۱۹۴۔ [۷] حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، پیش لفظ علی۔ علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج، ص ۷۔

ہے اور موجودہ دور میں "امۃً وسطاً" کی تعبیر ہے جس میں دوسرے فرقوں اور مسلکوں کی طرح نہ افراط ہے اور نہ تفریط، نہ تو بدعت، نہ ہی خارجیت اور اعتزال، اور نہ ہی شیعیت، اور نہ تو انکار ائمہ وصوفیاء واولیاء اور نہ ہی انکار تقلید، اس طرح اہل البدعۃ اور منکرین تقلید واولیاء کے درمیان یہ ایک توسط واعتدال کی راہ ہے، دراصل توسط واعتدال ہی کے راستہ کو اختیار کرنے کا ہم کو حکم بھی دیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (البقرۃ، ۱۴۳)

"اور ہم نے تم کو ایک ایسی امت بنایا ہے جو (ہر پہلو) سے نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو اور تمھارے لئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں"

یہ اس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے جنھوں نے بحکم خداوندی اعلان کیا ہے:۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الانعام ۱۵۳)

اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے، جو کہ مستقیم (سیدھا) ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس کا تمکو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم (اس راہ کے خلاف سے) احتیاط رکھو۔"

دیوبند کے مسلک پر قائم اور اس سے متفق علماء نے اس دور میں جس طرح خدمت دین انجام دی ہے وہ یقیناً بذات خود ایک مثال ہے، چاہے وہ علم حدیث ہو یا تفسیر، فقہ اور فتاوی ہوں یا علم کلام وعقائد حقہ، سلوک وتصوف اور طریقت ہو یا فلسفہ اور تاریخ وسیرت، غرض دین کے ہر شعبہ کی خدمت اللہ نے اس طبقۂ علماء سے لی ہے۔

تصوف میں جس طرح بدعات کو سمو دیا گیا تھا اور بدعات کا دوسرا نام تصوف کر دیا گیا تھا بلکہ اب بھی ایک بڑا طبقہ انھی بدعات کو تصوف کا جزو لاینفک سمجھتا ہے۔ اس کو بدعات سے پاک کرکے

نکھار کے اور اس فن کا جلاء کر کے جس طرح علماء دیوبند نے پیش کیا ہے وہ ایک زبردست کارنامہ ہے، اس کو آنے والی نسلیں سنہری الفاظ میں لکھیں گی، اس دور میں دراصل تصوف کو پوری طرح قرآن وسنت کے تابع کرنا صرف علماء دیوبند کا ہی حصہ ہے۔

شاملی کے جہاد حریت اور ہجرت مکہ کے بعد حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رح کا جہاد ختم نہیں ہوا بلکہ آپ کے علمی و روحانی فیوضات کا سلسلہ جاری رہا، ان ہی فیوضات کے نتیجہ میں آپ کے اکابر خلفاء میں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ نے ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی جو اسلام کا محفوظ قلعہ اور مسلمانوں کا ناقابل شکست حصار ثابت ہوا، ادھر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے گنگوہ میں درس حدیث وافتاء کے ساتھ ساتھ ارشاد وتلقین اور سلوک وتصوف کا زبردست سلسلہ شروع کیا، بعد میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کے ایک اور نوعمر خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے تھانہ بھون میں تقریباً نصف صدی تک خود حاجی صاحب کی قائم کردہ خانقاہ میں بیٹھ کر طریقت وسلوک کے دریا بہائے نیز مسلمانوں کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاح کا کام کر کے دین کی زبردست تجدیدی خدمت انجام دی۔

بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں دیوبند سے دو زبردست روحانی سلسلے جاری ہوئے اور سلوک وطریقت کے دو چشمے پھوٹے، ایک کا منبع تھانہ بھون میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی شکل میں تھا اور دوسرے کا منبع خود دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح قدس سرہٗ کی شکل میں تھا جو حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی رح کے خلفاء میں سے تھے، برصغیر کے گوشہ گوشہ سے لوگ کھنچ کھنچ کر ان دونوں اکابر تک آتے اور دین کی جس آواز کو انھوں نے بلند کیا تھا وہ دور دور تک پہونچائی۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہما اللہ تعالیٰ میں معمولی سیاسی اختلاف ضرور تھا، لیکن دونوں حضرات ایک دوسرے کا اکرام وعزت

کرتے تھے ۔ ان دونوں حضرات کے سیاسی اختلافات کبھی بھی ذاتی اختلافات نہیں بنے اس سلسلہ میں راقم السطور ذیل میں وہ خط پیش کر رہا ہے جو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمہ نے مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کو تھانہ بھون لکھا تھا جس میں حضرت حکیم الامت کے لئے "مولانا دامت برکاتہم" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، بعد میں حضرت حکیم الامت کا جواب حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رح کے نام ہے، ان خطوط کے پڑھنے کے بعد قارئین کو اندازہ ہوگا کہ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا کس قدر احترام کرتے تھے ۔

(نوٹ :۔ ان خطوط کے پس منظر کے سلسلے میں یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ پہلے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی "حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح سے بیعت ہونے کیلئے دیوبند گئے تھے ۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام نے بیعت نہیں کیا بلکہ دونوں حضرات کو تھانہ بھون حضرت حکیم الامت سے بیعت کرانے خود لے گئے[ث] لیکن حکیم الامت حضرت تھانوی رح نے بھی بیعت نہیں کیا اور حضرت شیخ الاسلام سے باصرار بیعت کروایا ۔ البتہ خط و کتابت اور تعلیم حضرت تھانوی قدس سرہ کی رہی، خود اس واقعہ سے بھی اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا کتنا احترام فرماتے تھے، اس کی تفصیل میں "حکیم الامت، نقوش و تأثرات" مصنفہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے شروع کے صفحات ملاحظہ فرمائے جائیں اس میں یہ تفصیل بھی موجود ہے کہ جب حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی تھانہ بھون تشریف لے گئے تو حضرت تھانوی رح نے ان کی کس طرح عزت اور مہمان نوازی کی اور ان کی وجہ سے اپنے بعض معمولات چھوڑ دیئے[۹] ")

خط حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رح بنام مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

(نوٹ) یہ خط مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی رح کو تھانہ بھون قیام کے دوران ملا تھا

ث مولانا عبدالماجد دریابادی، حکیم الامت، نقوش و تأثرات، الہ آباد ۱۹۹۰ء ص ۱۲ تا ۱۴
۹ " " " " " ص ۸۹ و ۹۰

غالبًا بارہ بنکی یا لکھ ۔ تھانہ بھون حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی ؒ کے ایماء سے آنا ہوا تھا اور تھانہ بھون آنے سے قبل دیوبند حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی ؒ کو اطلاع دی گئی تھی، چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ؒ خط نقل کرنے سے قبل تحریر کرتے ہیں: "یاد ہوگا کہ جولائی ۱۹۲۸ء میں میری بیعت ضابطہ سے حضرت [1] ہی کے حسب مشورہ وایماء مولانا حسین احمد صاحب مدظلہٗ کے ہاتھ پر ہوئی تھی، تفصیل سب اوپر گذر چکی ہے، تھانہ بھون کے قیام کو اب کی ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ مولانا کا مکتوب [2] ذیل، دیوبند سے موصول ہوا۔")

محترم المقام ۔ زید مجدکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ محررہ ۱۶ اکتوبر باعث سرفرازی ہوا تھا، اب تو جناب خانقاہ میں پہونچ گئے ہوں گے، خداوند کریم وہاں کی حاضری باعث برکات لامتناہیہ کرے، آمین۔

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی ؛ بیاد آر محبان بادہ پیما را

مجھکو قوی امید ہے کہ آنجناب وہاں پر اپنے اوقات کو مشاغل حقیقیہ میں صرف فرمائیں گے جن کے متعلق ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں۔

البتہ ایک ضروری عرض محض اخلاص کی بنا پر کرتا ہوں، اور امیدوار ہوں کہ کسی غیر محمل پر حمل نہ فرمائیں ہیں نے حسب الارشاد حضرت مولانا دامت برکاتہم [3] (یعنی حضرت تھانوی قدس سرہٗ) اور آپ حضرات کے اصرار پر، اس وقت بیعت کر لیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بدحالی، روسیاہی، ناکامی پر نہایت درجہ گریہ کناں ہوں، اور سخت شرمندہ، اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا دامت برکاتہم کے دربار میں پہونچا دیا ہے، اور مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے انس اور تعلق پیدا ہو گیا ہے، وللہ الحمد، اللّٰھم زد فزد، اب مناسب اور ضروری ہے کہ آپ مولانا

---

[1] (نوٹ: مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ؒ نے لفظ "حضرت" حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی ؒ کے لئے اور لفظ "مولانا" حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی ؒ کے لئے استعمال کیا ہے۔

[2] (نوٹ: اس خط میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی ؒ نے لفظ "مولانا" سے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی مراد لئے ہیں۔

سے بیعت بھی کرلیں، مجھے قوی امید ہے کہ مولانا دامت برکاتہم آپ کو نہ ٹالیں گے، میں نے خود ان دنوں جب حاضر ہوا تھا یہی عرض کیا تھا کہ آپ جب تشریف لائیں اور درخواست کریں تو جناب ان کو ضرور بیعت کرلیں۔ قواعد طریقت کے اصول پر بیعت کرلینا ہی زیادہ تر مفید اور کارآمد ہے اسی کی بنا پر فیض کی زیادہ تر امید ہے۔

مجھ روسیاہ کو بھی کبھی کبھی دعوت صالحہ سے یاد فرمالیا کریں، نیز مولانا دامت برکاتہم سے بھی دعاء کی التجا کردیا کریں۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ دیوبند، ۲۰ رجمادی الاول ۱۳۴۸ھ "

اس خط کے بعد مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی "تحریر کرتے ہیں۔

"مشورہ یا ارشاد بزرگانہ، مخلصانہ، مشفقانہ سب کچھ سہی، بہرحال ناقابل عمل تھا، اکتوبر ۱۹۲۹ء میں بھی اسی طرح ناقابل عمل ہے جس طرح جولائی ۱۹۲۸ء میں تھا، وہ گرامی نامہ بجنسہ حکیم الامتؒ کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔ ارشاد ہوا کہ "اس کا جواب میں لکھ دوں گا، آپ کو لکھنے میں شاید دقت ہو" اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے تھا، یہی مقصود بھی تھا، اصل مکتوب پڑھ لینے کے بعد اب اس جواب سے مشرف ہولیں"۔[۱۲]

مخدومی ومکرمی مولانا حسین احمد صاحب دامت فیضہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولوی عبدالماجد صاحب کے نام جو گرامی نامہ آیا اس میں مشورہ تحویل بیعت کا پڑھا، گو اس وجہ سے کہ میں اس کا مخاطب نہیں، مجھ کو جواب عرض کرنے کا استحقاق نہیں لیکن چونکہ اخیر تعلق مجھ سے ہے نیز اس میں مجھ کو مخاطب بنانے کی یاد دہانی بھی ہے اس لئے عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

مجملاً وہی عذر ہے جو زبانی عرض کیا تھا اور قدرے مفصلاً یہ عرض ہے کہ اس میں مولوی صاحب کا ضرر ہے، اس لئے امید ہے کہ اس مشورہ سے رجوع فرمائیں گے، وہ ضرر یہ ہے کہ میری خشونت وسوء خلق تو مشہور ہے، مگر مولوی صاحب کی یہ رعایت ودلجوئی جو صمیم قلب سے ہے وہ آپ ہی کے انتساب سے مسبب ہے، کیا آپ کو یہ گوارہ ہے کہ وہ اس رعایت

---

[۱۲] مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادیؒ، حکیم الامت۔ نقوش وتاثرات، ص ۹۱۔

سے محروم کر دیئے جائیں، دوسرے گو ان کو مجھ سے موافقت کافی ہے لیکن نفع کا مدار اعظم مناسبت ہے اس کو میں پہلی ملاقات میں طے کر چکا تھا، اور اسی بنا پر آپ نے میری سفارش کو قبول فرمایا جس کا میں شکر گذار ہوں، اور اگر ان بناؤں کو آپ ضعیف خیال فرمائیں تو میں بھی ان کی تقویت پر زور نہیں دیتا، لیکن جب اول بار میں بہ قول خود میری خاطر منظور تھی، سو اب بھی میری خاطر منظور فرمائی جائے، اور جس طرح سے کام چل رہا ہے، چلنے دیا جائے کہ آپ ان کے مخدوم رہیئے اور مجھ کو خادم رہنے دیجیے[۱۲] اس جدید تبدل میں میری اور ان کی دونوں کی پریشانی مضمر ہے، جس کا گوارہ کرنا اخلاق سامی سے بعید اور بہت بعید ہے اور جب اس کا مجھ پر مدار ہے اور میری طرف سے محض انکار ہے تو مولوی صاحب کو ایسی بات کا حکم فرمانا جو ان کی قدرت سے خارج ہے، تکلیف مالایطاق ہے جو ہر پہلو سے منفی ہے

والسلام : ناکارہ ننگ انام، اشرف برائے نام، از تھانہ بھون۔

جمادی الاول ۱۳۴۸ھ۔[۱۳]

ان خطوط سے ظاہر ہے کہ ہر دو حضرات حکیم الامت مولانا تھانویؒ اور شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ میں ایک دوسرے کا احترام اور ایک دوسرے کی عزت دل و جان سے تھی، مولانا صبغۃ اللہ بختیاری صاحب تحریر کرتے ہیں۔

" حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا کہ آپ کتابیں تصنیف نہیں کرتے۔ فرمایا کہ مولانا تھانویؒ نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بہت کافی ہیں، قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف پر کتابوں کا ڈھیر لگا دیا ہے، وہ حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ اور حضرت گنگوہیؒ کے فیض یافتہ تھے، حضرت مولانا شاہ امداد اللہ فاروقی تھانویؒ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ تھے، تصوف میں ان کی لکھی ہوئی چیزیں بہت کام کی ہیں "[۱۴]

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے بلند اخلاق پر تبصرہ کرتے ہوئے

---

[۱۲] اس سے مراد تعلیم و تربیت ہے، چنانچہ حکیم الامت قدس سرہٗ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کو تعلیم (یعنی تعلیم طریقت) دیتے رہے

[۱۳] مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادیؒ، حوالہ مذکورہ، ص ۹۱ و ۹۲۔

[۱۴] مولانا صبغۃ اللہ بختیاری صاحب، دارالعلوم دیوبند، الاحسان نمبر اپریل، مئی، جون ۱۹۵۸ء جلد ۲ شمارہ ۱۰، ۱۱، ص ۱۲۹

مولانا عبدالماجد دریاآبادی تحریر کرتے ہیں:

"مولانا مدنی کے سیاسی خیالات جو کچھ بھی ہوں اور اجتہادی غلطیاں تو صحابۂ کرام تک سے ہوئیں بلکہ مذہب اہل سنت کا دار و مدار ہی کہنا چاہیے کہ غیر نبی کے غیر معصوم ہونے کے عقیدہ پر ہے، لیکن جہاں تک تواضع، ضبط نفس، ایثار و انکسار اور جذبۂ خدمت خلق کا تعلق ہے مولانا حسین احمد صاحب کی ذات اپنی جگہ بے نظیر ہے، ہاں خود ان کے استاذ شیخ الہند کی نظیر ہو تو ہو، یا پھر ان ہی کے بڑے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی مہاجر مدنی تھے

قوم عجیب افراط و تفریط کے مرض میں اندھا دھند مبتلا ہے، کسی سے خوش ہوئے تو اسے پوجنے لگے، خفا ہوئے تو گالیاں دینے اور لعنت برسانے لگے، گویا ان کا لیڈر یا امیر فرشتہ ہو اور اگر فرشتہ نہیں ہے تو پھر شیطان کے ادھر کا کوئی درجہ نہیں، توازن و اعتدال کا گویا قحط پڑ گیا ہے، اور اشخاص و رجال کو ان کے صحیح مقام پر رکھنا، ہم لوگ بھول ہی گئے ہیں۔ شیعیت اور خارجیت دونوں بے اعتدالی کی پیداوار ہیں، اور اہل سنت کا مذہب جو بین بین ہے سارے پہلوؤں کے درمیان ایک حکیمانہ توازن کے ساتھ قائم ہوا تھا افسوس ہے کہ وہ خود اسی بدبختی کا شکار ہوا جا رہا ہے"۔[۱۶]

---

[۱۶] مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی، حکیم الامت، نقوش و تاثرات، ص ۹۰، ۹۱۔

بقیہ مکتوب مولانا مسیح اللہ جلال آبادی

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات: ۱۳) تحقیق عزت اللہ کے یہاں اسی کو بڑی جس کو ادب بڑا۔

اور مرکز کا ہونا حصول ترقی کیلئے علت ہے اس سے ہیبت اور رعب بدلیل "ترہبون" قائم ہوتا ہے — ان دونوں کے حصول پر مسلمانوں کی ترقی موقوف ہے، اس پر دلیل تیرہ سالہ زندگی تقویٰ والی زندگی، مکی زندگی ہے کہ تقویٰ تھا مرکز نہ تھا اور دس سالہ زندگی مرکز والی مدنی زندگی ہے، پس صحیح محکم باعزاز، بارعب و باہیبت ترقی کا مدار دو چیزوں پر موقوف ہے تقویٰ اور مرکز۔

والسلام - احقر مسیح اللہ ۲۲ محرم ۱۴۰۲ھ (مطابق ۱۶ نومبر ۱۹۸۱ء) (بشکریہ احوال و آثار کاندھلہ)
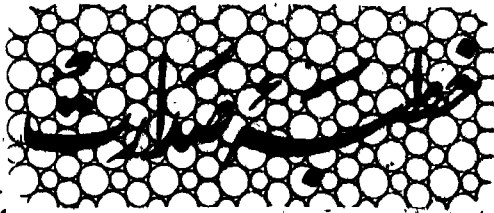
نمائندہ اجتماع مدارس عربیہ

مورخہ ۲۰، ۲۱ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ مطابق یکم و ۲ جولائی ۱۹۹۴ء یوم جمعہ و شنبہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ وذریتہ واھل بیتہ اجمعین،

امابعد! تمام حمد وثنا اور شکر وسپاس اس خدا کے لئے ہے جس نے محض اپنے فضل وکرم سے ہمیں صراط مستقیم پر قائم وبرقرار رکھا اور صراط مستقیم کے روشن میناروں یعنی مدارس عربیہ کے مسائل پر غور وفکر کے لئے ایک جگہ جمع ہوکر حل تلاش کرنے کی توفیق ارزانی کی۔ میں دل کی گہرائی کے ساتھ اپنی طرف سے اور اپنے رفقاء کار خدام مدرسہ کی جانب سے آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے اور راستے کی مشکلات کو دور فرمائے، آمین۔

علماء گرامی قدر! ہمارے ان مدارس عربیہ کا مقصد تاسیس صحیح طور پر معلوم کرنے کے لئے ان حالات کا پوری طرح ذہن میں ہونا ضروری ہے جو ان کی تاسیس کے وقت موجود تھے، اور جن کی سنگینی سے اس وقت ہندوستان ہی نہیں سارے عالم اسلام کو زبردست خطرہ

لاحق تھا۔

تاریخ پر اجمالی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ صدیوں تک ساری دنیا پر اسلامی پرچم آب تاب کے ساتھ لہلاتا رہا، اس دور میں کوئی قوم مسلمانوں سے ٹکرائی تو پاش پاش ہوگئی، جب صدیوں تک یہ عسکری تصادم اسلام کو پسپا نہ کرسکا تو مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو تار تار کرنے کے لئے ان میں علاقائی، لسانی اور خاندانی عصبیت بیدار کی گئی، اس طرح سازش کرکے اسلامی اتحاد کو عربی، ترکی، مصری، ہندی، ایرانی وغیرہ ٹکڑوں میں تقسیم کرادیا گیا۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں پر مغربی تہذیب وثقافت اور تعلیم کے ذریعہ حملہ کیا گیا، تاکہ مسلمان اسلامی اقتدار سے دست بردار ہوکر مغربی تہذیب وتمدن کے سانچے میں ڈھل جائیں، ہندوستان بھی انتہائی کرب انگیز حالات سے گذرا، انگریز نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد درندوں سے بڑھ کر وہ سفاکانہ انتقامی کارروائیاں کیں، جن کی تفصیلات سے آپ باخبر ہیں، سیاسی اقتدار پر قابض ہونے کے ساتھ ہی متاع دین وایمان پر شبخون مارنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے تیار کئے گئے جن کا کچھ اجمالی نقشہ برطانوی دارالعوام کے ایک ممبر کی تقریر سے معلوم کیا جاسکتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے آغاز میں کی گئی تھی۔

> "خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہئے، اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہ کرنا چاہیئے۔"

اسی طرح مغربی استعمار کی اس سازش یا پالیسی کو لارڈ میکالے کا یہ جملہ بڑی حد تک واضح کرتا ہے۔

> "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے اعتبار سے انگلستانی ہوں۔"

چنانچہ منظم منصوبے کے تحت ایک طرف ہزاروں عیسائی پادری مبلغ بن کر میدان میں

اتار دیئے گئے اور کلیسا کے ذریعہ دین وایمان کے خرمن کو آگ لگانے کی وہ مہم شروع کی گئی جو سرد ہونے کا نام نہ لیتی تھی، اس دور میں ہندوستان کے طول وعرض میں کوئی قابل ذکر شہر یا قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں پادریوں کے قدم نہ پہونچے ہوں، اور انھوں نے جم کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام نہ کیا ہو، دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں میں ذہنی وفکری ارتداد لانے کے لئے تعلیم گاہیں قائم کی گئیں، اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہندوستان میں اسلام اب چند سالوں کا مہمان ہے۔

ان جانگداز حالات میں اکابر دارالعلوم نے پہلے تا بمقدور اسلام کو بچانے کے لئے مسلح جدوجہد کی اور اس سلسلے میں ناکامی کے بعد جب حالات نے بالکل ایسا رخ اختیار کرلیا کہ ہندوستان کا اسلامی چمن خزاں کی زد میں محسوس ہونے لگا تو ان حضرات نے اسلام اور اسلامی اقدار کی حفاظت کے لئے دوسرے موثر طریقوں پر غور کرنا شروع کیا، ان پاکباز اولیاء کرام کے دلوں میں یہی بات راسخ ہوئی کہ ہمیں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے تعلیم کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے، یہ تجویز بیک وقت اتنے حضرات کے دل میں آئی اور اس پر اتنے منامی اشارات، اور اتنی الہامی تائیدات حاصل ہوئیں کہ انھوں نے بے سروسامانی کے باوجود دیوبند میں اس کار خیر کا آغاز فرمادیا۔

ان معروضات کا حاصل یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا آغاز کسی مدرسہ کے رسمی قیام کے طور پر عمل میں نہیں آیا۔ اور نہ یہ کام ہنگامی یا مقامی نوعیت کا تھا، بلکہ دارالعلوم اس مخلصانہ جدوجہد کا نقطۂ آغاز تھا جس میں اسلام اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ مضمر تھی، اس کے پس منظر میں ان تمام ریشہ دوانیوں کو ناکام بنانے کا عزم محکم کار فرما تھا جنھیں انگریز نے ہندوستانی مسلمانوں کی تباہی کے لئے مرتب کرنا شروع کردیا تھا، دارالعلوم دیوبند گویا اس ہمہ گیر تحریک کا پہلا مرکز تھا جس پر تعلیم کا غلاف ڈال دیا گیا تھا، اسی لئے دارالعلوم کے قدیم دستور اساسی میں مقاصد کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

۱۔ قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد وکلام اور ان علوم سے متعلقہ ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہونچانا، رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام

کی خدمت انجام دینا۔

۲:- اعمال و اخلاق اسلامیہ کی تربیت اور طلباء کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

۳:- اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع اور اشاعتِ اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر و تقریر بجالانا۔ اور مسلمانوں میں تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ سے خیر القرون اور سلفِ صالحین جیسے اخلاق و اعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

۴:- حکومت کے اثرات سے اجتناب و احتراز اور علم و فکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

۵:- علوم دینیہ کی اشاعت کیلئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔

ان مقاصد میں غور و فکر کرنے سے یہ بات بالکل یقین کے درجہ میں واضح ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم محض ایک تعلیم گاہ نہیں، بلکہ اسلام کی سربلندی، علوم اسلامی کے احیاء اور اسلامی اقدار کے تحفظ کی ایک جامع تحریک ہے۔

نصابِ تعلیم

ان مقاصد کو سامنے رکھ کر بے سرو سامانی کے عالم میں ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ عربیہ کی ابتدا ہوئی تو فارسی و عربی کا ایک دس سالہ مخلوط نصاب تیار کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ کسی طالب علم کو دو سے کم اور تین سے زیادہ اسباق نہیں دیئے جائیں گے، یہ نصاب غالباً عبوری تھا، چنانچہ دو سال کے بعد ہی ۱۲۸۵ھ میں نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی گئی، فارسی نصاب کو عربی سے الگ کر دیا گیا اور عربی کا نصاب اس طرح مقرر کیا گیا کہ اس دور کے ذہین طلبہ اس کو چھ سال میں مکمل کر لیں، مگر پھر ۱۲۹۰ھ میں دوبارہ غور کیا گیا اور عربی نصاب تعلیم کو آٹھ سالہ بنا دیا گیا دارالعلوم کی رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر ۱۳۰۲ھ میں دوبارہ نصاب تعلیم زیر غور آیا اور اس میں جزوی رد و بدل کیا گیا، اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں اس طرح کی ترمیمات کی جاتی رہیں۔

نصابِ تعلیم کے سلسلے میں حضرات اکابر کے طرز عمل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ انہوں

نے نصاب تعلیم کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا تھا پہلے مرحلہ میں جسے اس دور میں شعبۂ فارسی و ریاضی کہا جاتا تھا اور جسے آج کی اصطلاح میں مدرسۂ ابتدائیہ کہنا چاہئے، ان تمام چیزوں کی رعایت تھی جن کی ایک انسان کو اپنی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، اس دور میں چونکہ فارسی ملک کی رائج زبان تھی اس لئے اس مدرسۂ ابتدائیہ میں فارسی ادب، بلاغت اور انشار کا عنصر غالب تھا لیکن اس کے علاوہ حساب، تاریخ جغرافیہ اقلیدس، اخلاق، تصوف وغیرہ کے ذریعہ طالب علم کو اتنا علم اور تربیت کے ذریعہ اس کو ایسا مزاج دیدیا جاتا تھا کہ اگر وہ تعلیم منقطع کردے تو معاشرے کا ایک تعلیم یافتہ دیندار فرد شمار کیا جائے اور اگر وہ علوم عصریہ کی راہ اختیار کرے تو دین سے بیزار نہ ہو اور علوم عربیہ عالیہ میں داخل ہو تو اکابر دارالعلوم کو اسلام کی مختلف النوع خدمات کے لئے جن مجاہدین اور علمار راسخین کی ضرورت ہے ان کا فرد کامل بن جائے۔

اسی نہج پر کام جاری رہا، ہزاروں مدارس عربیہ دارالعلوم کے انداز پر قائم ہوتے اور ان کے بطن سے ایسی کامیاب نسل نے جنم لیا کہ ان کے کارناموں سے دنیا روشن ہے، صرف ہندوستان ہی نہیں سارا عالم [illegible] ن کے احسانات سے گراں بار ہے، ان مدارس کے فضلا میں ہزاروں کی تعداد ایسے [illegible] القدر علمار کی ہے جنھوں نے ایک ایک امت کے برابر کام کیا ہے۔

ہماری ماضی کی تاریخ سے یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہے کہ نصاب تعلیم نے مقاصد کے مطابق افراد تیار کرنے میں پوری رہنمائی کی اور مقاصد کے پیش نظر نصاب کا حسن کارکردگی شک وشبہ سے بالاتر رہا۔

عرصۂ دراز تک کام اسی طرح چلتا رہا، حضرات اکابرؒ اپنی کارکردگی کا جائزہ لے کر کام کو آگے بڑھاتے رہے اور جب تک زمام کار ان بالغ نظر مخلصین کے ہاتھ میں رہی نتائج بہتر سے بہتر حاصل ہوتے رہے۔

جہاں تک عصری فنون کے شامل نصاب کئے جانے کا مسئلہ ہے تو یہ آواز بھی نئی نہیں ہے، بانیین دارالعلوم کے ابتدائی سالوں میں یہ بات زیر غور آئی، اور حضرات اکابر رحمہم اللہ نے اس مسئلہ کو جس نوعیت سے سمجھا اس کو معلوم کرنے کے لئے حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی

قدس سرہ کی ۱۲۹۰ھ کی ایک تقریر کا یہ حصہ کافی ہے جسے دارالعلوم کی روداد میں طبع کیا گیا ہے، ارشاد فرماتے ہیں

"اب ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جاوے کہ درباب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا اور علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا، منجملہ دیگر اسباب بڑا سبب یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص ہو اس پہلو کا لحاظ چاہیئے جس طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو، سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علومِ جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی، ہاں علوم نقلیہ کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا، ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل لاحاصل نظر آیا، اور صرف بجانب علوم نقلی اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعدادِ علوم مروجہ اور استعدادِ علومِ جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے ضروری سمجھا گیا، دوسرے یہ کہ زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصانِ استعداد رہتی ہے ہاں بعد تحصیل فنونِ دانشمندی جس کو خاص تحصیلِ استعداد ہی کے لئے تجویز کیا گیا ہے اگر اور فنون قدیمہ وجدیدہ کو حاصل کیا جائے گا تو البتہ مقدارِ زمانۂ تحصیل برابر رہے گا، اس تقدیم تاخیر سے مطلب بخوبی حاصل ہوگا اور استعدادِ ہر علم کی بخوبی حاصل ہوگی اس لئے علوم نقلیہ اور اُن کے ساتھ علوم دانشمندی کو داخلِ تحصیل کیا، اس کے بعد اگر طلباء مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی" روداد ۱۲۹۰ھ ص ۱۱۲

نیز ۱۲۹۲ھ کی روداد میں حضرت اقدس رحمہ اللہ کی دوسری تقریر میں یہ بات اس طرح ارشاد فرمائی گئی۔

"اگر یہ خیال سدِ راہ ہے کہ یہاں علوم دنیویہ کی تعلیم کا چنداں اہتمام نہیں تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ مرض کا علاج چاہیئے، جو مرض نہ ہو اس کی دوا کھانی فضول ہے، دیوار کے رخنہ کو بند کرنا چاہیئے، بھٹہ کا بھرنا لازم ہے جو اینٹ ابھی گری ہی نہیں اس کا فکر بجز نادانی کیا ہے مدارس سرکاری اور کس لئے ہیں ان میں علوم دنیوی نہیں پڑھائے جاتے تو کیا ہوتا ہے، یہ مدارس اگر قدر ضرورت سے کم ہوتے تو مضائقہ بھی تھا مگر سب جانتے ہیں کہ سرکار کی توجہ سے

شہر تو شہر، گاؤں گاؤں میں مدرسے جاری ہوگئے، ان کے ہوتے اور مدارس علوم دنیوی کا اہتمام کرنا اور علوم دینی سے غفلت کارِ عقلِ دور اندیش نہیں۔" (روداد مدرسہ دارالعلوم ۱۲۹۲ھ ص۱۳)

حضرت حجۃ الاسلام قدس سرہٗ کی تقریروں سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ فنون عصریہ غفلت کے سبب ترک نہیں ہوگئے ہیں بلکہ عمداً ایسا کیا گیا ہے۔

فنون عصریہ کا ذکر تو ذیلی طور پر آگیا تھا، ورنہ گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ حضرات اکابرؒ نے نصابِ تعلیم کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا تھا، پہلا مرحلہ ابتدائی تعلیم کا تھا، جس میں طالبِ علم کو ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ضروریاتِ دین کا علم حاصل ہوجاتا تھا، پھر رفتہ رفتہ مقاصد نظروں سے اوجھل ہونے لگے اور عربی کے سال اول کو گویا اس طرح سمجھا جانے لگا کہ یہ ثانوی تعلیم کا سالِ اول نہیں بلکہ ابتدائی تعلیم کا سال اول ہے، اور اب نصاب تعلیم پر اس انداز سے غور کیا جانے لگا کہ تمام ضروریات کا تکفل اسی عربی نصابِ تعلیم میں کیا جائے، نتیجہ ظاہر ہے کہ جو کام مدرسہ ابتدائیہ کے چار پانچ سال اور عربی نصاب تعلیم کے آٹھ سال میں مکمل ہو رہا تھا اس کو صرف آٹھ سال میں انجام دینے کی کوشش کی جائے گی تو لازمی طور پر انحطاط آجائے گا، یہ انحطاط ہمارے سامنے ہے جس پر اربابِ فکر و نظر اپنے اپنے انداز سے گفتگو کرتے ہیں اور سرسری جائزے کے بعد اس کا ذمہ دار نصاب تعلیم کو ٹھہرا دیتے ہیں۔

شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ عربی نصاب تعلیم تو خواہ سات آٹھ سال ہی کا رہے لیکن مدرسہ ابتدائیہ کی تعلیم سے غفلت نہ برتی جائے، عربی کے سال اول میں صرف ان طلبہ کو داخل کیا جائے جو مدرسہ ابتدائیہ کی استعداد کے حامل ہوں۔

مدرسہ ابتدائیہ کی استعداد کے حامل طلبہ کے لئے اساتذۂ دارالعلوم پر مشتمل ایک کمیٹی نے آٹھ سالہ نصاب کا ایک مجوزہ خاکہ تیار کیا ہے جس پر آپ حضرات اپنے تدریسی اور علمی تجربات کی روشنی میں غور فرمائیں گے، پروردگار عالم بہتر سے بہتر کام کی توفیق ارزانی فرمائے آمین

طریقۂ تدریس

نصاب تعلیم پر غور و خوض کے بعد سب سے اہم بات طریقۂ تدریس کی ہے اور اس

سلسلے میں مجھے یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اس کام میں جو بصیرت اور تجربہ حضرات اساتذہ کو ہے وہ راقم الحروف کو نہیں ہے تاہم مشورہ کے طور پر عرض ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم کچھ تغیرات کے باوجود بڑی مدت تک انہی کتابوں پر مشتمل ہے جنھیں ملا نظام الدین سہالوی (المتوفی ۱۱۶۱ھ) نے منتخب کیا تھا یہ کتابیں متاخرین کی مرتب کردہ ہیں اور ان میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اختصار کے ساتھ لباب اپنے موضوع کے تمام مباحث ومسائل وجزئیات پر محیط ہو تاکہ طالب علم زیر درس موضوع کی تمام بحثوں پر مطلع ہو جائے، یہ باکمال مصنفین اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں مگر اختصار کے سبب ان کتابوں میں جگہ جگہ تعقید اور اغلاط کی نوعیت پیدا ہوگئی ہے اور اسی مشکل نے ایک نئی ضرورت کی طرف متوجہ کیا کہ ان مختصرات کے متون کی تشریح وتحلیل کی جائے، پھر یہ کہ متن کی تشریح وتحلیل کے عمل میں ضروری ہوگا کہ لغت، نحو، صرف اور بلاغت کے اصول سے کام لیا جائے اور ان کو منطبق کرکے مختصر عبارت کو قابل استفادہ بنایا جائے اس طرح عبارت کے تجزیہ سے طالب علم کا ذہن مسئلہ کی مکمل صورت کو مجموعی طور پر قبول نہیں کرسکتا، یا یوں کہیے کہ زیر بحث موضوع کا احاطہ، یا اس موضوع پر فکر میں بالیدگی اور جلا کی شان پیدا کرنے میں یہ طریق درس ناکام ہے مگر دوسری طرف اس کا زبردست فائدہ یہ ہے کہ اس سے عبارت سمجھنے کی قوت، نقد وتبصرہ کی صلاحیت، تحلیل وتجزیہ کا سلیقہ اور مشکلات کو حل کرنے کا قابل قدر ذوق پیدا ہوتا ہے، ایسی استعداد کے حامل طلبہ جب ان مطولات کا از خود مطالعہ کرتے ہیں جن میں علمی مسائل اور بحثوں کو بسط وسلاست کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے تو انھیں زبردست فائدہ ہوتا ہے اور وہ تبحر کی شان پیدا کر لیتے ہیں۔

اس کے برخلاف ایک دوسرا طریقہ تعلیم ہے جو اس دور میں رائج ہے کہ موضوع سے متعلق ایسی آسان اور سلیس کتابوں کا انتخاب کیا جائے جن میں عبارت فہمی کے لئے تحلیل وتجزیہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ آسانی کے ساتھ مسائل کی مکمل تصویر ذہن نشین ہو جائے، یہ طریق درس موضوع پر احاطہ کی صلاحیت پیدا کرنے کے سلسلے میں یقیناً کامیاب ہے لیکن تعلیم کا تجربہ رکھنے والے اپنے تجربات کی روشنی میں عبارت فہمی، دقیقہ رسی اور مشکلات پر عبور کے سلسلے میں اس طریقہ کو ناکام سمجھتے ہیں۔

ہمارے لئے قابل غور بات یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد جہاں مختلف مسائل و نظریات کا علمی احاطہ ذہن میں بالیدگی اور ملکۂ استنباط کا حصول ہے، وہیں عبارت فہمی کی بھرپور استعداد، نقد و تجزیہ کی کامل صلاحیت اور ذہن و فکر میں تیزی پیدا کرنے کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس لئے نصاب تعلیم اور طریقۂ درس میں دونوں مقاصد کو قریب کرنے کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔

تو کیا ایسا ممکن ہے کہ نصابِ تعلیم کے پہلے مرحلہ میں عبارت فہمی، تحلیل و تجزیہ اور نقد و تنقید کی صلاحیت کو اجاگر کرنے پر زور دیا جائے اور دوسرے مرحلہ میں مباحث و مسائل کے احاطہ کے سلیقے کو طاقتور بنانے کی کوشش کی جائے۔

اگر یہ طریقہ مفید ہے تو ہمیں نصاب تعلیم کے ابتدائی سالوں میں اس طریق تعلیم کی طرف لوٹنا ہوگا جو آج سے پچاس سال پہلے ہمارے اساتذہ کے تجربہ میں کامیاب تھا اور اس میں طولانی تقریروں کے بجائے عبارت فہمی اور استعداد سازی پر تمام صلاحیتوں کو مرکوز کیا جاتا تھا۔

آپ غور و فکر کے بعد اس سلسلہ میں فیصلہ فرمائیں، خدا اپنے فضل و کرم سے مفید طریق کار اختیار کرنے کی توفیق دے، آپ کے علم میں ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ نے رسالہ دانشمندی میں، اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے اپنی کتاب تکمیل الاذہان میں اس طرح کی بہت کچھ ہدایات دی ہیں، اس وقت آپ کی خدمت میں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی تکمیل الاذہان سے تدریس، تلمذ اور مطالعہ کا حصہ نقل کرکے پیش کیا جارہا ہے۔

تربیت

طرز تعلیم کے تعین کے بعد ایک اہم مسئلہ طلبہ کی تربیت سے متعلق ہے اور مدارس عربیہ کے مقصد تاسیس کی بنیاد پر اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، ہمارے اکابر قدس اللہ اسرارہم کا مقصد یہ نہیں تھا کہ طلبہ کو نظری طور پر فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، عقائد اور دیگر مسائل سے صرف واقف کرادیا جائے، جیسا کہ غیر مذہبی تعلیم میں ہوتا ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو یہ نظری تعلیم ایک ذریعہ اور وسیلہ تھی، اصل مقصد یہ تھا کہ طلبہ اپنے آپ کو سولہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھال لیں کیونکہ قرآن وحدیث کی تصریحات کے مطابق صحیح وکامل مسلمان وہ نہیں ہے جو نماز روزہ اور زکوٰۃ وحج وغیرہ کے مسائل سے واقف ہو یا صدق ودیانت اور احسان وتقویٰ کے مفہوم ومعانی سے نظری طور پر واقف ہو بلکہ صحیح اور کامل مسلمان وہ ہے جو ان نظری معلومات پر یقین رکھتا ہو اور عملی طور پر ان تمام اسلامی عبادات پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ اخلاق اور احسان کی نسبت سے آراستہ ہو، دین علم وعمل دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

موجودہ دور میں ایسا انحطاط آیا ہے کہ علم وعمل کی جامعیت پر زور دینے والی درسگاہیں بہت کم رہ گئی ہیں، وہ مدارس کامیاب سمجھے جا رہے ہیں جو طلبہ کو نظری طور پر علم سے آراستہ کردیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مدارس کے کامیاب طلبہ مستقبل میں دین کی خدمت انجام دینے کے بجائے معاش کے لئے دوسری راہوں میں تیزی کے ساتھ منتقل ہو رہے ہیں۔

ماضی میں صورت حال یہ تھی کہ مدارس دینیہ میں تربیت کا اہتمام بہت زیادہ اور باضابطہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی، انسانی معاشرہ سادگی لئے ہوئے تھا، مسلم گھرانوں میں بھی دینی ذہن کے نشوونما کے لئے ماحول سازگار تھا اور مدارس عربیہ کے مدرسین طلبہ کے لئے بہترین نمونہ ہوتے تھے، اس لئے کہ وہ تحصیلِ علم کے بعد اپنے طور پر تدریس کا پاکیزہ کام شروع نہیں کرتے تھے، فراغت کے بعد مدتوں اساتذہ اور مشائخ کی خدمت میں رہتے اور جب اساتذہ اور مشائخ کی جانب سے تدریس کا کام کرنے کی اجازت ملتی تو یہ کام شروع کرتے تھے، اور پھر خارجی ماحول میں بھی دین کی تباہی کے وہ اسباب ووسائل نہیں تھے جو آج قدم قدم پر موجود ہیں، اس لئے طلبہ اپنے بڑوں کی زیر نگرانی معمولی توجہ کے ذریعہ اچھے سانچے میں ڈھلتے تھے۔

موجودہ دور میں نوعیت تبدیل ہو چکی ہے اور تربیت کا باضابطہ نظم کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے کیونکہ مسلم گھرانوں کا ماحول بھی خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا ہے، مدارس بھی صرف نظری تعلیم پر قناعت کئے ہوئے ہیں، عملی تربیت اور اخلاقی کمالات حاصل کرنے کے لئے جو سلسلے تھے وہ ختم ہوتے جا رہے ہیں، طلبہ اپنے اساتذہ سے ربط بھی قائم نہیں کر رہے ہیں، اس لئے اب ہمیں اس کی شدید ضرورت ہے کہ طلبہ کی تربیت کے سلسلے میں لائحہ عمل مرتب کریں اور اس کو باضابطہ بنانے کی کوشش کریں، نیز ایسے لوگوں کو تعلیم وتدریس کے لئے ترجیح دیں جو اخلاقی کمالات اور نسبت

احسان سے آراستہ ہوں، مدرسے کے احول کو ایسا پاکیزہ بنانے کی کوشش کریں کہ اعمال صالحہ کی رغبت اور منکرات ومکروہات سے نفرت پیدا ہو اور ایسی تمام تدابیر عمل میں لائی جائیں جو مدارس کے طلبہ کو مقصد سے قریب تر کر دیں اور ان میں دعوت وارشاد و اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے سرفروشی کی وہ روح پیدا ہو جائے جو ان کے اسلاف کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

خدا اپنے فضل وکرم سے ایسی تجاویز کی رہنمائی فرمائے اور ان پر عمل کرنے کے لئے آسانیاں عطا کرے آمین۔

مشکلات

پھر یہ کہ ان تمام باتوں پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مدارس عربیہ کو ایسا سازگار احول میسر آئے کہ وہ ان مقاصد کو بروئے کار لانے میں اپنا فرض منصبی ادا کر سکیں، وہ مشکلات دور ہوں جن کے سبب اچھے مقاصد تک پہونچنا دشوار ہو رہا ہے۔

ان مشکلات نے ہمیں ایک زبردست آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے، جس کے سبب ہم اپنا مؤثر کردار ادا نہیں کر پا رہے ہیں، اور اگر ہم نے اصلاح احوال کی کوشش نہیں کی تو ہمارا حشر بھی ان قوموں سے مختلف نہیں ہوگا جو اپنی افادیت کھو دیتی ہیں اور بالآخر اپنا وجود ختم کرکے داستان پارینہ بن جاتی ہیں اما الزبد فیذهب جفاء واما ماينفع الناس فيمكث فى الارض،

میں یہاں ان مسائل کا ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں اور مؤدبانہ درخواست کرتا ہوں کہ خدارا ان چیزوں کو کسی خاص ادارے پر منطبق نہ فرمائیں بلکہ اس کو زبوں حالی کی ادھوری تصویر قرار دینے کے ساتھ علاج کی تدبیروں پر غور کریں۔

ہماری یہ مشکلات دو طرح کی ہیں داخلی اور خارجی، داخلی مسائل میں ہمارے باہمی اختلافات ہیں، طلبہ کے حصول کی جدوجہد میں مسابقت، مادی ترقیات کی طرف مکمل توجہ کے سبب تعلیم و تربیت اور معنوی ترقیات سے بے توجہی ہے، مدیہ ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم بھی کتنی ہی جگہ پورا نہیں ہوتا ہے، اور کہیں صرف برائے نام ہے، کتنے ہی مدارس میں صرف اونچی جماعتوں کی تعلیم ہے، جس کا مقصد آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں، علمی انحطاط کو چونکہ ایک عرصہ گذر گیا ہے اس لئے دیانت دار اور فرض شناس رجال کار مہیا نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

داخلی مشکلات سے ہماری مراد بیرونی حملے ہیں، کبھی نصاب تعلیم کے عنوان سے حملے کئے جارہے ہیں، کہیں بنیاد پرستی کے الزامات عائد ہورہے ہیں، کہیں مدارس کو دہشت گردی کا مرکز سمجھانے کی تگ ودو جاری ہے، کہیں سرکاری ایڈ دے کر ابدی نیند کی آغوش میں پہنچانے کی جدوجہد ہے، ایڈ قبول کرنے کے بعد نصاب تعلیم میں مداخلت ہے وغیرہ۔

ان تمام مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے متحدہ نظام کی ضرورت ہے، جس کا باقاعدہ نظام، انتخاب اور دستور العمل ہو اور اس کے تحت ان مشکلات پر قابو پانے کی جدوجہد کی جائے۔

پچاس مدارس عربیہ کے اس مختصر اجتماع میں آپ جیسے مصروف عمل بزرگوں اور احباب کو اس لئے دعوت دی گئی ہے کہ ہم اپنی کارکردگی کا جائزہ لیں اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل تیار کریں، انشاء اللہ ماہِ اکتوبر میں ایک بڑا اجتماع آپ حضرات کے مرتب کردہ پروگرام کے تحت منعقد کیا جائے گا۔

دعا ہے کہ پروردگار عالم ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور اکابر کے مقرر کردہ منہاج پر مقاصد کی تکمیل کے لئے ہماری جدوجہد کو مؤثر بنائے آمین یارب العالمین۔

والحمد للہ اولاً و آخراً

مرغوب الرحمٰن عفی عنہ

۲۰/۱/۱۴۱۵ ھ

حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی کا اہم مکتوب

(بجواب مراسلہ جناب سید حامد صاحب)
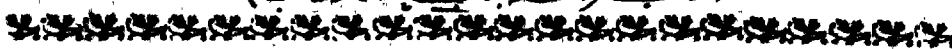
مکتوب جناب سیّد حامد صاحب

سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی و مکرمی السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستانی مسلمان علوم جدیدہ خصوصاً سائنسی علوم میں بمقابلہ دوسری قوموں کے کافی پیچھے ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس سفر میں وہ گرد کارواں بھی نہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا، کتنی حیرت کی بات ہے کہ وہ ملت جس نے لگ بھگ ساڑھے تین سو سال تک دنیائے علم و دانش کی امامت کی اور جس نے جابر بن حیان، خوارزمی، رازی، بیرونی، بوعلی سینا، اور ابن الہیثم جیسے اپنے دور کے علوم جدیدہ کے ماہرین پیدا کئے، آج مقتدیوں کی صف میں بھی نہیں، ایسا کیوں ہوا؟

مسلمان یہ کیوں بھول بیٹھے کہ خدا کی کتاب کا علم دین ہے تو خدا کی کائنات کا علم، علم سائنس ہے، تاریخی اتار چڑھاؤ کا یہ ایک ایسا معمہ ہے کہ جس کا حل پالینا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، حالات کا تقاضا ہے کہ اس معمہ میں الجھ کر وقت نہ برباد کیا جائے بلکہ ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے سائنسی علوم کی بابت ہندوستانی مسلمانوں کا جمود جلد از جلد ٹوٹ جائے، یہ بات اب کھل کر سامنے آچکی ہے کہ نت نئے سائنسی انکشافات کے بطن سے پیدا ہونے والے معاشی، تعلیمی، سماجی انقلاب کے اس دور میں صرف وہی گروہ عالمی برادری میں ایک باعزت مقام کا خواب دیکھ سکتا ہے

جو سائنسی [illegible] سے آراستہ ہو اور جس کو ٹکنالوجی پر عبور حاصل ہو، اس کے علاوہ الحکمۃ ضالۃ المؤمن (حکمت مومن کی متاع گمشدہ ہے) کے انقلاب آفریں قول کی روشنی میں دنیائے علم و دانش میں منصب امامت کی بازیابی ہم پر واجبات میں سے ہے۔

یہ جان کر یقیناً آپ کو خوشی ہو گی [illegible] مسلم یونیورسٹی میں مرکز فروغ سائنس کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں میں سائنسی علوم کا فروغ ہے، یہ مرکز مسلمانوں کو سائنس کی اہمیت یاد دلانے کے ساتھ ساتھ سائنسی مضامین میں کچھ تربیتی پروگرام کا انتظام بھی کرے گا، گو یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک مشکل کام ہے پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ کا بھرپور تعاون ہمیں حاصل رہا تو ان شاء اللہ اس کام کو بخوبی انجام دیا جا سکے گا۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ اس سوال نامہ کو اولین فرصت میں پُر کر کے منسلکہ لفافہ میں ہمیں واپس بھیج دیں گے اور یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ آپ ہمارے اس پروگرام کے بارے میں اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں نوازیں گے، امید کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ نیاز کیش

سید حامد

۱۹۸۷ء (۱۴۰۷ھ)

جواب حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی۔

مکرم و محترم جناب وائس چانسلر صاحب ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج گرامی!

آنجناب کی جانب سے مرکز فروغ سائنس سے متعلق سوالنامہ موصول ہوا، جواباً عرض ہے کہ جس طرح معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات و تمدنیات وغیرہ بہت سے علوم و فنون انسانیت کے خادم ہیں اور آج کے اس دور میں کاروانِ حیات انسانی ان کے بغیر نہیں چل سکتا، اسی طرح فنِ سائنس بھی ہے، خادمِ انسانیت ہونے کی حیثیت سے اس فن کو حاصل کیا جائے اور اس سے انسانیت کی فلاح و بہبود راحت و آسائش کا کام لیا جائے شرعاً بالکل اجازت ہے۔

ہاں ! البتہ اگر سائنس کے ذریعہ انسان کی ہلاکت کے سامان پیدا کئے جائیں یا سائنسی ترقی

کے بل بوتے پر طاقتور دوسرے کمزور پر ظلم کرے اور اس کے حقوق کو پامال کرے تو شریعت سائنس کے اس غلط استعمال کو جائز نہ رکھے گی، اس لئے سائنسی ترقیات کی طرف توجہ مبذول کرنے سے پہلے ایسے افراد کا تیار کرنا ضروری ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح کی دولت لازوال سے مالامال ہوں اور خوف خداوندی ان پر ہر آن اور ہر لمحہ طاری ہو تاکہ وہ خدا ترس ہو کر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ بن کر تمام عالم انسانیت کے لئے بجائے نقصان رساں ہونے کے راحت رساں ہوں، جیساکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سالہ مکی زندگی میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بنایا تھا اور ایسے افراد کی تیاری کا مرکز یہ دینی درسگاہیں ہیں جن کو مدارس عربیہ کہا جاتا ہے، ان دینی درسگاہوں میں داخل ہو کر جب اخلاص نیت طلب صادق کے ساتھ علوم دینیہ کو حاصل کیا جاتا ہے تو ضرور اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ جیساکہ ارشاد ربانی ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (الفاطر) اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے۔

یا تربیت باطنی کو خانقاہ کہا جاتا ہے، اس میں اخلاص اور طلب کے ساتھ قیام جسکے بارے میں ارشاد خداوندی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۔ (التوبۃ - ۱۱۹) اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور رہو ساتھ سچوں کے۔

الحاصل اہل سائنس جب ان مذکورہ اوصاف سے متصف ہونگے تو وہ تمام عالم انسانیت کے لئے سراسر راحت رساں ہوں گے نہ کہ ضرر رساں، جیساکہ آج کے دور میں مشاہدہ ہو رہا ہے

(۳) پس تقسیم کار کے اصول کے مطابق مدارس دینیہ کا موضوع افراد سازی ہے نہ صرف سامان سازی ــــــ یہ علمی ادارے دین اسلام کے ان علوم کی بقا و تحفظ کی خدمت انجام دے رہے ہیں جس دین کے لئے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ــ ۱۹) بیشک دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی حکم برداری۔

کا اعلان خداوندی ہے۔ نیز ارشاد فرمایا گیا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ (المائدہ-۳)

آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے :

نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰہُ بِالْاِسْلَامِ

ہم وہ قوم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی وجہ سے عزت بخشی۔

پس ان مدارس دینیہ کے لئے ضروری ہے کہ یہ اپنے موضوع سے نہ ہٹیں اور دین کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول و منہمک رہیں، کیونکہ بیک وقت عادتاً یہ ناممکن ہے کہ ایک طالب علم دین کا بھی پوری طرح علم حاصل کرے اور سائنس میں بھی کمال حاصل کرے، پس ان دونوں علوم و فنون کا جمع کرنا طَلَبُ الکُلّ فَوتُ الکُلّ کا مصداق بن جائے گا۔

(۳) البتہ جو مسلمان عصری علوم کی درسگاہوں میں تعلیم پاتے ہیں ان کو مخصوص طور پر سائنسی علوم میں مہارت حاصل کرائی جائے اور وہ آج کے دور میں نئی نئی ایجادوں کے موجد بنیں اس کے لئے مرکز فروغ سائنس کا قیام ایک مستحسن اقدام ہے۔

(۴) تقسیم کار کا اصول ہر جگہ کار فرما ہے، چنانچہ اگر مرکزی دینی درسگاہوں میں مرکز فروغ دین قائم کیا جائے اور عصری علوم کے پڑھنے والے ان طلباء کو جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں یہ دعوت دی جائے کہ وہ اس مرکز میں آکر علوم دینیہ، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں کمال حاصل کریں اور اس کے بعد ان علوم کو اپنے اپنے مقامات پر عصری علوم کی درسگاہوں میں جاکر جاری کریں تو عملاً اس کے لئے آپ حضرات بھی تیار نہ ہوں گے جیسا کہ اب تک کے عمل سے ظاہر ہے۔

اور اگر عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء فراغت کے بعد مرکز فروغ سائنس میں داخل ہو کر سائنس کا علم حاصل کرتے ہیں تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ تو تسلیم ہے کہ ماحول کا اثر ایک طبعی امر ہے، دوسرے یہ بھی تسلیم ہے کہ تابع پر متبوع کا اثر ہوتا ہے۔ پس جب عربی طلبہ جن پر پہلے دین

کہ ماحول کا اثر تو اعد کے ماحول میں داخل ہوں گے تو ان پر اس ماحول کا اثر غالب ہو جائے گا جیسا کہ مشاہدہ ہے، چنانچہ بعض وہ طلبہ جو طلبہ کالجوں میں داخل ہو جاتے ہیں وہ وہاں کے ماحول سے متاثر ہو جاتے ہیں، اور ان کی وضع قطع بدل جاتی ہے، حتیٰ کہ نماز میں بھی تساہل و تغافل کیا جاتا ہے، بعینہ اسی طرح جو انگریزی طلبہ تبلیغی جماعت میں آجاتے ہیں یا مدارس عربیہ دینیہ میں داخل ہو جاتے ہیں وہ دینی ماحول سے متاثر ہو کر دیندار بن جاتے ہیں، اس لئے عربی طلبہ کا داخلہ سائنس میں خلاف موضوع ہے۔ اور انگریزی طلبہ کا داخلہ موافقِ وضع ہے۔

(۵) یہ خیال کہ مسلمانوں کو دنیاوی امامت کا منصب محض مادی ترقیات کی بناء پر ملا تھا اور آج بھی وہ باعزت مقام ہر مادی طاقت کے ساتھ مل سکتا ہے، اس کے متعلق عرض ہے کہ ہر مسلمان کا بحیثیت مسلمان ہونے کے یہ پختہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کی دین دنیا، فلاح و ترقی اور دنیا کی امامت کے منصب کا ملنا ایمان اور عمل صالح بطاعت کاملہ باحکام ظاہرہ و باطنہ پر موقوف ہے نہ کہ محض مادی ترقیات پر، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران ۱۳۹) — اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو

دوسری جگہ فرمایا۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۔ ۱۹) — بیشک دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی حکم برداری۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو جو فتح و نصرت، سربلندی و امامت اہل مکہ اور روم اور فارس والوں پر ملی وہ مادی سازو سامان کی بناء پر نہیں ملی، جیسا کہ روایات سے ثابت ہے، مادی ساز و سامان کے اعتبار سے تو مسلمان ان سے بہت پیچھے تھے بلکہ یہ تمام فتح و نصرت وعدۂ خداوندی کے مطابق ایمان اور عمل صالح کی برکت سے حاصل ہوئی، آج بھی یہی اٹل قانون خداوندی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ تا قیامت جاری رہے گا، جب مسلمانوں میں ایمان اور عمل صالح کی یہ کمزوری ہو گئی تو دین کی برکت سے جو دنیا ملی تھی وہ بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔

(۶) مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کوئی ملک یا قوم خدانخواستہ اگر ایمان اور عمل صالح کی

مایہ سے عاری ہے تو وہ دنیا میں خواہ کتنی ہی مادی ترقیات حاصل کرے اور تمام دنیا والے مادی تربیت میں اسے اپنا امام تسلیم کرلیں تب بھی وہ انجام کار خائب و خاسر ہے، چنانچہ نمرودی، شدادی، فرعونی قارونی، طاغوتی، طاقتوں کا انجام ظاہر ہے، جس کی قرآن پاک شہادت دے رہا ہے اور ان کے لئے خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ (الحج-۱۱) (گنوائی دنیا و آخرت) کا اعلان ہو رہا ہے۔

(۷) بخلاف اس قوم یا ملک والوں کے کہ جو اپنے فطری ماحول کی وجہ سے مادی ترقیات کے اعتبار سے پسماندہ شمار کئے جاتے ہیں مگر ایمان اور عمل صالح کی دولت لازوال ان کو حاصل ہے تو بے شک وہ مفلحین میں سے ہیں اور دنیا اور آخرت میں کامیاب ہیں۔ اور عمل دنیوی نقد مال ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے اور ایسے حضرات کیلئے "استخلاف فی الارض" کا وعدہ خداوندی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور - ۵۵)

اور وعدہ کرلیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے اور کئے ہیں انھوں نے نیک کام البتہ پیچھے حاکم کردے گا ان کو ملک میں، جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو۔

پس جب یہ مسلم ہے کہ حیات انسانی کا اصل مقصد اپنے خالق و مالک رب العالمین کی عبادت و اطاعت کاملہ ہے، چنانچہ ہر ایک شعبۂ زندگی میں خواہ وہ معاملات ہوں یا معاشرات ہوں، اخلاقیات ہوں خواہ سیاسیات ہوں یا تمدنیات، ان سب میں احکام خداوندی کی پابندی لازم ہے اس کو،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (الذاریات-۵۶) (اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو) میں صراحتاً ارشاد فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کیسے کی جائے، اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یہ دین کے صحیح علم پر موقوف ہے اور علم دین پوری طرح ان مدارس عربیہ میں حاصل کیا جاتا ہے، پس مدارس عربیہ دینیہ کے لئے تو یہی لازم ہے کہ وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس میں مشغول و منہمک رہیں تاکہ علم دین کا سلسلہ جاری رہے جس پر تمام دین کی بقا موقوف ہے۔

البتہ سائنس پڑھنے والے طلباء کے لئے یہ خیر خواہانہ مشورہ ہے کہ جب وہ اپنے فن میں مہارت

حاصل کرسکیں تو علم دین حاصل کرنے کے لئے مدارس عربیہ دینیہ کی جانب رجوع کریں تاکہ دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے دن دونی رات چوگنی ترقیات حاصل ہوں اور،

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرۃ ـ ۵) (اور وہی ہیں مراد کو پہونچنے والے)

کا مصداق بن کر سعادت دارین کے ساتھ فائز المرام ہوں۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرۃ۔۲۰۱)

(اے ہمارے رب! دے ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے)

(۸) ان تمام گذارشات کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ استعمال مادیات سے انکار نہیں، اور کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ جمع مادیات کا بھی حکم دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔ (الانفال ـ ۶۰)

اور تیاری کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

خُذُوْا حِذْرَكُمْ (النساء ـ ۷۱) (لے لو اپنے ہتھیار)

یہ بطور کلی ہے، اور فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (النساء ـ ۲۰۰)

اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو۔

پس جس زمانہ میں جن مادی آلات کی ضرورت ہوگی ان کا حاصل کرنا ضروری و لازم زندگی ہوگا، بحکم "ما استطعتم" اور آج کے دور میں آلات جدیدہ کا حکم سائنس کے حصول پر موقوف ہے پس سائنس کے حصول سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے، لیکن حصول علم سائنس ہی کافی نہیں بلکہ جمیع حصول اسباب مادیات بھی ہوں اور جمیع اسباب آلات و مادیات موقوف ہیں مرکز پر، پس مسلمانوں کی ترقی کے لئے نہ محض حصول تقویٰ کافی ہے اور نہ حصول علم سائنس، بلکہ دونوں چیزوں کی ضرورت ہے تقویٰ اور مرکز۔ تقویٰ کا حصول شرط ہے اس سے سکون و سکینہ حاصل ہوتا ہے جو دلیل

(باقی برصفحہ)

مذہب کا سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، اور مذہب و سیاست دونوں کا دائرہ عمل الگ الگ ہے، دونوں کو اپنے دائرہ میں رہ کر ایک دوسرے کی مداخلت کے بغیر کام کرنا چاہئے دین و سیاست کی تفریق کا یہی نظریہ ترقی کر کے "سیکولرازم" کی شکل اختیار کر گیا، جو آج کل کے نظامہائے سیاست میں مقبول ترین نظریہ سمجھا جا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام میں اس نظریہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلامی تعلیمات کا چونکہ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق ہے جن میں سیاست بھی داخل ہے اس لئے اسلام میں دین کو سیاست سے بے تعلق رکھنے کا کوئی جواز ہی موجود نہیں ہے مسلمان مفکرین نے اس عیسائی نظریہ کی بہ زور تردید کی اور یہ ثابت کیا کہ سیاست کو دین سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اس نظریہ کی تردید کے جوش میں بہت سے مسلمان مفکرین سے ایک غلطی واقع ہوئی جو بظاہر بہت معمولی ہے لیکن اس کے اثرات بہت دور رس تھے، اس غلطی کو ہم مختصر الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ انھوں نے "سیکولرازم" کی تردید کے جوش میں، سیاست کو اسلامی بنانے کے بجائے اسلام کو ہی سیاسی بنا دیا، کہنا یوں تھا کہ سیاست کو دین سے الگ نہیں ہونا چاہئے، لیکن کہا یوں کہ دین کو سیاست سے الگ نہیں ہونا چاہئے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام کے بہت سے احکام سیاست و حکومت سے متعلق ضروری ہیں اور ایمان کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ہر مسلمان اسلام کے دوسرے احکام کی طرح ان احکام پر بھی بقدر استطاعت عمل کرنے کرانے کی کوشش کرے، حاکم کا فرض ہے کہ وہ اسلامی احکام کو نافذ کرے

اور انھیں احکام کے مطابق حکومت کرے، اور عوام کا فرض ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق ایسی حکومت کے قیام کی کوشش کریں اور اگر وہ قائم ہو جائے تو اس کی پوری پوری اطاعت کریں۔

لیکن بعض مفکرین اس نظریہ کی تردید میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے سیاست وحکومت کو اسلام کا مقصد اصلی، اس کا حقیقی نصب العین بلکہ انسان کی تخلیق کا اصل ہدف قرار دیدیا اور اسلام کے دوسرے احکام مثلاً عبادات وغیرہ کو نہ صرف ثانوی حیثیت دیدی بلکہ انھیں اسی مقصد اصلی یعنی سیاست کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک طریقہ قرار دیدیا، اس انتہا پسندی کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اس کے نتیجے میں دین کی مجموعی تصویر اور اس کی ترجیحات کی ترتیب الٹ کر رہ گئی۔ جو چیز وسیلہ تھی وہ مقصد بن کر ہمہ وقت دل ودماغ پر چھا گئی، اور جو مقصد اصلی تھا وہ ایک غیر اہم وسیلہ بن کر پس منظر میں چلا گیا چنانچہ اس طرز فکر کے تحت ذہن کچھ اس طرح کا بن گیا کہ ایک مسلمان کا اصل مقصد زندگی سیاست وحکومت کی اصلاح ہونا چاہئے، کام وہی کام ہے جو اس راستے میں انجام دیا جائے قربانی وہی قربانی ہے جو اس راہ میں پیش کی جائے۔

اور مثالی انسان (مسلمان) وہی ہے جس نے اس کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر دن رات اس کیلئے وقف کر دیا ہو، اور دین کے دوسرے شعبوں مثلاً عبادات وطاعات، زہد وتقویٰ وغیرہ کی نہ صرف یہ کہ کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہی بلکہ جو شخص ان کاموں میں مشغول ہوا اس کے بارے میں یہ تصور کہ گویا وہ مبادی میں الجھا ہوا ہے اور دین کے بنیادی مقاصد سے دور ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہوا کہ جب اسلام کے مقاصد اصلی سیاست وحکومت ہو گئے تو عبادات کی حیثیت محض وسیلہ کی رہ گئی تو یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کبھی کبھی وسائل کو مقصد پر قربان بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور مقصد کے حصول کے لئے اگر کبھی کسی وسیلہ میں کچھ اونچ نیچ یا کمی بیشی بھی ہو جائے تو وہ گوارہ کر لی جاتی ہے، لہذا مذکورہ انتہاپسندی کے نتیجے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بڑی گنجائش پیدا ہو گئی کہ سیاسی مقاصد کے لئے عبادات وغیرہ کے احکام میں کوئی کمی کوتاہی بھی ہو جائے تو وہ قابل ملامت نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک بڑے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے[1]۔

---

[1] ماہنامہ الحسن جامعہ اشرفیہ لاہور ۱۹۸۷ء ص ۱۸۶ -

سیاست وحکومت کو ایک شعبہ نہیں بلکہ دین کا مقصدِ اصلی قرار دینے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تجارت ومعیشت بھی دین کا ایک شعبہ ہے اس حیثیت سے دین کے بہت سے احکام تجارت ومعیشت سے بھی متعلق ہیں بلکہ کسب حلال کے بہت سے فضائل بھی احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔ اب اگر ان فضائل کے پیش نظر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ دین کا اصل مقصد ہی تجارت ومعیشت اور کسبِ حلال ہے، تو اتنی غلط ہوگی کہ اس پر دلائل قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے بعینہ اسی طرح سیاست وحکومت دین کا ایک شعبہ ضرور ہے کہ دین کے بہت سے احکام اس سے متعلق ہیں اور اسکے بہت سے فضائل قرآن واحادیث میں وارد ہوئے ہیں لیکن ان فضائل کی بنیاد پر اس کو دین کا مقصدِ اصلی قرار دینا ایسی ہی غلطی ہے جیسے تجارت ومعیشت کو دین کا مقصود اصلی اور نصب العین قرار دینا۔

چودھویں صدی کے آغاز میں جب سے مسلمانوں میں مغربی استعمار سے آزاد ہونے کی تحریکات شروع ہوئیں اسی وقت سے یہ انتہا پسندانہ طرز فکر عام ہوتا گیا، جس میں سیاست کو "خلافت فی الارض" اور "حکومتِ الٰہیہ" وغیرہ عنوانات سے دین کا بنیادی مقصد قرار دیدیا گیا۔

طرز فکر کی اس غلطی نے مسلمانوں میں اتنی آہستگی سے اپنی جگہ بنائی کہ اچھے اچھے لوگوں کو یہ احساس نہ ہوسکا کہ ان کے فکر وعمل کا کانٹا تبدیل ہوگیا ہے۔ "سیاسی استقلال" کی ضرورت واہمیت اس درجہ ذہنوں پر چھاگئی کہ اس باریک مگر دور رس غلطی پر غور کرکے "دین میں سیاست" کا صحیح مقام متعین کرنے کی فرصت ہی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تصور بعض نے شعوری طور پر اور بعض نے غیر شعوری طور پر اختیار کرلیا، اور تحریک کے اجتماعی عمل نے اس پر ایسی مہر ثبت کردی کہ اہل علم کو بھی کانٹے کی اس تبدیلی کا احساس نہ ہوسکا۔[1]

اس ماحول میں حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے اس باریک غلطی کو دوٹوک انداز میں واضح فرمایا اور قرآن وحدیث کے دلائل سے یہ ثابت کیا کہ دین میں سیاست کا صحیح مقام کیا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے الذین إن مکناهم في الأرض أقاموا الصلوٰة وآتوا الزکوٰة، اس سے واضح ہے کہ دیانات ہی مقصدِ اصلی ہیں، اور سیاست وحکومت اقامتِ

---

[1] ماہنامہ الحسن جامعہ اشرفیہ ۱۹۸۶ء ص ۶۸۲۔

دیانات کا وسیلہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ دیانات تو تمام انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر دیئے گئے اور سیاست وحکومت صرف چند کو، یعنی جہاں ضرورت سمجھی گئی ورنہ نہیں، وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ضرورت ہی کیلئے دیئے جاتے ہیں

شاید کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ دوسری آیت میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے جس سے دیانات کا وسیلہ ہونا اور تمکین فی الارض وسیاست کا مقصدِ اصلی ہونا سمجھ میں آرہا ہے اور وہ یہ ہے کہ وعداللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض، یہاں ایمان وعمل صالح کو شرط قرار دیا جارہا ہے، تمکین فی الارض کی، جس سے تمکین وسیاست کا مقصود اصلی ہونا لازم آتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین فی الارض کا وعدہ کیا گیا ہے اور بطور خاص حکومت وشوکت کا دین پر مرتب ہونا ذکر فرمایا گیا ہے پس دین پر سیاست وقوت موعود ہوئی لیکن موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔

دوسری آیت ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم۔ میں اقامت توراۃ وانجیل وقرآن یعنی عمل بالقرآن پر وسعتِ رزق کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے؟ بلکہ دین پر موعود ہے کہ دین دار بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا، پس موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں، یہاں بھی ایمان عمل صالح پر شوکت و قوت اور سیاست وغیرہ موعود ہیں جو بطور خاص اس پر مرتب ہوں گی نہ کہ مقصود اصلی جو اس کی غایت کہلائے۔

بہرحال یہ بات واضح ہے کہ سیاست ودیانت میں سیاست وسیلہ ہے اور دیانت مقصود اصلی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصودِ اصلی نہیں اور دیانات خود مقصود اصلی ہیں۔[1]

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس مختصر مگر جامع تحریر میں موضوع کو اس قدر واضح فرمادیا کہ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی، مطلب یہ ہے کہ نہ تو وہ سیکولر نظریہ درست ہے کہ سیاست وحکومت میں دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے، اور نہ یہ خیال

---

[1] خاتمۃ السوانح، خواجہ عزیز الحسن، ص ۲۹۔

درست ہے کہ دین کا اصل مقصد ہی سیاست و حکومت ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی رحمہ اللہ نے ماہنامہ معارف میں قومیات و سیاسیات کے ذیل میں لکھا ہے کہ

"مولانا مودودی رح نے حکومت الٰہیہ کے قیام کی براہ راست دعوت جو اس طرح دینا شروع کردی کہ گویا وہی مقصود بالذات ہے اور اس کے قیام کے بغیر گویا مسلمان مسلمان ہی نہیں رہ سکتے اور اس کیلئے ایک جماعت تک بنا ڈالی، یہ راہ عمل کسی طرح حلق سے نہیں اترتی تھی جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی سیرت اور سوانح میں اس کی سند نہیں ملتی تھی کہ انھوں نے اپنی بعثت کا مقصد یا اپنا کلمۂ دعوت براہ راست حکومت الٰہیہ کو قرار دیا ہو، بلکہ حدیث شریف میں تو یہاں تک ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام قیامت میں ایسے ہوں گے کہ جن کا ایک بھی متبع اور امتی نہ ہوگا، اور بعض کا صرف ایک ہی ہوگا، ظاہر ہے کہ اس سے نہ تو کمالِ نبوت میں کوئی کمی آئے گی اور نہ امتی کے کمالِ ایمان میں، جب آیت کریمہ وعداللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا اصل کام سلطنت و حکومت یا آجکل کی اصطلاح میں آزادی یا خودمختاری کی فکر میں پڑنا نہیں بلکہ خود اپنے ایمان کو درست کرنا اور اعمال صالحہ کو اختیار کرنا ہے، اس کے بعد ان شاء اللہ خلافت فی الارض کا قطعی وعدہ پورا ہونے کے سامان بھی غیب سے ظاہر ہوں گے"[۱]

درحقیقت بات بھی یہی ہے کہ اصل چیز ایمان اور عمل صالح ہے، اور جب اس راستہ سے ہم خلافت ارضی کے مستحق ہوجائیں گے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی قطعاً پورا ہوکر رہیگا لیکن براہ راست حکومت الٰہیہ کی سوچنا اور ایمان وعمل صالح کو ثانوی حیثیت دینا آیت کے مفہوم کے بالکل خلاف ہے، واقعہ یہ ہے کہ دین کا اصل مقصد بندے کا اپنے اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے جس کا مظاہرہ عبادات وطاعات کے ذریعہ ہوتا ہے سیاست و حکومت بھی اسی مقصد کی تحصیل کا ایک ذریعہ ہے جو نہ بجائے خود مقصد ہے اور نہ اقامتِ دین کا مقصد اس پر موقوف ہے بلکہ وہ حصول مقاصد کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے۔ لہٰذا اسلام میں وہی سیاست اور حکومت مطلوب ہے جو اس مقصد میں ممد و معاون ہو؛ اس کے برعکس جو سیاست اس مقصد کو پورا کرنے کے بجائے دین کے اصل مقاصد میں کوتاہی کرے وہ اسلامی سیاست نہیں ہے خواہ اس

[۱] معارف اعظم گڈھ ماہ جنوری ۱۹۶۷ء ص ۱۲
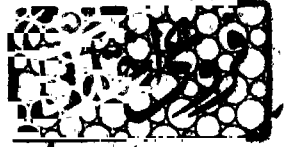
تابعین صحابہ کے نقش قدم پر

(دوسری قسط)

صحابۂ کرام کے باہمی اختلاف سے تابعین کے درمیان بھی فروعی مسائل میں اختلاف رہا، ہر تابعی نے جو عمل جس صحابی سے پایا اس نے اس پر عمل کیا، اگر اسکے خلاف دوسرا عمل ملا تو ان کی کوشش رہی کہ دونوں امور میں تطبیق پیدا کی جائے اور مختلف دلائل و ذرائع سے اصل حقیقت تک پہونچا جائے، حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ) صحابۂ کرام کے مابین اختلاف کو بیان فرمانے کے بعد لکھتے ہیں ۔

حاصل کلام یہ کہ ان اسباب و وجوہ کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے مذاہب میں اختلاف ہوا تھا اور ان سے تابعین نے اسی طرح حاصل کیا جس طرح جس کو توفیق ہوئی، انھوں نے جس حدیث کو اور مذہب صحابہ کو سنا اس کو یاد کیا اور اسے سمجھا اور جہاں تک ہو سکا مختلف امور کو جمع کیا، بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی، اور بعض اقوال کو اپنی نظر میں ضعیف سمجھا اگرچہ وہ کبار صحابہ سے منقول تھے .... اسی طرح تابعین میں سے ہر ایک عالم کا ایک مذہب اس کے خیال کے مطابق قائم ہوا، پس ہر شہر میں ایک امام (دین) قائم ہو گیا جیسے مدینہ میں حضرت سعید بن مسیب اور حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر تھے، ان کے بعد امام زہری، قاضی یحیٰی بن سعید اور حضرت ربیعہ بن عبدالرحمٰن مدینہ میں امام تھے، اور مکہ مکرمہ میں حضرت عطاء بن ابی رباح تھے. کوفہ میں حضرت ابراہیم نخعی اور امام شعبی تھے. بصرہ میں حضرت حسن بصری تھے یمن میں حضرت طاؤس بن کیسان تھے، اور شام میں امام مکحول تھے، پس خدا نے بہت سے

قلوب کو ان کے علوم کا مشتاق بنا دیا اور لوگوں نے نہایت رغبت سے ان سے حدیث صحابہ کے فتاویٰ اور اقوال اور ان کے مذاہب دریافت کئے، اور ان میں مسائل کا خوب تذکرہ رہا اور معاملات ان کے سامنے پیش کئے جانے لگے، حضرت سعید بن المسیب اور امام ابراہیم نخعی وغیرہم جیسے حضرات نے تمام ابواب فقہ کو جمع مرتب کر دیا، اور ہر باب کے متعلق ان کے پاس اصول مرتب تھے جن کو انھوں نے سلف سے لیا تھا،

حضرت سعید بن المسیب اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ تھا کہ فقہ میں حرمین کے علماء سب سے زیادہ پختہ ہیں اور ان کے مذہب کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عباس کے فتاویٰ اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلے ہیں، ان سب علوم کو انھوں نے بقدر استطاعت جمع کیا اور ان میں تحقیق و تفتیش سے غور کیا، جس پر علماء مدینہ کا اتفاق تھا ان کو خوب مستحکم طور پر لے لیا اور جس میں ان کا اختلاف تھا ان میں سے قوی اور راجح کو لے لیا، ان کے نزدیک ان کے راجح ہونے کی وجہ یا یہ تھی کہ اکثر علماء نے اس طرف امیلان کیا تھا یا وہ کسی قیاس قوی کے موافق تھے یا کتاب وسنت سے واضح طور پر مستنبط تھے، یا اسی طرح کا کوئی اور امر تھا اور جب انھیں اپنے محفوظات میں سے مسئلے کا جواب نہ مل سکا تو ان کے کلام سے اسے حاصل کیا اور کتاب وسنت کے ایماء اور اقتضاء کا تتبع کیا چنانچہ ہر باب میں انھیں بکثرت مسائل حاصل ہو گئے۔

حضرت ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب کی رائے یہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب کی رائے فقہ میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں جیسے حضرت علقمہ نے حضرت مسروق سے کہا تھا کہ کیا کوئی فقیہ حضرت ابن مسعود سے زیادہ قابل وثوق ہے؟ اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے امام اوزاعی سے کہا تھا کہ ابراہیم نخعی سالم بن عبداللہ سے زیادہ فقیہ ہیں، اور اگر صحابی ہونے کی فضیلت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ میں نہ ہوتی تو میں کہدیتا کہ حضرت علقمہ حضرت عبداللہ بن عمر سے زیادہ فقیہہ ہیں، اور عبداللہ بن مسعود تو عبداللہ بن مسعود ہی ہیں (یعنی ان کا تو کیا پوچھنا، اور امام ابوحنیفہ کے مذہب کی اصل حضرت عبداللہ بن مسعود کے فتوے۔ حضرت علی المرتضیٰ کے فیصلے، اور قاضی شریح اور دیگر قاضیوں کے فتاویٰ ہیں، پس ان میں سے امام ابوحنیفہ نے بقدر امکان مسائل فقہیہ کو جمع کیا اور جیسے اہل مدینہ کے آثار سے مدینہ کے علماء نے تخریج کی تھی

ایسے ہی کوفہ کے آثار سے انھوں نے تخریج مسائل کی پس ہر باب کے متعلق مسائل فقہ مرتب ہوگئے حضرت سعید فقہاء مدینہ کی زبان تھے اور ان کو حضرت عمرؓ کے فیصلے اور حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث سب سے زیادہ یاد تھیں اور حضرت ابراہیم فقہاء کوفہ کی زبان تھے پس جب وہ دونوں کوئی بات کہتے اور کسی کی جانب اس کو منسوب نہ کرتے تو وہ اکثر صراحتاً یا کنایۃً یا کسی اور طرح سے سلف میں سے کسی کی طرف منسوب ہوتی تھی پس فقہاء مدینہ اور کوفہ نے ان دونوں پر اتفاق کیا ان سے علم حاصل کیا اور سمجھا اور اس علم کے ذریعہ دوسرے مسائل کی تخریج کی، واللہ اعلم۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص۱۳۵)

ائمہ ہدیٰ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر :-

حضرات تابعین کے فروعی مسائل میں اختلافات کی بنا پر ائمہ عظام میں بھی باہمی اختلاف پیدا ہوا اور راہ عمل کی مختلف صورتیں سامنے آئیں، حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے آگے چل کر ائمہ کرام کے باہمی اختلاف کو بھی نہایت تفصیل سے تحریر فرمایا ہے، اور تبلایا ہے کہ ائمہ اربعہ نے کن کن اکابر سے استفادہ کیا ہے اور کس کس طرح ان کے مذاہب نے نشو ونما پائی ہے۔ آپ حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم نخعی اور ان کے ہم عصر علماء کی روش کی زیادہ پابندی تھی، آپ ابراہیم نخعی کے مذہب سے وہ بہت کم علیٰحدگی کرتے تھے۔ الا ماشاء اللہ، آپ ان کے مذہب کے مطابق تخریج مسائل میں عظیم مقام کے مالک تھے آپ وجوہ تخریج میں نہایت دقت نظر سے کام لیتے لہٰذا فروعات کی طرف ان کو کامل توجہ تھی، اگر تم ہمارے اس قول کی حقیقت معلوم کرنا چاہو تو امام محمدؒ کی کتاب الآثار جامع عبدالرزاق اور المصنف لابن ابی شیبہ سے حضرت ابراہیم نخعی اور ان کے معاصرین کے اقوال کی تلخیص کرو، پھر ان کے مذہب سے امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کا اندازہ کرو تو تم کو پتہ چلے گا کہ صرف چند قلیل مقامات کے سوا یہ استدلال ہر جگہ موجود ہوگا (۱) (یعنی آپ ان کی روش سے تجاوز نہیں کرتے) اور ان قلیل امور میں بھی وہ فقہائے کوفہ

(۱) حضرت محدث دہلوی کی اس تحقیق پر بہت سے کبار علماء نے کلام کیا ہے (مرتب)

کے مذہب سے نہیں نکلتے۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۳۵۶)

حضرت حکیم الامت رحمہ نے امام مالکؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ وغیرہم کے مذاہب پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ائمہ کرام کے درمیان اختلافات دراصل حضرات صحابۂ کرام اور تابعین کے درمیان فروعی اختلافات کے باعث پیش آیا تھا اور یہ اختلافات خواہ صحابہ و تابعین کے درمیان رہے ہوں یا ائمہ اربعہ کے مابین سب کا سرچشمہ شریعت ہی تھا،

امام شعرانی کا ارشاد

حضرت علامہ سید عبدالوہاب شعرانی (۹۷۶ھ) لکھتے ہیں۔

"یہ ظاہر ہے کہ مجتہدین نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کا راستہ اختیار کیا، چنانچہ کسی مجتہد کو نہ پاؤ گے کہ اس کا سلسلہ کسی ایک صحابی سے رجو اس کے قول میں متفق ہو) یا صحابہ کی ایک جماعت سے نہ ملتا ہو۔" (میزان کبریٰ جلد ۱ ص ۱۰۱)

امام شعرانی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ تمام ائمہ مسلمین اپنے تمام اقوال میں پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور نہیں ہے کوئی قول ان میں سے مگر یا وہ چشمۂ شریعت سے قریب ہے یا اقرب، اور بعید ہے یا ابعد، سند کے طویل اور قصیر ہونے کے اعتبار سے ـــ لیکن سلسلہ تمام اقوال کا شریعت سے جا ملتا ہے" (ایضاً ص ۱۰۵)

محقق العصر حضرت مولانا علامہ خالد محمود صاحب مدظلہ، حافظ ابن تیمیہؒ کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ :۔

"یہ وہ اعمال ہیں جو صحابہ کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، جب ان میں ـــ صحابۂ کرام مختلف العمل رہے اور ہر طریق عمل اپنی اپنی جگہ قائم رہا تو یہ بدون اس کے متصور نہیں کہ ان حضرات نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مختلف مواقع میں مختلف طریقوں پر عمل کرتے دیکھا ہو، پھر جوں جوں آپ کی آخری زندگی کے طریقے ان کی نگاہوں میں ممتاز اور راجح ہوتے چلے گئے، اپنی اپنی تحقیق اور ترجیح کے وجوہ ان کے سامنے روشن ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان اختلافات نے ائمہ اربعہ کی تحقیقات میں راجح مرجوح کی صورتیں اختیار کر لیں"

(آثار الحدیث ج ۱ ص ۹۳)

فروعات میں ائمہ کا اختلاف صحابہ کے اختلاف کے قریب قریب:

مذکورہ بالا ارشادات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ائمہ اربعہ کے فروعی اختلافات ان کے اپنے پیدا کردہ نہیں، صحابۂ کرام اور تابعین کے فروعی اختلافات کے سبب ائمہ اربعہ میں اختلافات نے راجح مرجوح افضل مفضول کی صورتیں اختیار کیں، لیکن ان اختلافات کے باوجود صحابۂ کرام کے درمیان مخالفت اور مخاصمت کی کوئی نوبت پیش نہیں آئی، اور نہ ہی ایک نے دوسرے کو گمراہ قرار دیا معاذ اللہ اس طرح ائمہ اربعہ کے آپس کے اختلافات کے باوجود مخالفت اور مخاصمت کو راہ نہیں دی گئی حضرت امام ابوحنیفہ تو امام الائمہ ہیں، ائمہ ثلاثہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد سب ہی آپ کے مدح میں رطب اللسان ہیں، اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ائمہ اربعہ بھی سب کے سب طریق ہدایت پر ہیں جس طرح صحابۂ کرام اور تابعین کے فروعی اختلافات، ذاتی عداوت اور نفسانی خواہشات پر مبنی نہ تھے بلکہ وسعت عمل پر محمول تھے اسی طرح ائمہ اربعہ کا اختلاف بھی اسی وسعت عمل کا نتیجہ تھا، مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبداللہ روپڑی صاحب سے بھی سن لیجئے۔ آپ لکھتے ہیں۔

ائمہ اربعہ کا اختلاف قریب قریب صحابہ کے اختلاف کے ہے (فتاویٰ اہلحدیث جلد ۱ ص ۴۲)

جس طرح صحابۂ کرام کو ان اختلافات کے باعث طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا اسی طرح ائمہ اربعہ کے بارے میں بھی بدزبانی اور بدگوئی کسی صورت میں درست نہیں، جو لوگ صحابہ کرام تابعین اور ائمہ کرام کے فروعات میں اختلاف کو اصولی اختلاف کے مشابہ سمجھنے لگتے ہیں وہ راہ ہدایت سے بہت دور جا پڑے ہیں، امام شعرانی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

عزیزمن اگر تو بہ انصاف دیکھے تو یہ حقیقت واضح اور منکشف ہو جائے گی کہ ائمہ اربعہ اور ان کے مقلدین سب کے سب طریق ہدایت پر ہیں، اس کے بعد اب کسی امام کے کسی مقلد پر اعتراض کا خیال نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ امر ذہن نشین ہو جائے گا کہ ائمہ اربعہ کے مسالک شریعت مطہرہ میں داخل ہیں اور ان کے مختلف اقوال امت کیلئے رحمت ہو کر نازل ہوئے ہیں، حق تعالیٰ شانہ جو علیم و حکیم ہیں ان کی مصلحت اس امر کو مقتضی تھی، اگر اللہ اس کو پسند نہ فرماتے تو اس کو بھی اسی طرح حرام قرار دیتے جس طرح کہ اصل دین میں اختلاف کو ممنوع قرار دیا۔ عزیزمن مبادا

تجدید یہ امر مشتبہ ہوجائے کہ تو ائمہ کے فروعی اختلاف کو اصولی اختلاف کے مشابہ اور اس کے حکم میں سمجھنے لگے جس کی وجہ سے ترا قدم میدان ہلاکت میں پڑجائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کے اختلاف فرعی کو رحمت قرار دیا ہے (ماخوذ از اختلاف الائمہ ص۳۳، حضرت شیخ الحدیث مہاجر مدنی)

ائمہ کا اختلاف فروع میں ہے اصول میں نہیں :-

امام شعرانی کے اس بیان سے صاف واضح ہے کہ ائمہ کے اختلافات اصول میں نہیں بلکہ فروع میں ہیں اور اختلاف فرعی کے باوجود سب کے سب طریق ہدایت پر ہیں، اور ان کے مسالک و مذاہب شریعت ہی کے چشمہ سے فیض یاب ہیں، جہاں تک عقائد اور اصول کا تعلق ہے اس میں اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں، اور یہاں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانی" لکھتے ہیں کہ۔

اس امت کا اختلاف ان چیزوں میں جن میں اجتہاد کی گنجائش ہے رحمت ہے، بہت بڑی نعمت ہے، بڑی عظیم فضیلت ہے۔ امت پر وسعت ہے اور حضرات صحابہ کرام اور ان کے بعد علماء نے جو استنباطات حضور کے اقوال وافعال سے کئے ہیں وہ سب اپنے اختلاف کے باوجود بمنزلہ مختلف شرائع کے ہیں اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں داخل ہیں لیکن عقائد میں اجتہاد کرنا گمراہی ہے اور حق وہی ہے جس پر اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے، حدیث میں جس اختلاف کی مدح ہے اس سے فرعی احکام کا اختلاف مراد ہے اور جس تفریق کی ممانعت وارد ہوئی ہے اس سے اصول کی تفریق مراد ہے (شرح مواہب)

حضرت علامہ سبکی رہ فرماتے ہیں کہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اصول کا اختلاف گمراہی ہے اور ہر فساد کا ذریعہ ہے (الاعتدال ص۲۱۶)

اختلاف مذاہب کی حقیقت اور اس کی حکمت :-

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رہ لکھتے ہیں :- ایک ہی مرغن غذا ایک تندرست آدمی کھا کر زیادہ قوی اور توانا ہوتا ہے، لیکن ایک ضعیف المعدہ مریض کو اس کا استعمال

ہلاکت سے قریب ترکر دیتا ہے۔ ایک ہی نسخہ ایک طبیب کا تجویز کیا ہوا ایک ہی وقت میں ایک مریض کے حق میں اکسیر شفا ثابت ہوتا ہے، مگر دوسرے مریض کے لیے جس کا مرض اس طرح کا نہ ہو سم قاتل سے کم نہیں رہتا۔ ان سب صورتوں میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ ایک ہی چیز ایک ہی وقت میں ایک ہی شیشی میں عطار کی دکان یا سرکاری ہسپتال میں رکھی ہوئی ہے اس کو ہم کسی طرح بھی مفید بھی، مضر بھی، منجی بھی اور مہلک بھی، واجب الاستعمال بھی اور ممنوع الاستعمال بھی کہہ سکتے ہیں؟ اس کا جواب بجز اسکے اور کیا ہوگا کہ یہ سب احکام و اوصاف واقعیہ اس دوا کے لئے مختلف استعمال کرنے والوں کی نسبت سے ثابت ہوئے ہیں جن کی واقعیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، تو میں پوچھتا ہوں کہ اب آپ کا وہ قاعدہ کہاں درست رہا کہ مختلف حیثیات زائدہ کے لگنے سے کسی چیز کے واقعی احکام نہیں بدل سکتے کیونکہ یہاں ماہیت اور حقیقت تو اس دوا کی غیر متغیر ہے جو کچھ بھی اختلاف آیا ہے بہرحال باہر سے آیا ہے۔ بیش بریں نیست کہ آپ یہ کہیں گے کہ مذاہب اربعہ پر اس مثال کے انطباق کی فرقہ مصوبہ (جو کل مجتہد مصیب کا قائل ہے) کے نزدیک کیا صورت ہوگی اس کے متعلق بالاجمال یوں کہا جا سکتا ہے کہ شارع کی طرف سے کسی مجتہد کو اجتہاد کی اور غیر مجتہد کو تقلید کی اجازت ہونے اور اپنے اجتہاد یا امام کے مسلک کو واجب الاتباع ٹھہرانے کے یہ معنی ہیں کہ ان کے مذاق کے موافق حق تعالیٰ شانہ کے علم ازلی میں جس فعل کا کرنا تمام بندوں کے حق میں مفید تھا، اس نے تمام مجتہدین امت محمدیہ کو ان کے جواز یا وجوب پر اتفاق کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی اور جس کا چھوڑنا اصلح تھا اسکے واسطے ایسے راستے نکالے اور سامان مہیا فرما دیئے کہ تمام مجتہدین کا اجماع اسکی حرمت یا کراہت پر ہوگیا، اور جس فعل کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنے علم ازلی میں بعض بندوں کے حق میں نافع اور بعض کے حق میں مضر سمجھا اس میں ائمہ ہدیٰ کی رائیں مختلف کر دیں، ادھر عام مومنین کے قلوب میں خالص اپنی رحمت سے جو مومنین پر مبذول ہوتی ہے ایسے مختلف ودواعی اسباب پیدا فرما دیئے جو ان میں سے ہر ایک کو خواہی نخواہی ایک ایسے امام کی تقلید کی طرف لے جائیں کہ جس کا مسلک اس خاص شخص کے حق میں اصلح تھا (ہدیہ سنیہ)

حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانی رہ نے کس قدر نفیس پیرایہ میں اختلاف مذاہب کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے اور بتلایا ہے کہ صحابہ کرام تابعین اور ائمہ ہدیٰ کا فروعی اختلاف امت کے لئے رحمت ہے

اور اس اختلاف سے امت میں تنگی نہیں بلکہ وسعت عمل سامنے آتی ہے۔

جو لوگ ائمہ اربعہ کے اختلاف کو ضلالت کا نام دیتے ہیں اور اسے امت میں انتشار کا باعث بتلاتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ اختلاف صرف ائمہ اربعہ کے درمیان نہیں تھا بلکہ ان سے بھی پہلے تابعین میں یہ اختلاف رہا اور ان سے بھی قبل صحابۂ کرام میں فروعات میں اختلاف رہا اور ان سے بھی پہلے بعض امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کے مختلف پیرائے اختیار فرمائے، اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی رائے واجتہاد کے مطابق کسی عمل کو ترجیح دی، ائمہ اربعہ کے خلاف نفرت کا طوفان پیدا کرنے والے اگر صحابۂ کرام ہی کے اختلافات پر نظر کرلیں تو شاید انھیں توبہ کی توفیق مل جائے۔

مذاہب ائمہ اربعہ پر طعن کرنے والے کون ہیں؟

پھر ان میں سے بعض لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ حضور تو ایک ہی شریعت لائے تھے یہ چار مذاہب کہاں سے آکھڑے ہوئے، یہ لوگ مذاہب اربعہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل پیش کرکے عوام کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں، ان لوگوں کو چاہیئے کہ امام ترمذی کی جامع ترمذی کا ضرور مطالعہ کریں، تاکہ انھیں پتہ چل جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کے مختلف پیرائے اختیار فرمائے اور صحابۂ کرام نے اسی کی روشنی میں مختلف راہ عمل اختیار کیں، سو یاد رکھئے، یہ چار فرقے نہیں، عمل کی چار راہیں ہیں جو صحابہ کے زمانہ میں یقیناً چار سے زائد تھیں۔

اس قسم کے معترضین کے جواب میں ہم مزید کچھ کہنے کے بجائے محدث شہیر امام شمس الدین محمد بن یوسف صالحی دمشقی شافعی (۹۴۲ھ) کا جواب نقل کئے دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے

سمعت بعض الجهال يقول النبي صلى الله عليه وسلم جاء بشرع واحد فمن اين مذاهب أربعة؟ (عقود الجمان ص۱۲)

قبل اس کے کہ کوئی شخص امام صالحی پر برس پڑے انھیں محدث جلیل علامہ ابن حجر شافعیؒ کا یہ بیان بھی پڑھ لینا چاہیئے۔

بعض جاہل کہنے لگے کہ حضور تو ایک ہی شریعت لائے تھے یہ چار مذہب کہاں سے آگئے (الخیرات الحسان ص۲۹) سو ہمیں اس پر طعن نہ کیا جائے کہ ہم نے ایسے لوگوں کو جاہل کہا ہے یہ محدثین کرام ہیں جو انھیں کھلے عام جاہل کہہ رہے ہیں، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے تو بات کھول دی ہے اور بتلایا ہے کہ ایسا کہنے والے کون ہیں، شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔

فصل قال الرافضی ...... واتخذوا مذاهب اربعة لم تكن فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (منہاج السنۃ جلد ۲ ص۱۹ مصر)

ہم ان رافضیوں کو کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ تم نے جو دو مذاہب نکال لئے ہیں، ایک جو تقیہ کے ساتھ چلے اور ایک وہ جو بغیر تقیہ کے چلے ان سے تو یہ چار ہی اچھے ہیں، کیونکہ ان میں دیانت وامانت کو کہیں کھونا نہیں پڑتا۔ اور تمھارے مذاہب میں قدم قدم پر امانت و دیانت کا ماتم ہوتا نظر آتا ہے (فاعتبروا یا اولی الابصار)

ہم آخر میں یہ کہہ کر اس مضمون کو تمام کرتے ہیں کہ فقہاء کے اختلافات کو حکمت رسالت کی وسعتوں میں دیکھئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مختلف وقتوں میں مختلف پیرایہ عمل اختیار کئے، صحابہ نے انھیں حکمت رسالت کی وسعتیں جانا اور کبھی ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار نہ ہوتے، اسی طرح ائمہ اربعہ کے پیرو پچھلی بارہ صدیوں میں سب ایک دوسرے کو اہل سنت کے دائرہ حقہ میں شمار کرتے آرہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ اپنے اختلاف کو صواب وخطا میں محدود رکھا انھیں حق وباطل کی پٹری پر کبھی نہیں لائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس صراط مستقیم سے وابستہ رکھے، اور فقہی اختلافات کو لڑنے کا میدان بنانے اور حق وباطل کا عنوان بنانے سے بچنے کی توفیق دے آمین

وما علینا الا البلاغ المبین۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اکبر شاہ خان نجیب آبادی

بارہویں صدی ہجری کے شروع میں قاضی محب اللہ ابن عبدالشکور بہاری قاضی صوبہ بہار المخاطب بہ فاضل خاں، میر سید مبارک محدث بلگرامی، خواجہ محمد نقشبند نبیرہ مجدد صاحب الف ثانی، شاہ محمد فاخر الہ آبادی، شیخ احمد امیٹھوی المعروف بہ ملا جیون، شیخ ابو الفیض عبدالرحیم صاحب دہلوی، میر عبدالجلیل ابن سید احمد بلگرامی، میرزا جانجاناں مظہر دہلوی، ملا نظام الدین ابن ملا قطب الدین لکھنوی، شیخ محمد افضل سرہندی، شیخ نور الدین گجراتی، وغیرہ بہت سے علمائے ربانی ہندوستان کے مختلف حصوں میں موجود تھے، لیکن اس افراتفری اور بے اطمینانی کے زمانہ میں کتاب وسنت کی اشاعت کا جو کام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے کیا وہ کسی دوسرے سے ممکن نہ ہوا، حضرت شاہ صاحب ممدوح نے ہندوستان میں سب سے پہلے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ لکھا، اس ترجمہ کے شائع ہوتے ہی ہر طرف سے مخالفت کا شور برپا ہوا اور مولویوں نے شاہ صاحب کی تکفیر تک نوبت پہنچائی، شاہ صاحب نے اس جوش مخالفت میں حج کا ارادہ کیا اور دو سال تک ہندوستان سے غیر حاضر رہے مکہ معظمہ میں قیام فرما کر دو حج ادا کئے اس کے بعد ہندوستان واپس آئے تو مخالفت کا جوش فرو ہو چکا تھا، واپس آکر شاہ صاحب کو کتاب وسنت کی اشاعت وتبلیغ کا آزاد اور وسیع موقع ملا، یہی وہ زمانہ تھا کہ نادر شاہ ایرانی نے ایران میں جعفری مذہب ایجاد کیا، جس کو شیعہ مذہب کی ایک اصلاح شدہ حالت کہنا چاہئے، اسی زمانہ میں محمد بن عبدالوہاب نے نجد میں شرک وبدعت کے استیصال اور کتاب وسنت کی اشاعت کے لئے زبردست تحریک شروع کی اور بعض سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کو محمد بن عبدالوہاب اور ان کے خاندان والوں کی مخالفت کرنی پڑی، ہندوستان میں آصف جاہ صوبہ دار دکن، صفدر جنگ صوبہ دار اودھ، نواب بنگش والی فرخ آباد، افغانان روہیل کھنڈ صوبہ دار پنجاب سب خود مختار ہو چکے تھے، سندھ، ملتان، گجرات، مالوہ، بنگال کشمیر وغیرہ کی بھی یہی حالت تھی، مرہٹوں نے بھی ادھم مچا رکھی تھی، راجپوتانہ بھی آزاد ہو چکا تھا، انگریز بھی

بنگال و مدراس و بمبئی میں اپنی طاقت بڑھانے کی اور ملک پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے، میسور میں سلطان حیدر علی بھی اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے سامان فراہم کر رہے تھے۔

اودھ اور روہیل کھنڈ کی جنگ دراصل شیعہ سنّی کی جنگ تھی

روہیل کھنڈ کے پٹھانوں کو دہلی سے خاص تعلق اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ سے خصوصی عقیدت تھی جس کے اسباب بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، لہذا روہیل کھنڈ میں کتاب وسنت کی اشاعت اور اس پر عملدرآمد کا زیادہ موقع ملا، صفدر جنگ حاکم اودھ چونکہ شیعہ اور ہندوستان بھر کے شیعوں کا پیشوائے اعظم کہا جاسکتا تھا، لہذا اودھ اور روہیل کھنڈ کی جس قدر لڑائیاں ہوئیں ان کا اصل سبب یہی مذہبی اختلاف تھا، اس مذہبی اختلاف بلکہ مخالفت نے بڑا طول کھینچا، نجیب الدولہ فرمانروائے نجیب آباد اور حافظ رحمت خاں فرماں روائے بریلی متبع کتاب وسنت اور شیعیت سے سخت متنفر تھے، نجیب الدولہ نے دارانگر میں برلب دریائے گنگ ایک عالیشان مدرسہ تعمیر اور جاری کر کے دینی تعلیم کو روہیل کھنڈ میں خوب رواج دیا، حافظ الملک حافظ رحمت خاں حاکم بریلی نے شیعہ مذہب کی تردید میں ایک کتاب لکھی، صفدر جنگ نے اپنے سُنّی ہمسایوں سے انتقام لینے اور روہیل کھنڈ و فرخ آباد کو برباد کرانے کے لئے مرہٹوں کو شمالی ہند میں فوجیں لانے کی ترغیب دی اور روہیل کھنڈ کے سنی پٹھانوں نے مرہٹوں کے مقابلہ میں اپنی پوری طاقتیں صرف کیں، آخر دہلی پر مرہٹوں کا قبضہ ہوا، احمد شاہ درانی کی آمد اور پانی پت کی تیسری عظیم الشان جنگ نے مرہٹوں کا زور توڑا اور چند روز کے لئے اودھ کے شیعوں اور صفدر جنگ کے جانشین شجاع الدولہ کو مرعوب و خاموش ہونا پڑا۔ لیکن فوراً ہی مذہبی عصبیت بلکہ تعصب میں جوش آیا، مرزا نجف خاں تربیت کردہ شجاع الدولہ نے دہلی میں بادشاہ پر اپنا اثر قائم کیا۔ شجاع الدولہ نے انگریزی فوجوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا، نجف خاں اول شاہی فوجیں لے کر دہلی سے نجیب آباد کی طرف روانہ ہوا اور چند روز کے بعد شجاع الدولہ انگریزی لشکر کے ساتھ بریلی کی طرف بڑھا، تمام روہیل کھنڈ کو روند ڈالا اور پٹھانوں کی بربادی کے ساتھ ہی دہلی کی سلطنت اسلامیہ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ بارہویں صدی ہجری کے آخر میں روہیل کھنڈ کے پٹھان انگریزوں اور اودھ

کے شیعوں کی متفقہ کوشش سے برباد ہوئے، اور اس کے بعد ہی تیرہویں صدی کے ابتدائی حصہ میں سلطان حیدر علی کی قائم کی ہوئی زبردست سلطنت نظام حیدر آباد اور انگریزوں نے مل کر برباد کی اور ٹیپو سلطان ابن حیدر علی کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ (البقرہ، رکوع ۱۹) اور انگریزوں نے دہلی پر اپنا قبضہ قائم کیا، ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں اسی قسم کے حالات پیش آئے اور پنجاب کے سوا تمام ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

تیرہویں صدی کے مجاہدین اسلام

اس تیرہویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رح اور شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رح نے قرآن مجید کے لفظی اور بامحاورہ دونوں قسم کے ترجمے اردو زبان میں کئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی نے درس حدیث کا سلسلہ جاری کر کے تمام ہندوستان کو سیراب کیا، آج ہندوستان میں جہاں کہیں حدیث کے درس کا سلسلہ جاری نظر آتا ہے وہ حضرت شاہ صاحب ممدوح ہی کے فیض کا نتیجہ ہے، حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی اور حضرت مولانا عبدالعلی بحر العلوم لکھنوی بھی انھی لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے تیرہویں صدی ہجری کے ابتدا میں دین اسلام کی بہت خدمت کی، اسی زمانے میں سکھوں نے پنجاب کی مسلم آبادی کے لئے اسلام کا ارکان بجالانا غیر ممکن اور ان کا مسلمان رہنا دشوار بنادیا، لہذا حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ، حضرت مولانا عبدالحی صاحب اور ان بزرگوں کے دوستوں نے ہندوستان سے افغانستان کے سرحدی علاقہ میں ہجرت کی اور وہاں سے سکھوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ اور سید صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ شہید ہوئے اور ان کی جماعت اور ان کے متبعین کا سلسلہ تو آج تک سرحدی علاقہ میں موجود رہا پایا جاتا ہے لیکن سکھوں کی حکومت و سلطنت عرصۂ دراز ہوا کہ ختم ہو چکی ہے۔

(۱) دارالعلوم دیوبند کے قدیم فاضل، نامور طبیب اور عالم باعمل مولانا حکیم محمد احسن صاحب سنبھلی ۵ رمئی ۱۹۹۴ء مطابق ۲۳ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ کو تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں اپنے آقائے رحیم وکریم کی آغوش رحمت میں پہونچ گئے۔ مرحوم حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کے حقیقی بھائی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے تلمیذ رشید تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد تکمیل الطب لکھنؤ میں فن طبابت کی تکمیل کی، اور یہی طبابت زندگی کا مشغلہ بن گیا، جس کا سلسلہ وفات سے چند دن پہلے تک جاری رہا، مرحوم کو فن طب میں بڑی مہارت حاصل تھی، خاص طور پر نبض شناسی میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے دست شفا کی فیض بخش نعمت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا اس لئے مطب خوب چلتا تھا مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی، لیکن آپ نے اسے حصولِ زر کے بجائے خدمت خلق اور زادِ آخرت کا ذریعہ بنا لیا تھا، روزانہ بہت سے مریض ایسے ہوتے تھے جن کے نسخوں پر "ف" کی علامت بنی ہوتی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس مریض کو دوا مفت دیدی جائے، مزید برآں بہت سے مریضوں کے پرہیز کے لئے بھی اپنے جیب خاص سے انتظام کردیا کرتے تھے، مریض کے گھر جانے کی بھی کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔

مطب کی مشغولیت کے ساتھ جمعیۃ علماء کے اصلاحی وسماجی پروگراموں میں نہایت مستعدی و دلچسپی کے ساتھ شرکت کرتے تھے، اپنے محلہ کی مسجد میں تقریباً ۴۰، ۵۰ سال تک لوجہ اللہ امامت کے فرائض انجام دیتے اور ایک طویل مدت تک درس قرآن و درس حدیث دیتے رہے حکیم صاحب کو قرآن سے خصوصی شغف تھا، اسی کا ثمرہ تھا کہ حافظ نہ ہونے کے باوجود قرآن اس قدر یاد تھا کہ گویا حافظ قرآن ہی تھے، سحر خیزی وتہجد گذاری زندگی کا محبوب مشغلہ تھا حتی کہ آخر میں جب مرض نے بالکل نڈھال کردیا تھا اور ضعف اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ خود سے تیمم بھی نہیں کرسکتے تھے ضعف ونقاہت کی اس حالت میں بھی نماز تہجد میں ناغہ نہیں ہونے دیا

مزاج میں قدرے ظرافت ولطافت تھی اس لئے گھر کے چھوٹے بڑے سب آپ سے

انتہائی درجہ مانوس تھے، شکار کے بھی شائقین تھے۔ اور اس سلسلے کے بڑے دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے تبلیغ دین اور احقاق حق وابطال باطل میں بھی بڑے مستعد تھے اور اس راستے میں بڑی بڑی قربانیاں دیں، انجمن معاون الاسلام جو سنبھل کا ایک مشہور عظیم دینی ادارہ ہے، طویل عرصہ تک مرحوم اس کے ناظم اعلیٰ اور متولی رہے، اسی انجمن کی اراضی پر "مدینہ مسجد" کے نام سے ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی اور ایک مدرسہ مدینۃ العلوم کے نام سے قائم فرمایا، غرضیکہ مرحوم اپنی نیک نفسی اور گوناگوں دینی وسماجی خدمات کے لحاظ سے ایک نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔

دعا ہے کہ خدائے غفور وشکور مرحوم کی سیئات کو مبدل بہ حسنات فرمائے ان کی علمی و دینی خدمات کو شرف قبولیت سے ہمکنار کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل وثواب جزیل ارزانی فرمائے۔

۳:۔ دارالعلوم دیوبند کے نامور فاضل، تحریک مدح صحابہ کے فعال ومتحرک قائد اور کاکوری ضلع لکھنؤ کے مشہور علمی وروحانی خانوادہ کے سپوت حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقی:

۲۳ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ مطابق ۳/۴ جون ۱۹۹۴ء کی درمیانی شب میں رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ✽ ہوگئے خاک انتہا یہ ہے۔

مرحوم حضرت مولانا عبدالرحیم فاروقی کے فرزند اور امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور قدس اسرارہما کے برادرزادہ تھے، ۲۴ شوال ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۴ء کو اپنے آبائی وطن کاکوری ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور متوسطات کی تعلیم علی الترتیب لکھنؤ اور مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ ضلع مرادآباد میں حاصل کی پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی وغیرہ اساتذہ دارالعلوم سے دورۂ حدیث وغیرہ پڑھ کر ۱۹۳۶ء میں سند فراغت حاصل کی، تعلیم وتحصیل سے فارغ ہوجانے کے بعد حضرت امام اہل سنت کے قائم کردہ ادارہ دارالمبلغین سے وابستہ ہوگئے اور حضرت امام اہل سنت کی معیت میں اس علمی وتربیتی ادارہ کو بام عروج تک پہونچانے میں بے لوث خدمات انجام دیں اور بانیٔ ادارہ کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک بحیثیت مہتمم کے اس کی خدمت کرتے رہے، دارالمبلغین کی زیر سرپرستی چلنے والا مدرسہ عربیہ خزینۃ العلوم آپ ہی کی مساعی مشکورہ کا مظہر ہے۔

۱۹۶۲ء میں دارالمبلغین سے الگ ہوکر اپنی تمام تر توجہات کا مرکز دارالعلوم فاروقیہ کاکوری کو بنا لیا تھا جسے انھوں نے ۱۹۶۶ء میں ایک مکتب کی شکل میں قائم کیا تھا مرحوم کے حسن اخلاق اور جہد مسلسل سے آج یہ مکتب ضلع لکھنؤ میں درس نظامی کا اہم ترین مرکز اور تعلیمی ادارہ شمار ہوتا ہے

خطۂ اودھ جو شیعی نوابان اودھ کی بدولت رافضیت کا ایک گڑھ باور کیا جاتا تھا جہاں شیعوں کے علاوہ سنی مکتب فکر سے وابستہ عوام بھی تشیع کی بدعات و خرافات سے ملوث تھے، مولانا مرحوم نے شیعوں کے اس مضبوط قلعہ میں اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے دراڑ پیدا کردی اور نواب محمود آباد جیسے با اقتدار غالی شیعہ کے حوصلے پست کردیئے۔

فضائل صحابہ پر آپ کی تقریر بڑی دل نشین اور اثر انگیز ہوتی تھی، اور صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص تک اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے، اپنی بے لوث علمی و دینی خدمات کی بناپر ملک کے علمی و دینی حلقوں میں وقار و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے

افسوس کہ فروتنی و انکساری، سادگی اور وضعداری کا یہ پیکر جمیل اور جہد و عمل کا شیدائی اور امام اہل سنت ـــــــ حضرت مولانا عبدالشکور رحمہ اللہ کا ساختہ و پرداختہ اور ان کی اداؤں کا امین اور ناموس صحابہ کا محافظ آج ہمارے درمیان میں نہیں رہا، جانے والے خدا کی تم پر ہزار ہزار رحمتیں ہوں۔

۳ :- شعبۂ تنظیم دارالعلوم دیوبند کے جواں سال کارکن مولانا غیاث الدین آسامی چند روزہ علالت کے بعد ۲ محرم ۱۴۱۵ھ کو رحلت کرگئے، مرحوم دارالعلوم سے فراغت کے بعد شعبۂ تنظیم سے وابستہ ہوگئے تھے۔

مرحوم دارالعلوم کے ایک فرض شناس خادم ہی نہیں بلکہ اس کے سچے عاشق تھے، اور اسی جذبہ سے دارالعلوم کی خدمت کرتے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کی اپنی خاص رحمت و نصرت سے دستگیری فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے، آمین۔

پتہ

ڈرافٹ و چیک کیلئے :- دارالعلوم دیوبند — اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے :- حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند — پن کوڈ نمبر 247554

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
PIN 247554
ماہنامہ
دارالعلوم
جلد نمبر ۷۹
شمارہ نمبر ۸
ماہ صفر المظفر ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۴ء
فی شمارہ ۶/=
سالانہ ۶۰/=
نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
مُدیر
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند
سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۳۰۰/- روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/-
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/-
ترسیل زر کا پتہ :- دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند سہارنپور یوپی

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا
- پاکستانی حضرات مولانا عبد الستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دار العلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

دورِ حاضر میں اسلامی اداروں اور دینی درسگاہوں کا ملک میں جس طرح سے جال پھیلا ہوا ہے وہ تاریخ کے کسی عہد میں نظر نہیں آتا اور بحمد اللہ اس میں روز بروز ترقی ہوتی جارہی ہے، آپ پورے ملک کا گھوم کر جائزہ لیں آپ کو ہر صوبہ اور صوبہ کے ہر ضلع اور ضلع کی اکثر بستیوں میں دینی مدارس و مکاتب ضرور ملیں گے اور ان میں ایک دو نہیں سیکڑوں مدرسے ایسے ملیں گے جن کا سالانہ بجٹ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہوگا۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان درسگاہوں اور علمی تربیت گاہوں کے مفید اثرات ظاہر بھی ہورہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ پوری فراخدلی سے ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ ان دینی مدارس اور جامعات سے پورے طور پر مطلوبہ فوائد حاصل نہیں ہورہے ہیں اور ملت کی تشکیل و تہذیب کے سلسلے میں ان سے جو توقعات وابستہ ہیں وہ پوری نہیں ہورہی ہیں اور مسلم معاشرہ بے چین اور مضطرب ہے کہ اسے صحیح طور پر رہنمائی نہیں مل پارہی ہے عقائد و اعمال کی دیواریں متزلزل ہوتی جارہی ہیں، اخلاق و کردار کی قدریں دم توڑتی جارہی ہیں اور شعوری و غیر شعوری طور پر امت اپنی ڈگر اور صحیح راستے سے ہٹتی جارہی ہے۔

حالانکہ ماضی میں ہمارے اسلاف نے انھیں مدارس اور دینی تربیت گاہوں سے ملت کے بھٹکے ہوئے قافلے کو صحیح سمت پر لگانے کے ساتھ مدارس کے انھیں زاویوں میں بیٹھ کر باطل کا مقابلہ

بھی کیا تھا اور اس مؤثر انداز سے کہ اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کا جائزہ لیجیے، کس طرح غیر ملکی اور بدیسی تاجروں نے اپنے مکروفریب اور سازشوں کے ذریعہ ملک پر قبضہ جما لینے کے بعد اسلامی ملی شعائر و علامات دینی عقائد و نظریات اور قومی روایات و تشخصات کو ختم کرنے کیلئے حکومتی سطح پر ایک طوفان برپا کر رکھا تھا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ صاف نظر آرہا تھا کہ اگر بروقت الحاد و لادینیت کے اس سیلاب بلاخیز کے آگے بند نہیں لگایا گیا تو ہمارے سارے ملی و دینی تشخصات خس و خاشاک کی طرح اس کی رو میں بہہ جائیں گے۔

بالآخر حضرات اکابر رحمہم اللہ رب قدیر کے اعتماد اور بھروسے پر اٹھے اور اس طوفان کے مقابلے میں دینی مدرسوں اور اسلامی تربیت گاہوں کی مستحکم اور مضبوط دیواریں کھڑی کر دیں اور نہ صرف اس بند کے ذریعہ طوفان کے رخ کو موڑ دیا بلکہ انھیں درسگاہوں کے بوریہ نشین بیلوتوں نے اپنے جوشِ عمل جذبۂ حریت، اصابت فکر دینی صلابت اور ایثار و قربانی سے ایک ایسا صالح انقلاب برپا کر دیا کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے مرجھائے ہوئے گلستاں میں بہار تازہ آگئی، اور پھر ایک دن وہ وقت آیا کہ ہندوستان سے مسلمانوں اور ان کی تہذیب کو مٹا دینے کا خواب دیکھنے والی قوم اپنی تمام تر قوت و شوکت اور حیلہ سازیوں کے باوجود ملک بدر ہونے پر مجبور ہو گئی۔

مقام حیرت و حسرت ہے کہ آج بھی وہی درسگاہیں ہیں وہی ان کا نظام تعلیم و تربیت ہے وہی قال اللہ و قال الرسول کی صدائے روح نواز ہے غرضیکہ بظاہر سب کچھ اسی منہاج اور ڈھرے پر موجود ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ ان کے علمی و فکری سوتے خشک ہو گئے ہیں، ان کی کوکھیں بانجھ ہو گئی ہیں، مردم سازی کے ان کے سارے آلات زنگ خوردہ اور بیکار ہو گئے ہیں کہ ان سے اب نہ تو حضرت شیخ الہند جیسا مردم ساز قائد پیدا ہو رہا ہے اور نہ حکیم الامۃ مولانا تھانوی جیسا مصلح و مربی، نہ کوئی انور شاہ کشمیری جیسا محدث و محقق نظر آرہا ہے اور نہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی جیسا مرد کامل مجاہد اور نہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب جیسا ذہن ثاقب رکھنے والا مفتی دکھائی دے رہا ہے اور نہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی جیسا مضطرب اور امت کے غم میں بے چین داعی۔ اس روح فرسا صورت حال کا شدید تقاضا ہے کہ قافلۂ ملت کے حدی خواں حضرات علماء کرام اور مصلحین امت سر جوڑ کر بیٹھیں اور صورت حال کا مکمل بالغ نظری اور سوز قلبی کے ساتھ جائزہ لیں اور اصلاح حال کیلئے ایسا طریق کار اور لائحہ عمل مرتب فرمائیں جس سے ہماری دینی درسگاہوں کی متاع گمشدہ

پھر انھیں واپس ملجائے اور مردم سازی کے یہ کارخانے از سرِ نو چاک و چوبند ہو کر رجال کار کی تیاری میں مصروف ہو جائیں۔

مقامِ شکر ہے کہ ہند و پاک کے علماء میں سے ایک طبقہ مدارس دینیہ کی اس زبوں حالی سے بے چین اور مضطرب نظر آرہا ہے اور حالات کی درستگی کی تدبیریں سوچ رہا ہے جس پر یہ حضرات بجا طور پر تبریک و تہنیت کے مستحق ہیں لیکن اسی کے ساتھ اتنی گذارش بھی ہے کہ اس وقت تک حالات کی اصلاح کیلئے جتنی بھی آوازیں اٹھی ہیں وہ نصاب تعلیم تک محدود رہیں، اگرچہ یہ بھی ایک محتاج توجہ امر ہے اور اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم کو اس کے اصل منہاج و مقصد پر قائم رکھتے ہوئے حالات و اذہان کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اس سے اہم تر معاملہ تربیت کا ہے، علوم دینیہ کی تحصیل کرنے والوں سے جس تیزی کیساتھ دینی مزاج اور ملت کے ساتھ شیفتگی کا جذبہ ختم ہو رہا ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ اس بات کی طرف پہلی فرصت میں غور کیا جائے، اور دیکھا جائے کہ وہ حضرات جو طلبہ کے معلم و مربی ہیں وہ مطلوبہ دیانت و تقویٰ، اخلاق و اخلاص اور فہم و بصیرت کے معیار پر اتر رہے ہیں یا اس میں کمی اور نقص ہے پھر ان طلبہ کو دیکھا جائے جو ہمارے اداروں میں زیر تعلیم ہیں کہ کیا وہ طالب علمی کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں یا نہیں پھر دلسوزی کے ساتھ ایسا طریقہ اور راستہ بتایا جائے جس سے اساتذہ و طلبہ دونوں کا دینی و اخلاقی احساس بیدار ہو اس سلسلے میں ذمہ داران مدارس کو بھی اپنا احتساب کرنا ہوگا کہ آیا وہ اپنی ذمہ داریوں کو اسلامی دائرہ میں رہتے ہوئے نباہ رہے ہیں یا نہیں غرضیکہ صرف نصاب تعلیم میں تغیر و تبدل سے مدارس کو صحیح طور پر فعال و متحرک نہیں بنایا جا سکتا بلکہ پورے نظام اور طریق کار پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اسکے بغیر کسی مفید نتیجہ تک پہنچنا مشکل ہے، اس لئے کہ نصاب کے سہل الحصول بنانے سے ممکن ہے کچھ علمی فائدہ ہو جائے لیکن دینی معاملہ میں جو کمی آئی ہے ظاہر ہے کہ یہ کمی نصاب کی تبدیلی سے نہیں پوری کی جا سکتی ہے بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جب تک صحیح دینی جذبہ بیدار نہیں ہوگا علمی استعداد بھی پیدا ہونا مشکل ہے۔

مفکر، فلسفی، زاہد، مؤرخ، رہنما، عالم　∴　ہماری درسگاہیں قوم کے معمار جنتی ہیں
مگر محروم ہو جاتی ہیں جب دین و دیانت سے　∴　تو پھر یہ قوم و ملت کیلئے ایک عار بنتی ہیں

عرصۂ دراز سے ہم اپنے ملک میں علم اور علماء کا ماتم سنتے چلے آرہے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اب علم باقی رہا نہ علماء، یعنی ایسے علماء نہیں رہے جو حالات زمانہ سے باخبر ہوں، دور حاضر کے تقاضوں کو پورا کرسکتے ہوں، یہ ماتم آج سے نہیں ہے، اس کی ابتداء اس وقت سے ہوگئی تھی جب ہندوستان سے مغلیہ حکومت کا چراغ گل ہوا، اور مسلمان اچانک ایک گہری تاریکی اور ہمہ گیر مایوسی کے شکار ہوگئے تھے، جب کہ اس وحشت اور ظلمت کے دور میں اگر کوئی روشنی مسلمانوں کے حق میں ہوسکتی تھی تو وہ علماء ہی کے پاس مل سکتی تھی اگر کوئی راستہ تھا تو علماء ہی کے بتانے سے معلوم ہوسکتا تھا اور خود باقی ماندہ علماء اپنے فریضے سے غافل نہیں تھے جہاں تک ان کی وسعت وطاقت تھی، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے دین ومذہب کو سنبھالنے کی جدوجہد کی، لیکن نئی حکومت جو اپنے جلو میں نئی روشنی، نئی تعلیم، نیا طرز زندگی لئے، جبر وتشدد، الحاد واباحیت اور تشکیک وارتیاب کے طوفان عظیم کے ساتھ پھیلتی اور بڑھتی چلی جارہی تھی اس کی رو میں ملک کا بڑا حصہ بہتا چلا گیا، ان کی نظر میں علماء اور ان کی تحفظِ دین کے سلسلہ کی ساری کاوشیں بے وقعت تھیں۔

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی گرتی ہوئی حکومت نے آخری سنبھالا لیا، دہلی اور اس کے آس پاس کے حلقوں میں لال قلعہ کی محدود بادشاہی نے انگریزوں سے آخری پنجہ آزمائی کی مگر اس میں اس نے شکست کھائی، اس شکست کے نتیجے میں جو تھوڑی سی رہی سہی امید تھی اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس جنگ میں دلی کے قریبی علاقہ تھانہ بھون اور شاملی کے میدان میں علمائے دین نے بھی حوصلہ مندانہ حصہ لیا، مشہور بزرگ حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کی قیادت میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور دوسرے بہت سے علماء نے میدان کارزار میں نمایاں

خدمت انجام دی، مگر جب اس میں ناکامی ہوئی اور ایک طرف سے علماء کا قتل عام شروع ہوگیا تو اندیشہ ہوا کہ علماء کے ختم ہوجانے سے دین ہی کا خاتمہ ہوجائے گا، اس دور کے اہل اللہ اور اہل علم کے قلوب میں اللہ کی طرف سے یہ تدبیر آئی کہ ایک عوامی طرز کا دینی مدرسہ قائم کیا جائے جس سے عوام کا گہرا ربط ہو، اور وہاں بیٹھ کر نئی نسل کی تربیت کی جائے تاکہ وہ دین سے دور نہ ہونے پائے اور آئندہ اسلام کے تحفظ و بقا کا انتظام ہوسکے، یہی خیال تھا جو دیوبند کی سرزمین میں دارالعلوم کی شکل میں نمودار ہوا اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد سہارنپور اور مرادآباد میں اسی طرز کے مدرسے قائم ہوتے چلے گئے، اور پھر جا بجا ان کی شاخیں کھلنے لگیں، مرکز دیوبند قرار پایا، یہاں علماء و مشائخ کی ایک ایسی جماعت اکٹھی ہوگئی جس کی نظیر چشم فلک نے کم دیکھی ہوگی، ان حضرات نے یکسوئی اور خلوص کے ساتھ اسلامی علوم اور دینی اعمال و اخلاق اور روحانیت کی حفاظت و صیانت کو اپنا فرض سمجھا، دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا اس کے دس سال بعد سرسید مرحوم نے علی گڈھ میں ایک کالج کی داغ بیل ڈالی، اور مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت و فرمانبرداری اور انقیاد و خود سپاری کا سبق زور شور سے پڑھانے لگے، مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان کے ساتھ ہوگیا۔

ان دونوں کے بعد علماء کا ایک طبقہ اور اٹھا جس نے قدیم و جدید دونوں کو آمیز کرکے دین کی خدمت کرنی چاہی، انھوں نے دین و دنیا کا ایک معجون مرکب تیار کرنا چاہا، ان کا مرکز لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام سے وجود میں آیا، یہ تین گروہ برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے میدان عمل میں اترے، تینوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا ہر ایک نے دوسرے سے کچھ فائدہ اٹھایا مگر ان کا امتیاز و تشخص علیحدہ قائم رہا، ہر ایک کے خیالات الگ تھے، طریقۂ کار علیحدہ تھا۔

ان تینوں جماعتوں کا مرکز نظر اور نصب العین اس اعتبار سے تو متحد تھا کہ مسلم حکومت کے سقوط سے یکایک ذلت و ادبار کی جو گھٹا مسلمانان ہند پر چھا گئی تھی، ہر ایک چاہتا تھا کہ مسلمان اس سے کسی طرح نجات حاصل کریں، اور قدیم عزت و شوکت حاصل کریں، سرسید مرحوم کا خیال تھا کہ اب حکومت بدل گئی ہے اور حکومت ہی عزت و سربلندی کا سرچشمہ ہے، اسی سرچشمہ

سے لگے لپٹے رہنے میں عزت حاصل ہونے کا امکان ہے، اسی کا ساتھ دینا چاہئے، اسی سے سربلندی حاصل ہوگی، یہ طبقہ قدیم طرز کے علماء کے بالکل جانب مقابل میں سفر کررہا تھا، اس طبقہ والوں کو علم دین کے تقدس کا احترام ضرور تھا، مگر وہ اس کو بالکل ثانوی اور ضمنی حیثیت سے قبول کرتے تھے، ان کے نزدیک انگریز چونکہ فاتح قوم تھی اس لئے اس کی تقلید کرنی اور اس کی تہذیب کو اختیار کرنا ضروری تھا تاکہ جن راستوں سے وہ غلبہ و فتح مندی کی منزل تک پہونچے ہیں، مسلمان بھی اسی راستے سے کامیابی اور عروج حاصل کریں، یہ لوگ علماء کو آثار قدیمہ سے زیادہ مرتبہ دینے کو تیار نہ تھے، جنھیں یادگار کے طور پر محفوظ تو رکھا جاسکتا ہے، مگر ان سے کوئی کام نہیں لیا جاسکتا۔

علماء دیوبند کا عقیدہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی ذلت و پستی کا علاج یہ نہیں ہے کہ طاقت کی پیروی کی جائے، بلکہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دینی علوم، شرعی اعمال، عقائد اور اخلاق و روحانیت میں پختگی حاصل کریں، اپنے ظاہر و باطن کو شریعت کے مطابق رکھیں، خواہ بظاہر اس میں دنیا کی ذلت محسوس ہو، مگر اس سے حق تعالیٰ کی رضا و محبت حاصل ہوگی، پھر اس نے چاہا تو دنیا میں بھی عزت حاصل ہوگی۔

اہل ندوہ نے ان دونوں نظریوں کو جمع کرنا چاہا۔ یہ لوگ انگریزوں اور انگریزی تہذیب سے فی الجملہ متاثر تھے، ان لوگوں کے نزدیک علوم اسلامیہ کے ساتھ مغربی علوم و فنون کی بھی بڑی اہمیت تھی، وہ غالباً یہ سوچتے تھے کہ یہ فاتح قوم اگر اسلام اور اسلامی علوم کے حق میں مطمئن ہوجائے اور اس کے اشکالات واعتراضات دور ہوجائیں تو ایک صالح انقلاب دنیا میں آجائے، اس وقت یورپ سے گوناگوں علوم و فنون اپنی سحر طرازیوں کے ساتھ سیلاب کی طرح امنڈ رہے تھے اور نگاہیں ان سے خیرہ ہو رہی تھیں، حال یہ ہوگیا تھا کہ جس علم و فن پر یورپ کی مہر لگی ہوئی نہ ہوتی وہ قطعاً قابل قبول نہ ہوتا، اور خواہ کیسا ہی گھٹیا فن ہو اور کتنی ہی غلط بات ہو اگر یورپ کی مہر تحسین و تصدیق اس پر ثبت ہے تو وہ بالکل قابل قبول، درست اور مستحسن تھی، یہ لوگ بھی اس بلائے عظیم سے کسی نہ کسی درجے میں متاثر تھے، ان کا خیال تھا کہ علماء عصر حاضر کے تقاضوں سے بے خبر ہیں، علوم جدیدہ سے ناواقف ہیں، قدیم علوم کے حصار میں بند ہیں، یورپ سے ہر روز نت نئے اعتراضات اسلام کے خلاف تیر کی طرح برستے چلے آرہے ہیں، لیکن علماء کو ان اعتراضات کی خبر

ہی نہیں، تو جواب کیا دیں گے، نئی نسل انگریزی علوم کی طرف مائل ہوتی چلی جارہی ہے، اس کے دل و دماغ میں یہ اعتراضات راسخ ہوتے چلے جارہے ہیں، انھیں مطمئن کرنے کی علمار میں صلاحیت نہیں ہے اس لئے ایسے باصلاحیت اصحاب علم ہونے چاہئیں، جو دینی علوم کے ساتھ جدید علوم سے بھی ماہرانہ واقفیت رکھتے ہوں، عربی زبان کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور رکھتے ہوں، وہ چاہتے تھے کہ اسلامی علوم میں رسوخ کے ساتھ حکمراں جماعت کے بھی علوم وفنون اور زبان سے علماء آراستہ ہوں اس طرح وہ برابری کا رتبہ حاصل کرسکیں گے اور اسے اپنے دین ومذہب کے حق میں مطمئن کرسکیں گے نیز اس کی نگاہ میں جو ذلت مسلمانوں اور اسلام کی ہورہی ہے وہ بھی ختم ہوجائے گی۔

انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی حصوں میں پورا مسلم معاشرہ ان تین بڑے کیمپوں میں تقسیم تھا، اور بھی کچھ چھوٹے چھوٹے کیمپ تھے، مگر زیادہ اہم یہی تینوں تھے یہ سب اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے نام پر متفق تھے، آپس میں اشتراک عمل کی صورتیں بھی نکلتی رہتی تھیں تاہم نظریہ اور طریقہ کار کے اختلاف کی وجہ سے کچھ آویزشیں بھی تھیں غلط فہمیاں بھی تھیں، ایک دوسرے پر گاہے گاہے طنز وتعریض کرتے رہتے تھے، لیکن مجموعی اعتبار سے نیک نیت لوگ تھے قرآن وسنت کو سب تسلیم کرتے تھے مگر ان کے استعمال اور فہم کا طریقہ الگ الگ تھا، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ طنز وتعریض بلکہ تجہیل وتحمیق کا نشانہ جس قدر وہ علمار بنے جنھوں نے اسلاف کی روایات کو سینے سے لگائے رکھنا چاہا انھیں جس قدر زمانے سے بے خبر بتایا گیا، انھیں جتنا ناقابل اعتناء اور خارج از بحث قرار دیا گیا اس درجہ کسی اور کو نہیں کہا اور سنا گیا، انھیں غیر بھی کوستے تھے اور وہ لوگ بھی صلواتیں سنانے سے نہ چوکتے تھے جو تھے تو زمرۂ علمار میں مگر روشن خیال سمجھے جاتے تھے، اس دور میں جو مضامین علم اور تعلیم کے موضوعات پر لکھے گئے ان میں اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔

اس مضمون میں ہم اس کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند جو دینی علوم کا مرکز بنایا گیا اس نے کس معیار کے علماء تیار کرنے کا ارادہ کیا تھا؟ اور کیا اس معیار کے علماء دین و ملت کے لئے ضروری اور مفید تھے، یا قوم پر بوجھ اور بے وقعت قسم کے لوگ تیار ہورہے تھے

اور کیا ان پر اعتراضات کی انگلیاں صحیح اٹھ رہی تھیں یا اس میں کچھ قصور انگلیاں اٹھانے والوں کا بھی تھا۔

اس سلسلے میں گذارش ہے کہ دنیا میں جہاں بھی مسلمانوں کی حکومت تھی یا اب ہے، اگر وہاں کے حکمراں مذہب سے کلیۃً آزاد نہیں ہوگئے ہیں تو اس جگہ اسلامی شریعت کامل طور پر نافذ ہو یا نہ ہو، لیکن مملکت کا مذہب اسلام ہی ہوتا ہے، حکومت اسلامی علوم و فنون اور اسلامی شعائر کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتی ہے اور اس کے لئے باصلاحیت علماء کے وجود کو ضروری سمجھتی ہے، جو اسلامی علوم اور اسلامی اعمال و اخلاق کو بالکل صحیح شکل میں باقی رکھیں، ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی حکومت خواہ جیسی بھی رہی ہو مگر اسلام اس کا مذہب تھا اس نے اسلامی علوم و اعمال کی اپنی استعداد کے بقدر سرپرستی کی، علماء و مشائخ کو کام کرنے کے مواقع بہم پہونچائے، حکومت ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتی رہی، جب تک ان کا حکومت سے کوئی سیاسی ٹکراؤ نہ ہوتا وہ اس کے ظل عاطفت میں اپنے فرائض مذہبی انجام دیتے رہتے، لیکن جب یہ حکومت ختم ہوگئی اور بدنہاد انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوگئی تو اب مذہبی علوم و اعمال شرعی، قوانین و احکام اور اسلامی معاشرہ کے تحفظ و بقا کا مسئلہ اہم بن گیا، حکومت کے دریا کا بہاؤ بالکل سمت مخالف میں تھا، اگر اس کے رحم و کرم پر مذہب کو چھوڑ دیا جاتا تو وہ کب کا ختم ہوچکا ہوتا، اس وقت غیرت مند علماء کی ایک تعداد موجود تھی، اگر پہلے سے کچھ غفلت تھی تو اسے سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریک نے جھنجھوڑ دیا تھا، ان غیور و صاحب ایمان علماء و مشائخ کو انگریزوں سے دوہری تکلیف تھی اول یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کی حکومت غصب کی، اسے برباد کیا، مسلمانوں کو ذلیل و خوار کیا، دوسرے یہ کہ ان کے عزائم سے پتہ چلتا تھا کہ وہ دین اسلام کا بالکلیہ استیصال کردینا چاہتے ہیں ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف صدیوں سے عداوت سلگ رہی تھی، اور ہندوستان میں حکومت حاصل کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمان ہی تھے، انھیں سے جگہ جگہ مقابلہ ہوا تھا اسلئے ان کا ارادہ بہرحال یہ تھا کہ ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کی جڑ اکھاڑ دینی ہے، اس صورت حال میں ان علماء کو کیسے گوارا ہوتا کہ اپنے دشمنوں، ظالموں، غاصبوں کی اہمیت تسلیم کرکے ان کے علوم و فنون کو خود حاصل کرتے اور ان کے بچوں کو ان کی گود میں دے دیتے، کیا یہ سمجھ میں آنے والی

بات ہے کہ ایک شخص ہمارے گھر میں آگ لگا رہا ہو اور ہماری تمام تر پونجی کو نذر آتش کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور ہم اس کی خوشامد کریں، اس کے گھر کی ٹھیکریاں چنیں انھیں سینے سے لگائیں، علماء یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ طوفان بلاء پوری امت مسلمہ کو اس کے قیمتی ورثہ سے محروم کر دے گا پھر مسلمان نہ مسلمان رہے گا نہ کافر، نام کے اعتبار سے مسلمان رہے گا اور حقیقت کے لحاظ سے اس میں اسلام کا نام و نشان نہ رہے گا۔

پھر ۱۸۵۷ء کی تاریخ شاہد ہے کہ انگریزوں نے چن چن کر بے شمار علماء کو قتل کیا، پھانسیوں پر چڑھایا، کالے پانی بھیجا، جن بزرگوں کو موقع ملا یہاں کے رستخیز کو دیکھ کر اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے انھوں نے حجاز کی طرف ہجرت کی راہ اختیار کی اور جو لوگ بچ رہے تھے ان کے سامنے کوئی راستہ نہ تھا کہ اسلام کی حفاظت کرتے، لڑائی اور جہاد کا موقع باقی نہ رہا تھا، حکومت کی سرپرستی ختم ہو چکی تھی، علماء کا صفایا کر دیا گیا تھا دور دور تک علاقے علماء سے خالی تھے، جن ارباب فضل وکمال کی ڈیوڑھیاں درسگاہ علوم بنی ہوئی تھیں اب وہاں خاک اڑ رہی تھی، اگر کچھ علماء باقی رہ گئے تھے تو وہ یا تو چھپ چھپا کر رہتے تھے اور ان کے سر پر ہر وقت خطرے کی تلوار لٹکتی رہتی تھی یا پھر وہ لوگ تھے جنھوں نے جنگ کے دوران انگریزوں کی وفاداری کی تھی، ان کا ساتھ دیا تھا، ان کے لئے مخبری کی تھی یہ لوگ اپنے کارناموں کے صلے میں جائدادیں حاصل کر کے آزادی اور راحت کا سانس لے رہے تھے مگر ان لوگوں سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ دین ومذہب اور قوم وملت کی صحیح خدمت کریں گے، ایسی حالت میں کوئی بتائے کس طرح کے علماء کی ضرورت تھی؟

اس دور میں ایسے علماء کی ضرورت تھی جو اللہ ورسول کے نام پر اپنی جان ومال اور عزت وناموس کو قربان کر دینے کا سچا جذبہ رکھتے ہوں، جنھیں دینی علوم میں اس درجہ رسوخ ہو کہ دین ومذہب کی ہر ضرورت کی تکمیل اپنے علم کی بدولت کر سکتے ہوں، جو حکومت کے دباؤ سے آزاد ہوں، ایسے با اخلاق اور صاحب نفس زکیہ ہوں کہ ان سے دین وایمان اور اخلاق فاضلہ سیکھے جا سکتے ہوں اور خود بھی دینی جذبہ سے سرشار ہو کر لوگوں کی اخلاقی اور باطنی تربیت کر سکتے ہوں، ایسے مجاہد ہوں جو ظالم وغاصب حکومت سے ٹکرا سکیں اور اسکی

جڑوں کو کمزور کر سکیں، ان میں محدث وفقیہ بھی ہوں ان میں مناظر و مبلغ بھی ہوں، ان میں مصنف وخطیب بھی ہوں، ان میں ایسے مخلص و بے نفس بھی ہوں کہ کسی دیہات، کسی گاؤں میں بے تکلف بیٹھ کر مسلمانوں کی خدمت بجا لاسکیں، ان میں ایسے متقی اور متدین لوگ بھی ہوں جن کے اوپر عامۃ المسلمین کو اعتماد ہو تاکہ جہاں جس طرح کے آدمی کی ضرورت ہو وہ ضرورت پوری کی جاسکے

اسی طرح کے بلند مقاصد کو سامنے رکھ کر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی، یہ صرف تعلیم وتدریس کا ایک ادارہ نہیں ہے جہاں استاذ نے کتاب پڑھادی اور طالب علم نے کتاب پڑھ لی اور بس، یہاں درحقیقت اسلام کے شیروں کی پرورش ہوتی تھی، یہاں کی فضاؤں میں ایسے مرد مومن نشو ونما پاتے تھے جن کی نگاہوں سے تقدیریں بدل جایا کرتی ہیں، سوانح قاسمی میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا ایک ارشاد نقل کیا ہے، شیخ الہند، دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے براہ راست شاگرد اور ان کے خصوصی تربیت یافتہ ہیں، وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ۔

"حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس تعلیم وتعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے، تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے ص ۲۲۶ / ج ۲ ۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے اس اجمالی ارشاد میں وہ تمام تفصیلات پنہاں ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا نصب العین تھا جس کے لئے افراد کار کے ساتھ بڑے سرمایہ اور منصوبہ بندپلان کی ضرورت تھی مگر یہ سب کچھ اللہ کے بھروسے پر کیا گیا، اور غریب مسلمانوں سے تحصیل چندہ کی طرح ڈالی گئی تاکہ انھیں اس مرکز اور اس کے واسطے سے دین سے مربوط کیا جاسکے، اس میں نہ کبھی کسی حکومت سے مدد چاہی گئی، نہ کسی نواب رئیس پر اعتماد کیا گیا۔

بتایا جائے کہ دین ومذہب کے تحفظ وبقا کے لئے یہ باتیں اہم تھیں یا نہیں ؟ کیا ان کے ضروری ہونے میں کسی کو کلام ہوسکتا ہے، اگر ایسا نہ کیا گیا تا تو ہر شخص اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائے کہ پھر انگریزوں کے سیلاب بلا کے مقابلے میں سینہ سپر ہوکر اسلام اور مسلمانوں کے دینی علوم اور اعمال

کی بقاء کے لئے اور کیا راستہ ہوسکتا تھا، اب تو یہ کہدینا آسان ہے کہ علماء حالات حاضرہ سے بے خبر ہیں، علوم جدیدہ سے ناواقف ہیں، یورپ سے آتے ہوئے اعتراضات کے جواب نہیں دے سکتے لیکن جس وقت یہ حضرات سینہ سپر ہوکر کھڑے تھے کیا کسی طرح عقل و ہوش رکھتے ہوتے باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ حالات سے بے خبر تھے، اگر یہ بے خبر ہوتے تو کشتی ڈوب چکی ہوتی، اندلس کا نقشہ سرزمین ہند پر قائم ہوجاتا، نہ علی گڑھ کا وجود اس حالت میں ہوتا، نہ ندوہ کا جس حالت میں اب وہ باقی ہے نام کے مسلمان بھی ختم کئے جاچکے ہوتے۔

فرض کیجئے کہ یہ حضرات بھی علوم جدیدہ کی تحصیل میں لگ جاتے اور انھیں سیکھنے لگتے تو سوچئے تو سہی کس سے سیکھتے، استاذ بھی انگریز تو ہوتے جنھوں نے ان کے دین ومذہب کی گردن پر تلوار رکھ رکھی تھی، اول تو یہ کہ ان کی غیرت کے خلاف تھا، اور اگر اپنی غیرت کا گلا گھونٹ کر سیکھتے تو ظاہر ہے کہ ہمیشہ کے لئے ان کی استادی کا قلادہ ان کی گردن میں ہوتا، اور ہمیشہ کے واسطے ان کا ممنون کرم ہونا پڑتا، ان حضرات کو یہ فن نہیں آتا کہ اپنے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کریں انھیں کی شان میں شوخ چشمی اور گستاخی کو فخر و کمال سمجھیں، اس کے بعد ان کی مرعوبیت کا بھی وہی عالم ہوتا جو عام طور سے انگریزی خواں طبقہ میں دیکھا جاتا ہے اور جب کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہوتا تو دو ایک نسل کے بعد دلوں سے اسلام ہی نکل جاتا، پھر کیا ان سے دین کی حفاظت کا کام ہوتا، یہ تو علوم جدیدہ سے انھیں بے خبر علماء کی صحبتوں، ان کے مواعظ ان کی تصانیف کا اثر ہے کہ جو لوگ انگریزیت میں کود رہے تھے اور اس میں لت پت ہوگئے تھے ان بزرگوں کی برکت سے اس سے صاف ستھرے ہوکر نکل آئے اور اس کے بعد ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ انگریزوں کے اٹھائے ہوتے اعتراضات کے جواب دے سکیں، ورنہ کیا انگریزی داں طبقہ جواب دینے کی ہمت کرسکتا تھا اور اگر ہمت بھی کرتا تو سرسید مرحوم کی طرح معذرت یا تحریف سے کام لیتا اور بجائے اس کے کہ اسلام کی ترجمانی ہوتی، اس کی صورت ہی مسخ ہوکر رہ جاتی، سچ پوچھئے تو ان حضرات نے بہت تدبر اور ہوش مندی کا ثبوت دیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ توفیق الٰہی ان کی دستگیر ہوئی کہ ان حضرات نے علوم جدیدہ کی جانب رخ نہیں کیا ورنہ جن لوگوں نے اس کی طرف رخ کیا، جو حشر ان کا ہوا وہی ان کا بھی ہوتا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں علوم جدیدہ کا شمول کیوں نہیں ہوا؟ اس سوال کا جواب دارالعلوم کے بانی مکرم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ کی زبان سے سن لیا جائے، اس سے اندازہ ہوگا کہ زمانہ کے مقتضیات سے یہ لوگ کس قدر باخبر تھے، اور جو کچھ کرتے تھے نہایت غور و تدبر کے بعد کرتے تھے، ۱۹ر ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹ر جنوری ۱۸۷۴ء میں دارالعلوم کے فارغ شدہ طلبہ کو سند اور انعام دینے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا تھا اس میں حضرت نانوتویؒ نے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ،

" اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ درباب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا، اور علوم جدیدہ کو کیوں نہیں شامل کیا گیا، منجملہ دیگر اسباب کے بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص، اس پہلو کا لحاظ چاہئے، جس طرف ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو، سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانۂ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی، ہاں علوم نقلیہ (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل کبھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا، ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل حاصل نظر آیا، صرف بجانب علوم نقلی (یعنی خالص اسلامی و دینی علوم) اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے (الخ) ضروری سمجھا گیا۔ سوانح قاسمی ص ۲۷۷ ج ۲ -

یہاں یہ سوال قدرتاً ذہنوں میں پیدا ہو سکتا تھا کہ ان نقلی علوم کے ساتھ جہاں بعض علوم عقلیہ منطق و فلسفہ کی گنجائش نکالی گئی وہیں علوم جدیدہ کو بھی کیوں نہیں شامل کیا گیا، اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت نانوتویؒ نے ارشاد فرمایا کہ:

" زمانۂ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے " سوانح قاسمی ص ۲۸۳ ج ۲ -

مطلب یہ ہے کہ جن علوم عقلیہ کی گنجائش دارالعلوم کے نصاب میں نکالی گئی ہے، وہ تو علوم نقلیہ کے خادم اور معاون کی حیثیت سے ہیں، ان سے ذہنی ورزش ہوتی ہے اور علمی استعداد بڑھتی ہے

لیکن علوم جدیدہ جن کی ایک الگ حیثیت ہے ان کو درس میں شامل کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ نہ دینی علوم میں رسوخ پیدا ہوتا اور نہ علوم جدیدہ میں ہی کوئی قابل ذکر قابلیت پیدا ہوتی، کیونکہ ان دونوں کا سمت سفر الگ الگ ہے، پھر بقول مولانا مناظر احسن گیلانی "یہ ہوتا کہ" استاذوں کے ایک حلقہ میں جن علوم و مسائل کی قدر و قیمت طلبہ پر واضح کی جاتی، معاً دوسرے حلقے میں پہونچنے کے ساتھ ہی ان کے وقار و وزن سے سے طلبہ کو خالی الذہن کرنے کی کوشش ہوتی، اثبات و نفی کے اس قصے میں اگر ہر دو کی نفی ہوتی رہے، تو ان دو متخالف طریقۂ تعلیم کا خود ہی سوچئے (نقصان استعداد کے علاوہ) دوسرا انجام ہی کیا ہوسکتا ہے۔ (سوانح قاسمی ص۲۸۴ ج ۲ بتصرف)

اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ تھا، اور اب یہ خطرہ واقعہ بن کر سامنے آچکا ہے کہ علوم دینیہ میں چونکہ معاش کی ضمانت نہیں ہے، بلکہ اسے تحصیل معاش کے ذریعے کے طور پر استعمال کرنا مذموم قرار دیا گیا ہے، اس کے برخلاف انگریزی علوم کسی نہ کسی درجے میں معاش کی ضمانت دیتے ہیں یا اس کی توقع پیدا کرتے ہیں اس لئے طالب علم کی زیادہ توجہ ان معاشی علوم ہی کی جانب ہوجاتی ہے اور وہ دینی علوم اور اس کے آثار و علائم سے برکنار ہوجاتا ہے، مولانا گیلانی فرماتے ہیں کہ:

"جدید علوم و فنون والسنہ کو چونکہ حکومت کی سرپرستی و پشت پناہی حاصل تھی، اس کی وجہ سے یہ بھی دیکھا گیا کہ اسلامی و دینی علوم کے جن آثار کی توقع پڑھنے والوں سے کی جاتی ہے بجائے ان کے اکثریت میں وہی رنگ غالب آجاتا ہے جو رنگ خالص مغربی علوم و فنون کی تعلیم پانے والوں کی خصوصیت ہے، رنگ ڈھنگ، وضع قطع، طریقۂ فکر و بیان سب ہی میں پایا گیا کہ وہ مغربی علوم کے طلبہ کے طفیلی بنے ہوئے ہیں،، الناس علی دین ملوکہم "بات تو پرانی ہے لیکن ہر نئے زمانے میں اس پرانی بات کا تجربہ کیا گیا ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم سے دارالعلوم کے نصاب سے متعلق ایک دن اسی سلسلہ میں گفتگو ہوئی، تو پہلی دفعہ اسی "پیر دانا" نے نوجوانی کے زمانہ میں فقیر کو سمجھایا تھا کہ توازن کا باقی رکھنا دشوار ہوجائے گا، طلبہ پر عموماً انگریزیت غالب آجائے گی دین کی ٹوٹی پھوٹی خدمت دارالعلوم کے طلبہ سے اس وقت جو بن آتی ہے تم دیکھوگے کہ اس سے بھی وہ محروم ہوجائیں گے وقت جیسے جیسے گذرتا چلا گیا مشاہدہ سے تجربہ کاروں کے خیال کی تائید ہوتی چلی جارہی ہے۔
(سوانح قاسمی ص۲۸۲ ج ۲)

کہنے اور لکھنے والوں نے جب یہ بات کہی اور لکھی تھی آج بھی وہی نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، جن مدارس نے انگریزی زبان اور اس کے علوم کو اہمیت دی ہے وہاں عموماً دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ ان مدارس سے چھلانگ لگا کر انگریزی جامعات میں جا کودتے ہیں، ہر سال کھیپ کی کھیپ ان مدارس سے نکل کر دنیاداری کے ان پہ بچوں میں جا گرتے ہیں اور جو باقی رہ جاتے ہیں، ان میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ بجائے دین کو نصب العین بنانے کے زیادہ تر کوشش دنیا ہی کی ہوتی ہے خود اگر بقدر خواہش دنیا حاصل کرنے کا موقع نہیں مل پاتا تو اپنی اولاد کو ادھر جھونک دیتے ہیں یہ ایسے مشاہدات ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مذکورہ بالا تفصیلات اور حضرت نانوتوی کی اس تقریر سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم کے قیام کا نصب العین کیا تھا؟ اور کس معیار کے علماء تیار کرنا چاہتا تھا، اب دیکھنا چاہئے کہ وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم کو خدمت دین کرتے ہوئے سوا سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے اور اس کے ذریعہ دین کی اتنی خدمات علم و فن اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں ہو چکی ہیں اور ایسے ایسے اساطین علم و فضل، بلند پایہ محدثین و فقہاء مخلص صوفیہ و مشائخ، بہترین مناظر و مبلغ اور کامیاب مصنف و اہل قلم اتنی بڑی مقدار میں تیار ہو چکے ہیں اور عظیم کارنامے انجام دے چکے ہیں، اور اب تک دیتے چلے جا رہے ہیں کہ کوئی آنکھ والا ان کے دیکھنے سے انکار نہیں کر سکتا، یہ دارالعلوم اور ان کے ہمرنگ مدارس کا ہی فیض ہے کہ آج ہندوستان کے قریہ قریہ میں باوجود مخالفانہ طاقتوں کی تمامتر زور آزمائیوں کے نہ صرف اسلام زندہ ہے بلکہ اسلامی شعائر زندہ و تابندہ ہیں، علماء کی اتنی بڑی تعداد ہر طرف بکھری اور پھیلی ہوئی ہے کہ شاید کوئی خطہ ان سے خالی ہو، اور ان میں سے اکثر اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق خدمت دین انجام دے رہے ہیں، دینی خدمت کا کون سا میدان ایسا ہوگا جہاں علمائے دیوبند کی خدمات جلیلہ کے روشن نقوش نہ جگمگا رہے ہوں، اب تو جو لوگ اعتراض کی وادی میں گھوم رہے ہیں وہ درحقیقت زمانے سے اپنی بے خبری کا ثبوت پیش کر رہے ہیں، ہاں جیسے زندگی کے ہر شعبے میں انحطاط نظر آ رہا ہے، علماء و مدارس بھی اس کے شکار ہیں، ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے، اور یہ کام بھی ہو رہا ہے جس پیمانے پر ہو رہا ہے وہ ناکافی محسوس کیا جاتا

ہے تاہم اس وقت دین اور دینی علوم کا جو چرچا ہے وہ انھیں مدارس اور انھیں علماء کی برکت ہے جو دارالعلوم دیوبند کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے ہیں

ضرورت تو نہیں تھی لیکن جی چاہتا ہے کہ چند شہادتیں بھی اس سلسلے میں پیش کردی جائیں یہ شہادتیں سید محبوب رضوی کی کتاب تاریخ دیوبند سے اخذ کی گئی ہیں، لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ لاہور کے مشہور روزنامہ سیاست نے لکھا تھا کہ

جہاں تک تحفظ دین، تردید مخالفین اور اصلاح مسلمین کا تعلق ہے، دارالعلوم دیوبند کے مدرسین و مبلغین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے، مثال کے طور پر ان غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کرلیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں، تو آپ کو روز روشن کی طرح نظر آئے گا کہ ان مساعی کے مقابلہ میں سب سے نمایاں طریق پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسہ عالیہ دیوبند ہی ہے اور دعویٰ سے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں دین حنیف، علوم عربیہ تفسیر حدیث اور فقہ کے چرچے بعونہ تعالیٰ بہت حد تک دیوبند کے وجود مسعود کی وجہ سے قائم ہیں۔"

(سیاست لاہور، ۲۷ر جون ۱۹۲۳ء)

کلکتہ کے اخبار "عصر جدید" نے علمائے دارالعلوم کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ۔

دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، اور مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے ہندوستان کے طویل و عریض براعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے ایسے وقت میں جب کہ علوم جدیدہ کی روشنی نے ظاہر بین نظروں کو خیرہ کردیا تھا جبکہ دنیوی عزت اور مناصب کی کشش اچھے اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی جب کہ لوگ مذہب سے بے پروا اور مذہبی تعلیم سے غافل ہوچکے تھے اور قال اللہ وقال الرسول کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقار خانہ میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم و تمدن کے شور و غوغا سے مغلوب ہوچکی تھی اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا جو قرآن و حدیث کے علم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا ملک کی غفلتوں اور سرد مہریوں کی آندھی نے رہ رہ کر اس کو

گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا، فاتح تہذیب کی خندہ زنی اس کو اپنی قدامت سے منحرف نہ کر سکی، نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کر اپنی رو میں اسے بہالے جائے مگر کس مپرسی کے باوجود وہ ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا، اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے ہر ہر گوشہ میں پہنچاتا رہا، یہاں تک کہ مسلسل جد وجہد کے بعد آج نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز، موصل، بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے فدائیان قرآن وحدیث آآکر پروانہ وار اس کے گرد مجتمع ہیں۔" (عصر جدید ۳، اکتوبر ۱۹۳۶ء)

آج سے تقریباً اسی سال پہلے ہندوستان کے ایک بڑے تاجر نے لکھا تھا کہ

میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں جہاں کہیں کسی درس گاہ، انجمن یا مدرسہ ومکتب میں کسی ذی استعداد عالم کی ضرورت ہوتی ہے تو دارالعلوم دیوبند ہی سے بلایا جاتا ہے اور وہیں کے تعلیم یافتہ عالم اور مدرس یہ قابلیت رکھتے ہیں کہ ہر قسم کی کتابیں بخوبی پڑھا سکیں، کلکتہ، بمبئی، دہلی، کانپور، الٰہ آباد، بنارس، بریلی، آگرہ، میرٹھ جس جگہ بھی آپ دیکھیں گے آپ کو دارالعلوم ہی کے فیض یافتہ مسند درس پر بیٹھے ہوئے ملیں گے (دارالعلوم دیوبند کی سیر اور اس کی مختصر تاریخ مطبوعہ ۱۳۳۵ھ)

اگر ہم خدمات جلیلہ کے اس اجمال کو ان علماء کے اسماء گرامی اور ان کی سیرت وسوانح کی تفصیل میں دیکھنا چاہیں تو اس کے لئے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے، دارالعلوم کے فضلاء میں اکثریت اصحاب درس علماء کی ہے جن میں ایک بڑی تعداد فن تدریس میں شہرت ومقبولیت کے حامل ہیں، یہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم میں جو نصاب درس اختیار کیا گیا اور اس کو جس انداز سے پڑھایا جاتا ہے، طالب علم اگر فطری استعداد و ذہانت کا ضروری حصہ بھی رکھتا ہو تو وہ بیشتر میدانوں میں کامل نکلتا ہے، یہ جامعیت کسی اور نصاب کو نصیب نہیں، استعداد علمی کا یہ حال سب اہل علم جانتے ہیں کہ جس نے دارالعلوم دیوبند کا نصاب سمجھ کر پڑھ لیا اسے کوئی بھی اور کہیں کا بھی دینی وعلمی نصاب دیدیا جائے وہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کا درس دیگا اور طلباء ان شاء اللہ مطمئن رہیں گے، اس کے برخلاف جدید اور جدید تر نصاب کے پڑھے ہوئے حضرات دارالعلوم کے نصاب میں چند قدم بھی شاید ہی چل سکیں

دارالعلوم دیوبند کے نصاب کے علاوہ دوسرے نصابوں کی پہونچ بس یہاں تک ہے کہ کچھ انشاء پردازوں، کچھ عربی بولنے والے، کچھ اردو کے ادیب پیدا کردیئے اور بس! لوگوں نے نعرے تو بہت خوشنما لگائے، جدید ترین اور بہترین نصاب کا نعرہ، جدید طریقۂ تعلیم و تربیت کا نعرہ، قرآن فہمی اور ذوق فصاحت و بلاغت کا نعرہ، علوم جدیدہ حاصل کرکے یورپ میں تبلیغ کا نعرہ اور نہ جانے کتنے کتنے نعرے جن سے فضا گونج اٹھی، اقصائے ہند میں غل مچ گیا، دیوبند کو کمتر گردانا گیا، مگر جب نتائج سامنے آئے تو اکثر نعرے ہوا ہوگئے، مایوسی، جھنجھلاہٹ اور شکایات کا طومار نعرہ لگانے والوں کے حصہ میں آیا اور جن طالب علموں کو علم و فضل کے بام ثریا تک پہونچانے کا وعدہ کیا گیا تھا، ان کا انجام یہ ہوا کہ عام طور سے ان میں دین سے دوری پیدا ہوگئی، طلب دنیا کا جذبہ کچھ زیادہ ہی ان میں دیکھا گیا، کچھ مورخ و مصنف ہوگئے بلاشبہ ان میں بعض نمونے کے انسان بھی بنے، بعض بڑی قدآور شخصیتیں تیار ہوئیں جن سے دنیا کو بہت نفع پہونچا، لیکن یہ مستثنیٰ افراد و اشخاص تھے اور سچ پوچھئے تو ایسے حضرات کی تربیت و تشکیل سیرت میں اصحاب دیوبند کا اچھا خاصا دخل رہا ہے، مگر ایسے مدارس کے طلبہ و علماء کا عمومی حال کیا تھا، علامہ شبلی اپنے ایک مکتوب میں تحریر کرتے ہیں، جو مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام لکھا گیا ہے کہ

> اس میں شبہ نہیں کہ طلبہ میں تقدس کا اثر نہیں ہے، آپ نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ایک دفعہ ندوہ کے لڑکے ڈیپوٹیشن کے طور پر بھیکن پور بھی گئے تھے، ان کی وضع سے آپ نے سمجھا کہ علی گڑھ کے لڑکے ہیں، یہ میری موجودگی سے قبل کا زمانہ ہے، اس کی وجہ میں نے بہت سوچا اس کے سوا کوئی نہیں کہ ابتداء سے آج تک کوئی پرنسپل مقدس اور با اثر نہیں ملا، ایک زمانہ میں مولوی فاروق صاحب مرحوم تھے وہ خود بے پروا تھے، مولوی . . . . . . صاحب خود پابند تھے لیکن اثر کچھ نہ تھا خود ان کا لڑکا . . . . ڈاڑھی ترشواتا تھا، اور وہ کچھ نہ کہتے تھے، اس کی نماز فجر نہ پڑھنے کی میں نے ان سے شکایت کی تو فرمایا کہ رات کو مطالعہ زیادہ دیکھتا ہے اس لئے صبح کو سوجاتا ہے، میں اول جب حیدرآباد سے آیا تو دیکھا کہ دارالاقامہ (بورڈنگ روم) میں طلبہ نے نواب محسن الملک وغیرہ کی تصویریں لگا رکھی ہیں، نماز نہ

پڑھنے پر گوشت کا پیالہ بند کیا جاتا تھا، لیکن ہر روز دس پانچ بند رہے، اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ کوئی مقدس بزرگ ہاتھ آئیں (مکاتیب شبلی ص۱۸۵ ج ۱)

آپ اندازہ کیجئے کہ جس ادارہ کا ابتدائی حال یہ ہو اس سے کس قسم کی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں، مقدس بزرگ تو دیوبند میں ملا کرتے تھے مگر وہاں سے ہمارے روشن خیال علماء کو ایک طرح کی جیسے ضد تھی۔ علامہ شبلی ہی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

دارالعلوم (ندوہ) کی کل میں نہایت ذلیل پرزے لگائے گئے ہیں، کیا قوم کو اس قدر امیدیں دلا کر دیوبند وغیرہ سے بھی گھٹیا مال دینا چاہئے۔ ص۱۴۱ ج ۱۔

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔

ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم کعبہ بنائیں گے۔ ص۱۴۹ ج ۱)

اور فرماتے ہیں کہ:

میں پوچھتا ہوں کہ آخر جب ندوہ بھی دیوبند ہے تو قوم کا روپیہ کیوں تباہ کیا جاتا ہے ص۱۵۱

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں دیوبند کی کس قدر تحقیر دل میں جاگزیں ہے، گویا دیوبند سرزمین ہند پر ایک جرم ہے، گناہ ہے، ایک فرسودہ عمارت ہے، گھٹیا مال تیار کرتا ہے، قوم کا روپیہ اس پر تباہ ہوتا ہے، لیکن اس کے بعد بھی مقدسین کی تلاش ہے جن کا طلبہ پر اثر ہو۔ علامہ شبلی بمبئی تشریف لے گئے، انھیں ندوہ کے لئے زمین ہموار کرنی ہے، اس کے لئے غالباً مال فراہم کرنا ہے، لیکن اس میں دشواری محسوس کر رہے ہیں، انھیں اس جنس کی ضرورت ہے جو علماء دیوبند میں اور قدیم نصاب تعلیم کے فاضلین میں تو بکثرت مل سکتی ہے، مگر جس نصاب تعلیم کو رائج کرنے کی وہ کوشش فرما رہے ہیں اس میں وہ جنس عنقا ہے، اس کی ضرورت ہے مگر دیکھئے کہ اس کا تذکرہ کس انداز میں کر رہے ہیں، لکھتے ہیں۔

"ندوہ کیلئے یہاں مولویوں کا جادو در کار ہے کسی مشہور واعظ کو لانا پڑے گا"

وعظ کی ضرورت ہے مگر مولویوں اور واعظ کے لئے کیا لہجہ اختیار کیا گیا ہے، تحریکات آغاز اکثر غنیمت ہوتا ہے بعد والے اسی کو نمونہ بناتے ہیں، [illegible] مدرسوں کی ابتدا

س رنگ میں نظر آرہی ہے تو اس سے کیا خیر کی توقع کی جاسکتی ہے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

ندوہ کا دعویٰ تھا کہ یہ قدیم وجدید یا بالفاظ دیگر دیوبند اور علی گڈھ کا مجموعہ ہوگا، لیکن جس طرح آدھا تیتر آدھا بٹیر نہ اچھا تیتر ہوتا نہ اچھا بٹیر، ندوہ میں نہ علی گڑھ کی پوری خوبیاں آئیں نہ دیوبند کی، فی الواقع ندوہ نے علی گڑھ اور دیوبند کی خوبیاں صحیح طور پر اخذ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، جب ندوہ کی بنیادیں ذرا گہری ہوئیں، اس نے اپنے آپ کو دوسرے اداروں کے مقابلے میں حریفانہ حیثیت سے پیش کیا ...... ارباب ندوہ کا دعویٰ تھا کہ وہ قوم کے دونوں بڑے تعلیمی اداروں سے اشتراک عمل کریں گے، لیکن ندوہ میں دونوں کی مخالفت ہوتی رہی، علی گڑھ کی نسبت جو کچھ مولانا شبلی ندوہ آجانے کے بعد کہتے رہے اس کا ذکر آگے آئے گا، دیوبند کی نسبت بھی ان کا طرز اسی طرح حقارت آمیز اور استہزاء سے بھرا ہوا ہے (مثال اوپر گذر چکی ہے)

واقعہ پھر یہ لکھتے ہیں کہ:

"واقعہ یہ ہے کہ مولانا شبلی نہ صرف کالج والوں سے ناراض تھے بلکہ وہ طبقۂ علماء کی نسبت بھی بڑی بری لائے رکھتے تھے، ان کے دلی خیالات اس زمانے کے ایک خط میں جب وہ ندوہ سے علیحدہ ہوئے تھے، ٹپک پڑے ہیں۔"

میرا نصب العین ایک مذہبی عام انجمن ہے، ندوہ ہو سکتا تھا، لیکن وہ مولویوں میں پھنس گیا، اور یہ فرقہ کبھی وسیع الخیال اور بلند ہمت نہیں ہو سکتا۔

عجیب بات ہے کہ جس فرقہ کی بلند ہمتی کی بنیاد پر دین اسلام کا فلک بوس قصر اب بھی قائم ہے اسی کے بارے میں کس تیقن کے ساتھ فیصلہ فرمارہے ہیں کہ یہ کبھی بلند ہمت نہیں ہو سکتا۔

محمد اکرام اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

ندوہ کا علی گڑھ اور دیوبند کی نسبت اس قدر حقارت سے بھرا ہوا طرز خیال تھا تو تعجب اس پر حیرت نہیں کہ ندوہ میں نہ جدید کی مادیت آئی اور نہ قدیم کی روحانیت، اور اس کا علمی معیار

روز بروز تنزل کرتا گیا۔

پھر یہ لکھتے ہوئے کہ علمی تصنیف وتالیف کی بعض منزلوں میں ندوہ کو اب بھی دیوبند پر چشم نمائی کا حق حاصل ہے اور وقت کا تقاضا بھی اسی سمت اشارہ کرتا ہے جدھر ندوہ قوم کو لے جانا چاہتا تھا، آگے تحریر کرتے ہیں کہ

لیکن کیا وجہ تھی کہ علم وروحانیت کا وہ پودا جسے بعض اللہ والوں نے دہلی سے ستر میل دور ایک قصبے میں لگایا تھا پھولتا پھلتا رہا اور لکھنوی ندوۃ العلوم کا تناور درخت چند دن کی بہا دکھانے کے بعد زمین پر آگیا - اے عقل چہ می گوید، اے عشق چہ فرمائی (موج کوثر ۱۹۲)

مولانا شبلی ندوہ سے مایوس ہو کر مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کو آریہ سماجیوں کے گروکل کے طرز کا مدرسہ بنانا چاہا، وہ لکھتے ہیں۔ اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح نظر ہو (مکاتیب شبلی ۲۲/۲۱۱)

مدرسۃ الاصلاح اب بھی چل رہا ہے، اس کا ایک مخصوص نصاب تعلیم ہے، اب معلوم ہوا ہے کہ اس میں اور کچھ جدت پیدا کی گئی ہے مگر کیا وہ ندوہ کے برابر بھی پہونچ سکا، اور کیا علامہ شبلی کے خواب کی وہ تعبیر بن سکا، ارباب اصلاح اگر ہمت کریں تو وہی جواب دیں۔

پھر اصلاح سے کچھ ہنگاموں کے بعد ایک ٹیم علیحدہ ہوئی، اس نے بلریا گنج ضلع اعظم گڈھ میں پڑاؤ ڈالا اور جامعۃ الفلاح کے نام سے اصلاح کا نیا ایڈیشن تیار کرنا چاہا، اس ادارہ کی بنیاد میں جماعت اسلامی کی روح گھلی ہوئی ہے، اور جماعت اسلامی اپنے بانی اور داعی کی ذہنی غلامی

---

(۱) آریہ سماج والوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کیلئے سنسکرت زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر گروکل کے نام سے مدارس قائم کئے تھے، علامہ شبلی فرماتے ہیں "کہ آریہ گروکل قائم کر رہے ہیں جو سنسکرت کی تعلیم کیلئے مخصوص ہے اور جس کا مقصد صرف اپنے مذاہب اور اپنے لٹریچر کی اشاعت ہے اس گروکل میں جو لڑکے داخل ہوتے ہیں ان سے عہد لیا جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام نہیں کریں گے، ۲۴ برس کی عمر تک ان کو تعلیم دی جاتی ہے، ان کو نہایت سادہ اور خشک غذا دی جاتی ہے سونے کو لکڑی کا تختہ ملتا ہے، اپنے ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے (مقالات شبلی ۸/۱۹۷) مولانا شبلی نے اسی نمونہ پر مدرسۃ الاصلاح کو بنانا چاہا لیکن اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی، خود ارباب اصلاح سے پوچھنے کا یہ سوال ہے۔

کے اثر سے علماء ومشائخ کے مقابلہ میں انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے زیادہ قریب ہے اس کا اثر جامعۃ الفلاح میں یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ دین کے نام پر دین کی تعلیم کے لئے قائم ہونے والا ادارہ خالص انگریزی تعلیم کی طرف تیزی سے بڑھتا چلا جارہا ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ جامعۃ الفلاح کے طلبہ وفضلاء پر کالج اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے نعرہ لگایا جاتا ہے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا، مگر فی الحقیقت اسلام کا چہرہ مسخ کیا جاتا ہے، اس دردناک صورت حال کا احساس وہاں کے بعض اہل انتظام اور بعض اساتذہ کو بھی ہے، مگر بے بس ہیں، جیسا بیج ڈالا جائے گا ضرور ہے کہ فصل ایسی ہی اُگے، اب اس ادارہ سے مسلمانوں کی دلچسپی اس لئے نہیں ہے کہ وہاں سے دین سیکھ کر اور دیندار بن کر طالب علم نکلے گا، بلکہ انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی کوہ کنی، اور وہاں کی حد سے بڑھی ہوئی گراں تعلیم سے بچ کر ان کی ڈگریاں حاصل کرنے کا یہ ایک مختصر اور سہل تر راستہ ہے، کیونکہ متعدد یونیورسٹیوں نے اس کی سند کو کسی خاص درجہ تک منظوری دے رکھی ہے، طالب علم اس میں اس لئے داخل ہوتا ہے کہ کم خرچ میں یہاں کی سند حاصل کرکے اس لائق ہوجاتا ہے کہ ملک اور بیرون ملک کی یونیورسٹیوں میں آگے کی تعلیم کے لئے داخلہ لے، ورنہ ابتداء تعلیم سے ہی اگر اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں جانا پڑے تو اس کے اخراجات بہت زیادہ ہوں گے اسی امید پر یہاں کے مصارف جو عام عربی مدارس سے بہر حال زائد ہیں طالب علم اور ان کے سرپرست گوارا کرلیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ طلبہ اس کو مدرسہ کہنے کے بجائے فلاح کالج کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

جامعۃ الفلاح سے انجمن طلبہ قدیم کی طرف سے ایک اس کا ایک ترجمان ماہنامہ "حیات نو" نکلتا ہے، اس کے ایک شمارہ کے اداریہ میں مدیر نے تحریر کیا ہے کہ

"آج خلیجی ممالک کی اہمیت بڑھ جانے کی وجہ سے عربی زبان کی طرف اشتیاق بڑھ گیا ہے، دوسرے یونیورسٹیوں سے مدارس کا الحاق ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ اسی جذبہ کے تحت اس مقدس وادی کا رخ کرتے ہیں، نیت کے خالص نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دھیرے دھیرے اس کا تقدس پامال ہوتا اور اس کی حرمت داغدار ہوتی جارہی ہے۔"

مدیر موصوف نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے مگر اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ طلبہ کو تصحیح نیت کا وعظ سنادیا جائے بلکہ ان تمام رخنوں اور سب سوراخوں کو بند کردینا چاہئے جن سے بری نیت کا ظہور ہوتا ہے، ایک طرف تو ارباب انتظام بطور فخر کے ترغیب کے لئے اعلان کرتے ہیں کہ فلاں مدرسے کی فلاں سند کو فلاں یونیورسٹی نے منظوری دے دی ہے، لہذا اے لوگو! آؤ اس مدرسے میں داخل ہوجاؤ پھر جب ہی نیت لے کر طالب علم آئے اور اس میں نیت بد کے اثرات ظاہر ہونے لگ جائیں تو اس کے خلاف وعظ کہنا شروع کردینا، دنیا کی کون سی منطق اس طرز عمل کو درست قرار دے گی۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

ان حالات کو دیکھنے کے بعد یہ بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے کہ دین کی حفاظت وصیانت کے لئے اللہ تعالیٰ نے علمائے دیوبند کو منتخب فرمالیا تھا، ان لوگوں نے طعنے سہے، دلخراش طنز برداشت کئے مگر اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم رہے لوگوں نے کم حوصلہ اور بے ہمت ہونے کا الزام لگایا، اگر یہ بے ہمت اور کم حوصلہ ہوتے تو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے، ہاں اب البتہ دیکھا جاتا ہے بہت سے لوگ اس بے معنی شور وغوغا سے متأثر ہوکر اپنے بزرگوں اور اسلاف کے طریقۂ کار میں زمانے کے تقاضوں کے عنوان سے ترمیم وتنسیخ کرنے لگ گئے ہیں، اسلاف نے خاموشی کے ساتھ کام کرنا اپنا شعار قرار دیا تھا، جتنا کرتے تھے اپنے زبان وقلم سے اس کا عشر عشیر بھی ظاہر نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اس فن ہی سے ناواقف تھے، آہستہ آہستہ رجال کار تیار کرتے رہے اور انھیں مختلف علاقوں میں بھیجتے رہے، اپنے طرز کے مدارس کی بناڈالتے رہے، ان میں فارغین کو کام پر لگاتے رہے، انھیں اس کی فکر نہ تھی اور نہ پروا کہ ہمارے کام کا تعارف ہو، اس کی نشرواشاعت ہو عرب وعجم اس سے واقف ہوں انگریزوں کے جیسے اور فنون سے یہ بزرگ ناواقف تھے، پروپیگنڈہ کے حق سے بھی نابلد تھے، ان کے لئے بس یہی کافی تھا کہ جس کے لئے کام کررہے ہیں وہ جانتا ہے، پھر کوئی مخلوق نہ جانے تو کیا مضائقہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں عرب وعجم، بخارا وسمرقند، ترکی، انڈونیشیا، ملیشیا، افریقہ کے نہ جانے کتنے طلبہ پڑھتے رہے، پڑھ پڑھ کر نکلتے رہے اور اب بھی دوسرے ممالک کے طلبہ باوجود بین الاقوامی سیاست کی پیچیدہ دشواریوں کے پڑھ رہے

ہیں، لیکن انھیں کس نے جانا، دارالعلوم نے کسی کے لئے اشتہار نہیں چھاپا، اس کے برخلاف دوسرے مدارس میں اگر ایک نومسلم آگیا، یا ایک عرب طالب علم آگیا تو اس کی اس درجہ نمائش کی گئی جیسے انھوں نے کوئی بہت عظیم کامیابی حاصل کرلی ہو۔

سلسلۂ کلام ذرا دراز ہوگیا، عرض کرنے کا منشا یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کا جو نصاب کسی قدر تغیر و ترمیم کے ساتھ جو ابتدا سے اب تک رائج ہے اور اس پر ایک سو تیس سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے اسے پڑھ پڑھ کر علماء کبار کی جو کھیپ متواتر نکلی اور نکلتی رہی اس کی جامعیت، اس کی بلند نظری، اس کی خدمات جلیلہ تو اب بحث و تحقیق سے بالاتر ہے، جن لوگوں نے اس نصاب تعلیم کو کسی حیثیت سے ناقص گردانا جو بھی اس کے دل سے معترف ہیں، دیوبند اور اس کے زیر اثر چلنے والے مدارس نے جیسے اہل فن علماء بالخصوص حدیث و تفسیر فقہ و سلوک اور احسان و تزکیۂ باطن میں پیدا کئے ان نظیر ملنی مشکل ہے، یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر "موج کوثر" سے شیخ محمد اکرم کا قدرے طویل اقتباس نقل کردیں، یہ ایک ایسے شخص کا اعتراف ہے جو نئی تعلیم اور نئی روشنی کا حامل ہے مگر ذہن و دماغ متوازن رکھتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"دیوبند کا قیام جنگ آزادی کے بیس پچیس[1] سال بعد ہوا، لیکن جلد ہی اس نے قوم کے تعلیمی نظام میں معزز جگہ حاصل کرلی اور آج قدیم طرز کی اسلامی درسگاہوں میں سب سے اہم گنا جاتا ہے، اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا بیج اچھا، اور اچھے ہاتھوں سے بویا گیا تھا، دیوبند کا مدرسہ حقیقۃً شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہ کے درس کی نمایاں خصوصیتوں کا حامل ہے اس میں فرنگی محل کی طرح منطق اور صرف و نحو اور فقہ ہی پر سارا وقت صرف نہیں ہوتا، بلکہ حدیث کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے، جو شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کی خصوصیت تھی، اسی خاندان سے شاہ عبدالغنی نے فیض حاصل کیا تھا اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ان سے ہی

[1] دارالعلوم کا قیام جنگ آزادی کے دس سال بعد ۱۸۶۷ء میں ہوا ہے

طرح حاجی امداداللہ صاحب، مولانا سید احمد بریلوی کے ایک خلیفہ[1] کے مرید تھے، اور مولانا سید احمد، شاہ عبدالعزیز کے نامور خلیفہ تھے، اس طرح دیوبند میں شروع ہی سے شاہ عبدالعزیز اور ان کے تلامذہ کے درس کی خصوصیات تھیں، مسلک ولی اللٰہی سے فیضیاب ہونے کے علاوہ مدرسہ کے منتظمین درس وتدریس کے جدید طریقوں اور نئے تعلیمی انتظامات سے بھی ناواقف نہ تھے، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے استاذ مولانا مملوک العلی دہلی کالج میں پروفیسر تھے اور ان دونوں بزرگوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی، پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب ایک عرصہ تک سرکاری محکمۂ تعلیم میں معزز عہدوں پر مامور رہے تھے، اور مولانا محمود حسن کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری مدارس کے انسپکٹر تھے، دیوبند نے ندوہ کی طرح اصلاح نصاب کے بلند بانگ دعوے تو نہیں کئے لیکن اس میں اصلاحیں کیں نصاب تعلیم میں مذہبی علوم کے علاوہ تاریخ، ہندسہ اور طب کا بھی انتظام کیا، ابتدائی درجوں میں اردو اور فارسی کی تعلیم بھی ضروری ہے، اس کے علاوہ دارالعلوم کو خوش قسمتی سے ایسے اساتذہ ملے جنھوں نے قوم کی نظروں میں اس کا وقار بڑھایا، مثلاً مولانا محمود حسن محدث، مولانا انور شاہ محدث اور مولانا شبیر احمد عثمانی، یہ لوگ زہد وتقویٰ راست گوئی، بے ریائی اور بے حرص میں اسلاف کے بہترین علماء وصلحاء کے نمونہ تھے، خود غرضیوں اور کج بحثیوں سے قطعاً پاک، نتیجہ یہ کہ مخالفین بھی ان کی عزت کرتے، مولانا شبلی سے مولانا محمود حسن کو اختلافات تھے، لیکن مولانا شبلی ایک خط میں ان کے متعلق لکھتے ہیں "میری نسبت چاہے ان کی جو رائے ہو لیکن وہ کوئی رائے دیانت کے خلاف نہ دیں گے۔

گذشتہ پچاس سال کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے، دیوبند کا نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی اور علمائے دیوبند کو حالات زمانہ اور مغربی مستشرقین

---

[1] حضرت حاجی صاحب شیخ میانجی نور محمد صاحب اور ان کے شیخ حاجی عبدالرحیم صاحب یہ دونوں حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ تھے

یا دورِ حاضر کے مصری علماء کی تصنیفات سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی بعض علمائے ندوہ کو ہے، لیکن دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے وہاں سے ہزاروں علماء اور طلبہ فارغ التحصیل ہوکر نکلے ہیں، جنھوں نے ملک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کئے، مذہب کی اشاعت کی، بدعتوں اور مضر اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کی، یہ درست ہے کہ وہ جدید ضروریات کے لحاظ سے کئی باتوں میں بہت باخبر نہیں لیکن آخر ان میں تقویٰ و پرہیزگاری اور روحانیت دوسروں سے زیادہ ہے صرف اسی فیض کا ملک کے دور دراز حصوں میں پہونچانا ملک اور قوم کی قابل قدر خدمت ہے ....

علامہ سید رشید رضا مصری ندوہ کے سالانہ جلسے کی تقریب پر ۱۹۱۲ء میں ہندوستان آئے تھے تو آپ دیوبند بھی تشریف لے گئے، اور اس دارالعلوم کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہوکر واپس جاتا، اس دارالعلوم نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔

دارالعلوم دیوبند نے بغیر کسی شور و غل کے تھوڑی ہی مدت میں جو اعتبار و مرتبہ حاصل کرلیا ہے وہ اس کے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کا واضح ثبوت ہے اور اس پر انھیں فخر کا جائز حق ہے۔

(موج کوثر ص ۲۰۸)

یہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیرِ سایہ تربیت پانے والے ان علماء و مشائخ کے کارنامے اور خدمات ہیں جنھوں نے اپنی عبقریت، اپنی بلند قامتی اور اپنے علمی و عملی بلند پایگی کی وجہ سے تاریخ کے صفحات پر اپنی جگہ بنالی ہے، انھیں نہ زمانہ بھول سکتا ہے، نہ تاریخ نظر انداز کرسکتی ہے بلکہ ان کے احوال و کوائف کو تاریخ فخر کے ساتھ بیان کرتی ہے، اب یہ تاریخ کے انمٹ نقوش ہیں جنھیں لیل و نہار کی گردشیں بھی محو نہیں کرسکتیں، مگر دارالعلوم کی آغوش تربیت سے کچھ کیا بہت سے ایسے جوانمرد بلکہ شیر دل مرد بھی بن کر نکلے ہیں جنھیں نہ تاریخ نے یاد رکھا، نہ زمانے کے حافظے میں انھیں جگہ مل سکی، یہ وہ بوریہ نشین ہیں جو چھپروں کے نیچے بیٹھے کوردہ دیہاتوں میں اپنی زندگی بسر کرلے گئے، ان کے حوصلے بہت اونچے نہ تھے ان کی امنگیں پرجوش نہ تھیں، ظاہر ہے کہ پڑھنے کیلئے جو طلبہ مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں ذہن و صلاحیت کے اعتبار سے سب عبقری اور عالی دماغ نہیں ہوتے، سو سو طلبہ میں

گنتی کے چند طلبہ ذہین و ذکی ہوتے ہیں جو بعد کو خدمات کے ذریعہ ایک شہرت عام حاصل کرتے ہیں، بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو دماغی صلاحیت کے اعتبار سے کمزور اور علمی لیاقت کے اعتبار سے ناقابل التفات اور معاشی معیار سے پست ہوتے ہیں، انھیں اساتذہ بھی بعض اوقات قابل توجہ نہیں سمجھتے اور دوسرے لوگ بھی ناکارہ خیال کرتے ہیں، وہ کسی طرح گرتے پڑتے اپنی تعلیم مکمل کر لیتے ہیں اور کتنے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پاتے درمیان میں ہی انھیں مدرسے اٹھنا پڑ جاتا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے مگر جس سے اللہ کام لینا چاہے ان میں کتنے ایسے ہیں کہ وہ جس قدر تعلیم حاصل کر سکے ہیں اسی کو لے کر کسی دیہات میں، کسی ناخواندہ بستی میں کسی اجاڑ گاؤں میں چند بچوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اپنی اسی کمزور صلاحیت کے ساتھ جو انھیں اونچی کتابیں سمجھنے نہیں دیتی تھی اسی کمزور صلاحیت لیکن طاقتور ایمان کو لے کر بچوں کو اپنے سامنے بٹھا لیتے ہیں اور ان کے معصوم دل و دماغ پر ابتدائی حروف شناسی کے ساتھ ایمان و عقیدہ کی پختگی کا بھی نقش بٹھاتے جاتے ہیں یہ لوگ گمنام رہتے ہیں گاؤں کے لوگ انھیں مولوی صاحب اور میانجی کہتے ہیں، انھیں صرف گاؤں کے لوگ جانتے ہیں یا پھر وہ ذات جانتی ہے جس کا جاننا سب پر بھاری ہے، یہ معمولی غذا کھا کر معمولی تنخواہ لے کر، کبھی مکتب کی چٹائی پر بیٹھ کر اور کبھی کسی کے برآمدہ یا دروازہ کی ناقابل پناہ چھت کے سائے میں اپنی زندگی گذار لیتے ہیں مگر دین و شریعت اور ایمان و عمل کی جڑیں مضبوط کر جاتے ہیں، انھیں کبھی شہرت کی آرزو نہیں ہوتی، یہ خود کو بڑے کارناموں کا اہل نہیں سمجھتے اور اور نہ اپنے کام کو کارنامہ سمجھتے، سیدھے سادے لوگوں میں رہتے ہیں پانچ وقت کی امامت کرتے ہیں کبھی کوئی کتاب پڑھ کر سنا دیتے ہیں، کبھی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ وعظ و تقریر کر لیتے ہیں، جمعہ پڑھاتے ہیں، عید بقرعید کی نماز پڑھاتے ہیں، نکاح پڑھاتے ہیں، لوگوں کی قربانیاں ذبح کرتے ہیں

دنیا والوں کے نظریہ کے لحاظ سے یہی چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہیں، نہ پچھے دار تقریریں کرتے نہ لمبے لمبے اسفار کرتے، نہ کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کرتے، نہ اشتہارات و اخبارات میں القاب و آداب کے ساتھ ان کے نام چھپتے نہ تجویزیں پیش کرتے، نہ ریزولیشن پاس کرتے، دنیا ان سے ناواقف رہتی ہے لیکن یہ اپنی اسی گمنامی میں چھوٹے چھوٹے بچوں پر محنت کرتے، ناخواندہ بوڑھوں اور جوانوں پر محنت کرتے، ان کے دم سے دیہاتوں میں دین کے چراغ جگمگاتے رہتے، پھر یہ اپنا

محنت سے دیہات کے بچوں کو تیار کر کے بڑے مدارس میں بھیجدیتے جہاں ان میں سے بعض بڑے بڑے نامور بنتے، دنیا ان ناموروں کو دیکھتی ہے مگر ان کی جڑوں میں ابتداءً جس نے پانی ڈالا ہے اس سے غافل رہتی ہے، دارالعلوم دیوبند نے اپنی آغوش تربیت میں ایسے گمنام سپاہیوں کی کھیپ کی کھیپ تیار کی ہے۔

آج بھی اگر ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے بے شمار گاؤں، دیہاتوں میں کوئی ہمت والا جائے اور تعلیم دینے والا میانجی حضرات کا جائزہ لے تو وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائیگا کہ ہر جگہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم مسلک وہم مشرب مدارس کے فیض یافتہ بہت قلیل مشاہرہ پر خوشی خوشی بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہیں، خاکسار کو یوپی اور بہار کے بکثرت گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور ہر جگہ میں نے انھیں مدارس کے فارغین کو مصروف عمل پایا، بلند بانگ دعوؤں والے مدارس کے فارغین کہیں نظر نہ آئے، یہ لوگ بڑے مدارس میں قدرے نظر آئیں گے ورنہ کسی سرکاری محکمے میں کلرک، کسی ایمبیسی میں ترجمان یا سعودی یا خلیجی ممالک میں تحصیل زر میں مصروف نظر آئیں گے، تحصیل زر کی یہ دوڑ فضلاء دیوبند میں بھی آگھسی ہے تاہم عرب میں بھی ایک بڑی تعداد ان کی مصروف خدمت دین و ایمان ہے۔

لیکن ان معروضات سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دارالعلوم نے علماء کا جو معیار تجویز کیا تھا مجموعی اعتبار سے وہ معیار پورے طور پر باقی ہے، ہم نے جو داستان سنائی ہے یہ ایکسو تیس سال کی مدت پر محیط ہے، ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم، طریقہ تعلیم معیار تعلیم میں کوئی نقص نہیں ہے انسانی کوشش کون سی ایسی ہوگی جو نقائص سے خالی ہوگی بیشک اس مدت صد و سی سال میں فراز کے ساتھ نشیب بھی بہت ہے حسن کے ساتھ قبح بھی لگا ہوا ہے، کمال کے پہلو میں نقص بھی ہے، ایک طرف بلند پایہ علماء و مشائخ ہیں تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جن کا وجود اہل علم کے لئے باعث ننگ ہے لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر مستقل گفتگو ہو سکتی ہے، یہ درحقیقت اپنا احتساب ہے جو ہر فرد اور ہر قوم پر فرض ہے، اور یہ مصلحین کا موضوع ہے۔

مولانا احتشام الحق تھانوی کی آپ بیتی کا ایک ورق

جماعت اسلامی افکار کے آئینے میں
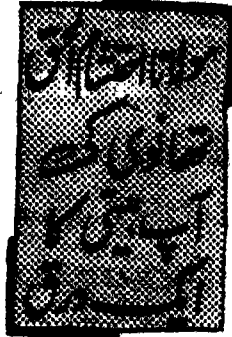
ایک سرسری نظر

میں نے اپنی پوری زندگی میں یا پاکستان کی ۲۳ سالہ تاریخ میں جبکہ میں سیاسیات سے بہت قریب رہا ہوں اور ہر سطح کی اور ہر قسم کی شخصیتوں سے میرا سابقہ پڑا ہے اور قومی زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف جماعتوں کے کردار پر میری نظر رہی ہے۔ نیز خوشگوار اور ناخوشگوار بہت سے تجربات ہوئے ہیں لیکن کسی کی مخالفت بے جا یا کسی کو رسوا کرنے کی معصیت سے کبھی زبان وقلم کو آلودہ نہیں کیا۔ جب کبھی اس قسم کا خیال آیا تو اس جماعت یا افراد کی مجبوریوں پر نظر گئی۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ جماعت اسلامی سے مجھے شدید اختلافات ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے دینی تصورات، اور فقہی اجتہادات سے میں نے ہمیشہ اختلاف کیا۔ جماعت اسلامی کی سیاست اور اس کے طریقہ کار کو بھی میں نے اپنی دینی اور اسلامی بصیرت کی بنا پر پسندیدہ نہیں سمجھا۔ میں نے انکی علمی تحقیقات اور ان کے تاریخی کارناموں کو حقیقت کے برعکس بھی سمجھا اور مصالح امت کے خلاف بھی پایا۔

ان کے بعض خیالات میرے نزدیک صریح گمراہی اور بے دینی پر مبنی ہیں۔ مختلف مواقع پر میں نے خود مودودی صاحب کو ٹوکا بھی ہے اور ان سے ان کی علمی تحقیقات اور فقہی اجتہادات میں رویے کی تبدیلی اور فقہ وحدیث کے معاملات میں رائے دینے سے گریز کی درخواست بھی کی ہے کہ یہ علوم وفنون ان کے دائرہ علم وتعلیم میں نہیں آتے ہیں۔ ان کی طبع آزمائی کے اظہار کیلئے ہماری ادبی وسیاسی زندگی کے بہت سے موضوعات ہیں جنمیں ان کی جولانی طبع اور قلم فرسائی سے قوم کو فائدہ بھی پہونچ سکتا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ اگر کسی نے مولانا مودودی صاحب کے فکر واجتہاد کے بارے میں مجھ سے کوئی بات دریافت کی ہے تو میں نے اسکا اظہار نہیں کیا۔ الحمدللہ کہ کتمان حق کی معصیت سے بھی میرا دامن پاک رہا ہے اور میں نے کبھی یہ

پسند نہیں کیا کہ گونگے شیطان کی وعید نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا مورد بنوں لیکن محض مخالف الزام اور کیچڑ اچھالنا میرا مقصد کبھی نہیں رہا۔

ہمارے ملک میں شروع سے اسلام اور لادینی افکار بے دین جماعتوں اور اسلامی نقطۂ نظر رکھنے والی جماعتوں اور دشمن اسلام قوتوں اور اسلام پسند عناصر کے مابین مقابلہ اور تصادم رہا ہے۔ اس تصادم میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کی مخالفت کو مسئلہ بنالینا میں نے ہمیشہ اسلامی مفاد کے خلاف سمجھا اور میں ہمیشہ اپنے اس یقین پر قائم رہا کہ جماعت اسلامی سے مقابلہ و تصادم میں جماعت اسلامی کو نقصان پہنچے یا نہ پہنچے، لادینی عناصر کو فائدہ ضرور پہنچے گا۔ اور یہ بات کسی مرحلے میں بھی میرے نزدیک پسندیدہ نہیں تھی۔ اسلئے جماعت اسلامی کی مخالفت کو کبھی مسئلہ نہیں بنایا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں جماعت اسلامی کے افکار و خیالات کا حامی یا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا معتقد ہوں۔ لیکن لادینی عناصر کا دشمن ضرور ہوں اور اپنے کسی فکری و نظری اختلاف سے انہیں فائدہ پہنچانا کبھی مطلوب و محبوب نہیں رہا۔

ہماری اس حکمت عملی اور پالیسی کی بنا پر خود ہمارے بعض بزرگوں نے ہمیں چھوڑ دیا اور ہم سے ناراض ہو گئے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کی خفگی اور ناراضگی کو ان کے اخلاص کے خلاف نہیں سمجھا۔ لیکن ہمیں اپنی رائے کے بارے میں بھی یمین و یسار کا تذبذب نہیں پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ مولانا حسرت موہانی کو غریق رحمت کرے کیا خوب کہہ گئے ہیں۔

طعن احباب سنے سرزنش خلق سہی ؛ ہم نے کیا کیا، تری خاطر سے گوارا نہ کیا

اگست سنہ ۱۹۶۹ء میں جب سوشلزم کے خلاف ملک گیر پیمانے پر مہم چلائی گئی تو ہم پر جگہ جگہ مودودی کے ایجنٹ اور مودودی کے پٹھو کے آوازے کسے گئے اور صرف مولانا مودودی صاحب کی مخالفت نہ کرنے کے جرم میں ہدف تنقید و استہزا بننا پڑا۔ یہاں تک کہ حضرت مولانا غلام اللہ خاں صاحب مدظلہ العالی ہم سے صرف اس بات پر جدا ہو گئے کہ انھیں ہمارے اسٹیج پر مولانا مودودی کا نام لے کر ان کی مخالفت کی اجازت نہیں دی گئی۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش ؛ میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اس کے برعکس مولانا مودودی صاحب، ان کے رفقاء اور ان کے اخبارات و رسائل نے ہمارے اس تعاون کا کتنا اعتراف اور اسلامی مفاد و مصالح کا کتنا لحاظ کیا، اس کا اندازہ اس کتاب میں پیش کردہ

حقائق کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

علماء کے وقار سے جماعت اسلامی کی تعصب پسندی کی داستان بڑی طویل اور افسوسناک ہے۔ اس باب میں اس نے بے دین عناصر کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ جماعت اسلامی کے ادب و شاعری میں علما کی عزت اور ان کا ناموس طنز و مزاح کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔ انھوں نے اسلامی ادب کے نام پر جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ ایک الگ موضوع ہے اور کسی دردمند نقاد کی توجہ کا منتظر۔

جماعت اسلامی نے علما کو کبھی قابل احترام سمجھا ہی نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے لے کر مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیراحمد عثمانی، اکابر دیوبند اور اس وقت کے علما تک ہر کوئی ان کی قلم کاریوں کا نخچیر اور ہر دامن ان کی دست درازیوں کا شاکی ہے۔

لیکن اب اس سے اس کی شکایت بھی نہیں کرنی چاہیئے، جس نے صحابۂ کرام کے بارے میں جو کفر کی ظلمت میں ہدایت کے روشن ستارے ہیں، تنقید سے بالاتر نہ ہونے کا صرف عقیدہ ہی نہیں رکھا بلکہ عملاً ہدف تنقید بھی بنا ڈالا ہو اور ان کے ناموس کا لحاظ نہ کیا ہو، اس سے علماء عہد یا کسی محترم خاتون کی عزت و احترام کی توقع چہ معنی دارد، یہاں تک کہ وہ علما جو جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون و اشتراک سے کبھی دست کش نہیں ہوئے وہ بھی ان کی تغافل کیشیوں کے شاکی ہیں۔ جماعت اسلامی نے علما کی پگڑیاں اچھالنے میں، ان کی کمزوریوں کو طشت از بام کرنے میں، انھیں رسوا کرنے میں اور انھیں آپس میں لڑانے میں افسوسناک کردار ادا کیا ہے۔

لیکن اب تاریخ اس موڑ پہ آگئی ہے کہ اگر اس تاریخ کو محفوظ نہ کر دیا گیا تو ایک تاریخی نقصان بھی ہوگا، اور اگر پہلے اختلاف کرنا اسلامی مفاد کے خلاف تھا تو اب اس اختلاف اور جماعت اسلامی کے کردار سے پردہ نہ اٹھانا بھی دینی و سیاسی مصالح کے خلاف ہے۔

میرا مقصد شکایات کے یہ دفتر کھولنا نہیں ہے، بلکہ جماعت اسلامی کا وہ کردار بیان کرنا ہے جس کا مظاہرہ اس نے پچھلے ڈیڑھ دو سال کی سیاسی زندگی میں سوشلزم اور اسلام کی جنگ کے دوران میں اسلامی نقطۂ نظر رکھنے والی جماعتوں کے مابین اتحاد کے مذاکرات میں اور انتخابات میں اسلامی عناصر سے اشتراک و تعاون میں کیا اور یہ اس لئے ضروری ٹھہرا کہ آئندہ سیاسی سفر میں ہم ان غلطیوں کا اعادہ نہ کریں جو کر چکے ہیں۔ مقصد بے لاگ تجزیے اور حقائق کے بے محابا اظہار و انکشاف کے بغیر ممکن نہ تھا

اگر کہیں لہجے میں درشتی اور قلم میں تیزی آگئی ہو تو جائے تعجب نہیں۔ حالانکہ اگر جماعت اسلامی پر محض تنقید کا جذبہ بھی کارفرما ہو تو اس کے لئے بھی وجہ جواز موجود ہے۔ آخر جماعت اسلامی کے اکابر و اصاغر نے اور اس کے اخبارات و رسائل نے ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے، ہمارے اسلاف اور وقت کی دینی و سیاسی جماعتوں، تحریکوں اور شخصیتوں کے بارے میں اس کی جو روش رہی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس لئے اگر اضطرار و اضطراب میں ضبط کا دامن ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ جائے یا جفا دستم سے گھبرا کر ہمارے منہ سے آہ نکل جائے تو کوئی شکوہ سنج کیوں ہو؟ آخر ہم بھی انسان ہیں اور پہلو میں پتھر کا بے حس ٹکڑا نہیں حساس دل رکھتے ہیں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ؛ روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

جماعت اسلامی کے فکر و عمل میں کئی موڑ آئے اور اس کا کاروان سیاست بہت سے نشیب و فراز سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔

- پہلے وہ ایک اصولی جماعت تھی اور صالح فکر ہی نہیں صالح طریقہ کار کی بھی پابند تھی اور اس میں اتنی متشدد تھی کہ "مسلم لیگ سے اشتراک و تعاون" کا سوال اٹھایا تو اس کے غیر صالح معیار کی بنا پر امیر جماعت اسلامی کے نزدیک خواجہ ناظم الدین مرحوم سے تو کیا اس کے پلیٹ فارم پر آسمان سے فرشتے اتر آتے تو ان سے تعاون کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔
- پہلے وہ ایک ایسی جماعت تھی جو جلسوں، جلوسوں، نعروں، ہنگاموں، استقبالیوں، خیر مقدموں، ایڈریسوں اور استقبالیوں کو اسلام کے مزاج کے خلاف سمجھتی تھی۔
- پہلے اس کے نزدیک اقتدار میں آنا کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔
- الیکشن میں حصہ لینا اس کے نزدیک گویا کتوں کی دوڑ میں حصہ لینا تھا۔
- مصر میں فوجی انقلاب کے بعد عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے کا سوال اٹھا اور ایک اخبار میں خبر آئی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مصر کے بعض علما کے اس فتوے سے اختلاف کیا ہے جس میں عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے اور پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے عدم جواز کی رائے ظاہر کی گئی تھی تو جماعت اسلامی نے اس "بے دینی" کے خلاف اخبار و رسائل میں ایک محاذ قائم کر دیا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ترجمان القرآن میں مولانا آزاد کے بیان و استدلال کے رد میں ایک نہایت مفصل مقالہ لکھا۔ لیکن جب

حالات بدل گئے اور محترمہ فاطمہ جناح کی سیاسی سربراہی میں شوقِ حکومت کی تکمیل ہوتی نظر آئی تو اس کے لئے بھی ایک فلسفہ حکمت عملی تخلیق کر لیا گیا۔ جماعت اسلامی کو احساس ہوا کہ اس کے سفر کا رخ اور انداز منزل سے اور دور رکھ رہا ہے اور یوسفِ مقصود اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔

خدایا! جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے ÷ کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

تو جہاں بتقاضائے وقت و بربنائے مصلحت " اسلامی حکمت عملی " کے تحت صاحب امر و امارات فرائض منصوصہ قرآنیہ و واجبات شرعیہ اسلامیہ میں تبدیلی کر سکتا ہو وہاں ان امورِ سیاسی کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ÷ ... جماعت اسلامی کے فکر اور طریقہ کار میں بھی تبدیلی آگئی اور ضروری ہو گیا کہ سیاسی مسائل کے حل و تصفیہ کے لئے وقتی و سیاسی مصالح پر مبنی طریقہ کار اختیار کیا جائے۔

÷ قیام خلافتِ الٰہیہ کے اسلامی نصب العین سے اسلامی جمہوریت اور پھر صرف " جمہوریت " کے نصب العین اور حصول مقصد کیلئے ان جماعتوں تک سے اشتراک و تعاون پر آمادہ ہو گئی جو جماعت اسلامی کی بلند پروازیوں میں نہ پہلے اس کا ساتھ دے سکتی تھیں اور نہ اس " متحدہ محاذ " کی شرائط میں ان کے لئے جماعت اسلامی کے منشور سے اتفاق اور مقاصد کی تائید کی شرط لازم تھی، نہ وہ جماعتیں " اسلامی فکر " کی حامل تھیں اور نہ صرف صالح طریقۂ کار پر ایمان رکھتی تھیں۔

جلسوں، جلوسوں، نعروں، استقبالیوں، خیر مقدموں، ایڈریسوں وغیرہ کی اہمیت کا اعتراف بھی نہ صرف زبانی اور فکری طور پر کیا بلکہ ان کے اہتمام میں تاریخ سیاست کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔

÷ پھر اس کے لئے اقتدار میں آنا اتنا ضروری ہو گیا کہ اس کے بغیر جماعت کے اسلامی مشن کی تکمیل ممکن ہی نظر نہ آتی تھی اور اس کے لئے استدلال میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ خلافت الٰہیہ کے قیام کا مقصد اقتدار و حکومت کے بغیر نامکمل محسوس ہونے لگا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اسلام کی دعوت و تبلیغ کا ایک نقش ناتمام اور ہجرت مدینہ اقدام تکمیل دعوت کی بجائے اس پر خطِ تنسیخ نظر آنے لگا۔

÷ سیاست میں عورتوں کے حصہ لینے کے جواز کے حق میں اخباری نمائندے کی رپورٹ کو جس کی مولانا آزاد سے نسبت کی تصدیق بھی نہیں ہوئی تھی اسے " امام الہند کے فتویٰ شرعیہ " کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور پاکستان کے صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کی تائید میں اپنے رویے کی اسلامی حیثیت پر اس بیان سے استدلال کیا گیا اور مصلحت وقت نے انہیں عالم دین اور مفتی شرع متین کی حیثیت سے پیش کر دیا۔

پہلے ان کا فتویٰ بھی قابل رد تھا پھر مفاد و مصالح کا تقاضا ہوا تو ان سے متعلق ایک اخباری رپورٹ بھی حجت شرعیہ بن گئی۔

ایک وقت تھا کہ مولانا آزاد بے دینی کی علامت تھے پھر وہ وقت بھی آیا کہ داڑھی کے مسئلے میں اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں ان کے افکار سے مولانا مودودی صاحب کے خیالات کی تائید کی گئی مولانا آزاد کے خیالات کا رد اور ان کی شخصیت کی نفی جماعت اسلامی کے اکابر اور ان کے اخبار و رسائل کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ لیکن جب اکابر دیوبند اور دیگر علماء اسلام نے مولانا مودودی صاحب کا رد اور تعاقب کیا اور انھیں کوئی جائے پناہ نہ ملی تو مولانا آزاد ہی کے دامن افکار میں پناہ ڈھونڈی۔ حتیٰ کہ مولانا مرحوم کی طرف سے مودودی صاحب کی مدح و توصیف میں ایک جعلی خط بھی وضع کرلیا گیا۔

تمہاری زلف میں آئی تو حسن کہلائی ⁂ وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے فکر و کردار کا کون سا رخ صحیح اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے؟۔ تو یہ ایک الگ بحث ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علم و بصیرت، اعتدال و توازن اور اخلاص و بے غرضی سے اس کے فکر و کردار کے دونوں رخ خالی ہیں۔

⁂ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ فرنگی سرکار کی "محسن خدمات" اور برٹش حکومت کے قیام و استحکام میں تعاون اور اہل وطن کے خلاف مخبری کے عوض، مجاہدین آزادی کو پھانسی کے تختوں پر لٹکوانے کے صلے میں اور انعام میں جو زمینیں انگریزوں نے دی تھیں ان کیلئے "اسلامی زمینداریاں" کی اصطلاح جماعت اسلامی کی علمی و فقہی ٹکسال سے ڈھل کر نکلی تھی اور ان زمینداریوں کے تحفظ و بقاء کیلئے اس کا مکتبہ فکر جدید علم کلام کی تدوین میں کوشاں تھا اور کہاں یہ وقت بھی آیا کہ بلا کسی استثناء کے ایک خاص حد سے زائد زمین کو حکومت کے قبضے میں لے لینے اور کاشتکاروں کو اس کے مالکانہ حقوق کے عطا کا مژدۂ جانفزا سنایا گیا۔

⁂ اور جن سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کو ان کے سرمایوں اور صنعتوں کے "اسلامی نظریۂ تحفظ" کی بشارتیں سنائی جا رہی تھیں اب انھیں بھی قومی ملکیت میں لئے جانے کے عوامی مطالبے کو جماعت کے "اسلامی منشور" میں شامل کرلیا گیا۔ یہ اور اس قسم کی پچاسوں باتیں ہیں جن سے اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں کسی نئے فن کا اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اس کا فیصلہ تو اہل علم و فن ہی کریں گے۔

ن شیخ محمد اکرام صاحب نو برصغیر کے مسلمانوں کی علمی و تہذیبی تاریخ (موج کوثر) کے نئے ایڈیشن
معتزلہ یا معتزلین جدید کے عنوان سے ایک نئے باب کا اضافہ ضرور کرنا چاہئے جس میں افکار و
سیرت جماعت اسلامی کے نشیب و فراز کی پوری تاریخ مرتب ہو جائے۔ اور اگر کوئی چاہے تو
تعبیرات و تاویلات جماعت اسلامی سے ایک نئی "کتاب الحیل" بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔

اس کا اور کوئی نتیجہ نکلا ہو یا نہ نکلا ہو اور نکلے یا نہ نکلے لیکن اس بات میں دو رائے نہیں ہو سکتیں
جماعت اسلامی کے کردار نے اس کا اعتبار کھو دیا۔ اب کوئی جماعت اس سے معاہدہ کرتے
ہوئے اس کی یقین دہانیوں پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ چنانچہ یکم جنوری سنہ ۱۹۷۰ء کو سیاسی جدوجہد
باب مقصود کھلتے ہی نشتر پارک کراچی کے پہلے مشترکہ جلسۂ عام میں میاں طفیل محمد صاحب کی
تقریر کے بعد ہی یہ بحث چھڑ گئی تھی۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف! ؎ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کسی کا آشنا!

اور حالات نے اس خدشے کو درست ثابت کر دیا۔ جماعت اسلامی نے اتحاد و تعاون کی ہر امید پر
پانی پھیرا۔ آخر میں چند ایسی جماعتوں کے اتحاد کا ڈرامہ کھیلا گیا جن پر خود جماعت کے فلسفۂ اجتماع کے مطابق
جماعت کا اطلاق نہیں ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ ملک کی مقتدر جماعتیں تھیں۔ لیکن جب اس ڈرامے
کا ڈراپ سین ہوا تو خود ان کے اخبار کے مطابق ان کی حیثیت محلہ کمیٹیوں سے زیادہ نہیں تھی اور جن
جماعتوں سے اتحاد ملک و ملت کی بہی خواہی اور اسلام کے بہترین مفاد کا تقاضا تھا۔ ان سے نہ خود
اتحاد کیا نہ دوسری جماعتوں کو مل بیٹھنے کے قابل رکھا۔ پہلے ایسے حالات پیدا کئے کہ جمعیت علمائے پاکستان
ان کی بزم ناز سے اٹھی، پھر جمعیت علمائے اسلام کے اعتماد کو مجروح کیا، پاکستان جمہوری پارٹی نے
دور تک ساتھ دیا لیکن۔ ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
نواب زادہ نصر اللہ خان بھی انکی تیر افگنیوں کا شکار ہوئے اور بالآخر ان سے بھی ٹھن گئی، غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل ؎ جو تیری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

ایک وقت وہ بھی تھا کہ نواب زادہ نصر اللہ خاں صاحب کی اسلام پسندی اور سوشلسٹوں کے خلاف
ان کی جہد آزمائی، اتحاد کی راہ میں ان کے ایثار، بےنفسی اور ان کے جذبات صالحہ و صادقہ کے تذکرے
میں مولانا مودودی صاحب رطب اللسان تھے اور صاحب "زندگی" کو ان کے اس قرب و اعتماد پر رشک

آتا تھا اور "زندگی" میں باحسرت و یاس اس کی روداد چھاپتے تھے۔

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے ٭ ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

اور پھر چرخ کہن سال نے یہ منظر بھی بادیدۂ حیران دیکھا کہ "زندگی" کے ایک کارٹون میں مولانا مودودی صاحب انھیں نواب زادہ نصر اللہ خاں صاحب کی تیر افگنیوں سے برنگ بسمل تڑپ رہے ہیں اور نواب زادہ صاحب اپنی کمین گاہ سے رقص بسمل کا یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اس کارٹون پر مولانا مودودی صاحب کی زبان سے یہ شعر کیا خوب اور برمحل تھا۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف ٭ اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

جماعت اسلامی فکر و عمل کے جن نشیب و فراز سے گزری ہے یہ اس کی مختصر روداد تھی۔ اگلے صفحات میں اسلامی نقطہ نظر رکھنے والی جماعتوں کے مابین اتحاد کی کوششوں اور راہ کی ناکامیوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں بھی جماعت اسلامی کا کردار زیر بحث آیا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کا اب تک وہی رویہ ہے۔ ع زمانہ بدل گیا لیکن اس نے اپنی خو نہیں چھوڑی۔

کرسی اقتدار اور منصب سیاست سے ایوب خاں کے دست بردار ہوتے ہی تاریخ پاکستان کی بدترین آمریت کے دور کا خاتمہ تو ہو گیا۔ لیکن اس دور میں آزاد خیال اور اشتراکیت کے جو بیج بوئے گئے تھے وہ اب تناور درخت بن چکے تھے اور پھل پھول رہے تھے۔ سوشلزم کا فتنہ تہذیب و اخلاق اور روحانی قدروں ہی کے لئے نہیں ملکی سالمیت کیلئے بھی ایک عظیم خطرہ بن چکا تھا۔ لادینی ازموں کے تیز و تند حملوں سے نظریۂ پاکستان کے نقوش دھندلے پڑ گئے تھے۔ علاحدگی پسندی کے نعرے زور و شور سے لگ رہے تھے۔ ملکی سیاست پر ایسے افراد اور گروہوں کی اجارہ داری قائم ہوتی جارہی تھی جو مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے اسلام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ محمود علی قصوری نے پنڈی میں وکلا سے خطاب کرتے ہوئے برملا اس کا اظہار بھی کیا تھا کہ قرآن صرف ضابطۂ اخلاق ہے۔ سیاسی و معاشی ضابطہ نہیں ہے۔ قیام پاکستان کی بنیادوں میں سے اسلام کو خارج کرنے اور تحریک پاکستان کی اساس صرف معاشی و اقتصادی منصوبوں کو قرار دینے کی سازشیں کی جارہی تھیں۔ علاقائی تہذیبوں اور زبانوں کے مسائل کو اچھالا جا رہا تھا۔ مختلف قسم کے تعصبات کو ہوا دی جارہی تھی۔ غرض یہ کہ ملک کے حالات اس درجے پیچیدہ اور خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے کہ ان سے نمٹنا اور مخالف قوتوں سے نبرد آزما

ہونا تنہا کسی ایک جماعت کے بس کی بات نہیں رہی تھی اس لئے ضروری تھا کہ سوشلزم اور علیحدگی پسندی کی مخالف نظریۂ پاکستان پر ایمان اور اسلامی نقطۂ نظر رکھنے والی تمام سیاسی جماعتیں اور تمام مکاتب فکر کی دینی جماعتیں متحد ہوں اور عوام میں ایک منظم اور زبردست تحریک شروع کی جائے۔

اخباری پروپیگنڈے نے بڑھا چڑھا کر جماعت اسلامی کی جو حیثیت لوگوں کے ذہنوں میں قائم کر دی تھی اس کی بنا پر جماعت اسلامی کی طرف لوگوں کا ذہن جا سکتا تھا کہ وہ ان حالات میں راہنمائی کے لئے آگے بڑھے اور اسلام و نظریۂ پاکستان کو "مختلف ازموں" کی زد سے بچا لے مگر جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے جماعت کا قلعہ صرف پروپیگنڈہ کی ہوا پر قائم تھا۔ کسی شہر، کسی صوبے، کسی طبقے میں بھی جماعت کو مقبولیت اور رسوخ حاصل نہیں تھا۔ اور جو تھوڑے بہت اثرات تھے تو مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی اور مفتی محمود صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان کا قلع قمع کر دیا تھا بلکہ پورے ملک میں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ ہزاروی گروپ نے جماعت کی سیاسی قلابازیوں اور فکری و اعتقادی گمراہیوں کو قوم کے سامنے پیش کر کے اس کے خلاف اتنی زبردست تحریک چلائی کہ جماعت میں کسی کے سامنے ٹھیرنے اور مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کیلئے لادینی عناصر کے خلاف تحریک چلانا تو درکنار اپنی مدافعت بھی مشکل تھی بلکہ جماعت کی تمام صلاحیتیں مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے مظالم کی دہائی اور فریاد کیلئے وقف ہو گئی تھیں۔

اگر مشرقی و مغربی پاکستان میں لادینی ازموں کے خلاف مرکزی جمعیت علماء اسلام کے بروقت اور کامیاب جہاد سے پیدا شدہ اسلامی فضا کا زبردست سہارا جماعت اسلامی کو نہ ملا ہوتا تو جماعت اسلامی پورے ملک میں کسی جگہ ایک جلسہ بھی نہیں کر سکتی تھی، مشرقی و مغربی پاکستان کے متعدد شہروں کے رہنے والے دردمند مسلمان اس پر گواہ ہیں کہ ہم نے اپنی جانوں پر کھیل کر ایسے مقامات پر سوشلزم کے خلاف جلسے کئے جہاں جماعت اسلامی سمیت کسی اسلام پسند جماعت کو جلسہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ ملتان، بنوں، کوہاٹ، ڈیرہ اسماعیل خاں اور مردان وغیرہ مقامات پر ہم یہ سمجھ کر جلسوں میں شریک ہوتے رہے کہ ممکن ہے وہاں سے صحیح سلامت واپسی ممکن نہ ہو۔

جماعت اسلامی نے مرکزی جمعیت کی ان مجاہدانہ خدمات کی داد اور نتیجے میں پیدا شدہ اسلامی ماحول سے فائدہ اٹھانے کا شکریہ اس طرح ادا کیا کہ مرکزی جمعیت کی تنظیم کو سبوتاژ کر کے غداروں نے

مقصد میں استعمال کرنے کے لئے ہر جگہ جماعت اسلامی اور اس کی ذیلی تنظیم اتحاد العلماء کے ارکان جمعیت کے عہدیدار بن جاتے تھے اور اندر ہی اندر دبی طور پر یہ کوشش کرتے تھے کہ مرکزی جمعیت علماء اسلام منظم ومستحکم نہ ہونے پائے۔ جب اس صورت حال سے بچنے کی ہماری طرف سے تدابیر اختیار کی گئیں اور ان حضرات کے رویے کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو یہ بات بھی طبع نازک پر گراں گزری اور امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بڑے تند اور تہدید آمیز لہجے میں جمعیت کے جلسوں کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم ؛ کہ ہوگا باعث افزائش درد نہاں وہ بھی!

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادوں کے علی الرغم جمعیت کو سوشلزم کے مقابلہ میں ہر جگہ امید سے زیادہ کامیابی عطا فرمائی۔ سوشلزم کے خلاف مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی تبلیغی مہم میں جماعت اسلامی کی جو افسوسناک روش رہی اس سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جماعت اسلامی سوشلزم کے خلاف جد وجہد میں اتنی سنجیدہ نہیں تھی جس درجے سوشلزم سے مسلمانوں کو ڈرا کر ملک کا انتخاب جیتنے کے لئے وہ بے چین و بے قرار تھی۔ علاحدگی پسند اور لادینی ازموں کے خلاف ہماری تبلیغی مہم کے ساتھ ساتھ مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی تنظیم کا کام بھی جاری رہا اور الحمد للہ کہ وہ بہت جلد ملک کی ایک فعال جماعت اور مؤثر قوت بن گئی۔

بقیہ ص ۲۶ شریعت میں جنسی مسائل و امور کا ذکر

اس کے بارے میں مشہور و معروف محقق محمود احمد شیرانی کا کہنا ہے کہ فرضی اور جعلی ہے تاہم اگر انتساب دیوان کو صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ رباعی تو یقیناً کسی رافضی کی سیاہ کارستانی ہی ہوسکتی ہے، ویسے کچھ محققین نے اس رباعی کو شیعی شاعر معین کاشانی کی جانب منسوب کیا ہے لیکن اس سے مولانا قاسمی کو کچھ لینا دینا نہیں ہے، انھیں مضمون لکھنا تھا، جو انھوں نے لکھ دیا زیادہ مغز ماری اور تحقیق کی کیا ضرورت ہے۔

نقطۂ نظر

شریعت میں جنسی مسائل و امور کا ذکر

از :- عبد الحمید نعمانی، جمعیۃ سنٹرل آفس، نئی دہلی ۲ -

اسلام مکمل دین فطرت ہے، اس کی حیثیت ایک کل کی ہے، لہذا اس کا ٹکڑوں میں مطالعہ مکمل طور پر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لازماً اسلامی شریعت کا مطالعہ وسیع تر تناظر میں ہونا چاہیئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا وجود بابرکت ہے، پوری انسانیت خصوصاً امت مسلمہ کے لئے کامل اسوۂ حسنہ ہے، لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ[1] جس کا لازمی تقاضا ہے کہ آپ کی حیات طیبہ کا کوئی گوشہ امت کی نظر سے اوجھل اور تاریکی میں نہیں رہنا چاہئے، چاہے پبلک ظاہری زندگی ہو چاہے پرائیویٹ زندگی ورنہ کامل اسوۂ حسنہ کا کامل ظہور و اطلاق نہیں ہو سکے گا، آپ کی بعثت کا ایک اہم مقصد تعلیم امت بھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم بنا کر مبعوث فرمایا ہے، ویعلمہم الکتاب والحکمۃ[2]، (انما بعثت معلماً) یہی وجہ ہے کہ جہاں آپ نے خدا کی وحدانیت واحدیت، حشر و نشر، عقیدۂ آخرت، برزخی زندگی، باطنی تطہیر و تزکیہ اور دوسری زندگی کے متعلق اہم ترین امور غیبیہ کا انکشاف فرمایا وہیں نسبتہً غیر اہم چیز پیشاب و پاخانہ تک کا طریقہ بھی بتایا۔ بول و براز کے طریقہ کی تعلیم تک، اہل ایمان آپ کی معلمیت اور شفقت علی الامت کا تقاضا سمجھتے ہیں جب کہ غیر اسے باعث تضحیک و تحقیر سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارے نبی کیسے ہیں کہ پیشاب و پاخانہ کی تعلیم دیتے ہیں[3] پھر جائز جنسی خواہشات کی تکمیل جو انسان کی ایک اہم ترین ضرورت اور بقاء نسل انسانی کا ذریعہ ہے، اسلامی شریعت اس اہم ترین قابل توجہ مسئلے کو کیوں کر نظر انداز کر دیتی، میاں بیوی کے باہمی تعلقات اور پرائیویٹ زندگی

---

[1] سورۃ الاحزاب [2] سورۂ آل عمران آیت ۱۶۴، سورۃ الجمعۃ آیت ۲ [illegible] سورۂ حجرات آیت ۱۵ [3] ابوداؤد [illegible]

سے متعلقہ امور و مسائل میں مکمل و واضح رہنمائی اسلام کی اکملیت کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اجالے میں ہے۔ اس کے بغیر یہ کہنا ہی خلاف واقعہ ہوگا کہ آپ کی زندگی انسان کے لئے کامل نمونہ ہے

اس پس منظر میں اگر کتب حدیث اور فقہی کتابوں کے کتاب الطہارت، کتاب الغسل، کتاب الحیض والنفاس، کتاب النکاح اور ازدواجی تعلقات کے سلسلے میں آنحضرتؐ اور آپ کی ازواج مطہرات کی دی گئی تعلیم وہدایت کا مطالعہ کیا جائے تو سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوگا پوری امت خصوصاً حضرات صحابہ، محدثین، فقہائے امت اور علمائے اسلام متفقہ طور پر سمجھتے رہے ہیں کہ ازدواجی تعلقات کے سلسلہ میں آپ نے جو ہدایات دی ہیں وہ سب آپ کی معلمیت ذاتی ایثار، اور امت پر غایت درجے کی شفقت پر مبنی ہیں، جو اپنی ضرورت کے تحت برائے تعلیم و مقصد دی گئیں ہیں نہ کہ برائے تفریح وتلذذ، جیسا کہ مغربی مستشرقین اور ان کے مشرقی سعادت مند شاگردوں نے سمجھ رکھا ہے، اور کمال تو یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی دی گئی تعلیمات وہدایات کا وہ طبقہ مذاق و مضحکہ اڑاتا ہے اور مزے لے لے کر شوشے چھوڑتا ہے جس کے یہاں "سیکس فری" ہے، عصمت و عفت اور حیا کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے، جہاں مرد و زن کا بے محابا اختلاط روشن خیالی کی دلیل اور "آزادی" کا لازمی حصہ ہے۔ اس تعلق سے سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ ان تجدد پسندوں اور بے نظام و نظریہ طائفہ کی تحریری و زبانی یلغار سے کچھ دیندار قسم کے لوگ بھی حوصلہ چھوڑ بیٹھے ہیں اور تجدد پسندوں کی سر میں سر ملانے لگے ہیں اور مغربیت زدہ نام نہاد معقول پسندوں کے نامعقول اعتراضات وشبہات کے ازالے کے بجائے خود غلط طور پر روایات کی غلط تاویل و انکار کس درجہ حیرتناک بات ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ علماء و فقہاء امت اور محدثین کرام میں سے کسی نے بھی ازدواجی زندگی سے متعلقہ روایات کی تردید و تغلیط نہیں کی ہے

ابتداءً ازدواجی زندگی سے متعلقہ روایات کی تضحیک عیسائی مشنریوں، آریہ سماجیوں اور رافضیوں نے کی تھی، ماضی قریب میں کچھ نام نہاد اہل قرآن منکرین حدیث نے حجیت حدیث کا انکار کیا اور بے مثال مستند و معتبر ذخیرہ حدیث کو عجمی سازش کا نتیجہ قرار دیا، انہیں خاص طور سے

ازدواجی زندگی اور میاں بیوی کے باہمی تعلقات، طہارت، غسل اور نکاح کے باب میں مرویات کو بھی اپنی غلط تنقید و تضحیک کا نشانہ بنایا، ایسے لوگوں میں عبداللہ چکڑالوی، میاں عبدالصمد بدایونی، احمد الدین امرتسری، نیاز فتحپوری، غلام احمد پرویز (مدیر طلوع اسلام کراچی پاکستان) عمر احمد عثمانی ڈاکٹر عبدالودود کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے، آگے چل کر یہ سلسلہ اتنا دراز ہو گیا کہ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب میاں محمد شفیع صاحب نے اپنے ایک فیصلے میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کی بعض روایات جو غسل جنابت اور میاں بیوی کے باہمی تعلقات سے متعلق ہیں پر تنقید کرتے ہوئے کہا، میں یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ یہ دونوں ازواج جو ہر لحاظ سے کامل تھیں انھوں نے اس عریانی کے ساتھ اپنی پرائیویٹ باتوں کو ظاہر کر دیا ہوگا جو ان کے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان میاں بیوی کی صورت میں ہوئی ہوں گی۔[1]

اسی طرح کا اظہار خیال فاطمہ مرنیسی نے بھی اپنی تازہ تصنیف " یہ کیسا نبی ہے کہ وہ مجمع عام میں جنسی معاملات کا ذکر کرتا ہے[2]۔ بنگلہ دیشی مصنفہ تسلیمہ نسرین نے اپنی کئی تحریروں اور انٹرویو میں ازدواجی تعلقات کے سلسلے میں کتاب وسنت کی دی گئی تعلیم وہدایت کا مذاق اڑایا ہے، اور یہاں تک کہتی ہیں کہ قرآن اب ازکار رفتہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے[3]۔ انگریزی کے معروف ومشہور صحافی سعید نقوی نے انگریزی روزنامہ دی پائنیر کے ایک مضمون میں حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ کی ایک روایت کہ جس میں حالت حیض میں جماع کے سوا بیوی سے ہر طرح کے استفادے کو جائز قرار دیا ہے واہیات قرار دیتے ہوئے سوال کیا ہے کہ کیا یہ سب باتیں عام چرچا کے لئے ہیں؟ اس واہیات کو اس کے بارے میں مذہب کے رکھوالے کیا کہتے ہیں:[4]

مولانا اخلاق حسین قاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں حضورؐ نے ارشاد فرمایا لوگوں میں بدترین شخص اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اپنی عورت کے پاس جاتے پھر وہ شخص راز کی باتوں کو پھیلائے" اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں " اس وعید کے مطابق آپ کے صحابہؓ اور خاص کر ازواج مطہرات کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی قربت کے حالات کو بیان

---

[1] ترجمان القرآن لاہور کا منصب رسالت نمبر بابت ستمبر ۱۹۶۱ء　[2] WOMAN IN ISLAM
[3] دیکھئے روزنامہ جن ستا ۱۱ مئی ۱۹۹۴ء　[4] دی پائنیر ۶ جنوری ۱۹۹۴ء سعید نقوی کی اس تحریر کو بعد میں کئی اخبارات نے شائع کیا، مثلاً جن ستا دہلی ۱۰ جنوری ۱۹۹۴ء

کرتی ہوں گی اور یہ بات کہ حضورؐ کی اتنی وعید اور تنبیہ کے باوجود ایسا عمل کرتے ہونگے کوئی شقی
انسان ہی اس کا تصور کرسکتا ہے۔[1]

پرائیویٹ زندگی اور میاں بیوی کے باہمی ازدواجی تعلقات کے افشا پر منکرین حدیث
(مثلاً غلام احمد پرویز) میاں محمد شفیع، فاطمہ مرنیسی، تسلیمہ نسرین، سعید نقوی اور مولانا اخلاق حسین قاسمی
کو اس لئے اشکال و اعتراض ہے کہ ان حضرات نے اس بات پر سرے سے غور ہی نہیں کیا کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ امت کے لئے نمونہ عمل ہونے کے ناطے پرائیویٹ زندگی کے افشا کا
تعلق دینی ضرورت اور امت کے لئے نجی زندگی میں مناسب تعلیم و رہنمائی سے ہے۔ نہ کہ عام چرچا
برائے تفریح و تلذذ ہے۔

رسول پاکؐ، ازواج مطہراتؓ اور صحابہ کرام رضؓ نے جس ایثار و قربانی کا ثبوت دیتے ہوئے
آنحضرتؐ کی پرائیویٹ زندگی کے حالات کو ہم تک من وعن پہونچایا اس کا ایمانی تقاضا تو یہ تھا کہ آنحضرت
اور آپ کی ازواج مطہرات کے لئے ہمارے دل میں امتنان و تشکر کا بحر بیکراں موجزن ہوجاتا
اور ہم سراپا سپاس گذار اور احسان مند ہوجاتے نہ کہ عام لوگوں کی زندگی پر قیاس کرتے ہوئے
ازدواجی تعلقات سے متعلق احادیث و روایات کو نشانہ تنقید و تضحیک بنائیں۔ اور اب جبکہ
سائنسی و ترقیاتی لحاظ سے دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ بائیلوجی علم تشریح الابدان والاجسام
خاصہ ترقی کر چکا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اساتذہ باقاعدہ نقشوں کے ذریعے انسانی جسم کی بناوٹ
کو طلبہ کے ذہن نشین کراتے ہیں، اور ڈاکٹر ضرورت شدیدہ کے وقت پوشیدہ مقام کا جائزہ
وعلاج کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات کے درمیان میاں

---

[1] ماہنامہ دارالعلوم دیوبند بابت اپریل ۱۹۹۴ء ص۱۔ مولانا اخلاق حسین صاحب نے یہ نقل کرکے جو تبصرہ کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا قاسمی سوچتے سمجھتے کم اور لکھتے زیادہ ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں علمی و تحقیقی طور پر بہت ہی جھول پایا جاتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ روایت یا مسئلہ پر ٹھہر کر سوچنے کے عادی نہیں ہیں جس کا لازمی نتیجہ غیر ذمہ دارانہ فیصلے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً یہی روایت جو انھوں نے مشکوٰۃ بحوالہ مسلم شریف نقل فرمایا ہے اسے حضرت عائشہؓ کی جانب منسوب کردیا ہے جب کہ یہ روایت حضرت ابوسعید خدریؓ سے ہے، حضرت عائشہؓ سے اس طرح کی کوئی روایت کسی بھی کتب حدیث میں مروی نہیں ہے۔ حتی کہ مولانا قاسمی نے مشکوٰۃ شریف کے جس صفحہ ۲۷۶ کا حوالہ دیا ہے وہاں پر حضرت ابوسعیدؓ ہی سے روایت ہے اہل علم مشکوٰۃ شریف کا محولہ صفحہ ملاحظہ فرمائیں۔

بیوی کے جائز تعلقات کے متعلق دی گئی معتدل و متوازن ہدایات و تعلیمات پر بیجا تنقید و تعریض بلفظ تغلیط و انکار کسی معنی میں بھی دانشمندانہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔

میاں بیوی کے باہمی ازدواجی تعلقات سے متعلق احادیث و روایات پر منکرین حدیث عیسائی، آریہ سماجی، میاں محمد شفیع، فاطمہ مرنیسی تسلیمہ نسرین اور سعید نقوی نے جو تنقید و اعتراض کیا ہے اس پر اتنا افسوس و تعجب نہیں ہے جتنا کہ اخلاق حسین قاسمی کی تحریر پر ہو رہا ہے، تجدد پسند حضرات کی جس ماحول میں پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سعید نقوی جیسے لوگ اسلامی شریعت کے بارے میں جتنی بھی ناواقفیت اور بے خبری کا ثبوت دے جائیں وہ کم ہے، ان کی وسعت مطالعہ اور علمی ذمہ داری کا حال تو یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے اس کے لئے کسی مستند و معتبر مجموعہ حدیث کا حوالہ دینے کے بجائے عرب گزٹ کے ایک تراشے کا حوالہ دیا ہے جو ان کے کسی دوست نے بھیج دیا تھا۔

جناب سعید نقوی نے حضرت عائشہؓ کے حوالے سے جس روایت کو کہانی تحریر کرتے ہوئے بکواس و واہیات قرار دیا ہے وہ سند صحیح کے ساتھ احادیث کے مستند و معتبر مجموعوں میں ان کے نقل کردہ الفاظ میں تو ملی نہیں البتہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے قدرے مختلف الفاظ میں مختلف کتب حدیث میں موجود ہے۔ وہ روایت یہ ہے، حضرت سعید بن مسیبؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا کہ میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں مگر آپ سے مجھے شرم آتی ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا دریافت فرمائیے میں آپ کی ماں ہوں، پوچھا آدمی عورت کو ڈھانپ لیتا ہے مگر انزال نہیں ہوتا ہے، اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا جب دونوں ختان مل جائیں تو غسل ضروری ہے[1]۔ اس کے علاوہ دیگر متعدد روایات میں بحالت حیض جماع کے سوا ہر طرح کے استفادے کو جائز قرار دیا ہے اصنعوا کل شیئ الا النکاح[2] اگرچہ بیوی سے حالت حیض میں جماع کے سوا ہر کام مثلاً سونا، بیٹھنا اس کے ہاتھ کا کھانا کھانا وغیرہ وغیرہ کے جواز کے سلسلے میں صحاح ستہ کے

---

[1] موطا امام مالک۔ [2] مسلم شریف جلد اول باب جواز غسل الحائض، عن انسؓ۔

علاوہ دیگر مستند کتب حدیث مثلاً موطا امام مالک، معانی الآثار، موطا امام محمد، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں بہت سی روایات موجود ہیں، تاہم یہاں صرف اصح الکتاب بعد کتاب اللہ بخاری شریف سے چند روایات کے نقل پر اکتفا کریں گے۔

بخاری شریف کتاب الحیض باب مباشرۃ الحائض کو لیجئے، باب کی پہلی روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے یہ ہے، میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کرتے اور دونوں جنبی ہوتے تھے اور آپ مجھے حکم فرماتے تو میں ازار باندھ لیتی پھر میرے ساتھ استراحت فرماتے، اس وقت کہ میں حالت حیض میں ہوتی، کان یأمرنی فأتزر فیباشرنی[1] وانا حائض۔ اس باب میں حضرت عائشہؓ اور حضرت میمونہؓ سے اور بھی متعدد روایات موجود ہیں، امام احمد نے اپنی مسند میں باب جواز مباشرۃ الحائض فیما فوق الازار کے تحت پندرہ روایات نقل کی ہیں، امام ابن تیمیہؒ نے حیض یا نفاس والی عورت سے مافوق الازار استمتاع کو جائز قرار دیا ہے، امام ترمذی نے باب مباشرۃ الحائض میں بھی اس طرح کی روایات موجود ہیں، متعلقہ دیگر تفصیلات بذل المجہود ص۱۶۱ ج۱ انوار المحمود ص۱۱۵ ج۱، المحلی ص۱۶۲ ج۲، عمدۃ القاری ص۹۳ ج۲، اور فتح القدیر ص۱۱۶ ج۱ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ذرا ہمیں بتایا جائے ان روایتوں میں مذکور کون سی بات عریانیت، واہیات اور بکواس کے قبیل سے ہے، آپ اور اور آپ کی ازواج مطہرات اور حضرات صحابہ کرام نے نجی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا حل پیش کیا ہے مزہ لینے کے لئے نہیں بیان فرمایا ہے اور نہ ہی کسی محدث وفقیہ کے پیش نظر (نعوذ باللہ) یہ بات تھی، تلذذ کی بات تو کوردماغ ٹیڑھی سوچ کا آدمی ہی سوچ سکتا ہے، محترمہ فاطمہ مرنیسی نے یہ تو لکھ دیا کہ یہ نبی کیسے جنسی معاملات کا مجمع عام میں ذکر کرتا ہے، لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مجمع کہاں تھا جہاں آپؐ جنسی معاملات کا ذکر فرماتے تھے، یہ سراسر بے لگام لفاظی اور غیر ذمہ دارانہ بات ہے، جو روشن خیالی اور تحقیق کے نام پر لکھی جاتی ہے، ہم نے اپنے اساتذۂ حدیث سے جو پڑھا سنا ہے اور خود جو مطالعہ کیا ہے اس میں تو ہم نے یہی پایا ہے کہ پرائیویٹ زندگی اور باہمی ازدواجی تعلقات کو آپ نے یا ازواج

---

[1] مباشرت کا مفہوم عربی میں، اردو میں مستعمل لفظ مباشرت سے بڑی حد تک مختلف ہے۔

مطہرات نے تعلیمی شرعی ضرورت کے تحت ہی ذکر فرمایا ہے، جب کسی نے پوچھا تو بتادیا، یوں ہی گلی کوچوں میں پرائیویٹ معاملات کا ذکر کرتے نہیں پھرتے تھے، اگر مخالفین کے پاس کوئی ثبوت ہے تو وہ کتب حدیث سے پیش کریں، ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پورے ذخیرۂ حدیث مستند ومعتبر تفاسیر اور اسلامی فقہ وتاریخ میں متمردین کی باتوں کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔

شریعت میں جنسی مسائل کے ذکر کے حوالے سے مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب مدظلہٗ کے تعلق سے کچھ لکھنا میرے لئے کوئی خوشگوار فریضہ نہیں، بلکہ تکلیف دہ ہے، ان سے دیرینہ تعلقات ہونے کے ناطے بارہا دل میں آیا کہ اپنے تعلقات خراب نہ کروں لیکن احقاق حق کی سوچ تعلقات پر غالب آگئی اور جانتے بوجھتے کہ ؎

حق بات کہی جب بھی احساس رہا مجھکو
لازم ہے شکن ان کے ماتھے پہ پڑی ہوگی

یہ ناگوار فریضہ بار بار انجام دینا پڑا۔

مولانا اخلاق حسین صاحب ایک لکھاڑ آدمی ہیں، تفسیر خصوصاً اردو تفاسیر پر ان کی نظر حد تک وسیع ہے تاہم وہ حدیث وفقہ پر بھی خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں، زیادہ لکھنا کوئی کمال نہیں ہے بلکہ تحقیق کے ساتھ صحیح بات لکھنا کافی ہے بسیار نویسی آدمی کو کسی مسئلے پر ٹھہر کر سوچنے کا موقع نہیں دیتی ہے مثلاً مولانا قاسمی نے قوی آواز کے اپنے مضمون الدنیا مزرعۃ الآخرۃ کو فرمان رسول تحریر کردیا۔ جب کہ علامہ سخاوی کا کہنا ہے کہ اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ لم اقف علیہ[1]۔

اسی طرح ایک بار ماہ محرم کے موقعہ پر انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف منسوب ایک زباں زد رباعی کو اپنی تحریر کی زینت بنالیا تھا۔ رباعی یہ ہے۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین ؛ دین است حسین دین پناہ است حسین
سرداد نہ داد دست در دست یزید ؛ حقا کہ بنائے لاالٰہ است حسین (باقی ص۴۸)

---

[1] المصنوع ص۱۰۷، المقاصد الحسنۃ ص۲۱۴۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ۲۲۹ھ
وفات ۳۲۱ھ
عمر ۹۲ سال

نام ونسب وولادت الامام المحدث الفقیہ احمد بن محمد بن سلامۃ بن سلمۃ بن عبد الملک بن سلمۃ بن سلیم بن سلیمان بن جواب الازدی ثم الحجری المصری الحنفی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

سال ولادت حسب روایت ابن عساکر ۲۲۹ھ وابن خلکان ۲۳۸ھ ہے مگر سمعانی نے ۲۲۹ھ ذکر کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے، حافظ ابن کثیر، حافظ بدر الدین عینی وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے لہذا امام طحاوی کی عمر امام بخاری کی وفات کے وقت ۲۷ سال ہوگی کیونکہ ان کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی ہے اسی طرح دوسرے اصحاب ستہ بھی امام طحاوی کے معاصر تھے۔

تحصیل علم وکثرتِ شیوخ امام طحاوی طلب علم کے لئے اپنے مسکن سے مصر آئے اور اپنے ماموں امام مزنی تلمیذ امام شافعیؒ کے پاس پڑھتے رہے اور ابتدا میں شافعی مذہب پر رہے، پھر احمد بن ابی عمران حنفی مصر میں قاضی ہو کر پہونچے تو ان کی صحبت میں بیٹھے، ان سے علم حاصل کیا تو فقہ شافعی کا اتباع ترک کرکے فقہ حنفی کے متبع ہو گئے (معجم البلدان یاقوت حموی)

محمد بن احمد شروطی کا بیان ہے کہ میں نے امام طحاوی سے پوچھا آپ نے اپنے ماموں (مزنی) کی کیوں مخالفت کی اور امام ابو حنیفہ کا مذہب کیوں اختیار کیا، فرمایا: میں دیکھتا تھا کہ ماموں ہمیشہ امام ابو حنیفہ کی کتابیں مطالعہ میں رکھتے تھے، ان سے استفادہ کرتے تھے اسی لئے میں اس کی طرف منتقل ہو گیا (مرآۃ الجنان یافعی)

علامہ کوثریؒ نے "الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی" میں اس جگہ مزید وضاحت کی ہے کہ میں نے اپنے ماموں (مزنی) کو دیکھ کر خود بھی امام صاحب کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا[1] اور ان کی کتابوں نے مجھے حنفی مذہب کا گرویدہ بنا دیا، جس طرح کہ ان کتابوں نے میرے

(۱) حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ماموں مزنی کو بھی بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ کی طرف مائل کردیا تھا جیسا کہ مختصر المزنی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس میں بہت سے مسائل ایسے مذکور ہیں جن میں مزنی نے امام شافعی کی مخالفت کی ہے (الحاوی ص۱۶)

چونکہ مذہب شافعی سے مذہب حنفی کی طرف منتقل ہونے کی یہ وجہ خود امام طحاوی سے اور بسند صحیح مروی ہے، اس لئے یہی معتمد و صحیح ہے، باقی دوسری حکایات بے سند اور خلاف درایت ہیں مثلاً حافظ ابن حجر نے لسان میں نقل کیا کہ وجہ یہ ہوئی کہ ایک دفعہ امام طحاوی اپنے ماموں سے سبق پڑھ رہے تھے ایک ایسا دقیق مسئلہ آیا کہ انھوں نے امام طحاوی کو بار بار سمجھایا مگر وہ نہ سمجھ سکے اس پر امام مزنی نے تنگ دل ہوکر غصہ سے فرمایا کہ واللہ تم تو کسی قابل نہ ہوئے، اس بات پر امام طحاوی ناخوش ہوکر احمد بن ابی عمران قاضی مصر کی مجلس میں چلے گئے جو قاضی بکار (حنفی) کے بعد دیار مصریہ کے قاضی القضاۃ ہوئے تھے وغیرہ الخ۔

امام طحاوی اور حافظ ابن حجر

پورے قصے کو جس رنگ آمیزی کے ساتھ حافظ نے ذکر کیا ہے وہ بقول علامہ کوثریؒ قابل عبرت ہے اور اس میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ قاضی بکار کی وفات امام مزنی متوفی ۲۶۴ھ سے بہت مدت بعد ۲۷۰ھ میں ہوئی اور حسب اقرار حافظ ابن حجر و موافق تصریح حافظ ذہبی ابن ابی عمران قاضی بکار کے بعد قاضی مقرر ہوکر عراق سے مصر آئے تو پھر یہ کہنا کہ امام طحاوی ناخوش ہوکر ان کے پاس چلے گئے، کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ امام طحاوی کی ذکاوت وجدت طبع کو سب تسلیم کرتے ہیں جو ان کی کتابوں سے بھی ظاہر ہے، ایک غبی طبیعت کا طالب علم جو استاد کے بار بار سمجھانے پر بھی ایک دقیق مسئلہ کو نہ سمجھ سکتا ہو کیا وہ آگے چل کر اس قدر اعلیٰ درجہ کا ذہین و ذکی بن سکتا ہے، آج اس کی کتابوں

لہ علامہ کوثریؒ کی تصریحات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ امام طحاویؒ احمد بن ابی عمران کی طرف رجوع کرنے سے قبل بکار بن قتیبہ کا رد بھی کتاب مزنی پر دیکھ چکے تھے، گویا یہ ایک دوسری بڑی وجہ فقہ حنفی کی طرف میلان کی پیدا ہوچکی تھی اور ان حالات کے نتیجہ میں کچھ روایات مکذوبہ امام طحاوی کے خلاف چلائی گئیں (الحاوی ص۱۷)

کو سمجھنے والے بھی با استعداد علماء میں کم ملیں گے

تذکرہ امام شافعی و امام مزنی

تیسرے یہ کہ امام مزنی امام شافعیؒ کے اخص تلامذہ میں سے تھے اور امام شافعی اعلیٰ درجہ کے ذکی وفطین تھے اور اپنے تلامذہ کی تعلیم وتفہیم پر بغایت حریص اور ان کی بلادت وکم فہمی پر بڑے صابر تھے، کبھی سمجھانے سے ملول وتنگ دل نہ ہوتے تھے، حتی کہ ربیع مرادی (امام شافعی کے مذہب جدید کے راوی) کے متعلق نقل ہے کہ بہت بطئ الفہم وبلید تھے، ایک دفعہ امام شافعی نے ان کو ایک مسئلہ چالیس بار سمجھایا، تب بھی نہ سمجھے اور شرمندہ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے۔ امام شافعی نے ان کو دوسرے وقت تنہائی میں بلا کر پھر مسئلے کی وضاحت کی حتی کہ وہ سمجھ گئے (فتاویٰ قفال مروزی)

ظاہر ہے کہ مزنی نے بھی اپنے شفیق استاد امام شافعی سے ایسی ہی وسعت صدر اور غبی طلبہ کی غباوت پر صبر وبرداشت کا طریقہ لیا ہوگا، پھر امام طحاوی کے ساتھ کہ وہ نہ صرف ایک تلمیذ بلکہ بھانجے بھی تھے، وہ کیسے ایسی بے صبری وتنگدلی کا مظاہرہ کرتے جو اس قصے میں گھڑا گیا ہے۔ (الحاوی ص۱۸)

حافظ ابن حجر نے امام مزنی کے حلف کی توجیہات میں ایک وجہ بعض فقہاء سے یہ بھی نقل کی ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ "جو شخص اہل حدیث کا مذہب ترک کرکے اہل رائے کا مذہب اختیار کریگا وہ فلاح نہیں پائے گا"

بفرض صحتِ واقعہ امام مزنی نے جس وقت حلف کے ساتھ وہ جملہ امام طحاوی کو فرمایا ہوگا اس وقت انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ مذہب تبدیل کردیں گے، پھر جب کہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تبدیلیٔ مذہب کافی عرصہ کے بعد اور دونوں فقہ کے مطالعہ وموازنہ کے بعد عمل میں آئی ہے۔

اہل حدیث کون ہیں

رہی یہ تعریض کہ اہل حدیث وہی لوگ ہیں، دوسرے نہیں، علامہ کوثریؒ نے اس کا بہت معقول جواب دیا ہے، فرمایا کہ اس بے دلیل دعوے کو ہم ان لوگوں کی زبانوں سے سننے کے عادی ہوچکے ہیں جو سلامت فکر سے محروم ہیں، وہ اگر اچھی طرح سوچتے سمجھتے کہ خود ان کے اصحاب مذہب نے قیاس شبہ ومناسبۃ اور رد مرسل میں تو کس قدر توسع کیا اور قبول حدیث میں اتنا تساہل کہ ہر کہ ومہ کی روایت لے لی، اور وہ پوری طرح اگر مسند

ابی العباس اصم کا مطالعہ کرتے تو یقیناً اپنے اس ادعا سے باز آجاتے۔ اہل سنت کے طبقات میں سے کون سا طبقہ ایسا ہے جو حدیث کو اصول استنباط کا دوسرا درجہ نہیں دیتا؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ حدیث کے متن و سند کو نقد وتقویم کی چھلنی میں ضرور چھاننا پڑے گا، ہر ناقل حدیث کی روایات کو بغیر بحث وتنقیب کے قبول کرلینے کی آزادی نہیں ہوسکتی واللہ ولی الہدایہ (حاوی ۱۵)

امام طحاوی بسلسلۂ امام اعظم امام طحاوی بواسطۂ امام مزنی امام شافعیؒ کے تلمیذ تھے اور ان کے واسطے سے امام مالکؒ و امام محمدؒ کے اور ان تینوں کے واسطہ سے امام اعظمؒ کے تلمیذ تھے، امام طحاوی کے شیوخ بکثرت تھے، ان میں مصری، مغاربہ، یمنی بصری، کوفی، حجازی، شامی، خراسانی وغیرہ سب ہی ہیں، کیونکہ امام طحاوی نے طلب حدیث وفقہ کے لئے اسفار کئے اور مصر میں جو بھی علماء آتے تھے ان سب سے استفادہ ضرور کرتے تھے، اس طرح انھوں نے اپنے وقت کے تمام علماء ومشائخ کا علم جمع کیا تھا، اسی لئے پھر خود بھی مرجع علماء روزگار ہوتے، ساری دنیا سے ہر مسلک وخیال کے اہل علم آپ سے استفادہ کے لئے مصر آتے تھے اور آپ کے بے نظیر تبحر علمی وجامعیت سے حیرت میں پڑتے تھے۔

ذکر امانی الاحبار حضرت مخدوم ومعظم مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی دہلوی دام ظلہم رئیس ادارہ تبلیغ نظام الدین دہلی نے حال ہی میں اپنی شرح معانی الآثار مسمّٰی "امانی الاحبار" کی ایک جلد شائع فرمائی ہے جو کتاب مذکور کی بہترین محققانہ شرح اور علماء کیلئے نہایت قابل قدر علمی تحفہ ہے، پہلی جلد بڑی تقطیع کے ۴۴۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے جس کے شروع میں ۶۸ صفحہ کا مقدمہ ہے اس میں امام طحاوی کے حالات پوری تحقیق وتفصیل سے لکھے ہیں۔

معانی الآثار، مشکل الآثار اور دوسری حدیثی تالیفات امام طحاوی کے شیوخ کا مکمل تذکرہ کیا ہے پھر ایک فصل میں امام طحاوی کے کبار تلامذہ کا بھی ذکر کیا ہے، ثناء امام طحاوی کے عنوان سے حسب ذیل اقوال جمع کئے ہیں۔

ثناء اکابر علماء ومحدثین محدث ابن یونس اور ابن عساکر کا قول ہے کہ امام طحاوی ثقہ ثبت فقیہ وعاقل تھے انھوں نے اپنا نظیر ومثیل نہیں چھوڑا (تذکرۃ الذہبی وتہذیب تاریخ دمشق)

شیخ مسلمہ بن القاسم الاندلسی نے فرمایا کہ امام طحاوی ثقہ جلیل القدر فقیہ، اختلاف علماء کے بڑے عالم اور تصنیف وتالیف کی بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ امام ابوحنیفہ کے متبع تھے اور حنفی مذہب کی بہت حمایت کرتے تھے (لسان)۔

علامہ ابن عبدالبر نے فرمایا کہ امام طحاوی سیر کے بڑے عالم جمیع مذاہب فقہاء کے واقف اور کوفی المذہب تھے (جامع بیان العلم)

علامہ سمعانی نے فرمایا کہ امام طحاوی ایسے بڑے امام ثقہ، ثبت، فقیہ وعالم تھے کہ اپنا مثل نہیں چھوڑا (کتاب الانساب)

علامہ ابن الجوزی کا قول ہے کہ امام طحاوی ثبت، فہیم، فقیہ و عاقل تھے۔ (المنتظم)

علامہ سبط ابن الجوزی نے فرمایا کہ امام طحاوی فقیہ، ثبت، فہیم وعاقل تھے، اور ان کے فضل، صدق، زہد و ورع پر علماء کا اتفاق ہے۔ (مرآۃ الزمان)

حافظ ذہبی نے فرمایا کہ امام طحاوی فقیہ، محدث، حافظ حدیث، ثقہ، ثبت، عاقل اور اعلام میں سے ایک تھے (تاریخ الکبیر)

اور تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ذکر خلال، ابوبکر رازی، حافظ ابوعوانہ، ابن جارود وغیرہ اکابر محدثین وحفاظ حدیث کے طبقہ میں کیا، اور اس طرح لکھا: "علامہ حافظ صاحب تصانیف بدیعہ، ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامۃ بن سلمۃ الازدی الحجری المصری الحنفی"۔ حافظ ابن کثیر نے بدایہ میں ۳۲۱ھ میں لکھا ہے کہ اسی سنہ میں اعیان میں احمد بن محمد بن سلامہ ابوجعفر طحاوی فقیہ حنفی صاحب مصنفات مفیدہ وفوائد غزیرہ فوت ہوئے اور وہ ثقات، اثبات اور حفاظ جہابذہ میں سے تھے، اسی طرح علامہ صلاح صفدی نے وافی میں، یافعی نے مرآۃ میں علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں، ابن عماد حنبلی نے شذرات الذہب میں، ابن طغری نے النجوم الزاہرہ میں، ابن ندیم نے فہرست میں، خفاجی مصری نے شرح شفاء میں اور علامہ عینی نے نخب الافکار میں، امام طحاوی کو ثقہ بارع فی الفقہ والحدیث، حافظ وناقد حدیث، شیخ الحنفیہ، احد الاعلام، شیخ الاسلام، امام العصر بلامدافعت، علم فقہ، حدیث اختلاف العلماء، لغت، نحو وغیرہ میں یکتائے روزگار، حدیث وعلل اور ناسخ ومنسوخ میں بڑا عالم اور ید طولیٰ رکھنے والا قرار دیا۔

محدث طبرانی، ابوبکر خطیب بغدادی، ابو عبداللہ حمیدی، حافظ مزی وغیرہ نے مدح وثنا کی علامہ عینی نے امام طحاوی کی ثقاہت دیانت وفضیلت تامہ کو مجمع علیہ کہہ کر یہ بھی فرمایا کہ " وہ قرآن وحدیث سے استنباط احکام اور تفقہ میں اپنے ہم سن معاصرین اور شرکاء بروایت اصحاب صحاح وسنن سے زیادہ اثبت وفائق تھے، اور یہ بات ان دونوں کے کلام میں موازنہ کرنے سے واضح ہے، اور ہمارے اس دعوٰی کی تصدیق امام طحاوی کی تصانیف علوم عقلیہ ونقلیہ سے بھی ہو سکتی ہے بالخصوص روایت حدیث، معرفت رجال اور کثرت شیوخ کے لحاظ سے تو یہ امر متیقن ہے کہ وہ بھی امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے اصحاب صحاح وسنن کی طرح بڑے پایہ کے امام حدیث، ثبت ثقہ وحجت تھے۔

امام طحاوی مجدد تھے

حضرت الاستاذ المعظم مولانا محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ علامہ ابن اثیر جزری نے امام طحاوی کو مجدد کہا ہے، میں کہتا ہوں کہ وہ واقعی امام حدیث ومجتہد تھے اور شرح حدیث وبیان محامل حدیث واصول وا جوبہ کے لحاظ سے وہ مجدد بھی تھے کیونکہ پہلے محدثین صرف روایت حدیث متناً وسنداً کرتے تھے معانی حدیث ومحامل وغیرہ پر بحث نہیں کرتے تھے۔ امام طحاوی نے اس نئے طرز میں لکھا اور اتنا کثیر حاصل لکھا کہ حق ادا کر گئے۔

فنِ رجال اور امام طحاوی

فنِ رجال میں ان کے کمال وسعتِ علم کا اندازہ ان مواقع میں ہوتا ہے جب احادیث متعارضہ پر بحث کرتے ہیں معانی الآثار مشکل الآثار اور تاریخ کبیر (فی الرجال) میں بکثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں، افسوس ہے کہ امام طحاوی کی تاریخ کبیر اس وقت ناپید ہے مگر اس سے نقول اکابر محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں جن سے اس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے (حاوی ومقدمہ امانی الاحبار ملخصاً)

جرح وتعدیل اور امام طحاوی

جرح وتعدیل کے بارے میں امام طحاوی کی رائے بطور سند کتب جرح وتعدیل میں ذکر ہوئی ہے اور معانی الآثار میں بھی بہ کثرت رواۃ کی جرح وتعدیل پر انھوں نے کلام کیا ہے اور مستقل کتاب بھی لکھی جس کا ذکر اوپر ہوا، اور "نقض المدلسین" کرابیسی کے رد میں لکھی ابو عبید کی کتاب السنۃ کی اغلاط پر مستقل

تصنیف کی۔

حافظ ابن حجر کا تعصب

لیکن نہ تو خود امام طحاوی کی تاریخ کبیر وغیرہ اس وقت موجود ہیں نہ ان کے اکابر تلامذہ کی کتابیں جن سے ان کے سب اقوال معلوم ہو سکتے، حافظ ابن حجر جو کچھ اوپر سے لیتے ہیں، اس میں وہ حنفیہ کے ساتھ پوری عصبیت برتتے ہیں، چنانچہ خود ان کے تلمیذ حافظ سخاوی کو اپنی تعلیقات درر کامنہ میں متعدد جگہ اعتراف کرنا پڑا کہ حافظ ابن حجر جب بھی کسی حنفی عالم کا ذکر کرتے ہیں تو اس کو کم درجہ کا دکھلانے پر مجبور رہیں۔

اسی تعصب شدید کے باعث انھوں نے امام طحاوی کا ذکر نہ ان کے جلیل القدر شیوخ واساتذہ کے حالات میں کیا اور نہ ان کے اعلیٰ درجہ کے تلامذہ واصحاب کے حالات میں کیا۔

البتہ جن لوگوں میں کوئی کلام تھا ان کے ضمن میں ان کا ذکر ضرور کیا، تاکہ ان کے ساتھ امام طحاوی کی قدر ومنزلت بھی کم ہو جائے، پھر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ یہ ہے کہ جن ضعیف رواۃ سے امام طحاوی نے کسی وجہ سے معدودے چند احادیث لے لی ہیں تو حافظ نے اس کو بڑھا چڑھا کر کہا کہ امام طحاوی نے ان سے بہت زیادہ روایت کی ہے۔ اور بہت سے اعلیٰ درجہ کے ثقہ رواۃ جن سے امام طحاوی نے بکثرت روایات لی ہیں، ان کے حالات میں حافظ نے یہ نہیں بتلایا کہ یہ امام طحاوی کی رواۃ میں ہیں

اسی طرح تہذیب ولسان میں امام طحاوی کے اقوال جرح وتعدیل بھی صرف منزورۃً کہیں کہیں لے لئے ہیں حافظ ابن حجرؒ کی اسی روش کے باعث حضرت شاہ صاحبؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جس قدر نقصان رجال حنفیہ کو حافظ سے پہونچا ہے اور کسی سے نہیں پہونچا کیونکہ تہذیب الکمال مزی میں (جس کا خلاصہ تہذیب التہذیب للحافظ ہے) بکثرت ائمہ محدثین کے حالات میں ان کے شیوخ وتلامذہ میں حنفیہؒ تھے۔ جن کا ذکر حافظ نے حذف کر دیا ہے دوسری کتب کے نقول سے ان کا پتہ چلتا ہے، توقع ہے کہ تہذیب الکمال حیدرآباد سے جلد شائع ہو گی تب موازنہ ہو سکے گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

مقدمہ امانی الاحبار

مقدمہ امانی الاحبار میں معانی الآثار اور مشکل الآثار کے رواۃ پر امام طحاوی کے کلمات جرح وتعدیل کو یکجا کر دیا ہے جس سے ایک

نظر میں امام موصوف کی بالغ نظری و وسعتِ علم کا اندازہ ہو جاتا ہے جزی اللہ المؤلف عنا و عن سائر اھل العلم خیرا لجزاء

ناقدینِ امام طحاوی

اوراق سابق میں تحریر ہوا کہ اکابر محدثین نے امام طحاوی کی ہر طرح توثیق و مدح کی ہے لیکن چند حضرات نے کچھ نقد بھی کیا ہے۔

امام بیہقی

ان میں سے ایک تو امام بیہقی ہیں، ان کا نقد و جواب جواہر مضیئہ میں بہ تفصیل موجود ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر نے فرمایا کہ امام بیہقی نے اپنی کتاب اوسط معروف بہ آثار و سنن میں کہا کہ امام طحاوی کی کتاب (معانی الآثار) میں نے دیکھی تو اس میں کتنی ہی احادیثِ ضعیفہ کی اپنی رائے کی وجہ سے تصحیح کر دی ہے اور کتنی ہی صحیح حدیثوں کو اپنی رائے کی وجہ سے ضعیف کہدیا ہے" شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے امام طحاوی کی کتاب دیکھی اور اپنے استاد قاضی القضاۃ علی الدین ماردینی کے فرمانے پر اس کی شرح لکھی اس کی سانید پر کلام کیا، اس کی احادیث و اسناد کو صحاح ستہ، مصنف ابن ابی شیبہ اور دوسری کتب حفاظ حدیث کی روایت کردہ احادیث کے ساتھ مطابقت دی اور اس کا نام "الحاوی فی بیان آثار الطحاوی" رکھا۔

حاشا و کلا جو بات امام بیہقی نے ان کی کتاب مذکور کی طرف منسوب کی ہے وہ اس میں کہیں بھی نہیں ہے، اسی طرح صاحب کشف الظنون نے بھی کہا کہ امام بیہقی نے جو کچھ امام طحاوی کے بارے میں کہا ہے وہ بے مبادا اتہام ہے اور وہ بھی ایسے شخص پر جس پر اکابر مشائخ حدیث نے اعتماد کیا ہے (مقدمہ امانی ص۵۵)

علامہ ابن تیمیہؒ

دوسرے ناقد علامہ ابن تیمیہؒ ہیں، انھوں نے منہاج السنہ میں حدیث ردشمس پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ حدیث موضوع ہے اور طحاوی نے اس کو روایت کر دی ہے کیونکہ وہ نقد حدیث کے ماہر نہ تھے اور ایک حدیث کو دوسری پر ترجیح بھی اپنی رائے کی وجہ سے دیا کرتے تھے، ان کو دوسرے اہل علم کی طرح اسناد کی معرفت نہ تھی۔ اگرچہ وہ کثیر الحدیث تھے اور فقیہ و عالم تھے۔

علامہ نے حدیث مذکور کی روایت کی وجہ سے امام طحاوی پر نقد مذکور کیا ہے حالانکہ اس کو

روایت کرنے والے وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ اور بہت سے محدثین متقدمین و متاخرین نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور موضوع نہیں قرار دیا۔

علامہ ابن جوزی

علامہ خفاجی مصری نے شرح شفا میں کہا کہ اس حدیث کو بعض حضرات نے موضوع کہا ہے حالانکہ حق اس کے خلاف ہے اور ان کو دھوکہ ابن جوزی کے کلام سے ہوا ہے حالانکہ ان کی کتاب میں بے جا تشدد ہے، ابن صلاح نے کہا ہے کہ انھوں نے بہت سی صحیح احادیث کو موضوعات میں داخل کر دیا ہے۔

پھر لکھا کہ اس حدیث کو تعدد طرق کی وجہ سے امام طحاوی نے صحیح قرار دیا ہے، اور ان سے قبل بھی بہت سے ائمہ حدیث نے اس کو صحیح کہا ہے اور تخریج کی مثلاً ابن شاہین، ابن مندہ ابن مردویہ نے اور طبرانی نے حسن کہا، امام سیوطی نے مستقل رسالہ میں اس حدیث کی متعدد طرق سے روایت کی اور پوری طرح تصحیح کی، لہٰذا معلوم ہوا کہ علامہ ابن تیمیہ اور ابن جوزی نے جو اس کو موضوع کہہ کر اعتراض کیا ہے وہ ان کی تخمینی غیر تحقیقی رائے ہے۔

حافظ ابن حجر

امام طحاوی پر نقد کرنے والوں میں تیسرے نمبر پر حافظ ابن حجر ہیں، انھوں نے لسان المیزان میں ان کا ذکر لاکر متکلم فیہ قرار دیا، پھر امام بیہقی کا قول مذکور نقل کیا جس کا جواب گذر چکا۔

اس کے بعد مسلمہ بن قاسم اندلسی کے ایک قول سے امام طحاوی کو متہم قرار دیا، حالانکہ امام ذہبی نے میزان میں اس کو ضعیف کہا اور مشبہ میں سے قرار دیا اور اسی مسلمہ نے امام بخاری پر الزام لگایا تھا کہ انھوں نے اپنے استاد علی بن مدینی کی کتاب العلل چرا کر نقل کرالی پھر اس کی مدد سے جامع صحیح بخاری تالیف کی جس سے ان کی اتنی عظمت بڑھی، حافظ نے تہذیب میں اس اتہام کو ذکر کرکے کہا کہ یہ واقعہ غلط ہے کیونکہ بے سند ہے لیکن افسوس ہے کہ اسی شخص سے حافظ نے امام طحاوی پر تہمت نقل کی تو اس کو بے سند نہیں کہا نہ اس کی تغلیط کی

امام طحاوی بڑے مجتہد تھے

حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ نے تعلیقات سنیہ میں فرمایا کہ امام طحاوی مجتہد تھے اور امام ابو یوسفؒ و امام محمد کے طبقہ میں تھے ان کا مرتبہ ان دونوں سے کم نہیں تھا۔ (مقدمۂ امانی ص۵۹)

(باقی آئندہ)

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوتے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین ومخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ وروغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقربا کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب وآلام سے محفوظ رکھے، آمین۔

پتہ

ڈرافٹ وچیک کیلئے:- دارالعلوم دیوبند — اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے:- حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند — پن کوڈ نمبر 247554

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دارالعلوم
PH. NO. 23429
COD - 01336
PIN - 247554
ماہ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۴ء
جلد ۷۹ شمارہ ۹
سالانہ 60/-
فی شمارہ 6/-
ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ دارالعلوم
دیوبند، سہارنپور
یو، پی
نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند
سالانہ بدل اشتراک
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۳۰۰/- روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/-
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/-
ہندوستان سے ۶۰/-

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں

بنگلور میں سہ روزہ تربیتی کیمپ و عظیم الشان اجلاس عام

زیر اہتمام: مجلس تحفظ ختم نبوت و جمعیۃ علماء کرناٹک

زیر نگرانی: کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

مرتب: مولانا محمد عثمان صاحب منصورپوری ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت

ریاست کرناٹک کے شہر بنگلور وغیرہ میں قادیانی گروہ کی سرگرمیاں چند سالوں سے تشویشناک حد تک بڑھتی جارہی تھیں، مقامی علمائے کرام و عمائدین ان کی روک تھام کے لئے فکر مند تھے، اور مناسب حال تدابیر اختیار فرماتے رہتے تھے، تاہم وہ حضرات قادیانی فتنہ کے خلاف عام بیداری پیدا کرنے کے لئے ایک سہ روزہ تربیتی کیمپ اور اجلاس عام کی ضرورت شدت سے محسوس فرمارہے تھے، اور کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی دفتر سے زبانی و تحریری طور پر تقاضا فرماتے رہے تھے کہ مذکورہ پروگراموں کی اجازت دیکر تاریخوں کا تعین کردیا جائے، آخر کار ماہ جولائی ۱۹۹۲ء میں حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند و صدر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت و حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری ناظم عمومی کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت و استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے مشورہ سے ۲۵ تا ۲۷ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ مطابق ۲ تا ۴ ستمبر ۱۹۹۲ء

جمعہ، ہفتہ، اتوار کی تاریخیں طے کر کے بنگلور کے ذمہ داران کو اطلاع کردی گئی، جس کے بعد ان حضرات نے بھرپور تیاری شروع فرمادی اور مرکزی دفتر سے ضروری راہنمائی حاصل کرتے رہے مذکورہ پروگراموں میں شرکت کے لئے دارالعلوم دیوبند کے مندرجہ ذیل حضرات کے سفر کا پروگرام طے ہوا۔ (۱) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (۲) حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند (۳) جناب مولانا مفتی محمود حسن صاحب بلند شہری استاذ و مفتی دارالعلوم دیوبند (۴) جناب مولانا محمد یامین صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند (۵) جناب مولانا محمد عرفان صاحب مبلغ دارالعلوم (۶) راقم الحروف محمد عثمان منصور پوری۔

بنگلور کے حضرات نے ملک کے دیگر مدارس کے علماء کرام کو بھی دعوت دی جو قادیانیت اور اس کی تردید کا خاص مطالعہ رکھتے ہیں اور کام کرتے رہتے ہیں اور مرکزی دفتر سے درخواست کی کہ ان حضرات سے ہماری دعوت قبول کرنے کی سفارش کردی جائے چنانچہ مندرجہ ذیل حضرات کو دفتر سے بھی خطوط روانہ کیے گئے۔ بفضلہ تعالیٰ وہ سب بنگلور تشریف لائے۔

(۱) حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند و امیر شریعت اڑیسہ

(۲) حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی مہتمم دارالمبلغین لکھنؤ

(۳) جناب مولانا سید سراج الساجدین صاحب نائب مہتمم مرکز العلوم سونگڑہ، اڑیسہ

(۴) جناب مولانا محمد علی صاحب کٹکی استاذ " " "

(۵) جناب مولانا محمد یوسف صاحب امروہوی استاذ جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ

(۶) جناب مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری استاذ دارالعلوم الاسلامیہ بستی

(۷) جناب مولانا مفتی محمد اسرار صاحب سہارنپوری استاذ مظاہر علوم دار جدید سہارنپور۔

تربیتی کیمپ کا نظام

مقررہ پروگرام کے مطابق ۲ر ستمبر ۹۲ء بروز جمعہ ۸ بجے صبح سے تربیتی کیمپ کی افتتاحی نشست مسجد جلیل مدرسہ شاہ ولی اللہ میں زیر صدارت حضرت مولانا شاہ ابوالسعود صاحب مہتمم مدرسہ سبیل الرشاد بنگلور منعقد ہوئی جس میں عمائدین شہر کے علاوہ پورے صوبہ کے تقریباً چھ سو

علمائے کرام نے شرکت فرمائی، اولاً جناب مولانا سید معصوم ثاقب صاحب فیض آبادی کنوینر تربیتی کیمپ نے خطبہ استقبالیہ پیش فرمایا، پھر مندرجہ ذیل حضرات نے افتتاحی تقریریں فرمائیں۔ حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی، حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری اور راقم الحروف محمد عثمان منصور پوری۔ ۱۲ بجے کے قریب صدر محترم کے مختصر خطاب اور دعائیہ کلمات پر یہ نشست بخیر و خوبی مکمل ہوئی۔

تربیتی کیمپ کی دوسری نشست اسی روز عصر کے بعد سے عشاء تک منعقد ہوئی، ۳ ستمبر کو بھی اسی طرح دو نشستیں ہوئیں، ۴ ستمبر کو پہلی نشست حسب معمول ۸ بجے سے ایک بجے تک اور دوسری نشست بعد ظہر تا عصر منعقد ہوئی، بہرحال تربیتی کیمپ کی کل چھ طویل نشستیں اسی مسجد میں ہوئیں جن میں خصوصی مربی کے فرائض حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نے انجام دیئے، ہر دو حضرات نے مسئلہ ختم نبوت رفع و نزول عیسیٰؑ اور دیگر متعلقہ مباحث پر مفصل روشنی ڈالی اور تحقیقی مسائل پر شرکاء کے علمی اشکالات حل فرمائے اور قادیانیت کی تردید کیلئے ان کو قیمتی مواد فراہم فرمایا، ۴ ستمبر کی پہلی نشست میں حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی نے بھی تربیتی کیمپ میں خصوصی خطاب فرمایا اور قادیانی فتنہ کی حقیقت سمجھنے اور اسکے تعاقب کے لئے تربیتی کیمپ کی ضرورت و اہمیت کو واضح فرمایا، تربیتی کیمپ کی آخری نشست میں حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی کے دست مبارک سے جملہ شرکاء کو اسناد شرکت عطا کی گئیں۔ علاوہ ازیں جملہ مندوبین کو رد قادیانیت کا وقیع لٹریچر (اردو انگلش) ہدیہ کیا گیا۔

بڑی بڑی مساجد میں ردّ قادیانیت پر علماء کے بیانات

منتظمین نے بنگلور کے عام مسلمانوں کے استفادہ کے لئے یکم ستمبر سے ہی شہر کی بڑی بڑی مساجد میں دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس کے مدعو علماء کرام کی تقریروں کے پروگرام بھی رکھ دیئے تھے جن کی اشاعت بذریعہ اخبارات و پوسٹر کی گئی تھی، بفضلہ تعالیٰ یہ پروگرام بھی بیحد کامیابی کے ساتھ جاری رہے، جن میں ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا، ان تقریروں سے قادیانیت کا

گروہ چہرہ بے نقاب ہوکر عام مسلمانوں کے سامنے آگیا، جن کے بعد امید ہے کہ وہ قادیانی مکر و فریب سے محفوظ رہیں گے۔

اجلاس عام

ایک کھلے اسٹیڈیم میں منعقد ہوا جو چھوٹے میدان کے نام سے مشہور ہے وہاں ٹین کے شیڈ کا وسیع و عریض پنڈال بنایا گیا۔ اجلاس عام کی کارروائی عصر کی نماز کے بعد سے شروع ہوکر رات کے ۱۰ بجے تک جاری رہی، عصر کے بعد ہی پورا پنڈال سامعین سے بھر گیا تھا، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سامعین کی تعداد بڑھتی چلی گئی، بنگلور کی تاریخ میں یہ اجلاس عدیم المثال تھا، ایک محتاط اندازہ کے مطابق تیس ہزار سے زائد فرزندانِ توحید شریک اجلاس ہوئے اور پورے اطمینان وسکون و دلجمعی کے ساتھ اخیر تک اجلاس کی کارروائی سماعت کرتے رہے، اجلاس کی صدارت حضرت مولانا ریاض احمد فیض آبادی مہتمم مدرسہ ریاض العلوم ہبلی وصدر جمعیۃ علمائے کرناٹک نے فرمائی اور مندرجہ ذیل حضرات نے اپنے اپنے انداز سے رد قادیانیت پر بصیرت افروز تقریریں فرمائیں۔

حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی ؛ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی ؛ حضرت مولانا عبد العلیم صاحب فاروقی

جناب مولانا محمد طاہر صاحب گیاوی ؛ راقم الحروف محمد عثمان منصور پوری

جناب مولانا عبد المتین میمن جوناگڈھی امیر جماعت اہل حدیث کرناٹک

جناب مولانا عبد الحفیظ صاحب جنیدی خطیب و امام جمعہ مسجد شکر بنگلور

جناب مولانا قدیر احمد صاحب اوالآمری خطیب و امام مسجد محمودیہ بنگلور

جناب مولانا احمد اللہ خاں صاحب مظہر صدیقی خطیب و امام مسجد بارلائن بنگلور ناظم اعلیٰ سنی جمعیۃ علماء

اخیر میں حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کے مختصر صدارتی کلمات اور دعا پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

اجلاس میں کیمپ میں منظور شدہ مندرجہ ذیل اہم تجاویز پڑھ کر سنائی گئیں جن کی

تائید تمام حاضرین نے کی۔

(۱) مدارس عربیہ کے ذمہ دار و اساتذہ حضرات مہینہ میں ایک روز رد قادیانیت کے لئے مخصوص فرمائیں
(۲) اساتذۂ کرام پروگرام بنا کر آس پاس کے مواضعات میں جاکر مساجد میں عوام کو قادیانی فتنہ کی حقیقت سمجھائیں اور بتلائیں کہ ختم نبوت کا عقیدہ بنیادی عقیدہ ہے۔
(۳) مدرسہ میں رد قادیانیت کی کتابیں مہیا ہونی چاہئے مکتبہ دارالعلوم دیوبند وغیرہ سے منگوائی جاسکتی ہیں۔
(۴) مجلس تحفظ ختم نبوت کرناٹک کا باضابطہ ایک دفتر قائم ہونا چاہئے جس میں ضروری کتابیں جمع کی جائیں اور اس کی شاخیں ہر ضلع میں ہونی چاہئے۔
(۵) دفتر کی جانب سے ایک مبلغ مقرر کیا جائے۔
(۶) مجلس کے ممبران ہر تین ماہ میں صوبہ کے ان علاقوں کا ضرور دورہ کریں جہاں قادیانیت کا فتنہ تیزی سے پھیل رہا ہے۔
(۷) ائمہ مساجد کو مجلس کے ساتھ مربوط کیا جائے اور ان حضرات سے گذارش کی جائے کہ وہ خصوصاً جمعہ کی تقریروں اور عموماً دیگر بیانات میں اس موضوع پر روشنی ڈالتے رہیں اور ائمہ مساجد عوام کو قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں سے باخبر کریں۔
(۸) مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقوں کے لئے بھی وقتاً فوقتاً رد قادیانیت پروگرام رکھے جائیں
(۹) جو حضرات علماء کرام رد قادیانیت پر معلومات و مہارت رکھتے ہیں ان کی تشکیل کی جائے اور معلوم کیا جائے کہ ہر ماہ وہ حضرات کتنا وقت اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے مجلس کے پروگرام کے تحت عنایت کریں گے۔
(۱۰) دفتر کی ذمہ داری ہوگی کہ ہر علاقہ میں قادیانیوں کا سروے کرے اور ان کی سرگرمیوں کی رپورٹ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کو بھیجتا رہے اور اس کی ایک کاپی مقامی دفتر میں رکھی جائے۔
(۱۱) شادی بیاہ اور دیگر سماجی تقریبات میں قادیانیوں سے مکمل قطع تعلق کیا جائے اور مسلمانوں کے قبرستانوں میں قادیانیوں کو دفن ہونے سے روکا جائے۔

(۱۲) مجلس کی طرف سے اردو، ہندی، انگریزی اور مقامی زبان میں حسب ضرورت پمفلٹ کتابچے شائع کئے جائیں۔

(۱۳) ہر تین ماہ پر مرکزی دفتر کی توسط سے کسی شخصیت کو دعوت دی جائے۔

قادیانی گروہ کی سازش اور ناکامی

منتظمین کی بھرپور تیاری اور قادیانی فریب کو بے نقاب ہوتا دیکھ کر بنگلور کے قادیانی گروہ نے پولس کمشنر کے سامنے نقض امن کا ہوا کھڑا کرکے چھوٹے میدان کے اجلاس عام کی اجازت دو روز قبل منسوخ کرادی مگر منتظمین کے بروقت اقدام اور مبنی برحقیقت وضاحتوں سے مطمئن ہوکر مقامی انتظامیہ نے اسی روز دوبارہ نہ صرف یہ کہ اجلاس عام کی اجازت دی بلکہ اس بات کی بھی ذمہ داری لی کہ قادیانی لوگ اجلاس کے پروگرام میں کسی قسم کی رخنہ اندازی نہیں کرسکیں گے۔ چنانچہ اجلاس کے جملہ پروگرام انتہائی پرسکون اور سنجیدگی کے ماحول میں پایۂ تکمیل کو پہونچے فللہ الحمد والمنۃ۔

ارکان مجلس تحفظ ختم نبوت وجمعیۃ علماء کرناٹک ومجلس استقبالیہ و دیگر احباب نے بنگلور کے تربیتی کیمپ وا جلاس عام ومساجد کے پروگراموں کو کامیاب کرنے اور مہمانوں کی خاطر خواہ ضیافت وراحت رسانی میں شب و روز جو انتھک جدوجہد فرمائی وہ قابلِ رشک اور قابلِ تقلید ہے۔ فجزاہم اللہ تعالیٰ۔ بنگلور کے اخبارات پاسبان وسالار، خوبصورت نے مذکورہ پروگراموں کی خبریں اور مضامین تفصیل کے ساتھ شائع کئے۔

خداوندکریم ان تمام حضرات کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور ہر مسلمان کو قادیانی فتنہ کے شر سے محفوظ رکھے، آمین۔

افادات مولانا سندھیؒ — حبیب الرحمٰن قاسمی
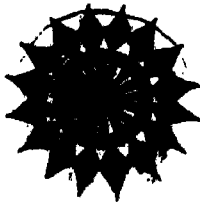
تشکیل جماعت میں شاہ عبدالرحیم کا اثر

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی علمی نشوونما اس اسلامی سوسائٹی میں ہوتی تھی جسے سلطان عالمگیرؒ نے اپنے عہد میں برپا کیا تھا۔ مزید برآں وہ اپنے نانا شیخ رفیع الدین بن قطب العالم بن شیخ عبدالعزیز شکربار جونپوری دہلوی کے خصوصی علوم و معارف سے بھی مستفید تھے جو انھیں بطور توارث کے حاصل ہوئے تھے۔[1]

---

[1] شاہ صاحب اپنے والد ماجد کے حوالے سے لکھتے ہیں: می فرمودند کہ شیخ رفیع الدین نے اپنے آخری ایام حیات میں ایک دن اپنا تمام اثاث بیت جمع کیا اور اپنے وارثوں میں تقسیم کردیا اور اولاد میں سے ہر ایک کو اس کے حسب حال دیا، جب سب سے چھوٹی اولاد (یعنی والدہ شاہ عبدالرحیم) کی باری آئی تو انھیں فوائد طریقت پر مشتمل ایک مختصر سا رسالہ اور اوراد مشائخ کرام کا شجرہ عنایت فرمایا، شیخ رفیع الدین کی رفیقۂ حیات نے عرض کیا، یہ بچی غیر شادی شدہ ہے اسے نکاح سے متعلق سامان دینا چاہیے نہ کہ یہ تصوف کے رسائل۔ فرمایا، یہ رسائل ہمیں اپنے بزرگوں سے میراث میں ملے ہیں، اس بچی کے بطن سے اس میراث معنوی کا مستحق ایک بچہ پیدا ہوگا میں نے یہ روحانی میراث اسی کے لئے دی ہے، رہے اسباب نکاح تو اللہ تعالیٰ اسے آسان کردیگا ہمیں اس کی فکر نہیں عرصۂ دراز کے بعد جب میں (شاہ عبدالرحیم) پیدا ہوا اور ہوشیار ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے ہماری نانی کے دل میں بات ڈالدی اور انھوں نے یہ رسائل مجھے دیدیئے (انفاس العارفین مجتبائی ۱۳۳۵ھ، ص ۴)

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ تعلیم و تدریس اور ارشاد و تلقین میں اپنا ایک خاص نظریہ و اسلوب رکھتے تھے اور یہ امر اہل نظر علماء کے نزدیک محقق ہے کہ شاہ عبدالرحیمؒ کی وہ مردم ساز شخصیت ہے جس نے شاہ ولی اللہ کے قلب و دماغ میں اس تحقیق و تجدید کی تخم ریزی کی جس کے وہ بعد میں چل کر داعی بنے۔

دعوت ولی اللّٰہی کے اصول

شاہ ولی اللہ کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بنیادی اصول جن پر دعوت ولی اللّٰہی کی عمارت قائم ہے چار ہیں (۱) تدبر فی القرآن[۱] جس کے اصول وضوابط انھوں نے اپنی مختصر مگر کثیر النفع تصنیف "الفوز الکبیر" میں بیان کر دیئے ہیں جو درحقیقت شاہ عبدالرحیم کے فیض تعلیم و تربیت کے نتائج ہیں، خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اپنے والد ماجد کے تذکرہ "بوارق الولایۃ" میں لکھتے ہیں: "آپ کا وظیفہ تھا کہ نوافل تہجد ..... اشراق اور چاشت کے علاوہ نماز مغرب کے بعد والدین اور بڑے بھائی کی ارواح کو ایصال ثواب کے لئے بھی دو رکعت پڑھتے تھے، اگر کوئی معذوری نہ ہوتی تو ہمیشہ تلاوت قرآن میں مشغول رہتے ..... روزانہ تلاوت کے علاوہ دوستوں میں ترجمہ وتفسیر کے ساتھ بھی دو تین رکوع پڑھتے تھے[۲] الخ

اور اپنے خود نوشت حالات میں لکھتے ہیں اور والد ماجد کی زیرنگرانی چند بار معانی شان نزول اور کتب تفسیر کی مراجعت سے قرآن حکیم میں تدبر حاصل کرنے کا موقعہ ملا اس طریقۂ تعلیم سے فہم قرآن کا باب عظیم مجھ پر کھل گیا۔[۳]

شاہ صاحب نے تدبر کے ساتھ قرآن کی تلاوت کو اپنی زندگی کا وظیفہ بنا لیا تھا اور اپنے اس طریقہ کو رواج دینے کی غرض سے "فتح الرحمٰن" کے نام سے اس وقت کی رائج زبان فارسی

---

(۱) تدبر فی القرآن کا طریقہ شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامہ میں بتایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابتداء میں ترجمہ وتفسیر کے بغیر قرآن پڑھے اگر نحو یا شان نزول کا کوئی مشکل مسئلہ آجائے تو ٹھہر کر اس پر غور وفکر کرے جب اس طرح قرآن کے مطالعہ سے فراغت ہو جائے پھر تفسیر جلالین پڑھے قرآن کے مطالعہ کا یہ طریقہ نہایت مفید ہے۔

(۲) انفاس العارفین، مجتبائی، ص ۸۶۔ (۳) الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف مشمولہ انفاس العارفین، ص ۲۰۳۔ مجتبائی ۱۳۳۵۔

میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور ضروری حواشی بھی تحریر کئے، بعد میں ان کے صاجزادوں حضرت شاہ عبدالعزیز نے تفسیر فتح العزیز اور شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالقادر نے اپنے اپنے تراجم قرآن کے ذریعہ اس کام کو آگے بڑھایا اور امت کے سامنے قرآن فہمی کی ایک ——— وسیع شاہراہ کھولدی، آئندہ چل کر جس قدر بھی قرآن کے تراجم ہوئے سب کا اصل ماخذ شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالقادر ہی کے تراجم ہیں۔

(۲) احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق میں سعی بلیغ اور حدیث و فقہ میں تطبیق کیساتھ عمل میں صریح حدیث کی ترجیح۔

اس اصل میں بھی شاہ صاحب اپنے والد ہی کے متبع ہیں، چنانچہ بوارق میں لکھتے ہیں
مخفی نماند کہ حضرت ایشاں در اکثر امور موافق فقہ حنفی عمل می کرد الا بعض چیزہا کہ بحسب حدیث یا وجدان بمذہب دیگر ترجیح می یافتند ازاں جملہ آں است کہ در اقتدام سورۂ فاتحہ می خواندند و در نماز جنازہ نیز۔[1]

واضح رہے کہ حضرت والد ماجد اکثر مسائل میں فقہ حنفی کے مطابق عمل کرتے تھے مگر بعض مسائل میں حدیث یا وجدان کی رو سے دوسرے مذہب کو ترجیح دیتے تھے، ان مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ خلف الامام سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے اور نماز جنازہ میں بھی اس کی قرأت کرتے تھے۔

اور خود اپنے رجحان کے بارے میں لکھتے ہیں: بعد از وفات ایشاں دوازدہ سال کم و بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ مواظبت نمودہ در ہر علمے خوض واقع شد...... و بعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ و اصول فقہ ایشاں و احادیثے کہ تمسک ایشاں است قرار داد خاطر بمدد نور غیبی روش فقہاء محدثین افتاد۔[2]

والد ماجد کی وفات کے بعد کم و بیش بارہ سال تک علوم دینی و عقلی کی تدریس میں مشغول رہا، اور ہر فن میں غور و خوض کیا۔ ...... مذاہب اربعہ اور ان کے اصول کی کتابوں کے مطالعہ نیز ان احادیث کے ملاحظہ کے بعد جن سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں بتائید نور غیبی،

---

[1] بوارق مشمولہ انفاس العارفین مجتبائی ص ۰۰۔ [2] الجزء اللطیف مشمولہ انفاس العارفین ص ۲۰۲ مجتبائی

فقہاء محدثین کے طریقہ پر چلنے کی بات دل میں بیٹھ گئی۔[1]

(۳) جمع بین العلم والتصوف، یعنی علم وعمل دونوں میں جامعیت پیدا کرنا، یہ طریقہ بھی شاہ صاحب نے اپنے والد محترم ہی سے اخذ کیا ہے، چنانچہ القول الجمیل میں لکھتے ہیں۔

فالعبد الضعیف ولی اللہ عفی عنہ ...... صحب اباہ الشیخ الاجل عبد الرحیم رضی اللہ عنہ وارضاہ دھرا طویلا وتعلم منہ العلوم الظاھرۃ وتأدب بآداب الطریقۃ ورأی منہ الکرامات وسئال عن المشکلات وسمع منہ کثیرا من فوائد الطریقۃ والحقیقۃ۔الخ

بندۂ ضعیف ولی اللہ اپنے والد بزرگ شیخ عبدالرحیم کی صحبت میں زمانۂ دراز تک رہا اور ان سے علوم ظاہری اور طریقت کے آداب سیکھے، ان کی کرامتیں دیکھیں مشکل مسائل کو حل کیا اور طریقت وحقیقت کے بہت سے فوائد سنے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم قدس سرہٗ نے ایک مکتوب میں اپنے اصول طریقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اصول پنجگانہ کہ ایں حقیر را عنایت فرمودہ اند درادائے آں صرف ہمت باید نمود دوام الذکر والتقویٰ علیٰ کل حال وایصال النفع للخلق من غیر تفرقۃ و عدم تفضیل نفسہ علی احد من خلق اللہ

---

[1] شاہ صاحب اپنی ایک دوسری کتاب "فیوض الحرمین" میں لکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حنفی مذہب کا ایک ایسا عمدہ طریقہ بتایا جو ان حدیثوں سے جن کو بخاری اور ان کے ساتھیوں نے جمع کیا اور ان کی جانچ پڑتال کی سے زیادہ قریب ہے اور وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد ان تینوں کے اقوال میں سے وہ قول قبول کیا جائے جو حدیث سے زیادہ قریب ہو اور ان کے بعد حنفی فقہاء میں سے ان کی بات تسلیم کی جائے جو فقہ کے ساتھ ساتھ حدیث کے بھی عالم ہوں، یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی خاموش رہے ہوں اور حدیث نے اس کی صراحت کردی ہو تو ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو قبول کر لیا جائے اور یہ طریقہ بھی مذہب حنفی میں شامل ہے الخ ۴۸
اسی کتاب کے ص ۶۲ پر فرماتے ہیں: "پھر مجھ پر ایک اور فیضان ہوا، مجھے بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کے شیرازہ کو جمع کرے اس لئے تمہیں چاہئے کہ قرۃ عاشت علی اپنی قوم کی کبھی مخالفت نہ کرو، اگر تم اس طرح مخالفت کروگے تو گویا اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو جاؤ گے"۔
(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ ص ۔۔۔)

والتواضع لامراللہ و بخلق اللہ۔ والسلام۔

پانچوں اصول جو بندہ کو عنایت ہوئے ہیں ان کی ادائیگی میں پوری کوشش صرف کیجیے۔
(الف) دوام ذکر (ب) دوام تقویٰ (ج) بغیر کسی فرق و امتیاز کے خلق خدا کو نفع پہونچانا (د) اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق سے اپنے آپ کو بہتر نہ سمجھنا (ہ) اللہ کے احکام اور اس کی مخلوق کے ساتھ تواضع وانکساری کا معاملہ کرنا۔

(۴) جمع بین علوم الشریعہ و بین الحکمۃ العملیۃ ،۔ یعنی احکام شریعت اور آداب معاشرت (خواہ اس کا تعلق تہذیب اخلاق سے ہو یا تدبیر منزل سے یا شہری و ملکی سیاست سے ہو) کے درمیان جمع و تطبیق اور دونوں کے مقتضیٰ پر عمل کرنا۔ بوارق الولایۃ میں لکھتے ہیں، حضرت ایشاں ایں فقیر را در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیاری آموختند۔ حضرت والد ماجد اس فقیر کو اپنی مجلس اور صحبت میں حکمت عملی اور آداب معاملہ کی تعلیم بہت دیتے تھے (ان کی کچھ مثالیں جو ان کے حافظہ میں رہ گئی تھیں شاہ صاحب نے بوارق میں تحریر کی ہیں جو انتہائی کارآمد اور مفید ہیں انشاء اللہ کسی موقع پر ان کا ترجمہ پیش کیا جائے گا۔)

اور اپنے خود نوشت تذکرہ الجزء اللطیف میں لکھتے ہیں "حکمت عملی کہ صلاح ایں دورہ در آں است بوسعتے تمام افادہ نمودند و توفیق و تشیید آں بکتاب وسنت و آثار صحابہ دادند" حکمت عملی جس سے اس عہد کی اصلاح وابستہ ہے پورے طور پر مجھے عطا کی گئی اور کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے اس کو مستحکم کرنے کی توفیق مرحمت ہوئی[1]

---

[1] یہی اصول چہارگانہ وہ بنیادی ستون ہیں جن پر امام ولی اللہ کی احیاء ملت یا بالفاظ دیگر دینی سیاسی تحریک کی عمارت قائم ہے۔ حضرت شاہ صاحب حرمین شریفین سے فک کل نظام (یعنی ہمہ گیر تبدیلی اور مکمل انقلاب کا داعیہ لیکر ہندوستان لوٹے تھے۔ ظاہر ہے اس وقت کا شاہی نظام اور اس کے ہوا خواہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور زبوں حالیوں کے باوجود شاہ صاحب کے نعرۂ انقلاب کو برداشت نہیں کرسکتا تھا اسلئے انھوں نے اپنے انقلابی نظریہ کو کبھی ترجمہ قرآن کے رنگ میں پیش کیا کبھی تصوف اور اسلامی فلسفہ کے دامن میں چھپایا کہیں نصیحت و موعظت کے پیرایہ میں ادا کیا اور کہیں اس کو تاریخ اسلام اور اسوۂ صحابہ کے لباس میں پیش کیا۔ فتح الرحمٰن، حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ، فیوض الحرمین، تفہیمات الٰہیہ اور ازالۃ الخفاء کا مطالعہ اس حقیقت کو بالکل منکشف کردیگا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ ولی اللّٰہی کی تشکیل و تاسیس میں حضرت شاہ عبدالرحیم قدس سرہٗ کی تعلیم و تربیت اور ارشاد و تلقین کو نشانِ منزل کی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم ایک بلند پایہ عالم دین، بالغ نظر فقیہ اور روشن ضمیر صوفی تھے، ان کی عقابی نگاہوں کے سامنے مستقبل، حال کی طرح نمایاں تھا، جس کی اصلاح و درستگی کے لئے انھوں نے ایک خاکہ مرتب کر لیا تھا جس میں رنگ بھرنے کے لئے انھوں نے اپنے ہونہار اور لائق ترین فرزند کو تیار کرنے کی کامیاب کوشش کی، مدرسہ رحیمیہ کے قیام اور اس کے نظامِ تعلیم و تربیت کی تاریخ پر جن حضرات کی نظر ہے وہ اس حقیقت کی تائید کئے بغیر نہیں رہ سکتے اس لئے بغیر کسی تردد کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ "جماعت ولی اللّٰہی کی تاسیس کا خاکہ بارہویں صدی کی ابتداء ہی میں مرتب ہو گیا تھا۔

تحقیق و تجدید کا آغاز

اللہ تعالیٰ نے امام ولی اللہ کو جادۂ قویمہ[1] کی تعیین کی توفیق بخشی اور مذہب حنفی کی تجدید و اصلاح کی قوت عطا فرمائی، چنانچہ انھوں نے فتاویٰ عالمگیری میں مرتب فتاویٰ کی احادیث موطا سے تطبیق کا کام شروع کیا، اسی سلسلہ میں مسوّیٰ شرح موطا کی تالیف عمل میں آئی بعد میں اس فن کی تکمیل و ترویج سراج الہند مجدد مائۃ ثالثہ عشر (تیرہویں صدی ہجری) امام عبدالعزیز کے ہاتھوں ہوئی جو امام ولی اللہ کے خلف اکبر اور ارشد تلامذہ میں سے تھے، پھر عام اہل ہند اسی فقہ مہذب کی جانب متوجہ ہو گئے۔

جماعت سازی میں شاہ عبدالعزیز کا کردار

تحریک ولی اللّٰہی میں سراج الہند شاہ عبدالعزیز کی وہی حیثیت ہے جو حنفی مسلک میں امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کی ہے، امام عبدالعزیز کا یہی ایک

---

[1] جادۂ قویمہ کی تحقیق و تنقیح کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی تصانیف مثلاً التفہیمات الالٰہیہ، المسوّیٰ شرح موطا، ازالۃ الخفاء وغیرہ میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ نص قرآنی، احادیث صحیحہ مشہورہ اجماع اور قیاس جلی سے اخذ کردہ احکام پر عمل کرنے کا نام شاہ صاحب کی اصطلاح میں جادۂ قویمہ ہے بعد میں حضرت شاہ صاحب کے منتسبین میں یہ اصطلاح طریقۂ محمدیہ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی تفصیل کے لئے مواقع المسترشدین مشمولہ التعریف ائمۃ التجدید ص ۳،۷ تا ۸،۷ دیکھئے۔

کارنامہ نہیں ہے کہ ولی اللّٰہی تحریک جو اعلیٰ طبقہ تک محدود تھی اسے سہل الحصول بنا کر مقبول خاص و عام بنا دیا بلکہ اسی کے ساتھ نوجوان علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جس نے تحریک کے مقاصد کو بروئے کار لانے میں تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں، جن میں مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی، مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی، مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، مولانا سید احمد شہید بریلوی اور مولانا محمد یعقوب دہلوی بطور خاص قابل ذکر ہیں، اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہ صرف ایک علمی جماعت ہی نہیں تھی بلکہ ایک سیاسی پارٹی بھی تھی، اس لئے کہ ملکی حالات کے مطابق حکمت عملی میں غور و فکر اور منصوبہ بندی بھی ان کے علم و فقہ کا ایک جزء تھی، یہی وہ جماعت ہے جسے ہم "حزب ولی اللّٰہی" ولی اللّٰہی جماعت کا نام دیتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ

ایرانی و تورانی (شیعہ و سنی) امراء کے حصول اقتدار میں بیجا مسابقت اور باہمی نزاع کی بناء پر سلطان شاہ عالم اوّل کے عہد میں دارالسلطنت دہلی میں جس فتنہ و فساد کا آغاز ہوا تھا وہ سلطان عالمگیر ثانی کے دور تک برابر بڑھتا رہا جس کے نتیجہ میں حکومت دہلی کمزور سے کمزور تر اور مراٹھوں و انگریزوں کی طاقت بڑھتی گئی تا آنکہ ۱۲۱۸ھ میں وہ دن بھی آگیا کہ "سلطان شاہ عالم ثانی" کی نصرت و مدد کے بہانے انگریز تاجر دہلی پر قابض ہو گئے۔ اس جدید صورت حال کے پیش نظر حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ نے فتویٰ جاری فرمایا کہ "اب ہندوستان دارالحرب ہو گیا" جس کی مسلمانوں کے اس طبقہ نے جو ولی اللّٰہی جماعت کے سیاسی نظریات کو پسند نہیں کرتا تھا مخالفت کی، حالانکہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے فتویٰ کا حاصل صرف یہ تھا کہ امرائے اسلام دشمن کے مقابلہ سے عاجز ہو چکے ہیں اس لئے اب عامۃ المسلمین پر دشمن کی مدافعت لازم ہو گئی ہے، لیکن اس مفہوم کو وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو حکمت عملی کے ماہر اور فلسفۂ سیاست کے عارف ہوں

جماعت کی سرگرمیاں

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے فتویٰ کے بعد ولی اللّٰہی جماعت نے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے متعین کردہ

اصول وضوابط کی روشنی میں اپنی ملی وسیاسی سرگرمیوں کو تیز کردیا بالخصوص حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے درس وارشاد اور وعظوں کے ذریعہ اس کے حلقۂ اثر کو بہت وسیع بنا دیا، اور اس میں عمومیت کی شان پیدا کردی، حتی کہ یہ ملی تنظیم حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کی وفات کے قریب اقدام کے قابل ہوگئی، اور انھیں کے مقرر کردہ خطوط کے مطابق حضرت سید احمد شہید خلیفہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور حضرت مولانا عبدالحی بڈھانوی کے زیر قیادت دہلی سے کوچ کرکے علاقہ سرحد کو اپنی سرگرمیوں کی جولانگاہ بنایا، اور اپنے دعاۃ سندھ، قندھار وکابل وغیرہ میں پھیلا دیئے۔

عارضی حکومت کا قیام

مجاہدین کی اس جماعت نے ۱۴ رجمادی الثانی ۱۲۴۲ھ میں اپنی ایک موقتہ حکومت (عارضی حکومت) قائم کرلی تھی، جس میں حضرت سید احمد شہید امیر اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید ومولانا عبدالحی بڈھانوی برابر درجے کے وزیر تھے، حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی امیر کے نائب کی حیثیت سے دہلی مرکز میں مقیم رہے، اور یہیں سے حکومت موقتہ (عارضی حکومت) کی مالی وجانی امداد کرتے رہے، یہ حکومت چار سال تک قائم رہی، اس مدت میں اس نے بلاد افاغنہ اور سارے ہندوستان میں شریعت اسلامی کے نفاذ اور جادۂ قویمہ کی ترویج میں انتہائی کوشش کی اور مقابل سے جنگ میں فتح وہزیمت سے دوچار ہوتے ہوئے آگے ہی بڑھتی رہی، یہاں تک کہ پشاور کے اکثر حصے اس کے زیر تصرف آگئے، اسی دوران یعنی قیام حکومت کے دوسرے سال حکومت کے وزیر اور اہم ترین رکن مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی وفات پاگئے اور پنجتار کے متصل قریہ "خار" میں مدفون ہوئے، بعد میں مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی کی خالی جگہ کو مولانا محمد حسن[1] رامپوری (رام پور منیہاران ضلع مظفر نگر یوپی) کے ذریعہ پُر کیا گیا۔

---

[1] مولانا محمد حسن رحمہ اللہ رام پور منیہاران ضلع مظفر نگر کے تھے، مولانا شاہ اسماعیل شہید اور مفتی الٰہی بخش کاندھلوی سے علم کی تکمیل کی، دوران جہاد انتہائی سادگی سے زندگی گذاری حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کے بعد لشکر مجاہدین میں عجز، علم، خاکساری اور قابلیت کے لحاظ سے مولانا محمد حسن جیسا کوئی نہ تھا۔ (جماعت مجاہدین ۲۷۹، غلام رسول مہر)

انگریزوں کی دسیسہ کاری اور حکومت مؤقتہ کا سقوط

حکومت مؤقتہ (عارضی حکومت) کے بڑھتے ہوئے قدم اور روز افزوں ترقیوں سے انگریز تاجروں کو تشویش ہوئی، راستے کی اس رکاوٹ کو دور کرنے کے واسطے انھوں نے اپنا قومی حربہ اختیار کیا یعنی افاغنہ اور مجاہدین میں اختلاف پیدا کرادیا، انگریزوں نے یہ کام خود مسلمانوں ہی کی اس جماعت سے لیا جو سیاسی نظریہ میں ولی اللّٰہی جماعت کے مخالف تھی ان لوگوں نے دین کے نام پر ملت میں افتراق وانتشار پیدا کردیا جس کے نتیجہ میں مجاہدین کی قوت کمزور ہوگئی بالخصوص جمادی الثانی ۱۲۴۶ھ میں اسی سازش کے تحت جب افغانیوں نے شہر و قصبات میں مقرر حکومت مؤقتہ (عارضی حکومت) کے قاضیوں اور داعیوں کو ایک ہی رات میں دھوکے سے قتل کر ڈالا[1] اس انتہائی غمناک حادثہ کے چار ماہ بعد بالاکوٹ کے میدان میں امیر المجاہدین حضرت سید احمد بریلوی وزیر اعظم مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی اور دیگر اساطین جماعت کی شہادت نے سارا قصہ ہی ختم کردیا

مولانا سید نصیر الدین دہلوی کی امارت

اس حادثۂ عظمیٰ کے بعد بچے کھچے مجاہدین نے منتشر رفقاء کو اکٹھا کرکے اپنی ایک جمعیت قائم کرلی مگر اس جمعیت کا باقاعدہ کوئی امیر نہیں تھا اس لئے حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ کے حکم سے مولانا سید نصیر الدین دہلوی[2] مجاہدین کی ایک بڑی جماعت اپنے ہمراہ لے کر سنہ ۱۲۵۰ھ میں دہلی سے روانہ ہوئے اور سندھ میں کچھ دنوں قیام کرنے

---

[1] حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی لکھتے ہیں "یہ حقیقت ہے کہ انگریزی ڈپلومیسی نے وہابیت کا الزام تراش کر وہ نقصان پہونچایا کہ نہ سکھوں کی ٹڈی دل وہ نقصان پہنچا سکی اور نہ یار محمد خاں وغیرہ پٹھانوں کی مسلح طاقت یہ کام کرسکی جو اس پروپیگنڈے نے کیا کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں سید صاحب کے غازیوں کے بڑے حصہ کو ایک ہی رات میں ذبح کرادیا (شاندار ماضی ج ۲ ص ۲۱۵)

[2] مولانا سید نصیر الدین بن نجم الدین الحسینی السونی پتی الدہلوی۔ حضرت شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نواسہ اور حضرت شاہ محمد اسحاق کے تلمیذ خاص اور داماد تھے نیز سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور شیخ مولانا شاہ محمد آفاق کے خلیفہ تھے، ۱۲۵۶ھ میں سستھانہ میں آپ کی وفات ہوئی، سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کو مولانا سید نصیر الدین سے شرف تلمذ و استفادہ حاصل تھا، تفصیل کیلئے

حضرت سید شہید بریلوی کے خاص اصحاب میں تھے، سید صاحب نے انھیں حیدرآباد، بمبئی وغیرہ کا داعی ونقیب مقرر کیا تھا، اس علاقہ میں انھوں نے قابل قدر خدمات انجام دی تھیں اور اس اطراف کے لوگ ان سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔

مرکز کی تبدیلی حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی اور ان کے اصحاب ومتوسلین ۱۲۵۸ھ تک مرکز دہلی میں مصروف جہد وعمل رہے مگر جماعت ولی اللٰہی کے درمیان اختلاف کے ختم کرنے میں کامیابی نہ مل سکی، علاوہ ازیں انگریزوں کی جانب سے دن بدن نگرانی بڑھتی رہی اور کام کرنا مشکل ہوگیا تو اپنے بھائی مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی کے ساتھ ۱۲۵۸ھ (یعنی واقعہ بالاکوٹ کے گیارہ سال بعد) مکہ معظمہ ہجرت کرگئے تاکہ بیرونی طاقت کی امداد کے ذریعہ ہندوستان کی اندرونی تحریک کو امداد بہم پہنچائیں، مکہ معظمہ ہی میں ۱۲۶۲ھ میں آپ کی وفات ہوگئی اور ان کی جگہ پر تحریک کا کام مولانا محمد یعقوب صاحب نے سنبھال لیا۔

جماعت تقسیم ہوگئی شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی کی وفات کے بعد ولی اللٰہی جماعت باقاعدہ دو حصوں دہلوی جماعت اور صادقپوری جماعت میں تقسیم ہوگئی، شیخ احمد سعید مجددی اور ان کے برادر خورد شیخ عبدالغنی مجددی جو علی الترتیب

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) گارا بنانا آپ کے شوق کے کام ہوگئے تھے، سید صاحب نے جب صوبہ سرحد کا قصد کیا تو مولانا ولایت علی ہمرکاب تھے، جب آزاد قبائل میں مرکز قائم کیا گیا تو مولانا ولایت علی سفارت کابل کے لئے نامزد کئے گئے، کابل کی سفارت سے واپسی کے بعد آپ کو حیدرآباد تحریک کی دعوت کے کام پر بھیجدیا گیا، حیدرآباد سے بمبئی پہونچے اور وہاں ابھی پوری طرح بساطِ عمل بچھانے نہیں پائے تھے کہ بالاکوٹ کا دردانگیز سانحہ پیش آگیا، چونکہ حادثہ بالاکوٹ کے وقت وہاں موجود نہ تھے اس لئے یہ بھی حضرت سید صاحب کی غیبوبت کے قائل ہوگئے تھے، اور اپنا الگ مرکز صادق پور پٹنہ میں قائم کرلیا تھا، اس مرکز کے مستحکم ہوجانے کے بعد آپ نے بنگال کا سفر کیا پھر وہاں سے براہ بمبئی مع اہل وعیال مکہ معظمہ گئے اور حج سے فراغت کے بعد یمن، نجد، عسیر، حضرموت، نجد وغیرہ کا دورہ کیا، اس سفر میں یمن کے مشہور زیدی عالم قاضی محمد بن علی شوکانی سے سند حدیث حاصل کی اور ان کی چند تصنیفات ساتھ لائے، حج سے واپسی کے بعد سرحد میں مجاہدین کی قیادت کو سنبھالا مگر ابھی قتال وجدال کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا کہ ۱۲۶۹ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں آپ کی وفات ہوگئی۔

کے بعد ستھانہ پہنچ گئے جو اس وقت حضرت سید احمد شہیدؒ کے رفقاء کا مرکز تھا، مولانا سید نصیرالدین کے یہاں پہونچنے پر مجاہدین نے انھیں اپنا امیر منتخب کرلیا اور ان کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی۔

جماعت ولی اللّٰہی میں اختلاف

بالاکوٹ کے شہدا میں امیرالمؤمنین سید احمد شہید کی نعش تلاش بسیار کے باوجود مجاہدین کو نہیں ملی اس بناء پر ان میں ایک فکری اختلاف رونما ہوگیا اور جماعت دو حصوں میں بٹ گئی، ارباب حل و عقد و صاحب فہم و بصیرت کو حضرت امیر کی شہادت پر یقین تھا مگر مجاہدین کا ایک طبقہ اس بات کو ماننے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں تھا، انھیں اصرار تھا کہ سید صاحب روپوش ہوگئے ہیں، مناسب وقت پر ظاہر ہوکر کفار ملحدین سے جنگ کریں گے، امیر ثانی مولانا سید نصیرالدین دہلوی نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے۔

جماعت مجاہدین کا یہ فکری اختلاف میدان جہاد تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ بلاد ہند میں پھیلے ہوئے ان کے اعوان و انصار بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، دہلی مرکز میں مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی اور ان کے وابستگان عقیدۂ شہادت کے قائل تھے جب کہ ان کے بالمقابل مولانا امیر ولایت علی[1] صادق پوری امیر کی غیبوبت پر اعتقاد رکھتے تھے، مولانا امیر ولایت علی

---

[1] مولانا ولایت علی صوبہ بہار کے ایک معزز و با اثر خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ کے دادا احمد علی "اردل" کے قاضی (جج) تھے (اردل اب ضلع گیا کا ایک قصبہ ہے) اور نانا رفیع الدین حسن خاں جن کے آغوش تربیت میں آپ پروان چڑھے صوبہ بہار کے ناظم یعنی گورنر تھے۔ اپنے والد مولوی فتح علی سے بارہ برس کی عمر میں مختصرات سے فراغت حاصل کی، بعد ازاں مولوی محمد اشرف لکھنوی استاد معقول و منقول کی خدمت میں چار سال رہ کر بڑی کتابیں پڑھیں، اسی زمانہ میں حضرت سید احمد شہید کا قافلہ لکھنو وارد ہوا اور سید صاحب کے وعظ سے متاثر ہوکر مولانا ولایت علی سید صاحب کی جماعت سے متعلق ہوگئے۔ اور پٹنہ میں تحریک کا کام شروع کردیا، سید صاحب کی تحریک سے وابستگی کے بعد آپ کو اسوۂ نبی سے ایسا ذوق حاصل ہوا کہ اپنے ساتھیوں کی خدمت میں پیش پیش رہتے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا اپنی کھودنا (باقی حاشیہ صفحہ پر)

حضرت شاہ عبدالعزیز و شاہ محمد اسحاق کے تلامذہ میں سے تھے ہندوستان میں دہلوی جماعت کے مرجع وقائد تھے

جماعت دہلوی کی قیادت اور معاونین

امیر ثانی مولانا سید نصیر الدین دہلوی کی وفات کے ایک عرصہ بعد ان کے متوسل حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی نے حجاز مقدس میں حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کی خدمت میں دو سالہ قیام کے بعد حضرت شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق ہندوستان واپس آکر ۱۲۶۴ھ میں جماعت دہلوی کی زمام قیادت کو سنبھالا اور جماعت کو نئے سرے سے منظم کرنے کا کام شروع کیا تاکہ جہادی سرگرمیاں پھر سے زندہ کی جائیں، حضرت حاجی صاحب کے اس کام میں مولانا مملوک علی نانوتوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ رحمہم اللہ معاون وشریک رہے، اس جماعت کا اصل مرکز حجاز میں تھا اور حضرت شاہ محمد اسحاق کے برادر خورد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اس کے سربراہ اعلیٰ تھے۔

جماعت صادقپوری کا مرکز قیادت

جماعت صادقپوری کا مرکز صادق پور پٹنہ تھا، اور اس کی قیادت حضرت مولانا ولایت علی صادقپوری انجام دے رہے تھے، بہار واڑیسہ اور بنگال کے لوگ عام طور پر انھیں سے وابستہ تھے، ۱۲۴۸ھ میں مولانا صادقپوری نے اپنے مرکز صادقپور میں بیعت جہاد کی تجدید کے لئے لوگوں کو دعوت دی اور حضرت سید احمد شہید (جو ان کے عقیدہ کے لحاظ سے زندہ مگر غائب تھے) کے نائب کی حیثیت سے اپنی امارت کا اعلان کر دیا۔ قاضی شوکانی کے تلمیذ اور ان کے ہم مسلک وہم عقیدہ مولانا عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی بھی حضرت مولانا صادقپوری سے وابستہ ہو گئے، اس طرح یہ حضرات صادق پوری جماعت کی تنظیم کے لئے پورے طور پر سرگرم عمل ہو گئے، لیکن حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ کے پاس ولحاظ سے دہلی اور اس کے اطراف میں علانیہ اپنی دعوت نہیں دیتے تھے، حضرت شاہ صاحب کے ہجرت مکہ کے بعد اسی سال یعنی ۱۲۵۸ھ میں مولانا امیر ولایت علی نے اپنے بھائی امیر عنایت علی غازیؒ کو بونیر روانہ کیا جو حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے منتظرین کا مرکز تھا، اور حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ۱۲۶۲ھ میں خود بھی بونیر پہونچ گئے، اور بجائے مولانا امیر ولایت عنایت علی غازی

کے آپ مجاہدین کے امیر قرار پائے۔ مولانا ولایت علی رحمہ اللہ کو مجاہدین بونیر پر کامل اقتدار حاصل ہوجانے کے باوجود عملاً جہاد کا موقع نہ مل سکا، کیونکہ ابھی خاطر خواہ تیاری نہیں ہو سکی تھی علاوہ ازیں ان کی جماعت حضرت امیر شہید کی رجعت کے انتظار میں رہی کہ حضرت کی حاضری کے بعد معرکۂ کارزار گرم کیا جائیگا۔ بالآخر اسی تیاری و انتظار کی حالت میں مولانا کی ۱۲۶۹ھ میں وفات ہوگئی:

جماعت صادقپور کے دوسرے امیر اور ان کی سرگرمیاں

ان کے انتقال کے بعد مولانا امیر عنایت علی[1] غازی امیر منتخب ہوئے، آپ نے جیسے ہی زمام قیادت ہاتھ میں لی انگریزوں کے حلیف جہاں داد خاں والی انب پر چڑھائی کردی، آپ کا یہ حملہ کامیاب رہا، جہاں داد خاں کی قوت ٹوٹ گئی اور انگریزوں کو بار بار اس کی مدد کے لئے فوجیں بھیجنی پڑیں جو ناکام رہیں مگر افسوس کہ حالات نے مساعدت نہیں کی (الف) قدیمی وفادار اکثر ستھانہ کے لڑکے منحرف ہوگئے (ب) ۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی عام بغاوت نے امداد کے راستے بند کردیئے (ج) ۱۸۵۷ء کی جنگ حریت کے ناکام ہوجانے کے بعد انگریزی تازہ دم فوج نے مجاہدین پر حملہ کردیا اور انھیں پہاڑی علاقوں میں پسپا ہوجانے پر مجبور کردیا، انھیں حالات میں پیغام اجل آگیا، اور ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۷ء میں آپ دارِ آخرت کو کوچ کرگئے۔

جماعت صادقپور کی سیاسی سرگرمیوں کا محور حضرت امیر الشہید کی غیبت کا عقیدہ تھا، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یہ جماعت مخالفین کے ساتھ محاربہ میں کسی کے ساتھ اشتراک پر اس

---

[1] مولانا امیر عنایت علی صادق پوری کی ولادت آبائی وطن صادق پور پٹنہ میں ہوئی اور وہیں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت سید احمد شہید بریلوی سے وابستہ ہوگئے اور انھیں سے سلوک کی تربیت حاصل کی اور سید صاحبؒ ہی کے ہمراہ علاقہ سرحد کی جانب ہجرت کی اور جہاد و قتال میں سید صاحب کے معاون رہے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا امیر ولایت علی سے وابستہ ہوگئے۔ مولانا موصوف عالم و فاضل کے ساتھ نہایت جری و بہادر بھی تھے نیز فنون حرب کے بھی ماہر تھے۔ تفصیل کیلئے دیکھئے الدر المنثور۔

وقت تک کے لیے تیار نہیں تھی جب تک کہ امیر غائب کی رجعت و ظہور نہ ہو جائے۔ بایں ہمہ اس جماعت میں ایسے مجاہدین بھی تھے جو امیر کی غیبت کے اس لازمی نتیجہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور وہ دہلوی جماعت کے ساتھ اشتراک کی جانب مائل تھے۔

جماعت صادق پوری کے اکابر

جماعت صادق پور کے اکابر میں حضرت مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولانا عبدالحق زیدی بنارسی کے علاوہ مولانا سید نذیر حسین دہلوی بھی تھے جن کی تعلیم ابتداء سے متوسطات تک مولانا ولایت علی اور دیگر علماء صادق پور کے زیر درس ہوئی تھی، بعد ازاں ۱۲۴۲ھ میں دہلی آ کے حضرت شاہ محمد دہلویؒ کے تلامذہ سے اخذ و کسب کے بعد خود حضرت شاہ صاحب سے بھی استفادہ کیا۔

مولانا نذیر حسین اپنے عہد کے اذکیاء میں تھے علوم دینیہ کے ساتھ ادب و معقول میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے طریقہ پر مذہب حنفی کے پابند تھے اسی کے مطابق فتاویٰ بھی دیتے تھے، اور فتاویٰ عالمگیری انھیں اس طرح مستحضر تھی کہ گویا اسے سبقاً سبقاً یاد کر رکھا ہو، علمائے صادقپور سے تلمذ کا رابطہ رکھنے کے باوجود اس زمانہ میں ان کا میلان علمائے صادق پور کی جانب نہیں تھا، لیکن ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء کے بعد نہ صرف حنفیت کی تقلید سے بلکہ ائمہ اربعہ کی پیروی سے آزاد ہو کر درپئے اجتہاد ہو گئے، پھر بھی قاضی شوکانی کے پیروکاروں کی جانب ان کا رجحان بڑی حد تک نہیں تھا۔

اس جماعت کے اکابر میں ایک اہم ترین شخصیت نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی کی بھی ہے، نواب صاحب کو مولانا عبدالحق بنارسی اور علمائے یمن سے بھی تلمذ حاصل تھا، قاضی شوکانی سے محبت کی حد تک تعلق رکھتے تھے، ان کی رائے و مسلک سے انحراف کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت مولانا ولایت علی صادق پوری سے بھی ملاقات کی تھی۔

دونوں جماعتوں کے رجحانات

جماعت دہلوی کا میلان حضرت مولانا عبدالحیؒ بڈھانوی [1] اور حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کی جانب

---

[1] حضرت مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بن نور اللہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر کے ایک علمی گھرانہ میں (باقی حاشیہ صفحہ

زیادہ تھا جب کہ جماعت صادق پوری حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی طرف میلان رکھتی تھی، البتہ دونوں جماعتیں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز اور حضرت سید احمد شہید رحمہم اللہ کی قیادت و امامت پر متفق تھیں، لیکن بعد میں جب علماء صادق پور نے یمن کے زیدی المذہب محدثین اور نجد کے علماء حنابلہ سے اپنا رابطہ قوی کرلیا، اور مولانا اسمٰعیل شہید کی تحقیقات کو بھی ترک کردیا اس وقت سے علوم و معارف کے باب میں دونوں جماعتوں میں اختلاف ہوگیا۔

حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی "کتاب التوحید" کے مطالعہ سے بخوبی ظاہر ہے کہ مشرک کی عدم[1] مغفرت اور توسّل جیسے مسائل میں مولانا اسمٰعیل شہید اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے نظریوں میں واضح فرق ہے، اسی طرح شاہ محمد اسمٰعیل شہید کے رسالہ "اصول فقہ" اور قاضی شوکانی کی کتاب "ارشاد الفحول" سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حضرات کے درمیان استدلال بالاجماع کے مسئلہ میں بیّن اختلاف ہے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) پیدا ہوئے اپنے والد ماجد کے علاوہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی، حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی ابناء حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے علوم و فنون کی تحصیل کی اپنے علم و فضل کے اعتبار سے حضرت شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ میں اکثر پر فوقیت رکھتے تھے بالخصوص علم فقہ اور کتب درسیہ میں ان کی مہارت و حذاقت کے سب ہی قائل تھے حضرت شاہ عبدالعزیز کی دامادی کا شرف بھی حاصل تھا، لغات القرآن کے نام سے ان کی ایک مطبوعہ تصنیف ہے مگر اس وقت نایاب ہے ۱۲۴۳ھ میں پنجتار کے قریب موضع خار میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہیں

(۱) آیت پاک ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء کی تفسیر پر دونوں کا اختلاف ہے اس آیت کا ظاہری اقتضاء یہی ہے کہ شرک غیر مغفور اور ماورائے شرک دیگر گناہ قابل مغفرت ہیں، یہ اس آیت کا ظاہری اقتضاء ہے اب شرک کا اطلاق دو درجوں پر ہوتا ہے، شرک اکبر اور شرک اصغر، شرک اکبر تو یقیناً ناقابل مغفرت اور ابدی عذاب کا باعث ہے اس میں کسی اہل اسلام کا اختلاف نہیں، شرک اصغر کو جمہور علماء باعتبار حکم کے شرک اکبر سے الگ قرار دیتے ہیں، شیخ محمد بن عبدالوہاب نے نص کے عموم کے پیش نظر شرک اصغر کو بھی شرک اکبر کے زمرہ میں رکھ دیا اور دونوں طرح کے شرک کے مرتکب کو کافر اور ابدی عذاب کا مستحق قرار دیتے ہیں، مولانا اسمٰعیل شہید کی تحقیق یہ ہے کہ شرک اصغر کفر کے برابر نہیں کہ اس کا مرتکب ابدیت عذاب کا مستحق ہو البتہ قرآن کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک اصغر کی جو سزا مقرر ہے وہ معاف نہیں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید حجیۃ اجماع کے قائل ہیں جب کہ قاضی شوکانی اس کے منکر ہیں مولانا اسمٰعیل شہید کی مشہور تصنیف عبقات سے واضح ہے کہ وہ شیخ اکبر ابن عربی کے فلسفہ تصوف کے بارے میں امام ابن تیمیہ اور ان کے اصحاب سے مخالفت رائے رکھتے ہیں، اور خود مولانا سید میاں نذیر حسین دہلوی، امام ابن عربی کی عدم تکفیر میں مولانا اسمٰعیل شہید کے متبع ہیں، میاں صاحب کے سوانح نگار "الحیات بعد الممات" میں لکھتے ہیں۔

"میاں صاحب طبقۂ علماء کرام میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی بڑی تعظیم کرتے اور خاتم الولایۃ المحمدیہ فرماتے، قاضی بشیر الدین قنوجی جو شیخ اکبر کے سخت مخالف تھے ایک مرتبہ دہلی اس غرض سے تشریف لائے کہ ان کے بارہ میں میاں صاحب سے مناظرہ کریں اور دو مہینے دہلی میں رہے اور روزانہ مجلس مناظرہ گرم رہی مگر میاں صاحب اپنی عقیدت سابقہ سے جو شیخ اکبر کی نسبت رکھتے تھے ایک تل کے برابر بھی پیچھے نہ ہٹے آخر مولانا ممدوح دو مہینے کے بعد واپس تشریف لے گئے۔

مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے بھی میاں صاحب سے کئی دن متواتر شیخ اکبر کی نسبت بحث کی اور فصوص الحکم پر اعتراضات جمائے میاں صاحب نے پہلے تو سمجھایا مگر جب دیکھا کہ ابھی لا نسلم کے کوچہ میں ہیں تو فرمایا کہ "فتوحات مکیہ" آخری تصنیف شیخ اکبر کی ہے اس لئے اپنی سب تصنیف سابقہ کی یہ ناسخ ہے اس جملہ پر یہ سمجھ گئے"

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہوگی وہ مزدر بھگتنی پڑے گی، مولانا شہید کی تحقیق کی رو سے قرآن کا عموم بھی باقی رہا اور دونوں طرح کے شرک اپنے اپنے درجے پر بھی باقی رہے۔

[۲] توسل فی الدعاء بحرمت فلاں کہکر اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے تو شیخ محمد بن عبدالوہاب اس کو شدت سے ممنوع قرار دیتے ہیں جبکہ تقویۃ الایمان میں مولانا شہید نے اسے جائز کہا ہے۔

[۳] اجماع کے شرعی حجت ہونے پر صدیق اکبر کی خلافت اور مصحف عثمانی کے متبوع ہونے کا مدار ہے لہذا شیعہ فرقہ اجماع کو کبھی بھی قبول نہیں کر سکتا، جب کہ اہل سنت اسے کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مولانا نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی اپنی کتاب "التاج المکلل" میں امام ابن عربی کی تکفیر سے رجوع کیا ہے، لکھتے ہیں۔

والمذهب الراجح فيه على ماذهب العلماء المحققون الجامعون بين العلم والعمل والشرع والسلوك السكوت فى شانه وصرف كلامه المخالف لظاهر الشرع الى محامل حسنة وكف اللسان عن تكفيره وتكفير غيره من المشائخ الذين ثبت تقواهم فى الدين وظهر علمهم فى الدنيا بين المسلمين وكانوا فى ذروة العليا فى العمل الصالح ومن ثم رأيت شيخنا الامام العلامة الشوكانى فى الفتح الربانى، مال الى ذلك .... واقول فى هذا الكتاب ان الصواب ماذهب اليه الشيخ احمد السرهندى مجدد الالف الثانى، والشيخ الاجل مسند الوقت احمد ولى الله المحدث الدهلوى والامام المجتهد الكبير محمد الشوكانى من قبول كلامه الموافق لظاهر الكتاب والسنة وتاويل كلامه الذى يخالف ظاهرهما وتاويله بما يستحسن من المحامل الحسنة الخ[1]

شیخ اکبر کے بارے میں راجح مذہب وہی ہے جو علم وعمل اور شریعت وطریقت کے جامع علماء محققین کا ان کے متعلق مذہب ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے اور ظاہر شرع کے مخالف ان کے کلام کو بہتر محمل کی جانب پھیرا جائے اور ان کی اور دیگران مشائخ کی تکفیر سے زبان کو بند رکھا جائے۔ جن کا تقویٰ دین اسلام میں ثابت اور جن کا علم بین المسلمین شائع ہے جو علم وعمل کی بلند چوٹی پر فائز تھے، اور میں نے اپنے شیخ علامہ شوکانی کو دیکھا کہ وہ اپنی کتاب الفتح الربانی میں علماء محققین کے اسی مسلک کی جانب مائل ہیں اور میں بھی اس کتاب میں کہتا ہوں کہ شیخ اکبر کے بارے میں درست اور صواب رائے وہی ہے جس کے قائل حضرت مجدد الف ثانی سرہندی، امام ولی اللہ محدث دہلوی اور امام کبیر محمد شوکانی ہیں یعنی ان کے ایسے کلام کو جو کتاب وسنت کے موافق ہیں قبول کرنا اور جو ظاہر قرآن وحدیث کے مخالف ہیں ان کی بہتر تاویل و توجیہ کرنا۔"

---

[1] التاج المکلل ص ۱۷۹ طبع شرف الدین الکتبی واولادہ بمبئی۔

بعد میں جماعتِ صادق پوری سے متعلق بہت سارے افراد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اتباع و پیروی سے بھی الگ ہو گئے اس لئے کہ حضرت محدث دہلوی نے ائمہ اربعہ کی تقلید اور امام ابن حزم ظاہری کی تردید میں حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیلی بحث کی ہے جب کہ یہ لوگ ائمہ اربعہ کی عدم تقلید میں امام ظاہری کے مسلک کو اختیار کئے ہوئے ہیں، ان نظری مسائل کے علاوہ دونوں جماعتوں کے درمیان فروع عملیہ میں بھی دھیرے دھیرے اختلاف اس درجہ بڑھ گیا کہ باہم مخاصمہ اور لڑائی جھگڑے تک نوبت پہونچ گئی، حالانکہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رکوع میں جانے اور اٹھنے کے وقت رفع یدین پر بطور استحباب کے عمل کرتے تھے، لیکن جب انھیں محسوس ہوا کہ اس عمل پر استمرار جماعت میں فتنہ برپا کر دیگا تو انھوں نے اسے ترک کر دیا، بایں ہمہ ان حضرات کے اخلاص میں شک نہیں کیا جا سکتا، انھوں نے یہ سب دین سمجھ کر ہی کیا اور ہزار قربانیاں دیکر علاقہ بویز میں حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک کو زندہ رکھا جس پر وہ بجا طور پر ذکر جمیل کے مستحق ہیں۔

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا، ربنا انک رؤف رحیم۔

از :- مولانا عبدالحفیظ رحمانی بوھرسر ، سدھارتھ نگر ،

مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم پر نظر ثانی اور حذف و اضافہ کا مسئلہ ایک بار پھر علماء دین اور صحافیوں کا موضوع بن گیا ہے ، ادھر دو تین برسوں میں اس موضوع پر بہت سے مضامین لکھے گئے ، چند ایک ممتاز اداروں میں مذاکرات کی مجلسیں بھی منعقد کی گئیں اور مروجہ نصاب تعلیم پر متعدد زاویوں سے نگاہ ڈالی گئی لیکن اب تک کوئی مثبت قدم یا اقدام سامنے نہیں آیا ، اسکے متعدد اسباب ہیں ـــــ پہلی وجہ تو یہی ہے کہ جس فکری نقطہ نظر سے درس نظامی میں تبدیلی لانے کی تحریک چل رہی ہے اس کے مطابق کتابوں کی تیاری میں کافی وقت درکار ہے اور ایسے اساتذہ فراہم کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے جو نئے نصاب تعلیم کا حق ادا کرسکیں۔

اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جو تبدیلئ نصاب کی تحریک کو عملی اقدام سے روک رہے ہیں ، لیکن سوال یہ ہے کہ جن فکری زاویوں کے تحت نصاب تعلیم میں تبدیلی لانے کا بیڑا اٹھایا گیا ہے وہ نصاب کس طرح کے علماء کو قوم وملت کے سامنے پیش کرے گا ؟ اور ان کی عملی سطح کیا ہوگی ؟ کیا نئے نصاب تعلیم سے اس قدر استعداد پیدا ہوجائے گی کہ طلبہ عصر حاضر کے تغیرات سے نبرد آزما ہوسکیں گے اور مجاہدانہ بصیرت کے ساتھ نئے مسائل کا سامنا کرسکیں گے

موجودہ علمی وعملی سطح کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا تو مشکل ہے کہ عصر حاضر کے تعلیم یافتہ جن کو ہر طرح کے وسائل اور سہولیات بھی میسر ہیں وہ علمی میدان میں گوئے سبقت لے جائیں گے مشاہدہ تو یہ ہے کہ دور جدید کے محققین نئے علمی زاویے کھولنے کے بجائے متقدمین کے علمی سرمایہ کو اپنی تحقیقات کا محور بنائے ہوئے ہیں ان کے ذریعہ کوئی ایسا علمی کارنامہ وجود میں نہیں آرہا ہے جس کو اختراع وایجاد کا نام دیا جاسکے ، اور سہولیت پسندیوں کا حال یہ ہے کہ اجتہاد د

استنباط کے جو شرائط علماء متقدمین نے پیش کئے تھے ان کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے آسان شرائط وضع کرنے کی تجویز سامنے لائی جا رہی ہے تاکہ قرآن وحدیث سے دور کی کوڑی لانے پر کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہو کہ آپ کو قرآن وحدیث سے براہ راست استنباط واجتہاد کا حق حاصل نہیں ہے، پھر اس علمی کم مائیگی کے بطن سے کتنے مسائل جنم لیں گے ان کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ نئے نصاب تعلیم کی سفارش میں یہ بات بھی پوری قوت کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ تفاسیر سے بشرط ضرورت استفادہ کیا جائے اور قرآن حکیم کو طلبہ اپنی جدوجہد سے سمجھیں، اس جدوجہد کا طریقہ کیا ہو اور وہ استعداد کس معیار کی ہوگی جو قرآن حکیم کو اس کی منشاء کے مطابق سمجھا دے گی ناقابل فہم ہے، قدیم علمی ورثہ سے آنکھیں بند کرکے قرآن حکیم نہیں کسی معمولی کتاب کا سمجھنا بھی مشکل ہے، قرآن حکیم تو علوم کا ایک بحر بیکراں ہے جس میں غوطہ زن ہو کر محیط علم کے ہزاروں غواصوں نے گہرہائے آبدار نکالے ہیں۔ اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اگر کسی کتاب کے افہام وتفہیم کے لئے اس کتاب کے مضامین اور اصطلاحات، زبان پر مکمل عبور، مضامین کا پس منظر، مضمون کا ماحول اور کتاب کی تلمیحات پر گہری نظر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ایک کتاب کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس فن کی متعدد کتابوں کا گہرا مطالعہ ضروری ہوتا ہے، تو کیا قرآن حکیم صرف زبان پر تھوڑی بہت قدرت حاصل کر لینے کے بعد اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ قرآن حکیم سے بلا تکلف مسائل کا استنباط کیا جائے؟ ایسی کھلی چھوٹ تو شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ شخص دے سکے۔ کوئی سمجھائے تو سہی کہ قدیم علمی ورثہ اور تفاسیر سے استفادہ کئے بغیر قرآن حکیم سمجھنے کی صورت کیا ہوگی، یہ اور بات ہے کہ موجودہ نصاب تعلیم میں قرآن حکیم پر جس قدر محنت درکار ہے اس کا موقعہ فراہم نہیں کیا گیا ہے، جب کہ سرچشمۂ علوم اسلامیہ یہی کتاب ہے، اور یہی کتاب ہدایت اور اسلامی نظام حیات کا ابدی دستور۔

قرآن حکیم سمجھنے کے لئے عربی زبان پر پوری قدرت حاصل ہونی چاہئے، جس دور میں قرآن حکیم نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہا تھا اس دور کے عربی ادب اور قدیم عربی ادب کا مطالعہ کرنے والے کی نظر وسیع ہونی چاہئے، پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ احادیث رسول میں

آیات قرآنیہ کا مفہوم اور ان کی تشریح کس طرح کی گئی ہے یعنی قرآنی مطالعہ کے لئے احادیث کا ذخیرہ بھی نظر میں ہونا چاہئے تاکہ اسی کے تناظر میں قرآن مجید کی آیات کا مفہوم متعین کیا جاسکے۔

احادیث وادب عربی میں وسیع نظر پیدا کرنے کے بعد قدیم تفاسیر کا گہری نظر سے مطالعہ بھی ضروری ہوگا تاکہ قدیم علمی ورثہ میں یہ دیکھا جاسکے کہ اہل تفسیر نے آیات کا مفہوم کس تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور اس قدیم علمی ورثہ میں کس حد تک ماحول کے اثرات پائے جاتے ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر دور کے علمی کارناموں پر اس دور کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ تغیر پذیر ہر زمانہ میں نت نئے مسائل سماج میں ابھرتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح ہر علم وفن کی کتابوں میں زیر بحث آجاتے ہیں اس لئے اگر قدیم تفاسیر میں اس زمانہ کے پیش آمد مسائل پر بحثیں ملتی ہیں اور آیات قرآنیہ کی تفسیر وتشریح میں گردوپیش کے اثرات پائے جاتے ہیں تو یہ کوئی قابل اعتراض یا چونکا دینے والی بات نہیں ہے آخر تغیرات سے نبرد آزمائی اور کیا ہے؟ جس دور میں قدیم تفاسیر منظر عام پر آئیں اس میں یونانی فلسفہ کی حکمرانی تھی، طبعیات اور ماوراء الطبعیات کی وہ موشگافیاں موضوع بحث بنی ہوئی تھیں جو اسلامی عقائد سے براہ راست متصادم تھیں انھیں حالات میں علم کلام کی ترتیب عمل میں آئی تھی جس کے نتیجہ میں یونانی فلسفہ اپنی توانائی کے باوجود اس کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکا

یہی حال عہد حاضر کی تفاسیر کا ہے، مفسر قدرتی طور پر درپیش مسائل کے تناظر میں آیات قرآنیہ کی تعبیر وتفسیر پر مجبور ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ تعبیر وتشریح اسلامی مزاج اور روح سے قریب تر ہے یا نہیں اور ان تعبیرات کا اسلام کے بنیادی عقائد سے کوئی تصادم تو نہیں ہے، اس فیصلہ کے لئے جہاں کتاب وسنت کے عموم پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے وہیں آثار صحابہ اور ان کے تعامل کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا، یہی کچھ بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ علماء متقدمین نے کیا ہے اور انتہائی غور وفکر کے بعد وہ شرائط وضع کئے ہیں جو کج فکری اور آزاد روی کو پنپنے کا موقعہ نہیں دیتے اور ہر کس وناکس براہ راست کتاب وسنت سے مسائل کے استخراج واستنباط کی جرأت نہیں کرسکتا، چنانچہ عصر حاضر میں جو لوگ اپنے خیالات ومزعومات کو کتاب وسنت سے مبرہن کرنے کی کوشش کررہے ہیں ان کو عوام وخواص ناقابل اعتنا تصور کررہے ہیں، اسی طرح اگر قدیم علمی

ورثہ اور قدیم وجدید تفاسیر سے استفادہ کئے بغیر عصر حاضر کے طلبہ نے قرآن حکیم کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی اور ان کو استنباط و استخراج مسائل کی سند جواز بھی عطا کر دی گئی تو ہر طالب علم اپنی جگہ بے مثال مجتہد ہوگا اور ایسا معبر قرآن جو الکتاب کی تفسیر و تشریح کے بجائے اپنے خیالات کو قرآن حکیم میں پڑھتا ہوا ملے گا۔

بہر حال قرآن حکیم کو سمجھنے سمجھانے پر جس قدر محنت کی جائے وہ الکتاب کا حق ہے، اسی طرح حدیث کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے اور اس کی تحریک میں یہ جذبہ کارفرما رہنا چاہئے کہ حدیث کے طلبہ میں محدثانہ ژرف نگاہی اور فقیہانہ بصیرت پیدا ہو سکے، نیز فرمودات رسول کی حیثیت و اہمیت واضح ہو کر سامنے آجائے، طلبہ کو اس طرف بھی متوجہ کیا جائے کہ وہ اساتذۂ حدیث کے درس میں شریک ہونا ہی کافی نہ سمجھیں بلکہ حضرات محدثین کی تشریحات سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے درس میں شریک ہوں، اساتذۂ حدیث بھی معاون کتابوں کی نشاندہی کرتے ہوئے طلبہ میں مطالعۂ حدیث کا ذوق پیدا کریں لیکن یہ مطالعہ مفید مطلب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اصولِ حدیث کا استحضار ہو اور احادیث پر غور و فکر کرتے ہوئے ان احادیث کی فنی حیثیت بھی سامنے ہو اس سلسلہ میں محدثین کرام جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان پر گہری نظر ہونی چاہئے تاکہ احادیث کی تعبیر و تشریح میں فکری کج روی کو راہ نہ مل سکے۔

قرآن و حدیث کے بعد اسلامیات کا ایک اہم موضوع فقہ اسلامی ہے، یہ موضوع قرآن و حدیث سے الگ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ کتاب و سنت میں پھیلے ہوئے اصول زندگی اور مسائل کی اصول و ضابطہ کے تحت مدون ترتیبی صورت ہے، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ فقہ اسلامی سے استفادہ کے بغیر اسلامیات کے طالب علم کا دو قدم چلنا بھی مشکل ہے، لیکن کیا دوران تدریس اساتذہ مسائل پر زور دینے کے بجائے اصول فقہ پر زیادہ زور صرف کریں تاکہ طلبہ براہ راست کتاب و سنت سے مسائل کا استخراج و استنباط کر سکیں، بظاہر یہ کام تو آسان معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تجربات و مشاہدات کے خلاف کہ طلبہ اصول فقہ کو ازبر کر لینے کے بعد خود کتاب و سنت سے مسائل حل کر لیں۔ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ عصر حاضر کے طلبہ کتاب و سنت

سے مسائل کے استخراج کے نام پر کتاب وسنت کو تختۂ مشق بنالیں گے، پھر یہیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو فقہی سرمایہ ہماری نظروں کے سامنے اس وقت موجود ہے کیا وہ اصول فقہ کے مطابق نہیں ہے اور اگر ہے تو ازسر نو استخراج واستنباط پر عرق ریزی کرنے کا کیا حاصل ہے، ہاں عصر حاضر نے جو جدید مسائل پیدا کردیئے ہیں کتاب وسنت کی روشنی میں اصول فقہ کے مطابق ان کا حل علماء کرام کا فریضہ ہے ، اسی کیساتھ فقہ اسلامی کے طلبہ میں اتنی استعداد پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ تغیر پذیر حالات میں مسائل کا حل تلاش کرسکیں اسی زاویۂ فکر کے تحت درس نظامی کے طلبہ کو متعدد مسالک فقہ سے نہ صرف یہ کہ پوری معلومات بہم پہونچائی جاتی ہیں بلکہ ہر اختلافی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اساتذۂ کرام ہر مسلک کے دلائل کو بھی واضح کردیتے ہیں، اس کا بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عملی زندگی میں اگر ایک مسلک کے کسی مسئلہ پر عمل کرنے میں دشواری پیدا ہورہی ہے تو ایک ہی مسلک کے معتبر دیدہ ور علماء دوسرے مسلک کے مسئلہ پر اجماع کرلیتے ہیں۔ لے دے کے منطق اور علم کلام دو ایسے مضامین ہیں جن کو عصری مسائل کے تناظر میں بے سود قرار دیا جارہا ہے لیکن سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کے بعد اپنی جگہ پر ان کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ گو یہ ہر دو مضامین مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں مگر یہ قصور علمی کم مائیگی یا ان مضامین میں مہارت پیدا نہ کرنے کا ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالات کے تقاضے پر دو ایک مضامین کا مروج نصاب تعلیم میں اضافہ کردیا جائے تاکہ عصری افکار ورجحانات سے واقفیت حاصل ہوسکے لیکن جو لوگ درس نظامی میں انگریزی، ریاضیات، سائنس اور سماجی علوم کے اضافہ پر زور آزمائی کررہے ہیں وہ ایک سعیٔ لاحاصل میں مصروف ہیں، آخر ان مضامین سے طلبہ میں کتنی وسعت نظر پیدا ہوجائے گی اور کس حد تک وہ اپنے علمی ودینی مضامین کو سائنسی دلائل سے مبرہن کرسکیں گے۔ اگر کسی فن کے مبادی سے ادنیٰ مناسبت پیدا کردیجائے اور اس فن کی دقیق کتابوں کے مطالعہ کی طلبہ میں استعداد پیدا نہ ہوسکے تو ایسے طلبہ ژولیدگیٔ فکر کے شکار ہوسکتے ہیں دین وملت کیلئے مفید ثابت نہیں ہوسکتے۔

اس کے علاوہ علم منطق وکلام کے جو اثرات قدیم علمی سرمایہ میں موجود ہیں اور ان علوم کی اصطلاحات کو پیش نظر رکھ کر جو علمی مباحث قدیم سرمایہ میں پھیلے ہوئے ہیں ان سے استفادہ

کی کیا صورت ہوگی ابھی حال تک جو بحثیں دینی کتابوں میں پیش کی گئی ہیں کیا ان علوم کے بغیر ان کا سمجھنا ممکن ہوگا، یہ کہہ کر تو دامن نہیں بچایا جاسکتا کہ ان مباحث کی بالکل ضرورت نہیں ہے، ورنہ جانیے اور الہیات کی تشکیل جدید کو سامنے رکھ لیجئے پھر بتائیے کہ فلسفہ و منطق میں مہارت پیدا کئے بغیر الہیات کی تشکیل جدید کس طرح کی جائے گی، اور مغربی مصنفین اور مغرب زدہ کلامیوں نے جو بحثیں پیش کی ہیں ان کا جواب کن اصطلاحات اور اسلوب میں دیا جائے گا، جبکہ مباحث اور اصطلاحات ان مصنفین نے قدیم ہی استعمال کئے ہیں ان اسباب کی بناپر فلسفہ و منطق کو فرسودہ کہہ کر بالائے طاق رکھنے کی تجویز سمجھ میں نہیں آتی۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی کچھ کم توجہ کے قابل نہیں ہے کہ جو لوگ نصاب میں تبدیلیاں لانے کے اسباب بیان کر رہے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ چند فنون کے مبادی پڑھا دینے سے طلبہ میں اتنی استعداد پیدا نہیں ہوگی کہ وہ جدید درسگاہوں میں داخلہ لینے کے قابل ہو جائیں، جب صورت حال اس حد تک ابتر ہو کہ عصری درسگاہوں میں بھی نہ جاسکتے ہوں جن کی علمی سطح پر آٹھ آٹھ آنسو روئے جارہے ہیں اور یہی حال اضافی مضامین اقتصادیات اور سماجیات وغیرہ کا ہوگا، حالانکہ دور جدید میں ان مضامین کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی موجودہ نصاب تعلیم میں پیوندکاری کی اجازت دی جاسکتی ہے، تو انگریزی ہندی اور عصری مضامین میں مہارت کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے، میرا خیال ہے کہ پیوندکاری کے بجائے وہ فارغ التحصیل طلبہ جن کے ہونہار اور ذہین ہونے کی اساتذہ تصدیق کرتے ہیں ان فارغین کو ان کے ذوق کے مطابق انگریزی یا ہندی یا عصری مضامین دو سال پڑھائے جائیں، اندازہ ہے کہ دو سال میں یہ فارغین انگریزی یا ہندی اور دیگر مضامین میں اتنی مہارت پیدا کرلیں گے کہ وہ اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کر سکیں، لیکن ملت اسلامیہ کو ان ترجمانوں کے لئے بارگراں کا متحمل ہونا پڑے گا۔ میں نے چار سال پہلے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ۔

"دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں رخنہ اندازی کرنے کے بجائے اعلیٰ دینی درسگاہوں کے فارغ التحصیل فاضلوں کے لئے ماہرین تعلیم دوسالہ نصاب تعلیم تیار کریں اس میں داخلہ کیلئے استعدادی مقابلہ کرایا جائے جو امیدوار کامیاب ہوں ان کو ان کی خواہش

کے مطابق انگریزی، ہندی، سائنس وغیرہ میں داخل کیا جائے اور ان کی تعلیم و تربیت
کے لئے بہترین اساتذہ کا انتظام کیا جائے، یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دو
سالہ محنت کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے اور ملت اسلامیہ کو انگریزی ہندی اور عربی
میں اسلام کی ترجمانی کرنے والے قابل قدر افراد ہر سال میسر آتے رہیں گے، رہی قدیم نصاب
میں حذف و اضافہ کی بات تو وہ صرف نظری حیثیت سے مفید دکھائی دے رہی ہے
عملی طور پر بیک وقت درس نظامی کے ساتھ انگریزی وغیرہ پڑھنے والے طلبہ نہ
مسٹر ہی بن پاتے ہیں نہ ہی بالغ نظر عالم دین بلکہ علوم دینیہ کے نام پر اس طرح کے طلبہ
نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں، دونوں میدانوں میں یہ کمزور لوگ اسلامی تہذیب و
روایات سے بھی اپنا رشتہ منقطع کر لیتے ہیں جیسا کہ دو ایک اس طرح کی دینی درسگاہوں
کے فاضلوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے۔“

اس سلسلہ میں ایک قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ جو ہمدردانِ ملت پوری ہمدردی کے ساتھ مروجہ نصاب تعلیم میں حذف و اضافہ پر زور قلم صرف کر رہے ہیں وہ اقلیت کے عصری اداروں میں اسلامیات کی تدریس پر زور کیوں نہیں دیتے، کیا ان کا مطمح نظر صرف یہ ہے کہ دینی درسگاہوں کے طلبہ ہی مسلمان بن کر رہیں اور عصری درسگاہوں کے طلبہ اسلام سے دور کا رشتہ ناطہ رکھے بغیر اپنی زندگی عام انسانوں کی طرح گذاریں اور تہذیب عالم پر تبصرہ کرتے ہوئے مغربیوں کے چبائے ہوئے نوالوں کو از سر نو چبائیں اور اسلام کو اپنی تحقیقات کا ہدف بنائیں اگر ایسا نہیں ہے تو دینی درسگاہوں کو خراب نہ کریں اور ان کو اسی حال پر چھوڑ دیں جس میں وہ مطمئن رہیں

میرے اس فقرہ پر اس طرح کے ہمدردانِ ملت چیں بجبیں نہ ہوں بلکہ سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور چشم بصیرت وا کر کے دیکھیں کہ یہی مدارس عربیہ علوم اسلامیہ کے محافظ و امین ہیں اسلامی تہذیب و روایات انھیں کے دم قدم سے قائم ہیں حالانکہ اسلام کا نام لینے والا اور اپنی اسلامیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والا ایک طبقہ ان روایات کو مٹانے کے درپے ہے یعنی یہ طبقہ اسلامی تشخص کو صرف تقریر و تحریر کی حد تک انگیز کرنے کے لئے تیار ہے اسلامی تہذیب

(باقی آئندہ)

ماہ دسمبر ۱۹۹۳ء اور جنوری ۱۹۹۴ء میں بالکل غلط طور پر روزنامہ قومی آواز دہلی میں مولانا قاسمی اور ان کے ہم نواؤں نے جناب ڈاکٹر شاہ آفتاب احمد کی کتاب کے حوالے سے جنسی مسائل کو چھیڑ دیا (جب کہ اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی) اور خلاف واقعہ تفسیر جلالین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے تعلق سے جو غلط اور بے ہودہ واقعہ تحریر کیا گیا ہے اسکے بہانے جلال الدین سیوطی (جب کہ اس کے ذمے دار جلال الدین محلی ہیں کیونکہ مذکورہ واقعہ سورۂ احزاب کی تفسیر میں درج کیا گیا ہے جو شیخ محلی کی تفسیر کا جز ہے) پر تنقید کے ساتھ ان علماء و مفتیان کرام مثلاً مفتی محمود حسن گنگوہی، قاضی شہر کانپور مولانا مفتی منظور احمد مظاہری، مولانا مفتی زید احمد، مولانا محمد منظور نعمانی، قاضی سید عبدالعزیز، مولانا یوسف لدھیانوی، مولانا فضل الرحمن ندوی، ڈاکٹر ماجد علی خاں کی طرف سے ڈاکٹر آفتاب کی کتاب کی تصدیق و تائید کو "غیر ذمہ دارانہ روش" سے تعبیر کیا۔[1] حالانکہ مصدقین میں کوئی بھی غیر ذمے دار نہیں ہے، اگر دلیل سے ان کے موقف کو غلط ثابت کر دیا جاتا تب تو کوئی بات ہوتی لیکن مولانا قاسمی تو بے دلیل بالکل سطحی انداز میں مذکورہ علماء و مفتیان کرام کی پگڑیاں اچھالتے چلے گئے ہیں، اور ان سے کتاب میں نقل کردہ روایات کا حوالہ طلب کیا۔ راقم الحروف نے ۱۴ جنوری ۱۹۹۴ء کے قومی آواز میں مولانا قاسمی کے موقف و دلائل کا تجزیہ کرتے ہوئے تمام تر متعلقہ حوالے فراہم کر دیئے۔ مولانا قاسمی صاحب نے ۲۲ جنوری کے قومی آواز میں ایک جوابی مراسلہ شائع کیا جس میں ہمارے پیش کردہ دلائل و تنقیحات کو بالکل مس نہیں کیا، گویا کہ ہمارے تمام تر دلائل اور

---

[1] دیکھیے روزنامہ قومی آواز ۹ جنوری ۱۹۹۴ء

غلطیوں کی نشاندہی سے انھوں نے اتفاق کرلیا، البتہ ایک روایت کا یہ کہکر انکار کردیا کہ ہماری محولہ کتابوں میں وہ موجود نہیں ہے اور وہ روایت جھوٹی ہے، حالانکہ ہماری کتب محولہ ترمذی ابن ماجہ، زادالمعاد اور احیاء العلوم کے محولہ کتاب، باب، جلد میں پوری روایت موجود ہے چند دنوں کے بعد مولانا قاسمی نے اپنے ذاتی مکتوب میں لکھا کہ ازدواجی تعلقات کے سلسلہ میں درج احادیث واقوال کی مکمل تحقیق کرکے ان پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ مزید لکھا کہ اس سلسلہ کی حدیثیں اور اقوال صحابہ جھوٹے ہیں" لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں دی، البتہ آگے احیاء العلوم (از امام غزالی) کی ایک روایت کو ضعیف قرار دیا جب کہ مولانا کے دعویٰ وضع حدیث اور اس کی دلیل میں تضاد ہے، موضوع اور ضعیف روایات ہم درجہ نہیں ہیں جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے۔

ہم انتظار میں تھے کہ دیکھیں مولانا قاسمی متعلقہ احادیث واقوال کی مکمل تحقیق اور ان پر مفصل تبصرہ کرکے ہم جیسے طالب علموں کی معلومات میں کس حد تک اضافہ فرماتے ہیں، چار، پانچ مہینے کے وقفے کے بعد ان کی تحقیق کا مفصل تبصرہ ماہنامہ دارالعلوم بابت ماہ اپریل ۱۹۹۴ء میں جو شائع ہوا ہے، وہ علم وتحقیق اور مغالطہ آمیزی کا افسوسناک نمونہ ہے، مولانا قاسمی نے یہاں بھی فقہاء امت پر لطیف چوٹ کرنے سے گریز نہیں کیا، جہاں تک کلام الٰہی اور کلام رسول کی شائستگی کا تعلق ہے، اس سے کس مؤمن کو انکار ہوسکتا ہے؟ اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا ضرورتاً بغرض تعلیم بھی میاں بیوی کے باہمی تعلقات کا ذکر بھی شرعاً شائستگی کے منافی ہے؟ ہمارا جواب "نہیں" میں ہے، کیونکہ عہد رسالت سے لے کر آج تک میاں بیوی کے باہمی ازدواجی تعلقات کا ذکر ہوتا رہا ہے، محدثین نے روایات کیں فقہاء نے مسائل کا استنباط کیا ہے، اساتذۂ کرام برابر پڑھاتے رہے ہیں، مشائخ وصوفیہ اپنے مریدوں ومتعلقین کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق مسائل ومعاملات میں برابر رہنمائی کرتے رہے ہیں، عہد حاضر میں سیدنا شیخ الاسلامؒ کے مکتوبات (چھار جلدیں) اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تربیت السالک کو پیش کیا جاسکتا ہے

افشاء راز کی ممانعت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ازواج مطہرات اور حضرات صحابہؓ سے ضرورتاً بغرض تعلیم میاں بیوی کی پرائیوٹ زندگی سے متعلق ہدایات وروایات ہیں، ان کو مولانا قاسمی نے بلا سوچے سمجھے غلط طور پر افشاء راز کی

مخالفت سے جوڑدیا ہے، انھوں نے اس سلق سے جو روایت مشکوٰۃ سے نقل کی ہے وہ حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے مسلم شریف کتاب النکاح اور ابوداؤد کتاب الادب میں موجود ہے جب کہ مولانا قاسمی نے ——— اس روایت کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف منسوب کردیا ہے، روایت یہ ہے

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من اشر الناس عند اللہ منزلۃ یوم القیمۃ الرجل یفضی الی امرأتہ وتفضی الیہ ثم ینشر سرّھا۔

اس حدیث کا ترجمہ ماقبل میں دیا جا چکا ہے۔ اس کا تعلق کس بات سے ہے، اس کی نوعیت کیا ہے اس کی تفصیلی وضاحت کے لئے شروح حدیث کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے[۱]۔ روایت کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے بعد یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ممانعت افشائے راز کی روایت کا تعلق دینی ضرورت کے پیش نظر بغرض تعلیم سے نہیں ہے، نہ ہی اس ذات سے جس کا ہر ظاہری باطنی عمل امت کے لئے نمونہ ہوتا ہے بلکہ اس کا تعلق اس عام امتی سے ہے جس کا کوئی قول و فعل دوسرے کے لئے حجت ونمونہ نہیں ہے، اور وہ بطور تفریح وتلذذ کے میاں بیوی کے مخصوص باہمی تعلقات کی کیفیت وہیئت اور فعل مخصوص کا تذکرہ کرتا ہے جو زن وشو کے مابین ایک مقدس راز کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا افشاء بلاشبہ عنداللہ بدترین فعل ہے، کیونکہ اس سے سماج میں جنسی انارکی کی اشاعت کا قوی امکان ہوتا ہے، میاں بیوی کی خوبی، کمی کو بیان کرنے سے بہت سے معاشرتی سماجی مسائل ومشکلات پیدا ہوسکتے ہیں، سامع کا ذہن بھی بھٹک سکتا ہے اور اس کی سوچ کی رو غلط سمت میں بہہ سکتی ہے، عام آدمی کا میاں بیوی کے باہمی مخصوص تعلقات کا افشاء واظہار کی کوئی دینی شرعی ضرورت نہیں ہے لہذا اس کا افشائے راز بے ضرورت اور کارِ عبث ہونے کے ساتھ برائے تفریح وتلذذ ہی ہوسکتا ہے نہ کہ دینی ضرورت کے تحت برائے تعلیم لہٰذا مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کا زیر گفتگو متعلقہ روایت کی بنیاد پر یہ کہنا ہی غیر متعلق اور

---

[۱] نووی مسلم شریف، فتح الملہم شرح مسلم از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا تقی عثمانی، عون المعبود شرح ابوداؤد از مولانا شمس الحق عظیم آبادی۔ بذل المجہود از مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ سہارنپوری مع تعلیقات شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ از ملا علی قاری، التعلیق الصبیح از مولانا ادریس کاندھلویؒ، مرعاۃ المفاتیح از مولانا عبداللہ مبارکپوریؒ نیز لمعات واشعۃ اللمعات از عبدالحق محدث دہلوی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

بے معنی سی بات ہے کہ آنحضرتؐ یا ازواج مطہراتؓ یا صحابہ کرامؓ اپنی قربت کے حالات بیان کرتے ہوں گے؟ یہ تشکیلی انداز بتاتا ہے کہ مولانا قاسمی نے متعلقہ روایات کی بذات خود ڈھنگ سے تحقیق ومطالعہ نہیں کیا ہے، مسئلہ اصل میں یہ نہیں ہے کہ حضرت علیؓ نے داماد ہونے کے ناطے مذی کا مسئلہ آپ سے براہ راست دریافت نہیں کیا بلکہ حضرت مقدادؓ کے توسط سے دریافت کیا۔ مسئلہ اصل یہ ہے کہ مذی کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا اور آپ نے بتایا

مولانا قاسمی کے مزعومہ خیال ودعوے کی تردید وتغلیط پر وہ روایت کافی وشافی ہے، جو حضرت انسؓ سے صحاح ستہ کے علاوہ دیگر تقریباً اکثر کتب حدیث کے کتاب الغسل میں موجود ہے حتیٰ کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی بلوغ المرام اور شوق نیمویؒ کی آثار السنن میں بھی، ہم یہاں بخاری شریف جلد اول باب اذا جامع ثم عاد ومن دار علی نسائہ فی غسل واحد سے نقل کر رہے ہیں، حضرت انسؓ کا کہنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دن اور رات کے ایک ہی وقت میں اپنی تمام ازواج کے پاس گئے اور وہ گیارہ تھیں۔ (اور غسل ایک ہی کیا) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدور علی نسائہ فی الساعۃ الواحدۃ من اللیل والنہار وھن احدی عشرۃ مسلم اور دیگر صحاح ستہ میں کان یدور کی بجائے کان یطوف کے الفاظ ہیں، دونوں کا معنی ایک ہی ہے، یہاں سوال یہ ہے کہ جب تک آنحضرتؐ یا ازواج مطہرات نے اپنی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں بتایا نہیں تو حضرت انسؓ کو کیسے معلوم ہوا کہ آپنے تمام بیویوں سے جماع کے بعد ایک ہی غسل فرمایا۔ کیا اسے ممانعت افشائے راز کے تحت رکھا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہی کہا جائے گا کہ یہ سب کچھ دینی ضرورت کے تحت تعلیم کی غرض سے کیا گیا تھا۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ

مولانا اخلاق حسین قاسمی نے ہیئت جماع کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کا جو واقعہ نقل کرکے اس پر تبصرہ وتجزیہ کیا ہے وہ بھی تحقیق وتجزیہ کا انتہائی افسوسناک نمونہ ہے، اس روایت پر بھی انھوں نے حسب عادت سابقہ غور وفکر سے کام نہیں لیا ہے، قرآن حکیم کی سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۳ کی تفسیر میں کتب حدیث وتفسیر (مثلاً دیکھیے مسند احمد اور ترمذی، اور تفسیر ابن جریر، قرطبی، اور ابن کثیر وغیرہ) میں مذکورہ واقعہ عمرؓ کو نقل کیا گیا ہے، مولانا قاسمی نے حضرت عمرؓ اور ابن عمرؓ اور ان دونوں کے دو واقعہ

کو ایک تسلیم کرکے تنقید کی ہے جو قطعی طور پر غلط ہے۔ انھوں نے ۹ رجنوری ۱۹۹۴ء کے قومی آواز میں ڈاکٹر اے۔اے شاہ کی کتاب کی تصدیق کرنے والے علماء ومفتیان کرام سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ حضرت عمرؓ سے متعلق اثر ابن عباس رضؓ کے مستند ہونے کا ثبوت پیش کریں۔ راقم الحروف نے کسی تفسیر یا کسی کم تر درجے کی کتب حدیث سے ثبوت دینے کی بجائے صحاح ستہ میں شمار ترمذی شریف کتاب التفسیر جلد دوم ص۱۳۶ اور مسند احمد جلد اول ص۲۹۷ سے حضرت عمرؓ کے واقعہ کے مستند ہونے کا ثبوت فراہم کردیا تھا (قومی آواز ۱۴ رجنوری ۱۹۹۴ء)

مولانا قاسمی روایت پر درایتی واسنادی لحاظ سے بحث وگفتگو تو نہ کرسکے البتہ بلا سوچے سمجھے روایت کا سلسلہ اسرائیلیات سے جوڑ دیا، حالانکہ اسلامیات کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ اسرائیلیات کا تعلق عموماً ماقبل نزول قرآن کے واقعات سے ہوتا ہے نہ کہ بعد کے واقعات سے رسالہ دارالعلوم کے ماہ اپریل ۱۹۹۴ء میں شائع شدہ مضمون میں بھی انھوں نے غلط طور پر واقعہ حضرت عمرؓ کو اسرائیلیات کے ذیل میں رکھنے کی سعی نامشکور کی ہے، جب کہ آج تک کسی مستند مفسر ومحدث اور شارح حدیث نے اس کی جرأت نہیں کی تھی، میں پوری روایت مع سند کے ترمذی سے دے رہا ہوں اس کے بعد متعلقہ دیگر پہلوؤں پر بحث کی جائے گی پوری روایت یہ ہے۔

حدثنا عبد بن حمید نا الحسن بن موسی نا یعقوب بن عبد اللہ الاشعری عن جعفر بن ابی المغیرۃ عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال جاء عمر الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ هلکت قال وما اهلکك قال حولت رحلی اللیلة قال فلم یرد علیه رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئا قال فانزلت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم هذه الآیة نساءکم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم اقبل وادبر واتق الدبر والحیضة هذا حدیث حسن غریب (کتاب التفسیر ص۱۳۶ ج ۲ ترمذی شریف)

مسند احمد کی روایت میں اللیلۃ کی جگہ فی البارحۃ کا لفظ ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے بھی اس روایت کی تصحیح وتحسین کی ہے، روایت کا ترجمہ یہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ آپؐ کی خدمت میں تشریف لائے اور کہا۔ یا رسول اللہ میں تو ہلاک ہوگیا۔ آپؐ نے فرمایا کس نے ہلاک کیا (یعنی کیا آفت) حضرت عمرؓ نے

عرض کیا، رات کو میں نے اپنے کجاوے کا رخ پھیر دیا تھا۔ آپؐ نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔ "تمھاری عورتیں تمھاری کھیتی ہیں، سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو[1] آگے سے یا پیچھے سے اور بچو دبر سے اور حالت حیض میں مجامعت کرنے سے۔

اس پوری روایت میں ایک بھی لفظ آپ کو ایسا نظر آتا ہے جس کا تعلق بر قول مولانا اخلاق حسین "فعل مکروہ" اسرائیلیات، یا جھوٹی من گھڑت بات سے ہو۔ درحقیقت خرابی یا جھوٹ روایت میں نہیں بلکہ مولانا قاسمی کی سوچ اور ذہن میں ہے، اس لئے وہ روایت کا تعلق ہیئت جماع کی بجائے غلط محل جماع سے جوڑ رہے ہیں جو قطعی طور پر متفق علیہ غیر فطری غیر طبعی ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہے کہ مولانا قاسمی دوسروں کے بارے میں یہ تو لکھتے ہیں کہ لوگ سرسری طور پر تفسیر کی کتابوں میں روایت دیکھ کر نقل کر دیتے ہیں، لیکن ان کا حال بھی بذات خود کچھ مختلف نہیں ہے، انھوں نے ایک بالکل صاف ستھری بات کو غلط رخ دیدیا، پشت کی طرف سے صحیح محل میں جماع کرنا اور وطی فی الدبر دونوں بالکل الگ الگ بات ہے، صورت اول کے جائز ہونے پر (پوری امت) تمام محدثین فقہاء ومفسرین کا اتفاق ہے، جب کہ دوسری صورت متفقہ طور پر حرام وناجائز ہے اور جن لوگوں نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت امام مالکؒ کی طرف اس فعل شنیع وملعون کو منسوب کیا ہے وہ قطعاً غلط اور خلاف واقعہ ہے۔

مولانا قاسمی نے تحویل کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ پوری طرح صحیح نہیں ہے، تحویل درحقیقت سابقہ حالت کو پھیر دینے کو کہا جاتا ہے جس کا مکمل تحقق سابقہ حالت کے مکمل مخالف حالت میں ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا معاملہ لے کر اس لئے آئے تھے کہ انھوں نے عام معمول بہا ہیئت جماع سے ہٹ کر دوسری ہیئت جماع کو اپنایا تھا، نہ کہ یہود مدینہ کے طریقۂ صحبت اختیار کر لینے کے خدشے کی وجہ سے، ویسے کروٹ سے صحبت کرنا بھی ہیئت جماع کی تحویل کے ذیل میں آتا ہے جو جائز ہے، لیکن سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۳ کو یہودیوں کے اس غلط خیال کا کہ عقب سے جماع کرنے سے بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ صحیح اور مکمل جواب اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ آیت متعلقہ کو عقب سے جماع کرنے سے جوڑا جائے، جیسا کہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد

---

[1] قرآنی روایت کا ترجمہ حضرت شیخ الہند سے لیا گیا ہے۔

اور دیگر کتب احادیث صحیحہ کی متفقہ رد آیت سے واضح ہوتا ہے کہ آیت کا شان نزول یہودیوں کا غلط خیال ہے لیکن جہاں تک مختلف ہیئت جماع (عمل جماع نہیں جیسا کہ مولانا قاسمی سمجھ رہے ہیں) کے اختیار کرنے کا تعلق ہے تو شریعت نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے، زوجین اپنے لئے کوئی ہیئت جماع کو اپنا سکتے ہیں، چنانچہ امام مسلمؒ نے تو یہ باب ہی باندھا ہے کہ "جماع ہر طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ سیدنا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ آیت نساء کم الخ کے تحت تمام محدثین فقہاء ومفسرین کی توضیح وتفسیر کا بہترین خلاصہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں" یہود عورت کی پشت کی طرف ہو کر وطی کرنے کو ممنوع کہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس سے بچہ احول پیدا ہوتا ہے، آپ سے پوچھا گیا تو اس پر یہ آیت اتری یعنی تمہاری عورتیں تمھارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں جس میں نطفہ بجائے تخم اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے، یعنی اس سے مقصد اصلی صرف نسل کا باقی رکھنا اور اولاد کا پیدا ہونا ہے، سو تم کو اختیار ہے، آگے سے یا کروٹ سے یا پشت کی طرف سے، پڑ کر یا بیٹھ کر جس طرح چاہو مجامعت کرو، مگر یہ ضرور رہے کہ تخم ریزی اس خاص موقع میں ہوں جہاں پیداواری کی امید ہو، یعنی مجامعت خاص فرج ہی میں ہو، لواطت ہرگز ہرگز نہ ہو، یہود کا خیال غلط ہے کہ اس سے بچہ احول پیدا ہوتا ہے۔"[1]

اس کی تائید بذات خود مولانا قاسمی کی بعد کی سطور سے ہوتی ہے، لیکن وہ اپنے آپ کی تردید محسوس نہیں کر رہے ہیں، ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ غیر تحقیقی ذہنیت کے تحت عجلت پسندی کی وجہ سے من اتی امراتہ فی قبلہا من دبرہا، اور من اتی امراتہ فی دبرہا میں کوئی فرق ہی نہیں کر رہے ہیں، ورنہ اے اے شاہ کی اس تشریح کو کہ "پشت کی طرف سے جماع کر لیا" غیر طبعی غیر فطری نہ تحریر کرتے۔ من دبرھا اور فی دبرھا دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، "من" کا تعلق ہیئت جماع اور رخ پر دلالت کرتا ہے، اور "فی" غیر توقع جماع پر۔ ایک بالکل جائز ہے جبکہ دوسری قطعی حرام ہے

متعلقہ واقعہ عمرؓ کی روایتی حیثیت

اب کچھ گفتگو متعلقہ واقعہ حضرت عمرؓ بسلسلہ روایت ابن عباسؓ ہوجائے، مولانا قاسمی

[1] دیکھئے ترجمہ شیخ الہندؒ ص ۱۲ مطبوعہ مجمع الملک الفہد سعودیہ عربیہ والجمعۃ بکڈپو۔

نے راقم الحروف کو لکھے ایک نجی مکتوب میں اس طرح کی روایت کو جھوٹی من گھڑت تحریر کیا تھا جبکہ قومی آواز اور زیر بحث دارالعلوم کے شمارے میں حافظ عماد الدین ابن کثیر کے حوالے سے مرجوح قرار دیا اور لکھا کہ اس طرح کی روایت کا حوالہ دینا تشیع پھیلانے کے ہم معنی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کوئی بھی دعوی دلیل سے ثابت نہیں کر پائے ہیں اور آج تک ثبوت طلب ہیں، راقم الحروف روایت کی اسنادی حیثیت ترمذی شریف کے حوالے سے پیش کر چکا ہے کہ روایت نہ تو موضوع وضعیف ہے نہ ہی مرجوح بلکہ حسن غریب ہے۔ (ہذا حسن غریب، امام ترمذی) مولانا قاسمی نے یہ غلط لکھا ہے کہ حافظ ابن کثیر نے اس روایت کو مرجوح قرار دیا ہے، انھوں نے تو تائیداً اس دعوے کے ثبوت میں متعلقہ روایت کو پیش کیا ہے کہ موقع ومحل صحیح یعنی فرج میں کسی بھی ہیئت سے جماع کیا جا سکتا ہے، ابن کثیر نے دوسرے سے واقعۂ عمرؓ والی روایت پر کوئی جرح وتنقید کی ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ابن کثیر کی طرف اس دعوے کا انتساب کہ انھوں نے سعید بن جبیر والے قول (روایت) کو مجروح قرار دیا ہے، علمی دیانت کے منافی اور مولانا قاسمی کی شخصیت سے فروتر بات ہے، مفسر ابن کثیرؒ نے جس روایت پر جرح وتنقید کرکے اس کی تردید وتغلیط کی ہے وہ حضرت عبداللہ ابن عمر سے متعلق ہے کہ وہ پیچھے کے حصہ میں صحبت کرنے کو جائز قرار دیتے تھے (افتی ان توتی النساء فی ادبارھن) حضرت ابن عمر کے شاگرد حضرت نافع نے بھی اس غلط اور جھوٹ بات کی تردید وتغلیط کی ہے نہ کہ حضرت عمر کے واقعہ کی، بڑی حیرت ہے کہ مولانا قاسمی حضرت عمر اور حضرت ابن عمر کی روایتوں میں کوئی فرق نہیں کر رہے ہیں اور سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے چلے جا رہے ہیں، صاحب تفسیر ابن کثیر نے حضرت عمر کا واقعہ بالکل شروع میں نقل کیا ہے اور حضرت ابن عمر کی روایت بالکل آخر میں دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے دونوں بالکل الگ الگ معاملہ ہے، مولانا قاسمی نے حوالہ تو تفسیر ابن کثیر کا صحیح دیا ہے (جلد اول ص۲۶۲-۲۶۳) لیکن بات بالکل غلط لکھی ہے یہ بالکل ویسے ہی غیر ذمہ دارانہ بات ہے جیسے کہ انھوں نے ممانعت افشاء راز والی روایت کے لئے مشکوٰۃ شریف کے صفحہ کا حوالہ صحیح دیا لیکن روایت کا انتساب حضرت ابو سعید خدریؓ کی بجائے حضرت عائشہؓ کی طرف کر دیا، تفسیر ابن کثیر کوئی نایاب نادر الوجود یا مخطوطے کی شکل میں نہیں ہے کہ حوالہ تلاش کرنے میں پریشانی ہو، ہمارے اہل علم قارئین میں سے کوئی بھی سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۳ کی تفسیر تفسیر ابن کثیر میں دیکھ

حقیقت حال کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

انحراف

مولانا قاسمی کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے متعلقہ واقعے والی روایت اسرائیلیات کا حصہ، مرجوح، من گھڑت اور جھوٹی ہے ان میں سے وہ کوئی دعویٰ دلیل سے ثابت نہیں کرسکے (اور غیر متعلق طور پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی علمی واقعی حیثیت راقم الحروف واضح کرچکا ہے) البتہ ایک کمزور سہارے کے ذریعہ روایت کی روایتی اسنادی حیثیت مجروح اور کم کرنے کی سعی نامشکور کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نساءکم حرث لکم الخ حضرت عمرؓ کے سلسلے میں نہیں بلکہ مہاجرین کے ایک خاندان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ روایت بھی حضرت ابن عباسؓ سے ابوداؤد شریف میں مروی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مہاجر نے مدینہ کی ایک انصاری خاتون سے نکاح کرکے آزادی کے ساتھ صحبت کرنی چاہی اور انصاری خاتون نے ایک ہی (عام طریقہ پر) صحبت کرنے پر اصرار کیا بصورت دیگر علیحدگی کی دھمکی دی، یہ واقعہ آپ کے علم میں آیا، آپ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ بظاہر ترمذی، مسند احمد، اور ابوداؤد کی روایت میں تضاد نظر آتا ہے لیکن جو لوگ اصول تفسیر سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی تضاد نہیں ہے، جس طرح ایک واقعہ یا سوال کسی آیت کا شان نزول نہیں ہوسکتا ہے اسی طرح حسب تشریح الامام شاہ ولی اللہؒ متعدد واقعات، نفوس انسانیہ، پورا زمانہ ماحول میں شان نزول بن سکتا ہے[1] اور مفسرین کی اس تشریح کی موجودگی میں کہ (جس کا حوالہ خود مولانا قاسمی نے بھی دیا ہے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلاوت کرنے اور کسی موقعہ پر پیش کرنے کو بھی نازل ہونے سے تعبیر کردیا جاتا ہے۔ سرے سے کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا ہے، آیت مذکورہ حضرت عمر کے واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی یا آپ نے تلاوت فرمائی، دونوں صورتوں میں حضرت عمرؓ کے واقعے کی صحت و عدم صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، اصل مسئلہ تلاوت آیت یا نزول کا نہیں بلکہ واقعہ عمرؓ کی صحت اور عدم صحت کا ہے، مولانا قاسمی کا اس پر بحث کرنا ہی اصل مسئلہ و دعوی سے انحراف ہے، انھوں نے

---

[1] دیکھئے الفوز الکبیر بعنوان حقیقۃ اسباب النزول ص۲۸–۲۹ مطبوعہ ندوۃ العلماء لکھنو۔ راقم الحروف نے تحریر میں زیادہ تر محولہ کتب کا باب وغیرہ حوالہ دینے پر اکتفا کیا ہے۔ کیونکہ مطبوعہ مختلف ہونے کی وجہ سے صفحہ نمبر دینے سے کام نہیں چلتا ہے اور حوالہ تلاش کرنے میں پریشانی ہوتی ہے۔

جب یہ تسلیم کرلیا کہ "آپؐ نے حضرت عمرؓ کے واقعہ میں آیت تلاوت فرمائی تھی"، تو یہ دعویٰ سرے سے بے بنیاد ثابت ہوجاتا ہے کہ زیر بحث روایت اسرائیلیات کا حصہ ہے جسے حضرت عمرؓ کو بدنام کرنے کے لئے گھڑا گیا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ نساءکم حرث لکم الخ والی آیت اصلاً یہودیوں کے اس خیال کی تردید کے لئے نازل ہوئی تھی کہ عقب سے صحبت کرنے سے بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے اور حضرت عمرؓ اور مہاجر کے واقعے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کی تلاوت فرمائی تھی، اس صورت میں تمام متعلقہ روایتوں میں تطبیق ہوجاتی ہے جو بہرحال تردید و ترجیح سے بہتر ہے، راقم الحروف مستند مفسرین کی تشریحات و تحقیقات اور بخاری و مسلم کی متفقہ روایت کے علاوہ دیگر کتب حدیث کی آیت سے متعلق روایتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے۔

آخر میں راقم الحروف مولانا قاسمی سے یہ گذارش کرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی بھی مسئلے پر لکھنے سے پہلے اس کے تمام متعلقہ پہلوؤں پر غور فرمالیا کریں اور ضروری حد تک مطالعہ بھی آخر مغربیت زدہ جدت پسندوں کی خاطر کس حد تک احادیث، مسلک فقہاء و محدثین کی غلط تاویل کی جائے گی امید ہے کہ ہماری مذکورہ تفصیلات و تشریحات کے بعد نام نہاد روشن خیالوں کے زیر اثر انھوں نے شریعت میں میاں بیوی کے باہمی پرائیویٹ تعلقات کے متعلق مذکور مسائل و امور کے بارے میں جو رائے قائم کرلی ہے اس پر نظر ثانی فرمائیں گے اور جن روایات و احادیث پر ائمہ فن رجال اور محدثین نے کوئی کلام نہیں کیا ہے انھیں خواہ مخواہ اختلافی یا اسرائیلیات سے نہ جوڑیں گے۔

بقیہ صفحہ ۵۴ دارالعلوم دیوبند اور اس کا نصاب تعلیم

غیر منظم صورت میں تھوڑے سے افراد پر مشتمل تھا، اس کے قواعد و ضوابط منضبط ہوگئے، اور مولانا شیخ الہند نے امام ولی اللہ اور مولانا قاسم کی کتابوں کو اس درجہ کی تعلیم کا لازمی عنصر قرار دیا۔ علاوہ ازیں مدرسہ دیوبند کو دارالعلوم کے درجہ تک پہنچایا گیا اور دارالحدیث کو اس کی مرکزی درسگاہ (کالج) قرار دیا گیا۔

⁂

تالیفات امام طحاویؒ

امام موصوف کی تمام تالیفات جمع و تحقیق اور کثرت فوائد کے لحاظ سے نہایت ممتاز و مقبول رہی ہیں۔ فقہاء مدققین اور علمائے محققین نے ان کو ہمیشہ بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے، لیکن بہ نسبت متاخرین کے متقدمین میں ان کا اعتبار زیادہ رہا ہے، اسی لئے ان کی کتابیں بہت کم طبع ہو سکیں، ان میں سے مشہور و اہم تالیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) معانی الآثار

حسب تحقیق ملا علی قاری یہ کتاب امام موصوف کی سب سے پہلی تصنیف ہے اور اس کو بغور و انصاف مطالعہ کرنے والا حسب ارشاد حافظ عینی اس کو دوسری تمام کتب مشہورہ متداولہ مقبولہ پر ترجیح دیگا اور فرمایا کہ اس بات میں شک کرنے والا یا جاہل ہوگا یا متعصب، چنانچہ جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ پر تو اس کی ترجیح اس قدر واضح ہے کہ کوئی عالم و عاقل اس میں شک نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں وجوہ استنباطات کا بیان، وجوہ معارضات کا اظہار اور ناسخ و منسوخ کی تمیز وغیرہ ایسے امور ہیں جو ان دوسری کتابوں میں نہیں ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ اس میں کچھ ضعیف روایات بھی ہیں تو کہا جائے گا کہ کتب مذکورہ بھی اس سے خالی نہیں ہیں، باقی سنن دارقطنی، سنن دارمی اور سنن بیہقی وغیرہ کو تو کسی اعتبار سے بھی معانی الآثار کے برابر نہیں رکھا جا سکتا چونکہ اس کی خدمت نہیں ہوئی اور اس کے مضامین عالیہ و تحقیقات فائقہ کو نمایاں نہیں کیا گیا اس لئے وہ مخفی خزانوں کی طرح اکثر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے، کم ہمت اور کم فہم متاخرین نے اس کے مطالعہ و استفادہ سے گریز کیا اور مخالفوں نے احناف کے خلاف پروپیگنڈے کا سلسلہ برابر جاری رکھا جس سے

کے محاسن پوشیدہ رہے اور حقدار اپنے حقوق سے محروم رہے۔ اب خدا کا شکر ہے کہ ان دبی ہوئی چیزوں کے ابھرنے کا وقت و موقعہ آیا ہے۔ واللہ المستعان۔

علامہ ابن حزم اور معانی الآثار کی ترجیح موطا مالک پر

علامہ ابن حزم اندلسی ظاہری اپنی رائے پر جمود اور تشدد میں ضرب المثل ہیں کہ اپنے مخالف کی سخت الفاظ میں تجہیل و تحمیق ان کا خاص شعار ہے حتی کہ ائمہ و محدثین کبار کی بھی تردید کرتے ہیں تو نہایت درشت و نازیبا لہجہ میں کرتے ہیں، ائمہ احناف سے بھی بہت زیادہ تعصب رکھتے ہیں مگر باوجود اس کے امام طحاوی کی جلالت قدر سے اس قدر متاثر ہیں کہ اپنی کتاب مراتب الدیانۃ میں مصنف طحاوی کو موطا امام مالک پر ترجیح دی ہے، حالانکہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے عجالۂ نافعہ میں موطا امام مالک کو صحیحین (بخاری و مسلم) کی اصل وام قرار دیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب اور معانی الآثار

ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ بھی شرح معانی الآثار مذکور کو سنن ابی داؤد کے درجہ میں فرمایا کرتے تھے، غرض یہ امر ناقابل انکار ہے کہ اس کا مرتبہ سنن اربعہ سے تو کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ ان میں سے اکثر پر اس کو ترجیح ہے۔

افسوس ہے کہ بعض حضرات نے علامہ ابن حزم کی ترجیح مذکور کو ان کی جلالتِ شان کے خلاف سمجھا اور لکھا ہے حالانکہ خاص اس معاملہ میں ہمیں کوئی بات ایسی معلوم نہیں ہوئی واللہ اعلم عند اللہ

معانی الآثار کے خصائص و مزایا

یہاں ہم معانی الآثار کی چند خصوصیات محاسن و مزایا بھی ذکر کرتے ہیں تاکہ تعارف کامل ہو جائے

اس کو مقدمۂ امانی ص ۲۲ سے ترجمہ کیا جاتا ہے۔ جزی اللہ مؤلفہ خیر الجزاء

(۱) اس میں بہت سی وہ صحیح احادیث ہیں جو دوسری کتب حدیث میں نہیں پائی جاتیں۔

(۲) امام طحاوی اسانید حدیث بہ کثرت نقل کرتے ہیں اس لئے بیشتر احادیث مرویات غیر سے اس میں بہم زیادات ملتی ہیں اور تعدد اسانید سے حدیث قوی ہوجاتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں نے ایک حدیث کو ضعیف سند سے نقل کیا تھا امام طحاوی اسی کو قوی سند

سے لاتے ہیں، یا ان کے یہاں ایک طریق سے مروی تھی یہاں بہت سے طرق ذکر کئے، اور اس سے محدث کو بہت سے نکات و فوائد مہمہ حاصل ہوجاتے ہیں، کہیں ایسا ہوا ہے کہ دوسروں نے کسی حدیث کو بطریق تدلیس روایت کیا تھا، امام طحاوی نے اس سے تدلیس کا عیب ہٹا دیا، کہیں ایسا ہے کہ دوسروں نے حدیث کی روایت کسی ایسے راوی سے کی جو آخر عمر میں متصف بہ اختلاط ہوگیا تھا، امام طحاوی اسی راوی سے قبل اختلاط کی روایت لاتے ہیں، کہیں ایسا ہوا ہے کہ دوسروں نے ایک حدیث کو مرسل، منقطع یا موقوف طریقہ سے روایت کیا تھا، امام نے اس کو بطریق اتصال مرفوع روایت کیا اسی طرح امام اپنی کتاب میں دوسروں کے غیر منسوب رواۃ کی نسبت بتلا دیتے ہیں مبہم کا تسمیہ، مشتبہ کی تمیز، مجمل کی تفسیر، اضطراب و شک راوی کا سبب بیان کردیتے ہیں اور اسی قسم کے اور فوائد کثیرہ متنوعہ اس میں ملیں گے

(۳) معانی الآثار میں بکثرت آثار صحابہ و تابعین و اقوال ائمہ ذکر کئے گئے ہیں جو امام طحاوی کے معاصر محدثین کی کتابوں میں نہیں ہوتے، پھر امام طحاوی ائمہ کا کلام احادیث و رجال کی تصحیح، ترجیح یا تضعیف میں بھی نقل کرتے ہیں۔

(۴) مسائل فقہ پر ترجمہ باندھتے ہیں پھر احادیث لاتے ہیں اور ایسے دقیق استنباطات کرتے ہیں کہ ان کی طرف اذہان کم متوجہ ہوتے ہیں

(۵) پوری کتاب فقہی ابواب پر مرتب ہے لیکن بہت سے مواقع میں نہایت لطیف طریقوں سے خصوصی مناسبات پیدا کرکے ایسی احادیث لاتے ہیں جو بظاہر ان ابواب سے متعلق نہیں معلوم ہوتیں جیسے باب المیاہ میں حدیث "المسلم لا ینجس" اور حدیث "بول اعرابی در مسجد" یا حدیث قراۃ فی الفجر، باب وقت الفجر، میں وغیرہا۔

(۶) ادلۂ احناف کے ساتھ دوسروں کے دلائل بھی ذکر کرتے ہیں، تمام اخبار و آثار پر سند و متن رعایت و نظر کے لحاظ سے مکمل بحث و تنقیب کرتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ کتاب تفقہ و تعلیم طرق تفقہ اور ملکہ تفقہ کو ترقی دینے کے لئے بے نظیر و بے مثل ہے اس کے بعد بھی کوئی ایسی نافع و مفید کتاب سے صرف نظر و تغافل برتے تو یہ عقل و انصاف سے بہت بعید ہے

معانی الآثار کے بہت سے شیوخ وہی ہیں جو مسلم شریف کے ہیں، اس کی بیشتر احادیث

واسناد وہی ہیں جو صحاح ستہ، مصنف ابن ابی شیبہ اور دیگر کتب حفاظ حدیث کی ہیں، اور کتاب کے خصائص و محاسن کچھ اوپر لکھے گئے ہیں ان سے بھی کتاب مذکور کی مزید عظمت اور افادیت واضح ہے۔

علامہ عینیؒ (شارح بخاری ومعانی الآثار) نے برسوں تک جامعہ مؤیدیہ مصر میں معانی الآثار کا درس دیا ہے۔ ملک مؤید بڑا عالم اور علم دوست بادشاہ تھا علماء کو جمع کرکے علمی بحثیں کیا کرتا تھا حدیث کی بڑی بڑی کتابوں کے لئے خاص طور سے الگ الگ نمایاں مسندیں بنوائی تھیں جن پر بیٹھ کر علماء درس حدیث دیا کرتے تھے، ایک مسند وکرسی معانی الآثار کے لئے بھی مقرر کی تھی جس کیلئے علامہ عینی کو نامزد کیا تھا چنانچہ آپ نے مدتوں تک اس کا درس بڑی خوبی وتحقیق سے دیا، ظاہر ہے کہ ایک طرف دوسری امہات کتب بخاری ومسلم وغیرہ کے شیوخ ملک مؤید کے مقرر کردہ بیٹھ کر درس دیتے ہوں گے دوسری طرف حنفیہ کی واحد کتاب معانی الآثار کا درس علامہ عینی دیتے ہوں گے تو علامہ عینی کا درس کس شان کا ہوتا ہوگا۔

علامہ عینی نے غالباً اسی زمانہ میں معانی الآثار کی دونوں شرحیں لکھیں جن کا ذکر آگے آتا ہے آج بھی اس کی ضرورت ہے کہ معانی الآثار ہمارے دورۂ حدیث کا باقاعدہ جزو بن کر اس کا درس بخاری وترمذی کی طرح پوری تحقیق وتدقیق کے ساتھ دیا جائے، اگر ملک مؤید کے زمانہ میں اس کے درس کا اہتمام ضروری تھا تو آج اس سے کہیں زیادہ ضروری ہے کما لایخفی علی اہل العلم والبصیرۃ۔

اگر معانی الآثار کا درس اس کی شروح کو سامنے رکھ کر دیا جائے طلبۂ حدیث کو ہدایت ہو کہ الجوہر النقی جامع مسانید امام اعظم، کتب امام ابی یوسف وکتب امام محمد، عمدۃ القاری، عقود الجواہر المنیفہ وغیرہ کا لازمی طور سے خارج اوقات درس میں مطالعہ کریں، اور جہاں ضرورت ہو اساتذہ سے رجوع کریں تو ہمارے طلبہ صحیح معنی میں عالم حدیث ہو کر نکلیں اور جو کمی آج محسوس ہو رہی ہے اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

معانی الآثار کی شروح میں سے علامہ قرشی کی شرح - حاوی - اس لحاظ سے بہت زیادہ اہم ہے کہ اس کی احادیث کو صحاح ستہ ودیگر کتب حدیث کی احادیث کے ساتھ مطابق دکھایا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اس کا کچھ حصہ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے، کاش پوری کتاب

بھی کہیں ہو اور طبع ہو جائے۔

امام بیہقی نے جو اعتراضات امام طحاوی پر کیے تھے ان کے جواب میں قاضی القضاۃ شیخ علاؤالدین ماردینی نے الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی لکھی جس کا جواب آج تک کسی سے نہ ہو سکا واقعی بے مثل تحقیقی کتاب ہے دو جلد میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے اور سنن بیہقی کے ساتھ بھی شائع ہوئی ہے۔

اس میں مؤلف موصوف نے خاص طور پر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جس قسم کے اعتراضات امام بیہقی نے امام طحاوی پر کئے ہیں ان سب کے مرتکب وہ خود ہیں اور امام طحاوی ان سے بری ہیں مثلاً وہ اپنے مذہب کی تائید میں کوئی ضعیف السند حدیث لاتے ہیں اور اس کی توثیق کر دیتے ہیں اور ایک حدیث ہمارے مذہب کے موافق لاتے ہیں جس کی سند میں وہی شخص راوی ہوتا ہے جس کی اپنے معاملہ میں توثیق کر چکے تھے لیکن دو چار ورق کے بعد ہی یہاں اس کی تضعیف کر دیتے ہیں، بکثرت ایسا کرتے ہیں، اس وقت دونوں کتابیں مطبوعہ موجود ہیں جس کو شک ہو وہ دیکھ سکتا ہے، دوسری بہترین شرح حافظ عینی (شارح بخاری) کی مبانی الاخبار ہے جو دارالکتب المصریۃ میں خود مؤلف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ۶ جلدوں میں موجود ہے، اس میں رجال پر کلام نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے مؤلف موصوف نے مستقل کتاب معانی الاخبار لکھی تھی وہ بھی دو جلدوں میں ہے، حافظ عینی کی یہ عظیم الشان خدمت بھی شرح بخاری سے کم درجہ کی نہیں ہے (حاوی علامہ کوثریؒ)

تیسری قابل ذکر شرح بھی علامہ عینی کی ہی ہے "نخب الافکار فی شرح معانی الآثار" جس میں علامہ نے رجال پر بھی شرح معانی حدیث کے ذیل ہی میں بحث کی ہے جیسا کہ عمدۃ القاری شرح بخاری میں کی ہے اس کا بھی قلمی نسخہ دارالکتب المصریہ میں ہے اور کچھ اجزاء استنبول کے کتبخانوں میں بھی ہیں پوری کتاب ۸ ضخیم جلدوں میں ہے۔

چوتھی بہترین شرح خدا کے فضل و کرم بے پایاں سے وہ ہے جو حضرت العلام مولانا محمد یوسف صاحب دام ظلہم و عم فیوضہم امانی الاحبار کے نام سے تالیف فرما رہے ہیں جس کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے، ان کے پاس حافظ عینی کی شروح مذکورہ کے بھی کچھ حصے موجود ہیں جس سے توقع ہے

کہ یہ تمام شروح سابقہ کا بہترین خلاصہ و نچوڑ ہوگا، اللہ تعالیٰ حضرت موصوف کو اس کے اتمام و تکمیل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

علامہ کوثری نے معانی الآثار کی تلخیص کرنے والوں میں حافظ مغرب علامہ ابن عبدالبر مالکی اور حافظ زیلعی حنفی (صاحب نصب الرایہ) کے اسمار گرامی تحریر فرمائے ہیں۔

(۲) مشکل الآثار اس میں احادیث کے تضاد رفع کئے ہیں اور ان سے احکام کا استخراج کیا ہے، یہ آخری تصنیف ہے، استنبول کے مکتبہ فیض اللہ شیخ الاسلام میں مکمل، ضخیم مجلدات میں موجود ہے، حیدرآباد سے جو چار جلدیں طبع ہوئی ہیں وہ غالباً پوری کتاب کا نصف سے بھی کم حصہ ہے۔

علامہ کوثری نے فرمایا کہ جن لوگوں نے امام شافعی کی "اختلاف الحدیث" اور ابن قتیبہ کی "مختلف الحدیث" دیکھی ہوں اور پھر امام طحاوی کی کتاب مذکور بھی دیکھیں تو وہ بھی امام طحاوی کی جلالت قدر و وسعت علم کے زیادہ قائل ہوں گے۔

(۳) اختلاف العلماء یہ تصنیف مکمل نہیں ہو سکی تاہم ۱۳۰ جزو حدیثی میں بیان کی جاتی ہے، علامہ کوثری نے فرمایا کہ اس کی اصل میں نہیں دیکھ سکا البتہ اس کا خلاصہ جو ابوبکر رازی نے کیا ہے مکتبہ جار اللہ استنبول میں موجود ہے، اس مختصر میں ائمہ اربعہ، اصحاب ائمہ اربعہ، نخعی، عثمان بتی، اوزاعی ثوری، لیث بن سعد، ابن شبرمہ ابن ابی لیلیٰ، حسن بن حی وغیرہ مجتہدین و کبار محدثین متقدمین کے اقوال ذکر کئے ہیں، جن کی آرار آج مسائل خلافیہ میں معلوم ہو جائیں تو بہت بڑا علمی نفع ہو۔ کاش: وہ اصل یا یہ مختصر ہی شائع ہو جائے (حاوی علامہ کوثری)

(۴) کتاب احکام القرآن ۲۰ جزو میں احکام القرآن پر تصنیف ہے۔ قاضی عیاض نے اکمال میں فرمایا کہ امام طحاوی کی ایک ہزار ورق کی کتاب تفسیر قرآن میں ہے اور وہ ان کی احکام القرآن ہے (حاوی)

(۵) کتاب الشروط الکبیر ۴۰ جزو کی کتاب ہے جس کا کچھ حصہ بعض مستشرقین یورپ نے طبع کرایا ہے، کچھ اجزاء قلمی اس کے استنبول کے

کتب خانوں میں ہیں، اس کے علاوہ الشروط الاوسط اور الشروط الصغیر بھی ہیں اور ان سب سے امام طحاوی کا علم شروط و توثیق میں بھی کمال ظاہر ہے۔

(۸) مختصر الامام الطحاوی فقہ حنفی میں سب سے پہلی نہایت معتمد و اعلی تصنیف ہے اس میں امام اعظم و اصحاب امام کے اقوال مع ترجیحات ذکر کئے ہیں تصحیح وطبع کے پورے اہتمام سے احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے ۱۳۷۰ھ میں شائع کر دی ہے، صفحات ۴۰۸ اس کی بہت شروح لکھی گئیں، سب سے اقدم و اہم اور درایت و روایت کے لحاظ سے مستحکم ابوبکر رازی جصاص کی شرح ہے جس کا کچھ حصہ دارالکتب المصریہ میں ہے اور باقی اجزاء استنبول کے کتب خانوں میں ہیں، مختصر المزنی کے طرز و ترتیب پر ہے جو فقہ شافعی کی مشہور کتاب ہے، امام طحاوی نے اس کے علاوہ فقہ میں مختصر کبیر و مختصر صغیر بھی لکھی ہے۔

(۱۱) نقض کتاب المدلسین ۵ جزو کی کتاب ہے جس میں کرابیسی کی کتاب المدلسین کا بہترین رد کیا ہے، کرابیسی کی کتاب بہت مضر و خطرناک تھی اس میں اعداء سنت کو حدیث کے خلاف مواد فراہم کیا تھا اور اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے سب رواۃ حدیث کو گرانے کی سعی کی تھی تاکہ صرف وہ اور اس کا مذہب زندہ رہے۔

(۱۲) الرد علی ابی عبید کتاب النسب میں جو غلطیاں انھوں نے کی تھیں ان کی تصحیح امام طحاوی نے کی۔ (الجواہر المضیئہ)

(۱۳) التاریخ الکبیر ابن خلکان، ابن کثیر، یافعی، سیوطی، ملا علی قاری وغیرہ سب نے اس کا ذکر کیا ہے، ابن خلکان نے لکھا کہ میں نے اس کتاب کی تلاش میں انتہائی جستجو کی لیکن کامیابی نہ ہوئی، کتب رجال اس کی نقول سے بھری ہوئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت اہم اور معتمد ترین کتاب ہے۔

(۱۴) کتاب فی النحل واحکامها ۴۰ جزو کی اہم کتاب ہے۔ (حاوی)

(۱۵) عقیدۃ الطحاوی :- علامہ کوثری نے فرمایا کہ اس میں اہل سنت

والجماعت کے عقائد بہ لحاظِ مذہب فقہاء امت (امام اعظم و اصحاب امام) بیان کئے ہیں جس کی بہت سی شروح بھی لکھی گئی ہیں۔ (حاوی)

(۱۶) سنن الشافعی اس میں وہ سب احادیث جمع کر دی ہیں جو امام مزنی کے واسطہ سے امام شافعی سے مروی ہیں، علامہ عینی نے کہا کہ "مسند امام شافعی" کو روایت کرنے والے اکثر امام طحاوی کے واسطہ سے ہیں اسی لئے سنن الشافعی کو سنن الطحاوی بھی کہا جاتا ہے۔

(۱۷) شرح المغنی حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس سے بہت جگہ اخذ کیا ہے، مثلاً باب اذا صلی فی الثوب الواحد فلیجعل علی عاتقیہ" میں کہا کہ طحاوی نے شرح المغنی میں اس کا باب قائم کیا ہے اور اس کی ممانعت حضرت ابن عمرؓ، پھر طاؤس و نخعی سے نقل کی ہے۔ (مقدمہ امانی الاحبار)

ان کے علاوہ دوسری تالیفات یہ ہیں۔ النوادر الفقہیہ[۱۸]، ۱۰ جزء میں۔ النوادر والحکایات[۱۹] تقریباً ۲۰ جزء میں۔ جزء[۲۰] فی حکم ارض مکہ۔ جزء[۲۱] فی قسم الفیئ والغنائم۔ کتاب[۲۲] الاشربہ، الرد[۲۳] علی عیسی بن ابان، جزء[۲۴] فی الرزیۃ۔ شرح الجامع[۲۵] الصغیر للامام محمد، شرح الجامع[۲۶] الکبیر لہ، کتاب[۲۷] المحاضر والسجلات کتاب[۲۸] الوصایا، کتاب[۲۹] الفرائض، اخبار[۳۰] ابی حنیفہ و اصحابہ، کتاب التسویۃ[۳۱] بین حدثنا واخبرنا کتاب[۳۲] صحیح الآثار۔ اختلاف الروایات علی مذہب[۳۳] الکوفیین۔

بقیہ ص ۳۳ دینی مدارس کا نصاب تعلیم

وروایات کو عملی جامہ پہنانے سے کتراتا ہے، یہ ایسا لباس اور ایسی وضع قطع کو رائج کرنے پر آمادہ ہے جو دیگر ملتوں سے ممتاز نہ کر سکے بلکہ دیگر ملتوں کی تہذیب و روایات میں گم ہو جائے دشواری یہ ہے کہ خالص دینی ادارے اس نئے سانچے اور ڈھانچے پر اطمینان کے بجائے اپنے تشخصات کو قائم رکھنے پر اٹل ہیں خواہ کوئی انھیں بنیاد پرست کہے یا کٹر پنتھی، یہ اسلاف کے نقوش قدم پر قائم ہی رہیں گے اور تادیر اپنی خالص دینی تعلیم و تربیت کے ذریعہ اسلامی تہذیب و روایات کا نمونہ پیش کرتے رہیں گے۔

دارالعلوم دیوبند اور اس کا نظام تعلیم

از مولانا عبید اللہ سندھی

۱۸۵۷ء میں جب دہلی کی سلطنت کی آخری نشانی بھی مٹ گئی تو اس کے دو سال بعد شاہ محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت نے جو اب حجاز میں مقیم تھی اور امیر امداد اللہ کی رہنمائی میں ہندوستانی کام کرتی تھی فیصلہ کیا کہ اطراف دہلی میں امام عبدالعزیز کے مدرسے کے نمونہ پر ایک مدرسہ بنایا جائے چنانچہ مولانا قاسم اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سات سال تک مسلسل کوشش کرتے رہے، تب کہیں جاکر ۱۲۸۳ھ یعنی ۱۸۶۶ء میں سقوط دہلی کے نو سال بعد مدرسہ دیوبند کی تاسیس ہو سکی۔ اس کے بعد ان کی دوڑ دھوپ سے اسی طرز پر ایک مدرسہ سہارنپور میں اور ایک مراد آباد میں بنا جو مدرسہ دیوبند ہی کی شاخیں تھیں، اب تک شاہ محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت کی رہنمائی امیر امداد اللہ کے سپرد تھی، اور مکہ معظمہ میں بیٹھ کر اس تحریک کو چلاتے تھے، جب مدرسہ دیوبند کی تاسیس عمل میں آگئی تو اس جماعت نے مدرسہ مذکور کو اپنا مرکز بنا لیا، اس مدرسہ کے تمام کام امیر امداد اللہ کی مصلحت پر چلتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیوبند کی روح دراصل امیر امداد اللہ کی مصلحت پر چلنا ہے

ل ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنا پڑی، اس کے فوراً بعد ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کی شاخیں قائم کی جانے لگیں چنانچہ مدرسہ دیوبند کے چھ ماہ بعد سہارنپور میں ایک شاخ کھلی آخر میں تو ان شاخوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس تک پہنچ گئی تھی، مدرسہ دیوبند کی ان شاخوں کا نظام "لامرکزی" تھا یعنی سب کی سب دارالعلوم کے تابع اور اس کے قوانین کے مقید نہ تھیں شروع میں جب میں "جمعیت انصار" کی تنظیم کا کام کرتا تھا تو میری خواہش یہ تھی کہ یہ نظام "لامرکزی" کی بجائے مرکزی ہو جائے لیکن میرے استاد شیخ الہند اس خیال کی طرف کم التفات فرماتے، اس واقعہ کے تین سال بعد مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ لامرکزی نظام کس قدر مفید تھا، لامرکزیت کی وجہ سے حکومت ان شاخوں کے سارے نظام کو اپنے قابو میں نہیں کر سکتی بیشک مرکزیت کی وجہ سے ظاہری صورت اچھی ہو جاتی لیکن آزادی بہرحال "ظاہری صورت" سے مقدم ہوتی ہے (کتاب التمہید صفحہ ۱۶۲)

مدرسہ دیوبند کے ہفت سالہ نصاب تعلیم اور مستقل نظام عمل اور اساسی قواعد مولانا محمد قاسم نے بنائے، اس طرح انھوں نے اپنی اسکیم میں امام عبدالعزیز کے مدرسہ اور حزب ولی اللہ کے مقاصد کو محفوظ کردیا اس کے بعد دوبارہ مدرسہ دیوبند کے نصاب پر نظرثانی ہوئی، پہلی دفعہ مولانا محمد یعقوب صاحب دیوبندی کے زمانہ میں سات سال کے بجائے یہ نصاب ہشت سالہ کردیا گیا، دوسری بار مولانا شیخ الہند نے تحریک جمعیت الانصار کی بنا ڈالی۔ الحمدللہ کہ دونوں دفعہ حزب ولی اللہ کی تعلیمات کی روح محفوظ رہی، اب جب کبھی مدرسہ کے نصاب میں ترمیم کا سوال پیدا ہوتا ہے میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ پہلے کا ہفت سالہ نصاب تعلیم ہر حال میں محفوظ رہے، میں ڈرتا ہوں کہ مصر و شام کی تقلید میں کہیں اس نصاب میں بھی قطع و برید نہ کردی جائے جس کی وجہ سے اس کی وہ استعداد ختم نہ ہوجائے جس کے سبب سے اب تک یہ نصاب امام ولی اللہ کی حکمت کے مطالعہ کے لئے مقدمہ بنتا رہا ہے

مدرسہ دیوبند کے مرکزی فکر اور اس کی سیاسی مصلحت کے اصول امیر امداد اللہ اور ان کے رفقاء مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد اور مولانا محمد یعقوب دیوبندی کی جماعت نے معین کئے تھے، اس لئے دیوبندی پارٹی کی مرکزی جماعت میں وہ شخص شامل نہیں ہوسکتا، جو اصول کا ملاً تسلیم نہ کرتا ہو، مدرسۂ دیوبند کا اساسی اصول یہ ہے کہ حزب ولی اللہ نے اپنے پہلے دور میں جس قدر علوم و معارف کی اشاعت ضروری سمجھی، حنفی فقہ کی پابندی سے ان علوم و معارف کو تدریس و تصنیف کے ذریعہ زندہ رکھا جائے، نیز اس مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم سے جس قدر علماء تیار ہوں وہ مساجد اور مدارس میں کام کرنے کے لئے پوری استعداد رکھتے ہوں، اس تعلیم کے بعد جس قدر علماء امام ولی اللہ کے جادۂ قویمہ اور حکمت کی حفاظت کرنا چاہیں یا اپنے اندر حکومت کے مناصب عالیہ کی اہلیت پیدا کریں تو ان کے لئے کوئی خاص نصاب معین نہیں ہے، وہ درسی کتابوں سے فارغ ہوکر اساتذہ کی صحبت میں رہیں مثلاً یہ کہ علماء مولانا مولانا محمد قاسم کی صحبت میں امام ولی اللہ کی حکمت سے آشنا ہوسکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب دیوبندی کی رفاقت میں سیاسی اصول سمجھ سکتے تھے اور امیر امداد اللہ کی بیعت سے پارٹی میں منسلک ہوسکتے تھے۔

علاوہ ازیں مدرسۂ دیوبند کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کابل میں اپنا وقار پیدا کرے اس لئے ماورائے دریائے سندھ سے جس قدر طلبہ دیوبندی نظام کے ماتحت تعلیم پائیں انھیں

ہدایت کردی جائے کہ وہ اپنی قوم کے نظام اور اپنی حکومت کے آئین کو برہم نہ کریں، جس طرح ہندوستان میں دیوبندی جماعت مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے ساتھ بالاضطرار منازعت میں مبتلا ہوگئی ہے، کوشش کی جائے کہ یہ جھگڑے دریائے سندھ سے اُدھر نہ پھیلنے پائیں۔

نیز مدرسہ دیوبند کے لئے ضروری ہے کہ مکہ معظمہ کے مرکز کے توسط سے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ اپنا ربط زیادہ مستحکم کرتا رہے، نیز اضطراری حالات کو چھوڑکر مدرسہ دیوبند کو چاہئے کہ حکومت انگریزی کے مصالح سے غیر جانبداری اختیار کرے۔

مدرسہ دیوبند کی تاریخ کا پہلا دور مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات پر ۱۳۲۳ھ میں ختم ہوتا ہے۔ اس چہل سالہ دور کا سب سے بڑا کارنامہ علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت ہے اس عہد میں مدرسۂ دیوبند کی علمی تحریک اطراف ہند سے نکل کر افغانستان و ترکستان اور حجاز اور قازان تک پہونچ گئی اس اثنار میں دیوبند کے مرکزی فکر پر جس قدر بھی حملے ہوئے خواہ وہ نصاریٰ اور ہنود کی طرف سے ہوں یا شیعہ و مبتدعین کی طرف سے، یا نجدی و یمنی ذوق رکھنے والے نوجوانوں کی طرف سے، ان میں سے اکثر اعتراضات کے جوابات محققانہ اور مجادلانہ تیار ہوگئے۔

یہ مدرسۂ دیوبند کے پہلے دور کا کارنامہ ہے، مدرسہ دیوبند کا دوسرا دور ۱۳۲۳ھ میں حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی شیخ الہند کی صدارت سے شروع ہوا اور ۱۳۳۹ھ میں ان کی وفات پر ختم ہوا، اگر امام عبدالعزیز کی وفات پر ۱۲۳۹ھ میں حزب ولی اللہ کا پہلا دور ختم کردیا جائے اور امام ولی اللہ کے کام کی ابتدا ۱۱۴۴ھ سے پانچ سال پہلے جب کہ انھوں نے ترجمۂ قرآن لکھنا شروع کیا تھا مان لیا جائے تو حزب ولی اللہ کا پہلا دور بھی سو سال کا بن جاتا ہے۔ اور دوسرا دور بھی پورے سو سال کا قرار پاتا ہے۔

مدرسہ دیوبند کے دوسرے دور میں سب سے پہلے مولانا شیخ الہندؒ نے مدرسہ کے پرانے فارغ شدہ عالموں کو جمعیت الانصار میں جمع کرنا شروع کیا اس طرح دیوبندی نظام کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی ساری اجتماعی طاقت منظم ہوگئی اور اس نظام میں جس طرح ہندوستان کے علماء داخل ہوئے اسی طرح افغانستانی اور ترکستانی علماء بھی شامل ہوگئے نیز درجہ تکمیل جواب تک (باقی ص۴۲)

نصاب کی خامی یا خوبی؟

جہاں تک
دینی مدارس کے نصاب کا تعلق ہے اس میں اس
کے سوا کوئی خامی نہیں کہ سرکاری حلقوں میں اس نصاب کو شرفِ
پذیرائی حاصل نہیں، یہ اپنی اپنی نظر ہے کہ اس کو خامی تصور کیا جائے؟ یا خوبی؟ ہماری
دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ یہ اس نصاب کی خامی نہیں بلکہ خوبی ہے۔ جو نصاب تعلیم سرکاری
تعلیم گاہوں میں نافذ ہے ایک جہان کا جہان اس سے استفادہ کرکے اپنی دنیا بنا رہا ہے اور ہزاروں میں ایک
آدھ فرد ایسا ہے جو دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے ذریعہ اپنے دین کو سیکھنا اور اپنی عاقبت کو سنوارنا چاہتا ہے۔
اگر مجوزہ سرکاری منصوبے کے مطابق دینی مدارس میں بھی وہی نصاب تعلیم جاری کر دیا جائے جس کی افراط بدہضمی کی حد تک پہنچ
گئی ہے (اور جدید تعلیم گاہوں کے ہزاروں افراد اچھی اچھی ڈگریوں کا پشتارہ لئے بے روزگاری کی وادی تیہ میں
سرگرداں ہیں) تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ ہزاروں میں سے ایک فرد جو دین سیکھنے کیلئے دینی مدارس کو قبلۂ توجہ بناتا
تھا اس کیلئے بھی کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہیگی۔ اسلئے دینی مدارس کو جدید تعلیم گاہوں میں ڈھالنے
کے بجائے یہی بہتر ہیکہ ان مدارس کو انکے حال پر رہنے دیا جائے اور جو لوگ سرکاری
مراعات کے خواہشمند ہوں ان کو مشورہ دیا جائے کہ

وہ
دینی مدارس
کے بجائے جدید تعلیم گاہوں
سے استفادہ کریں دینی مدارس کو
جدید تعلیم گاہوں میں تبدیل کرکے ان کی
ماہیت بدل دینا علماء کرام کا ایک ایسا جرم
ہوگا جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ (مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی)

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین ومخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ وروغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ ابھی رقم لگادی جائے اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھا لیا گیا، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عند اللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب وآلام سے محفوظ رکھے، آمین۔

پتہ

ڈرافٹ وچیک کیلئے :- دارالعلوم دیوبند ، اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے :- (حضرت مولانا) مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ، پن کوڈ نمبر 247554

۱۵:۔ حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ
۱۶:۔ حضرت مولانا قاری محمد صدیق "
۱۷:۔ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ
۱۸:۔ حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی "

حضرات مشائخ

۱:۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ
۲:۔ قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی "
۳:۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری "
۴:۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی "
۵:۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی "
۶:۔ حضرت مولانا محمد علی مونگیری "
۷:۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری "
۸:۔ حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین دیوبندی "
۹:۔ حضرت مولانا ضرغام الدین فیض آبادی "
۱۰:۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری "
۱۱:۔ حضرت مولانا عبدالغفور عباسی مدنی "
۱۲:۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری "
۱۳:۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمہ اللہ "
۱۴:۔ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری "
۱۵:۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی "
۱۶:۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا "
۱۷:۔ حضرت مولانا اسعد اللہ رام پوری "
۱۸:۔ حضرت مولانا عبدالحق اکوڑوی "
۱۹:۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی "
۲۰:۔ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ
۲۱:۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری "
۲۲:۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادی "
۲۳:۔ حضرت مولانا قاری فخرالدین گیاوی "
۲۴:۔ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی مدظلہ
۲۵:۔ حضرت مولانا عبدالجبار معروفی سابق شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مرادآباد رحمہ اللہ
۲۶:۔ حضرت مولانا ابرارالحق ہردوئی مدظلہ
۲۷:۔ حضرت مولانا سید اسعد مدنی "
۲۸:۔ حضرت مولانا قاری محمد صدیق "
۲۹:۔ حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی "
۳۰:۔ حضرت مولانا محمد طلحہ کاندھلوی "
۳۱:۔ حضرت مولانا احمد علی آسامی "

۷:- حضرت مولانا عبدالمومن دیوبندی	رحمہ اللہ	۲۱:- حضرت مولانا محمد مراد پاک پٹنی	رحمہ اللہ
۸:- حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی	"	۲۲:- حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی	"
۹:- حضرت مولانا غلام رسول خاں ہزاروی	"	۲۳:- حضرت مولانا محمد رسول خاں	"
۱۰:- حضرت مولانا محمد صدیق انبیٹھوی	"	۲۴:- حضرت مولانا عبدالحق اکوڑوی	"
۱۱:- حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی	"	۲۵:- حضرت مولانا حمیدالدین فیض آبادی	"
۱۲:- حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی	"	۲۶:- حضرت مولانا محمد حیات سنبھلی	"
۱۳:- حضرت مولانا خیر محمد جالندھری	"	۲۷:- حضرت مولانا احمد حسن کانپوری	"
۱۴:- حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری	"	۲۸:- حضرت مولانا عبدالستار معروفی	"
۱۵:- حضرت مولانا محمد صدیق کشمیری	"	۲۹:- حضرت مولانا بشیر احمد بلند شہری	"
۱۶:- حضرت مولانا محمد عبدالسمیع دیوبندی	"	۳۰:- حضرت مولانا معراج الحق دیوبندی	"
۱۷:- حضرت مولانا زین العابدین اعظمی	"	۳۱:- حضرت مولانا محمد حسین بہاری	"
۱۸:- حضرت مولانا محمد یحییٰ سہسرامی	"	۳۲:- حضرت مولانا شکر اللہ اعظمی	"
۱۹:- حضرت مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوری	"	۳۳:- حضرت مولانا علی احمد اعظمی	"
۲۰:- حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہوی	"	۳۴:- حضرت مولانا عبدالصمد کوپاگنجی	"

مبلغینِ اسلام

۱:- حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی	رحمہ اللہ	۸:- حضرت مولانا محمد قاسم شاہجہانپوری	رحمہ اللہ
۲:- حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن بجنوری	"	۹:- حضرت مولانا عبدالجبار حصاروی	"
۳:- حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی	"	۱۰:- حضرت مولانا محمد علی جالندھری	"
۴:- حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب	"	۱۱:- حضرت مولانا سید ارشاد احمد فیض آبادی	"
۵:- حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری	"	۱۲:- حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی	"
۶:- حضرت مولانا محمد ادریس سکروڈوی	"	۱۳:- حضرت مولانا عبید اللہ بلیاوی	"
۷:- حضرت مولانا سید معظم علی	"	۱۴:- حضرت مولانا محمد عمر پالن پوری	مدظلہٗ

۱:۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ
۲:۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی ״
۳:۔ حضرت مولانا سعادت علی سہارنپوری ״
۴:۔ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی ״
۵:۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی ״
۶:۔ حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی ״
۷:۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ״
۸:۔ حضرت مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوری ״
۹:۔ حضرت مولانا مفتی ریاض الدین بجنوری ״
۱۰:۔ حضرت مولانا مفتی محمد فاروق ״
۱۱:۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ میرٹھی ״
۱۲:۔ حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوری ״
۱۳:۔ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی مدظلہ
۱۴:۔ حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی مدظلہ
۱۵:۔ حضرت مولانا مفتی محمد اسمٰعیل بسم اللہ سورتی رحمہ اللہ
۱۶:۔ حضرت مولانا مفتی احمد سعید اجراڑوی ״
۱۷:۔ حضرت مولانا فقیر اللہ رائے پوری رحمہ اللہ
۱۸:۔ حضرت مولانا مفتی محمود سرحدی ״
۱۹:۔ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی ״
۲۰:۔ حضرت مولانا مفتی محمد یوسف آزاد کشمیر ״
۲۱:۔ حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی مدظلہ
۲۲:۔ حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری ״
۲۳:۔ حضرت مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی رحمہ اللہ
۲۴:۔ حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی مدظلہ
۲۵:۔ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی ״
۲۶:۔ حضرت مولانا مفتی منظور احمد مظاہری ״
۲۷:۔ حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی ״
۲۸:۔ حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن دہلی ״
۲۹:۔ حضرت مولانا مفتی شبیر احمد مدراسی ״
۳۰:۔ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام ״
۳۱:۔ حضرت مولانا مفتی ابوزید باندہ ״

اصحاب تدریس

۱:۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ
۲:۔ حضرت مولانا سید احمد دہلوی ״
۳:۔ حضرت مولانا احمد حسن امروہوی ״
۴:۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ
۵:۔ حضرت مولانا منفعت علی ״ ״
۶:۔ حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھی ״

۷:۔ حضرت مولانا حسین علی پنجابی رحمہ اللہ
۸:۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی ″
۹:۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ″
۱۰:۔ حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی ″
۱۱:۔ حضرت مولانا غلام اللہ خان رحمہ اللہ
۱۲:۔ حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی مدظلہ
۱۳:۔ حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی ″

متکلمین اسلام

۱:۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ
۲:۔ حضرت مولانا رحیم اللہ بجنوری ″
۳:۔ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری ″
۴:۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ″
۵:۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی ″
۶:۔ حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی ″
۷:۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
۸:۔ حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی ″
۹:۔ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی ″
۱۰:۔ حضرت مولانا علامہ خالد محمود مدظلہ
۱۱:۔ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین ″

مصنفین و مؤرخین

۱:۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ
۲:۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ″
۳:۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ″
۴:۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی ″
۵:۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ″
۶:۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی ″
۷:۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی ″
۸:۔ حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی ″
۹:۔ حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث سہارنپوری ″
۱۰:۔ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ″
۱۱:۔ حضرت مولانا قاضی زین العابدین رحمہ اللہ
۱۲:۔ مولانا نور الحسن شیرکوٹی ″
۱۳:۔ مولانا یعقوب الرحمٰن ″
۱۴:۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ
۱۵:۔ حضرت مولانا سرفراز احمد صفدر ″
۱۶:۔ مولانا سید نور الحسن بخاری رحمہ اللہ
۱۷:۔ مولانا قاضی محمد اطہر مبارکپوری مدظلہ
۱۸:۔ مولانا محمد تقی عثمانی ″
۱۹:۔ مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی ″
۲۰:۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی ″

طبقاتِ مشاہیر علماء دیوبند

محدثین

1 :- حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری رحمہ اللہ
۲ :- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ״
۳ :- حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ״
۴ :- حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی ״
۵ :- حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ״
۶ :- حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ״
۷ :- حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی ״
۸ :- حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ״
۹ :- حضرت مولانا عبد العلی میرٹھی ״
۱۰ :- حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری ״
۱۱ :- حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ״
۱۲ :- حضرت مولانا محمد اسحاق امرتسری ״
۱۳ :- حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ״
۱۴ :- حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی ״
۱۵ :- حضرت مولانا عبد العزیز گجرانوالہ رحمہ اللہ
۱۶ :- حضرت مولانا فخر الدین مراد آبادی ״
۱۷ :- حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری ״
۱۸ :- حضرت مولانا حبیب الرحمن محدث اعظمی ״
۱۹ :- حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری ״
۲۰ :- حضرت مولانا ماجد علی جون پوری ״
۲۱ :- حضرت مولانا عبد الغفار مئوی ״
۲۲ :- حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی ״
۲۳ :- حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ״
۲۴ :- حضرت مولانا اشفاق الرحمن کاندھلوی ״
۲۵ :- حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوری ״
۲۶ :- حضرت مولانا عبد الرحمن کامل پوری ״
۲۷ :-

مفسرین

۱ :- حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ
۲ :- حضرت مولانا عبد الرحمن امروہوی ״
۳ :- حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی ״
۴ :- حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
۵ :- حضرت مولانا احمد علی لاہوری ״
۶ :- حضرت مولانا احمد سعید دہلوی ״

دارالعلوم نے مسلمانوں کو کیا دیا؟

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بظاہر ناکام ہونے والے شکستہ دل مسلمانوں کی دینی و قومی روایات کا تحفظ کیا، ولی اللّٰہی منہاج پر تعلیمات کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی، اسلام مخالف تحریکات کی سرکوبی کی، برصغیر اور دیگر براعظموں میں مساجد و مدارس کے ذریعہ قال اللہ و قال الرسول کی صداؤں کو عام کیا، فرنگی سامراج کے ظالمانہ اقتدار کی جڑیں اکھاڑ کر ہندوستان کو آزاد کرایا، اسلام اور پیغمبر اسلام پر کئے گئے ناروا حملوں کا جواب دیا، تفسیر حدیث، فقہ، کلام اور جملہ علوم و فنون کی عظیم الشان لائبریری تیار کی، عظمت صحابہ اور عزت اسلاف کا تحفظ کیا منکرین ختم نبوت کا کامیاب تعاقب کیا، بدعات کی تاریکیوں میں سنت کی مشعلیں روشن کیں اور آئندہ کام کرنے کے لئے سیکڑوں مجاہد، عالم، مفسر، محدث، متکلم، فقیہ، مؤرخ، مقرر، خطیب، طبیب، مناظر، صحافی، صوفیا، قرار، حفاظ اور سیاستداں پیدا کئے۔

تعداد فضلاء دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ تا ۱۴۱۴ھ							
ہندوستان	۲۰۳۷۹	مالدیپ	۱	فرانس	۱		
پاکستان	۱۵۲۴	ترکستان	۲۰	فیجی	۷		
بنگلہ دیش	۲۱۵۴	مصر	۱	لبنان	۶		
افغانستان	۱۱۸	یمن	۱	تعداد بیرون ملک	۵۰۷۸		
نیپال	۱۱۹	انڈونیشیا	۱				
برما	۱۶۰	ملیشیا	۵۱۸	تعداد اندرون ملک	۲۰۳۷۹		
شری لنکا	۱۹	کمبوڈیا	۱				
چین	۴۴	امریکہ	۱۶	کل تعداد	۲۵۴۵۷		
روس	۷۰	افریقہ	۲۳۷				
ایران	۱۱	برطانیہ	۲۱	تعداد مستفیدین	۵۱۹۲۵		
عراق	۲	سوڈان	۶				
کویت	۲	ویسٹ انڈیز	۴	کل تعداد	۷۷۳۸۲		
سعودی عرب	۲	تھائی لینڈ	۸				
مسقط	۱	نیوزی لینڈ	۲				

ایک صحابی سے ایک معاملہ میں سہو ہوگیا، احساس لغزش وخطا نے بہت شرمسار و نادم کیا، حضور رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست بخشش ورحمت کرائی جاسکتی تھی، لیکن ہاں کیا کہوں! اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے بندھوادیا، اور کہا کہ جب تک میرے خدا کی طرف سے معافی نہ ہو میں یہاں سے رہائی پانے کا نہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک بات پہونچی، فرمایا اگر وہ مجھ سے کہتا تو میں اس کی معافی کی درخواست خدا سے کرتا، لیکن اس نے خود اپنے معاملہ کو خدا کے سپرد کردیا ہے۔ تو میں بھی خدا کے فیصلہ کا انتظار کروں گا، عبد ومعبود کے درمیان تعلق عبدیت ومعبودیت کے ایسے مظاہر دنیائے انسانیت نے شاید ہی دیکھے ہوں۔ فیصلۂ معافی خدا کی طرف سے ہوتا ہے، لوگ رہا کرنے دوڑتے ہیں لیکن وہ تو جذب وکیف کے کسی اور ہی عالم میں تھے، دو سعادتوں کو جمع کرنا چاہتے تھے، کہا کہ مجھے نبیٔ رحمت اپنے دست مبارک سے رہا فرمائیں، اور نبیٔ رحمت نے رہا فرمایا، خدا سے فیصلہ معافی اور نبیؐ سے رہائی، ان دو سعادتوں سے نوازے گئے۔

یہ تو برائے نمونہ ایک مثال ہے ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا ہر فرد کا یہی حال تھا، نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے امت کو کیسا اونچا مقام عطا فرمایا تھا، اس کی پرواز کتنی اونچی رکھی گئی تھی ؎

غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

عرض مدعا آہ! آج یہ امت کس مقام پر کھڑی ہے اسی امت کا ایک فرد میں خود ہوں سوچوں تو صحیح کہ میں کس مقام پر ہوں، کیا خدا سے مجھے ایسا تعلق ہے، کیا خدا سے مجھے کوئی توقع ہے، کیا میں خدا سے کہہ کر کوئی بات پوری کرواسکتا ہوں، نگاہِ سماوی کیلئے گر گیا کہ نگاہِ ارضی میں بھی کچھ وقعت باقی نہیں رہی، امت کے اس حال زار پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی کڑھن ہوتی ہوگی رات ودن امت کے غم میں جس نے زندگی بھر اپنے کو بے چین رکھا، قبر اطہر کے اندر اس کی فرحت ومسرت کیلئے امت نے کیا سوغات بھیجی ہے، اللہ ہم سب کو ہوش نصیب فرمائے، عزیز دوستو! آج زندگی ہے تلافی مافات کا موقع میسر ہے کل فرصت ملے نہ ملے ارادہ فرمائیں کہ اس دولت لازوال کو اس علم معرفت کو جسے دینے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو واسطہ بنایا گیا تھا پانے کی ہم کوشش کرینگے اور ساری دنیا کو اپنے بوں پایۂ دینے کی کوشش کریں گے تاکہ انسانیت پھر اس مقام پر آکھڑی ہوجائے جس مقام پر نبی ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہونچایا تھا۔ (باقی برصفحہ ۱۷)

مولوی صاحب مکرر وسہ کر راپنی رٹ لگا رہے تھے کہ آپ ایک حلقۂ قلم تشکیل دیجئے اور سب اہل قلم مل کر قوم کی اصلاح فرما دیجئے۔ علامہ نے فرمایا، مولوی صاحب، آپ بڑے بھولے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ ہم سب مل کر قوم کی اصلاح کرسکیں، آخر میں مولوی صاحب نے فرمایا، کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایک نبیؐ امی نے باوجود صاحب قلم نہ ہونے کے صرف ۲۳ سال کے مختصر عرصہ میں آج سے زیادہ بگڑی قوم کی اصلاح فرمادی تھی، علامہ نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہوا تھا، مولوی صاحب نے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ آپ معجزہ کا انکار کرتے ہیں، لیکن آج مجھے بھی اور آپ کو بھی معلوم ہوگیا کہ آپ معجزہ کے منکر نہیں ہیں، کیوں کہ جہاں سارے اہل قلم ایک بات میں عاجز ہیں وہاں ایک نبیؐ امی وہ بات پوری کرکے دکھا رہا ہے، علامہ صاحب! آپ ہی فرمائیے کہ پھر معجزہ کسے کہتے ہیں؟

حضورؐ کا اصل کارنامہ

یہ نہیں کہ اس نبیؐ علم وحکمت نے اس علم کو جو خدا کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا، امت میں صرف منتقل فرمادیا، بلکہ اس علم عرفان کے ذریعہ امت کے ہر فرد کو اس مقام پر پہونچا دیا کہ اس سے اونچے مقام کا تصور نہیں کیا جاسکتا، نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے؟ دنیا کے اور مصلحین کی طرح کہ گوتم فلاں جگہ پیدا ہوا اور اس کی تعلیمات یہ تھیں، زرتشت فلاں جگہ پیدا ہوا، اور اس کی تعلیمات یہ یہ تھیں۔ اسی زمرہ میں یہ پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے اور کلمہ نماز روزہ حج اور زکوٰۃ آپ کی تعلیمات تھیں اور بس، ساری دنیا بس اتنا ہی جانتی ہے اور مقام افسوس ہے کہ مسلمان بھی اتنا ہی جانتا ہے، اس لئے کہ علوم عصری میں اس سے زیادہ جاننے کی گنجائش نہیں تھی بلکہ اس کی صرف اتنی ہی گنجائش رکھی گئی تھی، اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل کارنامے کو چھپایا گیا تھا، ایک ایسا کارنامہ جسے دنیائے انسانیت اپنی ابتدار سے آج تک نہیں دیکھ سکی تھی، اور قیامت تک کسی اور سے ایسے کارنامہ کی توقع نہیں کی جاسکتی، وہ کارنامہ کیا تھا؟ وہ عظیم کارنامہ یہ تھا کہ صرف ۲۳ سال کے عرصہ مختصر میں کم وبیش ایک لاکھ ۲۴ ہزار کی ایک ایسی مقدس وعظیم جماعت تیار ہوگئی تھی کہ اس جماعت کا ہر فرد رہتا تو فرش پر تھا لیکن اس کا تعلق عرش والے سے قائم ہوگیا تھا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر۔

بچوں کو منتقل کر دیتیں، ان میں طلب علم، جذبہ عمل پیدا کر دیتیں، انھیں دین کی خاطر قربانی دینے کے لئے تیار و آمادہ کر دیتیں، اس طرح تعلیم اطفال کا ٹارجیٹ پورا ہو جاتا تھا۔

گھر کا مقام

گھر کیا تھا؟ ایک خانقاہ، جہاں پر اللہ کا ذکر ہوتا تھا، گھر کیا تھا؟ ایک مدرسہ، جہاں پر علم دین سیکھا سکھایا جاتا تھا۔ گھر کیا تھا؟؟! دینی جد و جہد کا ایک مرکز۔ جہاں پر بچوں میں مجاہدانہ جذبات پیدا کئے جاتے تھے، عورتیں علم کا اتنا وافر حصہ پالیتی تھیں کہ انھیں یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ دین کے تعلق سے مردوں کے متعلق کیا تقاضے ہیں، عورتوں کے متعلق کیا تقاضے ہیں اور بچوں کے متعلق کیا تقاضے ہیں، وہ اپنے گھر میں رہ کر ان سہ رُخی تقاضوں کو پورا کرنے اور کرانے کی فکر میں ڈوبی رہتیں، مردوں کو ان کے تقاضے یاد دلاتیں بچوں کو ان کے تقاضوں سے روشناس کرتیں اور اپنے متعلق تقاضوں کو پورا کرنے میں منہمک ہو جاتیں، وقت کی تنگ دامانی مثالوں کو پیش کرنے کی اجازت نہیں دے رہی ہے، سیرت کی کتابوں میں ان کی تفصیلات مل جائیں گی۔

زورِ قلم یا اعجازِ نبوت

یہ صرف اعجازِ رسالت تھا کہ ۲۳ رسال کی فکر و محنت نے یہ بہار دکھائی تھی، اور نبی بھی وہ جسے اپنے اُمّی ہونے پر فخر ہے، اس نبیِ حکیم کبھی صحافی و مصنف ہونے کا اور اپنے اہل قلم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا، اس کو صرف اور صرف ایک اعجاز ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، ورنہ مشاہدات و تجربات کی دنیا میں یہ ایک انھونی بات تھی، دنیا میں کتنے لکھاڑ ہیں، کتنے اہل قلم ہیں جنھوں نے اپنی انشا پردازی اور قلم کے دھنی ہونے کا سکہ جمایا ہے، کیا ان کی تحریروں نے کبھی ایسا انقلاب پیدا کیا ہے؟

قریب کے زمانہ میں ایک صاحب قلم کے بڑے دھنی تھے، اور ایک رسالہ کے مدیر۔ علمی دنیا ان کو "علامہ" کے بھاری بھرکم نام سے جانتی تھی، لیکن وہ معجزہ کے منکر تھے ان کے پاس ایک مولوی صاحب پہونچ گئے اور یوں ارشاد فرمایا کہ علامہ صاحب! اللہ نے آپ کو صاحب قلم بنایا ہے، خدا کے لئے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیے، اور اگر آپ کوشش کر ڈالیں تو توقع ہے کہ قوم کی اصلاح ہو جائے گی، علامہ نے جواباً فرمایا کہ یہ ناممکن ہے۔

کام لیا اور لٹیروں کے سردار سے کہا۔ بھائی! مال ومتاع تو تمھارے کچھ کام آئے جو تمھیں مطلوب بھی ہے، لیکن یہ نستعلیقات کس کام کے اور یہ تمھارا مطلوب بھی نہیں، انھیں واپس لوٹا دو، اس درخواست پر سبحان اللہ! ایک لیٹرے کی زبان سے حکمت کی بات اچھل پڑی، اس نے کہا، حضرت علم در سینہ نہ کہ در سفینہ، اور مسکراتے ہوئے نستعلیقات واپس کر دیئے، بات بڑے پتہ کی تھی، حضرت غزالی رہ کے دل میں بیٹھ گئی، گھر آئے تو پہلا کام یہ کیا کہ سفینہ کے خزانہ کو سینہ میں چھپا لیا اور سب کچھ ازبر کر لیا، اور پھر کہا اب اس کے لٹنے کا کوئی خطرہ نہیں

ع۔ نہ بہت دور پہنچ جائے مری بات کہیں۔

تعلیم بالغان آئیے پلٹ کر اس حلقۂ تعلیم کی طرف جہاں پر شمع رسالت کے پروانے علم وعرفان حاصل کر رہے تھے، اور معرفت وآگہی، تعلیم بالغاں کا د (Adult Education) ٹارجیٹ، مسجد نبوی میں پورا ہو رہا تھا، اور پورا ہو گیا تھا، اور یہ مرحلہ کتنی سادگی کے ساتھ طے ہو گیا اور کتنی آسانی کے ساتھ

تعلیم نسواں ادھر مسجد کا حلقہ ختم ہو گیا ادھر گھر کا حلقہ شروع ہو گیا، مسجد کے حلقہ کا جیسا اشتیاق مردوں کو تھا، گھر کے حلقوں کا ایسا اشتیاق عورتوں کو تھا مرد مسجد کے حلقہ سے نکل کر گھر کے حلقہ میں بیٹھ گئے، اور وہ سب کچھ جو انھوں نے زبانِ رسالت سے سنا تھا گھر میں سنا دیا، وہ مسجد کے متعلم تھے اور گھر کے استاد، اس طرح گھر کی عورتیں گھر میں رہ کر علم وعرفان سے فیضیاب ہوتی تھیں، شمع انجمن بننے کی انھیں قطعی ضرورت نہیں تھی۔ گھر چراغ خانہ ہی سے روشن ہو جاتے تھے، اور یہ چراغ خانہ کبھی اتنے تاباں ومنور ہو جاتے کہ مردوں کو اس روشنی کے لئے رہین منت ہونا پڑتا اور وہ مسائل جو مردوں کے لئے باعثِ الجھن ہوتے عورتیں ان کو سلجھا دیتیں، بہرحال بغیر کسی شور وہنگامہ کے تعلیم نسواں کا یہ مرحلہ یوں پورا ہو جاتا۔

تعلیم اطفال مسجد کے متعلم اور گھر کے معلم، اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر جب کاروبار زندگی میں لگ جاتے تو یہ گھر کی طالبات بچوں کی استاد بن جاتیں اور گھریلو کام کاج سے وقت نکال کر بڑی اہمیت کے ساتھ اس خزانے کو جیسے مردوں نے ان پر لٹا دیا تھا

تھے، وہیں ڈھلتے تھے، قربان جائیے اس حلقۂ تعلیم کے۔

مثالی زندگی

اس حلقۂ تعلیم میں زندگی بنی، ڈھلی اور سنوری۔ فکر و نظر کو روشنی ملی، فکر کا رخ صحیح ہوا، عمل کا پہلو نمایاں ہوا، پھر زندگی اس معیار پر پہونچ گئی کہ زبان نبوت پکار اٹھی۔ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ۔ میرے صحابہ چمکتے ستاروں کی مانند ہیں، کوئی ان میں سے کسی کی بھی اقتدا کرے گا ہدایت پالیگا۔ یہ سند، سند تعلیم نہیں تھی بلکہ سند زندگی تھی، ہے کوئی ادارہ یا دانشکدہ کہ اپنے فارغین کو سند فراغت کی بجائے سندِ معیار زندگی دے سکے۔

یہ ستارے چمکے، ان کی چمک کیسی تھی؟ ہر ایک اپنے اندر ایک انفرادیت اور جاذبیت رکھتا، یہاں بوبکرؓ جیسے صدیق، عمرؓ جیسے فاروق، عثمانؓ جیسے غنی، علیؓ جیسے اہل علم و بصیرت، ابی بن کعبؓ جیسے قاری، عبداللہ ابن مسعودؓ، اور عبداللہ ابن عباسؓ جیسے فقیہ، خالد بن ولیدؓ جیسے جرنیل، معاذ بن جبلؓ جیسے صوفی، اور ابوالدرداءؓ جیسے اہل ورع و تقویٰ سب یہاں ملیں گے، ان جلووں کا مشاہدہ کوئی کیا کر سکے گا ع

میں کامیابِ دید بھی ناکامِ دید بھی ⁂ جلووں کے اژدحام نے حیراں بنادیا

تعلیم میں دل کا مقام

یہاں پر تختیاں تھیں نہ قرطاس جن پر علم و حکم کے موتی نقش تحریر کئے جاتے، کسی نے کبھی ورق پریشاں پر نقش کرلیا ہو تو ہو ورنہ تعلیقات (NOTES) کا کام دینے والا اصل صفحہ صفحۂ دل تھا، جہاں پر ہر موتی اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے جگہ پاتا تھا جس کے گم ہونے کا خوف و خطرا نھیں بالکل نہیں تھا۔

واقعۂ غزالیؒ

قرطاس دل کی اس اہمیت کا اندازہ بعد کے دور کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے، امام غزالیؒ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے تعلیقات کا دفتر لئے ایک کارواں کے ساتھ وطن مالوف واپس ہورہے تھے، اتفاق کی بات کہ راستے میں قافلہ لٹا، اوروں کا مال اور اس کے متعلقات، لیکن امام غزالیؒ کے تعلیقات چھین لئے گئے مال کے کے لٹنے کا اہل قافلہ کو شاید اتنا غم نہ ہوا ہو جتنا کہ ان کے لٹنے کا امام غزالیؒ کو ہوا، اوروں کی نظر میں ان کا مال لٹا تھا، حضرت امام غزالیؒ کی نظر میں ان کی زندگی لٹی تھی، انھوں نے جرأت سے

زلفِ جاناں سنوارنے والو ÷ اور بھی کام ہیں زمانہ میں

مسجد نبوی کا چبوترہ تھا جہاں ان کا قیام رہتا، یہ گویا ان کی اقامت گاہ تھی جسے مسجد نبوی کی پرکیف فضائیں حاصل تھیں، جن میں ان کا ایمان بنتا، ان کی کردار سازی ہوتی، جہاں آدمی انسان بنتا تھا اور انسان آدمی، تعلیم وتعلم کے اس اقامتی کردار نے کبھی اقامتی کردار کی مروجہ اصطلاح نہیں پائی اور نہ کبھی اس اقامت گاہ کو ہوسٹل کے خوشنما نام سے موسوم کیا گیا، اس اقامت گاہ میں روشنی، پانی، مطبخ (Boarding) دارالمطالعہ، کتب خانہ وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں تھا، ان لوازمات کے نہ ہونے کی ان کو کبھی شکایت بھی نہیں ہوئی، شمع علم کے پروانوں کو ان لوازمات کی ضرورت بھی نہیں تھی، ان کا مقصد بہرکیف تحصیل علم تھا اور بس، یہ صفہ کے رہنے والے تھے اور کردار کے اعتبار سے مزکّیٰ ومصفا تھے۔

جذبات وکردار سازی اس حلقۂ تعلیم میں جذبات وکردار (Sentiment of Character) کا فلسفہ پیش نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ عملی حیثیت سے اعلیٰ جذبات کے ذریعہ کردار سازی کی جاتی تھی، شاید ہی اس حلقۂ تعلیم کے شرکا نے اس بات کو پڑھا یا سنا ہو کہ

Sentiments are The raw Material of Character

جذبات کردار سازی کے لئے خام اشیاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔

The First work of All Education is the Formation Right Sentiments and Disposition

(تعلیم کا پہلا کام صحیح جذبات ومزاج کی تشکیل ہے۔

لیکن عملی حیثیت سے (Practically) جذبات کو صحیح رخ مل جاتا تھا، اور اس کے نتیجہ میں کردار کا ایک اعلیٰ نمونہ سامنے آجاتا تھا۔

تربیت کا اہتمام یہ حلقۂ تعلیم، تعلیم کا بھی مرکز تھا اور تربیت کا بھی، یہاں سے فیض پانے والے تعلیمی حیثیت سے فقیہ اور کردار کے اعتبار سے رشد وہدایت کے چراغ ہوتے تھے، زندگیاں سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا ایک مرقعِ تاباں ہوتی تھیں، وہیں پڑھنے

تکرارِ عمل

خیر! تکرارِ عمل سے بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے، اس لئے ایک بھائی نے پہلے وضو کیا، اس کے بعد دوسرے بھائی نے وضو کیا تاکہ وضو والا عمل دوبارا اس بدوی میاں کے سامنے آجائے اور وضو کا صحیح طریقہ ان کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ دونوں کے وضو کو دیکھنے کے بعد بڑے میاں نے کہا کہ بچو! تم دونوں کا وضو صحیح ہے، میرا ہی وضو غلط تھا۔

دیکھا ان دو نونہالوں نے کس طرح ادب کا بھی لحاظ رکھا اور معلوم بات کو پہنچا بھی دیا، یہ دونوں بھائی حضرات حسنین رض تھے۔

الغرض! علم عرفان کے طلب سے ابلاغ تک یہ چار مراحل تھے مقام صحابیت کے ہر فرد کو ان مراحل سے گذرنا پڑتا تھا اور ہر فرد امت چاہے مرد ہو یا عورت، چاہے بچہ ہو یا بوڑھا، اس علم عرفان سے فیضیاب ہوتا تھا

تعلیمی پلان

طلب سے ابلاغ تک کی رسائی کے لیے نہ کوئی فلسفہ کی کتاب لکھی گئی نہ یونیورسٹی کا نظام سجایا گیا، نہ پروفیسر مقرر کیے گئے، نہ نصابی کتب اور نہ ہی کوئی رقم خطیر منظور ہوئی، نہ ہی تعلیم بالغان و تعلیم نسوان اور نہ تعلیم اطفال کے شعبے قائم ہوئے مگر نتیجہ بڑا شاندار تھا اور بڑا نتیجہ خیز، سو فیصد تعلیم کا ٹارجیٹ بڑی سادگی کے ساتھ پورا کرلیا گیا تھا، نہ ہنگامے تھے نہ جلسے، اور نہ ہی شعور عامہ کی بیداری کے پروگرام، تکمیل کا مقصد کا ایک سادہ نظام تھا جس کو دانشکدہ اور یونیورسٹی کا نام کبھی نہیں ملا، اس سادہ نظام کی تعبیر سادہ الفاظ میں ایک حلقۂ تعلیم سے کی جاسکتی ہے، تعلیمی پلان (EDUCATIONAL PLANING) کی ساری چیزیں اسی میں سموئی گئی تھیں، اس حلقۂ تعلیم میں شرکت کا اہتمام ایک ایک کو تھا اور ہر ایک کو تھا، تقاضہا ئے زندگی اس حلقہ سے الگ ہونے کے متقاضی ہوتے تو بھائی اپنے بھائی سے، دوست اپنے دوست سے اور شناسا اپنے شناسا سے کہہ جاتا کہ اتنی دیر میں جا رہا ہوں، جو کچھ تم پاؤ مجھے بھی دیدینا، پھر میں چلا آؤں گا تم چلے جانا، تمھاری غیر حاضری میں مجھے جو کچھ ملے وہ تمھیں بھی دیدونگا

اقامتی کردار

یہ توان کا نظام تھا جو ازدواجی زندگی کی بندھن میں بندھے ہوئے تھے لیکن متوکلین علی اللہ کا ایک گروہ بھی تھا جس نے ہر طرف سے توجہ ہٹا کر مقصد تکمیل کے لئے اپنے کو یکسو کرلیا تھا اور دورِ تحصیل میں کبھی اس نے یہ نہیں کہا کہ ؏

(مشاہدہ سے معقول کی طرف) PROCEED EMPITICAL TO RETIONAL
(تحلیل سے ترکیب کی طرف) PROCEED ANALYSIS TO SYNTHESIS
نفسیاتی سے منطقی کی طرف) PSYCHOLOGICAL TO LOGICAL

وغیرہ وغیرہ، لیکن اصول حکمت کو برتنے کا ہم بہت کم موقع نکال پاتے ہیں، اتنے ہی نہیں اس سے آگے کے اور اصول حکمت ان حضرات کی زندگیوں میں ہمیں نظر آسکتے ہیں، دیکھئے کتنے نفسیاتی وسائنسی انداز میں انھوں نے بات کو پہونچایا۔

بڑے میاں نماز سے فارغ ہو کر جانے لگے تو فرمایا، بچا جان! السلام علیکم!

کہو بچو، کیا بات ہے؟

چچا جان، ہم دو بھائیوں کے درمیان وضو کے بارے میں بات چل رہی ہے، ہم دونوں کو اپنے اپنے وضو کے صحیح ہونے پر اصرار ہے، آپ ہم دونوں کا وضو دیکھ لیجئے اور فیصلہ دیجئے کہ کس کا وضو صحیح ہے۔ پھر دونوں نے وضو کیا، یہ نہیں کہ بیک وقت کیا ہو جس کی وجہ سے ذہن بٹ جاتا پہلے ایک نے وضو کیا، اس کے بعد دوسرے نے وضو کیا، ہمیں معلوم ہے کہ دو عمل ایک ساتھ بخوبی انجام نہیں دیئے جا سکتے جیسے کہ خوشخط لکھنے کے لئے کہیں تو جلدی کی قید نہ لگائیں، جلدی لکھنے کو کہیں تو خوشخط ہونے کی پابندی نہ لگائیں، ورنہ ذہن بٹ جائے گا اور کام خوبی کے ساتھ انجام نہ پاسکیگا اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ تکرار عمل سے کوئی بات ذہن میں ٹھیک طرح بیٹھ جاتی ہے۔

اکبر کے دربار میں ایک شاعر تھا، کسی بات کے ایک بار سننے پر اُسے یاد ہو جاتی تھی، اس کے غلام کا حال یہ تھا کہ دو بار کے سننے پر اسے یاد ہو جاتی تھی، کوئی نووارد شاعر دربار میں آکر بادشاہ کی مدح سرائی کرتا اور بادشاہ خوش ہو جاتا تو درباری شاعر دربار میں کہتا کہ حضور! یہ اشعار تو میرے ہیں اور خود سنا دیتا کہ اُسے وہ اشعار نووارد شاعر کی زبانی سننے پر یاد ہو گئے تھے، پھر وہ درباری شاعر کہتا کہ حضور! آپ کو میری بات پر یقین نہ ہو تو میرے غلام سے سن لیجئے، غلام کو دو بار کے سننے کا موقع ملا ہوتا (ایک بار نووارد کی زبانی، دوسری بار درباری شاعر کی زبانی) اور اسے وہ اشعار یاد ہو جاتے اور وہ بھی سنا دیتا، اور نووارد شاعر شرمندہ ہو جاتا۔

اور حقیقت حال دریافت فرمائی کہ اے اللہ کے نبیؐ! آپ نے ہمارے تعلق سے کیا ارشاد فرمایا
چہرۂ انور پر ابھی جلال تھا، فرمایا کہ میں تمھیں دنیا ہی میں سخت سزا دوں گا، نبوت کے مزاج
شناسوں نے بھانپ لیا کہ معاملہ بہت سنگین ہوگیا ہے، کچھ عذر و معذرت نہیں کیا اعتراف
خطا کے ساتھ تلافیٔ مافات کے لئے ایک سال کی مہلت مانگی جو دربار رسالت سے دیدی
گئی، اس طرح قبیلہ اشعر کے اطراف میں بسنے والے دسیوں قبائل کے لئے علم وعرفان کا سامان
مہیا ہوگیا۔

بچوں میں احساس ذمہ داری

بڑے تو بڑے بچے بھی فرض ابلاغ کی ادائیگی کے جذبات سے سرشار تھے، بچہ بچہ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ معلوم بات کو نامعلوم تک پہونچانا ہے، معلوم بات کا تقاضہ انھیں معلوم تھا

مسجد نبوی میں ایک بدوی آئے، جلدی سے وضو کیا اور نماز پڑھنے لگے، مسجد نبوی میں موجود دو بچوں نے ان کی جلدی و شتابی کو دیکھ لیا کہ اس شتابی نے وضو کے آداب کو مجروح کیا تھا، مجھے یہ کہنے دیجئے کہ ان بچوں کو اس پر تعجب ہوا کہ یہ اونٹوں کے دور کا آدمی راکٹ کے زمانہ کا وضو کیوں کر رہا ہے، جہاں پر ہر کام فاسٹ ہے، اطمینان وطمانیت کا نام نہیں، نماز بھی ایک منٹ میں دو رکعت پڑھ لی جاتی ہے۔ خیر تقاضۂ معلوم نے اکسایا کہ بڑے میاں کو سمجھایا جائے کہ ان کا وضو ٹھیک نہیں ہوا ہے، وضو ٹھیک نہ ہو تو نماز کیسے ٹھیک ہوگی؟ لیکن پاس ادب نے روکا کہ چھوٹے ہو کر بڑوں کو کیسے نصیحت کریں، نبیؐ کا ارشاد بلغوا عنی ولو آیۃ اکسا رہا تھا کہ معلوم بات کہہ ڈالو، اور وہ ارشاد گرامی کہ "وہ ہم میں سے نہیں جو بڑوں کا اکرام نہ کرے" روک رہا تھا۔ یہاں اچھے اچھوں کی حکمت وفراست جواب دے جاتی ہے، لیکن جس ماحول میں وہ پرورش پا رہے تھے اس نے انھیں خردمند بھی بنایا تھا اور آداب خردمندی بھی سکھائے تھے۔

تعلیم کے اصول وحکمت

ہم بھی (MAXIMS OF TEACHING) (مقولات اصول حکمت) پڑھتے ہیں کہ

معلوم سے نامعلوم کی طرف (PROCEED FROM THE KNOWN TO THE UNKNOWN)

خصوص سے عموم کی طرف (PROCEED PERTICULAR OF THE GENRERAL)

(TO APPLY) کے بعد یہ نہیں کہ بات ختم ہوگئی، ابھی ایک اور قدم باقی ہے، ابلاغ (To preach) جانی بات کو انجانوں تک پہونچانا، یہ بھی اپنے علم پر عمل کے زمرے میں آتا ہے، اور یہ بات ہر جاننے والے کیلئے ضروری قرار دی گئی ہے. آج (each one Teach one) (ہر ایک، ایک ایک کو سکھائے) کا نعرہ بڑا سحر آفریں بن گیا ہے، اور اس پر سر دُھنا جاتا ہے اور بڑی مدح سرائی اس کی ہوتی ہے، لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم کہ آج کا یہ نعرہ اپنی اصل کے اعتبار سے بہت پرانا ہے، آج سے تقریبًا پندرہ سو سال پہلے معلم انسانیت نے اس کو صرف ایک نعرہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک لائحہ عمل کے طور پر امت کے سامنے رکھا تھا بَلِّغُوا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً۔

واقعۂ اشعر اگر تمھیں ایک بات بھی معلوم ہے تو اسے دوسروں تک پہنچاؤ. یہ وہ لائحہ عمل تھا جس پر انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے عمل ہوتا تھا، کوتاہی کہیں ہوگئی تو چہرۂ انور کے تیور بدل جاتے، ایک موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا، کہ مجھے تعجب ہے ان لوگوں پر جو انجانے ہیں اور جاننے والوں سے جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور مجھے تعجب ہوتا ہے ان پر جو جانتے ہیں مگر انجانوں کو نہیں سکھاتے۔ میں دنیا ہی میں ان کو سخت سزا دوں گا۔

اللہ اکبر! جاننے کے باوجود دوسروں کو نہ سکھانا، ایک ایسی خطا ہے جس پر دنیا ہی میں سزا دی جاسکتی ہے. ایک ایسی لغزش ہے جو امانت میں خیانت کے مرادف ہے. دوسروں کو سکھانا، یہ بات ایک نعرہ کی حد تک نہیں تھی بلکہ ایک سنجیدہ مطالبہ کی تھی، وہ نبی رحمت جس کی زبان مبارک سے ہمیشہ شفقت و رافت کی گل افشانیاں ہوتی تھیں آج سزا کے الفاظ نکل رہے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم مضطرب ہو گئے، پوچھا، یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کس کے متعلق سزا کی بات فرما رہے ہیں، آپ نے بلا روک ٹوک واضح طور پر فرمایا کہ قبیلۂ اشعر کے متعلق، تاکہ بھول کرنے والوں کو اپنی بھول کا احساس ہو، اور اوروں کیلئے درسِ عبرت ہو اور لوگ بھول کی بھول بھلیوں سے نکل کر اور اپنی علم دانی کے زعم سے نکل کر میدانِ عمل میں آئیں اور اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کی سعیِ بلیغ کریں ___ بات بردوشِ باد، قبیلۂ اشعر تک پہونچ گئی، ذمہ داران قبیلہ دوڑتے ہوئے خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے

نظر آیا فوراً اس کی اصلاح کر دی گئی۔ ایک صحابی نماز پڑھ کر رخصت ہونے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور فرمایا جاؤ دوبارہ پڑھو۔ نماز دہرائی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابھی ٹھیک نہیں پھر سے دہراؤ۔ کئی بار اسی طرح کے فرمان پر اُن صحابی نے عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان! یا رسول اللہ۔ بتایئے کہاں کوتاہی ہو رہی ہے میں سمجھ نہیں سکا۔ فرمایا تو مہ وجلسہ میں تعجیل نہ کرو۔ تعدیل کا خیال رکھو ورنہ یہ تعجیل چوری کے مرادف ہوگی پھر کسی موقع پر فرمایا کہ نماز ایسی پڑھو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو۔ صلوا کما رأیتمونی اصلی۔

اللہ اکبر! اس معلم انسانیت کی تعلیم بھی نمونہ تھی اور تعمیل بھی نمونہ (IDEAL) اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہمیں نہ کمال علم حاصل ہے اور نہ ہی کمال عمل، علم محرک ہوتا ہے عمل کا، جو علم محرک عمل نہ ہو اس کو کیا نام دیا جائے؟

بہر حال علم الٰہی کو جو چیز علوم عصری سے ممتاز کرتی ہے وہ جذبۂ عمل ہی ہے۔ دنیوی علوم میں یہ ضروری نہیں کہ جو بہترین معلم ہو وہ بہترین عامل بھی ہو، لیکن علم الٰہی متنبہ کرتا ہے کہ علم پر عمل بھی ضروری ہے۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (کیا لوگوں کو حکم کرتے ہو اچھی باتوں کا اور بھول جاتے ہو اپنے آپ کو اور تم کتاب پڑھتے ہو، کیا تمھیں شعور نہیں ہے۔

عدم اطلاق کی سزا علم ہو اور عمل نہ ہو اس کی پاداش بھی بڑی سخت ہے عالم برزخ کا ایک واقعہ عالم مثال میں یوں سمجھایا گیا ہے کہ ایک کے سر کو پتھر سے کچلا جا رہا ہے، پتھر اتنے زور سے مارا جاتا ہے کہ لڑھک کر دور گر جاتا ہے جب تک کہ اسے اٹھا کر لایا جائے، سر پھر سے ٹھیک ہو جاتا ہے پھر دوبارہ مارا جاتا ہے، یہ اس کا حال ہے جس نے قرآن کو پڑھا اور اس پر عمل نہ کیا اور نماز میں کوتاہی و سستی کی۔ کل قیامت میں وہ پانچ سوال جن کے جواب کے بغیر کسی کے قدم اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے، اس میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ تو نے اپنے علم پر کیا عمل کیا؟ اللہ اپنے کرم سے، ہمیں جہالت کی اندھیریوں سے بھی نکالے اور دولت علم عطا کرنے کے بعد توفیق عمل بھی عطا فرمائے۔ آمین۔

(د) ابلاغ { طلب (DESIRE) اکتساب (ACQUIRE) اور اطلاق

معلوم ہیں، ہمیں PHILOSOPHY OF EDUCATION (فلسفۂ تعلیم) معلوم ہے، اور ہمیں معلوم ہے Individual & Social Aims in Education (تعلیم میں انفرادی وسماجی مقاصد) SOCIOLOGICAL BASES OF EDUCATION (تعلیم کی سماجی بنیادیں) PSYCHOLOGICAL SCIENTIFIC TENDENCIES EDUCATION (تعلیم میں نفسیاتی وسائنسی رجحانات)

یہ ساری باتیں کتابوں میں مسطور تو ہو جاتی ہیں دلوں کو متاثر نہیں کرتیں اس لئے مروجہ نظام علوم ایک ایسا کیف ہے جس سے روح کو کوئی سرور نہیں ملتا۔

دانشکدۂ نبوی دور نبوی کا ایک دانشکدہ وہ تھا جس نے زندگی بھر میں کبھی دانشکدہ کا نام نہیں پایا، لیکن اس میں پڑھنے والوں کی کیفیت یہ تھی کہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی ان کے دل ودماغ میں سرور اور روح میں ایک گداز پیدا کر دیتے تھے۔

بہرحال! ہم اصول تعلیمات اور تعلیم کے ایک ایک جز کو فلسفیانہ اور سائنسی انداز فکر کے ساتھ پڑھتے تو بہت ہیں لیکن انھیں برتنے کا شاید ہی کبھی خیال آتا ہو، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولیات کو اپنی تمامتر تفصیلات وتشریحات کے ساتھ شاید ہی اجاگر کیا ہو لیکن ان سب کو برت کر اور عملی زندگی میں لاکر دکھایا تھا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اصولِ تعلیمات کو اس تجزیاتی (ANALYSIS) انداز سے شاید ہی جانتے ہوں لیکن اس کے باوجود ہم ان کی عملی زندگی میں ترکیبی (SYNTHESIS) حیثیت سے ان کو دیکھ سکتے ہیں، اکتساب علم ہی ان کا منتہائے نظر نہیں تھا، بلکہ اس سے آگے کی کوئی منزل تھی جس کو پانے کے لئے وہ عملی طور سے متحرک ہو جاتے تھے، اس منزل کی نشاندہی مختصر سے مختصر الفاظ میں یوں کی جاسکتی ہے کہ ؎ علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے

لذت شوق بھی ہے اور لذت دیدار بھی (اقبال)

احتیاط اطلاق اطلاق کے مرحلہ میں یہ بات بھی ملحوظ رہتی تھی کہ اطلاق ٹھیک ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں؟ جہاں تھوڑی سی بھول ولغزش یا سہو

عمل میں اس کی زندگی تمام ہوجائے تو اس کو روز قیامت علماء کے ساتھ اٹھایا جائے گا. عالم تو نہ ہوگا لیکن اعزاز عالموں کا سا پائے گا جب عمر عزیز کی مہلت میں موقع صرف اتنی ہی بات کا مل جائے تو ایسے نوازا جائے گا تو پھر تصور کیجئے کہ کوئی اپنی پوری زندگی کو اس کام کے لئے صرف کردے گا تو اسے کیا کچھ ملیگا۔

اس علم کو سیکھنے کے لئے چلے تو راستہ آسان ہوجائے فرشتے اس کے قدموں کے نیچے پر بچھائیں جنگل کے درندے اور بحر و بر کے جانور اس کی مغفرت کی دعائیں مانگیں اور اس کا حاصل کرنے والا اوروں پر درجۂ فضیلت پائے، شب بیدار زاہدوں اور عابدوں کا ثواب سو کر حاصل کرے، اللہ ہمیں ان باتوں کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے۔

(ج) اطلاق

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اکتساب علم ہی سب کچھ نہیں بلکہ اکتساب علم کا پہلا تقاضا زندگی میں اس کا اطلاق ہے، عصری علوم میں ہم جو کچھ پڑھتے ہیں وہ بس فلسفہ ہے، اس فلسفہ کا منتہا صرف اکتساب (GAIN) ہے اس سے آگے کچھ نہیں، اسے اس بات سے کچھ سروکار نہیں کہ جو کچھ پایا ہے، اکتساب کیا ہے وہ عملی زندگی میں آتا بھی ہے یا نہیں اس لئے ان علوم کا ماہر فلسفوں میں گم تو ہوجاتا ہے لیکن عملی زندگی میں کچھ لا نہیں پاتا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو علم الہٰی کے نام پر جو کچھ دیا. اس کو برتا بھی، کیا بھی، دے کر کیا اور کر کے دیا، اطلاق بعد الاکتساب اور اکتساب بالاطلاق کی دو طرفہ کرشمہ سازیاں تھیں جس نے زندگی کو زندگی کی آگہی عطا کی تھی، پھر تعلیم و تزکیہ سے جو مقدس گروہ تیار ہوگیا تھا اس گروہ کی زندگی میں یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں، سیکھ کر کرتے تھے اور کر کے سیکھتے تھے، سیکھتے تھے کرنے کے لئے اور کرتے تھے سیکھنے کے لئے۔

دنیوی دانشکدے

اس وقت دنیا میں ہزاروں دانشکدے ہیں، لیکن یہ بات دانشت میں آنے کو نہیں کہ یہ علم و دانش کی باتیں صرف سیکھنے کے لئے نہیں بلکہ عملی زندگی میں برتنے کیلئے ہیں، ہم فلسفہ میں کتنا کچھ پڑھتے ہیں، ہیں ——— Meaning and Aims of Education (مطلب اور اغراض و مقاصد تعلیم)

اور تحصیل علم کے بعد ابھی تک منزل کا پتہ نہیں چلا؟ پھر وہ علم کس کام کا جو منزل کا پتہ نہ بتا دے اتنے سارے علوم کا حصول اور منزل کا پتہ نہ چلے تعجب کی بات ہے اور دوسری یہ کہ بیٹا! بہت خوب! تم نے ایک اہم بات دریافت کی ہے، دنیا میں بہت سارے علوم ہیں، منطق ہے فلسفہ ہے وغیرہ وغیرہ لیکن ان علوم میں نجات دینے والا علم علم الٰہی ہے جو نبوت کے واسطے سے حاصل ہوا ہے۔

اس واقعہ کے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ علوم عصری و دنیوی کو نہ سیکھا جائے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے اس علم کو حاصل کیا جائے جو سبب نجات ہے اور حصولِ معرفت کا ضامن، اس وقت علوم عصری کے دبدبہ نے کچھ ایسا ذہن بنا دیا ہے کہ علوم اصلی و ضروری کی طرف سے توجہ ہٹ گئی ہے بلکہ اس کے حصول کو فضول گردانا جا رہا ہے۔ لیکن ایک امتی ہونے کی حیثیت سے ہمیں اس علم کی وراثت عطا کی گئی ہے اور ورثہ میں ہمیں یہ علم دیا جا رہا ہے، اس کا اکتساب اسکی حفاظت ہمارے ذمہ ضروری ہے، ہم اس علم کے امین ہیں اور اس امانت سے خود بھی فیضیاب ہوتے ہوئے دوسروں تک اس امانت کو منتقل کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر اس امانت کو ہم نے حاصل نہیں کیا تو روز قیامت مواخذہ کا سامنا کرنا پڑے گا اور کوئی چیز اس مجرمانہ غفلت سے ہمیں بچا نہیں سکے گی اللہ تعالیٰ ہمیں اس علم کی طلب صادق عطا فرمائے اور اس کی اہمیت کو ہمارے دلوں میں جما دے۔

(ب) اکتساب

طلب صادق کے ساتھ ہی دوسرا قدم اس کے اکتساب کا ہے، اہم اس علم کو حاصل کرنا تو چاہیں اور اس کی تحصیل کی کوشش نہ کریں یہ بھی ایک جرم ہوگا، اس لئے کہ جو چیز (Require) (ضرورت کی) ہوتی ہے اس کو Acquire (حاصل) کرنا ضروری ہوجاتا ہے Require Ment کا اصل تقاضہ (Acquire Ment (اکتساب) ہوتا ہے اس لئے اس علم کو پانے کے لئے ہم اپنے وقت کو فارغ کریں، ضرورت پڑے تو سفر کریں، بہر حال اس علم کی تحصیل میں ہر وہ کوشش کر ڈالیں جو ہمارے بس میں ہے۔

جس طرح طلب کو فرض قرار دیا گیا ہے اسی طرح اس کے اکتساب کی ترغیب دی گئی، بشارتیں سنائی گئیں، اگر کوئی اعذار واقعی کی وجہ سے زیادہ کچھ حاصل نہ کر سکے تو کم سے کم اتنا تو کرے چالیس باتوں کو سیکھ لے، اس کی حفاظت کرے اور دوسروں تک اس کو پہونچا دے اور اتنے ہی

کی ترغیب دی گئی ہے کہ اگر یہ علم چین میں ملتا ہو تو وہاں تک کا سفر اختیار کر کے اس کو پالے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس ترغیب وتشویق کے ساتھ یہ عجیب واقعہ بھی پیش نظر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ورقِ توریت تلاوت کر رہے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور ناگواری کے جذبات کے ساتھ تمتما رہا ہے، وہاں کسی انسانی وضع کردہ علم کو نہیں پڑھا جا رہا تھا بلکہ اس علم کو پڑھا جا رہا تھا جو خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی وساطت سے ملا تھا، بادی النظر میں ان دونوں باتوں میں کتنا تضاد نظر آتا ہے، اور اگر حقیقت حال پر غور کیا جائے تو کوئی تضاد نہیں، اس لئے کہ علم موسوی (علیہ السلام) ہی کو تکمیلات تامہ کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا تھا اور یہ علم مقصد اصل کے لئے یعنی معرفت خداوندی کے حاصل کرنے کے لئے از بس ضروری ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم والے علم سے توجہات کو اِدھر اُدھر مبذول کرنا اس علم کی ناقدری تھی، اور اس علم کی قدر دانی کا تقاضا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی موجود ہوتے تو ان کے لئے بھی اسی علم کی اتباع ضروری ہو جاتی، تو وہ علم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے قیامت تک کے لئے انسانیت کو دیا گیا ہے یہ علم جہاں سے بھی حاصل ہو زمان و مکان کی قید کے بغیر حاصل کیا جائے

بہر حال اس علم کے اکتساب کو نہیں جو آگے کی بات ہے بلکہ اس علم کی طلب کو فرض قرار دیا گیا ہے، جب طلب ہی فرض ہو تو اکتساب کا درجہ کیا ہوگا؟ جب طلب ہی کو فرض کا درجہ دیا جا رہا ہے تو اس علم کی کتنی اہمیت خدا و رسول کی نظر میں ہوگی اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔

تعلیم کے مدارج (الف) طلب

حضرت امام غزالی رح کی خدمت میں ان کے ایک شاگرد نے ۷-۸ سال رہ کر علوم مروجہ کو حاصل کیا اور فراغت کے بعد جب واپسی کا موقع آیا تو استاد محترم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض پرداز ہوا کہ حضرت میں نے آپ کی خدمت میں رہ کر کئی علوم کو سیکھا ہے، مجھے بتا دیجئے ان تمام علوم میں وہ کون سا علم ہے جو نجات کا سبب ہے، اس واقعہ پر امام غزالیؒ کی طرف سے جو ردعمل سامنے آتا ہے اس کی تعبیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ اتنے دنوں کی صحبت

علم عرفان

یہ سارے نظریات اہل علم کی فکری پرواز تو متعین کرتے ہیں لیکن اصل مقصد تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی، ظاہر ہے، انسان چاہے جتنا ذہین و فطین ہو بہر حال اس کی عقل محدود ہے وہ حقیقت کو پانا بھی چاہے تو خدائی رہنمائی کے بغیر پا نہیں سکتا، اس لئے اس کے مقرر کردہ اور مجوزہ اغراض و مقاصد مادہ اور دنیائے مادیت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ فکر کو جس بات پر مرتکز کیا جاتا ہے وہ بات ان تمام نظریات سے وراء الوراء ہے جو چاہے اور جو کچھ چاہے مقصدِ تعلیم متعین کرے، لیکن حقیقت میں علم وہ ہے جو عرفانِ خداوندی اور معرفت خداوندی عطا کرے، علم کا مقصد خدا کی پہچان اور معرفت کا حاصل کرنا ہے، وہ علم، علم کہلانے کا مستحق نہیں ہے جو خدا کی معرفت تک نہ پہونچائے۔

ہم نے علم کے نام پر جو کچھ پڑھا ہے یا جو کچھ پایا ہے وہ علم الاشیاء ہے۔ علم معرفت نہیں وہ علم کائنات ہے، علم خالقِ کائنات نہیں، علم مخلوقات ہے علم خالق نہیں، اس لئے بہت سارے علوم کو حاصل کرنے کے باوجود انسان مقصد و اصل کو پا نہیں سکا ہے، حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو علم دیا جاتا ہے اس کا مقصد معرفتِ خداوندی کا حصول ہے، یہ علم خدا کی طرف سے ودیعت کیا جاتا ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے واسطہ سے انسانیت کو مل سکتا ہے انسانیت کی صلاح و فلاح، ترقی و کمال کے لئے اسی علم کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کا آغاز اللہ ہی کے نام کے ساتھ ہوتا ہے مخلوقات کے نام کے ساتھ نہیں۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ (پڑھ اپنے رب کے نام کے ساتھ)

علم عرفان کی قدر و قیمت

اس لئے ظاہر ہے دنیا کے سارے علوم سے سرشار مگر علم الٰہی اور علم نبویؐ سے بے نیاز ہو کر انسانیت، کما[illegible] انسانیت کی طالب ہو تو اسے گمراہیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں لگے گا، کمال انسانیت کا حص[illegible] تو دور کی بات ہے۔

یہ علم عرفان خدا کی نظر میں اور رسول خدا کی نظر میں کتنا قیمتی ہے اس کا اندازہ اسی با[illegible] سے ہوتا ہے کہ اس کی طلب کو فرض قرار دیا گیا ہے طلب العلم فریضة علی کل مسلم علم کی طلب ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔ اور اس کے اکتسا[illegible] کے لئے دور دراز

قطب الدین محمد ایم اے، بی ایڈ
فاضل دینیات، ادیب کامل۔
الفلاح ۲۲۴۷ کامت گلی
بیلگام ۔ ۵۹۰۰۰۲

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانیت کو جو شرافت وکرامت عطا فرمائی ہے اس کی بنیاد علم ہے ورنہ تسبیح وتحمید اور اطاعت وفرمابرداری میں فرشتے بہت آگے تھے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی معلم انسانیت بناکر دنیا میں مبعوث کئے گئے، اس لئے علم ہی وہ دولت ہے جس کے ذریعہ انسانیت کو ترقی وکمال حاصل ہوتا ہے اسے دنیا کی زندگی میں امامت اور آخرت کی زندگی میں خدا کا قرب وانعام حاصل ہوتا ہے۔

الحمدللہ اس وقت یہاں پر اہل علم جمع ہوئے ہیں اور فلسفۂ تعلیم (PHILOSOPHY OF EDUCATION) اور نفسیات تعلیم (SYCHOLOGY OF EDUCATION) سے واقف ہیں، جو کچھ ہم نے فلسفۂ تعلیم کے ذریعہ جانا اور پہچانا وہ دراصل سرمایہ ہے، برناڈشا وشیلے اور گاندھی جی جیسے دیگر اہل علم کے نظریات کا۔

تعلیم کیوں؟

تعلیم کیوں؟ اور کس لئے کے جواب میں مختلف نظریات کی روشنی میں ہیں جو کچھ ملا ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم برائے تعلیم، تعلیم برائے ادب، تعلیم برائے زندگی،

تعلیم برائے جمہوریت Education For Democracy
تعلیم برائے شہریت Education For Citizen Ship
تعلیم برائے ملکی وجذباتی یکجہتی Education For National a Emotional Entegration
تعلیم برائے بین الملکی افہام وتفہیم Education For International understand

قابل فخر کارنامے

نامور مورخ
مولانا غلام رسول مہر

بزرگان دیوبند میں جن مقدس ہستیوں کو اوّلین درجہ کا احترام و اعزاز حاصل ہے وہ حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ہیں، ان کے اسماء گرامی اس سرزمین کے آسمان پر درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں مسافروں کو راستہ بتاتے ہیں، وہ اپنی زندگیوں میں علم و ہدایت کے مشعل بردار تھے، جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونہ چھوڑ گئے جو دلوں اور روحوں میں برابر دین حق کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے، خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی تو ایک یادگار ایسی ہے جو ایک صدی سے اس وسیع سرزمین پر دینی علوم کے قیام و بقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے، اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں کے دائرہ میں قابل فخر ہیں (مضمون سے اقتباس) الجمعیۃ ۱۹۸۰ء ص ۶

یہودیت بنام قادیانیت

قادیانی تحریک یا تو براہ راست یہودی تنظیم ہے یا یہودیت کی عمیل (وکارندہ) ہے، درج ذیل تینوں امور میں غور و فکر سے دعویٰ کی حقیقت تک رسائی ہوسکتی ہے۔

① ہندوستان میں بٹالہ کے نزدیک واقع "قادیان" اور پاکستان میں "ربوہ" کے بعد قادیانیوں کا سب سے منظم مرکز اسرائیل کے شہر "حیفا" میں ہے اس وقت بھی جبکہ اسرائیل میں مسلمانوں کا رہنا دوبھر ہے قادیانیوں کو اسرائیل میں کام کرنے کی پوری آزادی ہے۔

② کمیونسٹ روس میں جہاں کسی کا علانیہ مسلمان رہنا موت کو دعوت دینا تھا جہاں لینن سے لے کر بریزنیف کے دور تک کروڑوں مسلمان شہید کئے گئے اسی روس میں انقلاب کے وقت سے اب تک قادیانیت کو کام کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ (باقی بر ص ۱)

افضل ما شہدت بہ......

عرصہ ہوا یوپی اسمبلی میں بجٹ سیشن کے موقع پر مسٹر بالیوال نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "ہمارے اسکولوں میں تعلیم پانے والے طلبہ جب اپنے مقصد میں ناکام ہوتے ہیں تو قطب مینار سے کود کر یا کسی پل سے چھلانگ لگا کر جان دیدیتے ہیں، کیونکہ انھیں جینا نہیں سکھایا جاتا، ان کے سامنے زندگی کا کوئی آدرش (مقصد) نہیں ہے"

اس کے برخلاف میرے ہی حلقۂ انتخاب میں دیوبند ایک قصبہ ہے جہاں ایک عربی یونیورسٹی دارالعلوم کے نام سے قائم ہے، جہاں کا طالب علم معمولی خوراک کھاکر اور معمولی لباس پہن کر تعلیمی زندگی گذارتا ہے اور جب فارغ ہوتا ہے تو ملک کا ایک اچھا شہری بنتا ہے، حکومت پر بوجھ نہیں بنتا بلکہ خودکفیل ہوتا ہے۔

یہ شہادت ہمیں بتاتی ہے کہ جدید تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں دینی مدارس کی کیا اہمیت ہے۔

(روزنامہ الجمعیۃ ۱۹۸۰ء دارالعلوم دیوبند ص ۱۰۰)

رشد وہدایت کے چراغ

از پروفیسر محمد شفیع سابق قائم مقام وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سرسید کی تعلیمی تحریک نے برصغیر میں تعلیم جدید کے لئے جابجا مدرسوں کا قیام اور دیوبند کی کوششوں سے کم از کم شمالی ہند میں مدارس کا جال بچھادیا۔ ہاں دیوبند نے اس مقصد کو بھی پیش نظر رکھا کہ دینی تعلیم کے واسطے حکومت پر بالکل انحصار نہ کیا جائے اور اپنے اداروں کو چلانے کے لئے کلیتاً صرف اپنے وسائل پر بھروسہ و اعتماد کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اس بے لوث محنت خلوص لگن اور ایثار کے نتیجے میں رشد وہدایت کے جو چراغ روشن ہوئے ان کی تابانی سے آج ایک جہان روشن ہے خدا سے دعا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے اکابرین نے علم وعمل کی جو شمع روشن کی ہے اس کی ضیاپاشی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(محمد شفیع) (الجمعیۃ دارالعلوم دیوبند نمبر ۱۹۸۰ء ص ۲۴۴)

والفضل ماشهدت به الاعداء

اس موقع پر ان کے اس واقعہ کے سنانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ جامعہ عباسیہ کے ارباب حل وعقد کو توجہ دلانا چاہتے تھے کہ جامعہ کا نصاب بھی "دیوبند" کے طرز پر ترتیب دیا جائے تاکہ اصلی غرض یعنی دین کی نشر واشاعت حاصل ہوسکے نصاب تعلیم میں عصری تقاضوں کے نام پر غیر ضروری آمیزش اصلی مقصد کو فوت کر دیتی ہے۔

(ماخوذ، الرشید دارالعلوم نمبر ص ۴۰۲)

علم خدا کی ایک امانت ہے

ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائص واعمال کو پہونچائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ یہ نقصان ہے کہ تحصیل علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہوگیا ہے، علم خدا کی ایک امانت ہے اور اسکو صرف اسلئے ڈھونڈھنا چاہیئے کہ وہ "علم" ہے۔ لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہمکو ایک دوسری راہ بتلائی ہے، وہ علم کا شوق اسلئے دلواتی ہے کہ بلا اسکے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی، پس اب ہندوستان میں علم کو علم کیلئے نہیں بلکہ معیشت کیلئے حاصل کیا جاتا ہے، یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں جو انگریزی تعلیم کی نوآبادیاں ہیں کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں، مشتاقان علم تشنگان حقیقت سے؟ نہیں، ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالہ چاول کے پرستاروں سے جن کو یقین دلایا گیا ہے کہ بلاحصول تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کرسکتے لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ علم کی اس عام توہین وتذلیل کی تاریکی میں سچی علم پرستی کی روشنی برابر چمکتی رہی ہے، یہ ملت کے طالبان علم کی وہ جماعتیں ہیں جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون مختلف عربی مدارس میں حاصل کر رہی ہیں، آپ یقین کیجئے کہ بجا طور پر آج صرف یہی ایک جماعت علم کی سچی پرستار کہی جاسکتی ہے، ان لوگوں کو معلوم ہے کہ انگریزی تعلیم کی ڈگریاں لیکر بڑے بڑے عہدوں اور نوکریوں کے دروازے میں قدم رکھ سکتے ہیں اور ایک کلرک سے لیکر ڈاکٹر سنہا کی نوکری تک صرف انگریزی کی تعلیم ہی سے مل سکتی ہے ان کو پوری طرح یقین ہے کہ عربی تعلیم کو آج کوئی نہیں پوچھتا حتیٰ کہ روٹی بھی اسکے ذریعہ نہیں مل سکتی پھر بھی انکے دلوں میں ایک مخفی مگر طاقتور جذبہ موجود ہے جو انگریزی تعلیم کی طرف لیجانے نہیں دیتا اور اس کسمپرسی میں بھی عربی تعلیم ہی کیلئے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں یہ جذبہ بجز علم پرستی اور رضائے الٰہی کے اور کوئی دنیاوی غرض نہیں رکھتا اسلئے دنیا بھر میں علم کو علم کیلئے اگر پڑھنے والی جماعت ہے تو وہ "عربی مدارس" ہی کی جماعت ہے۔

(تحریک خلافت کے ایک خطبہ سے ماخوذ)

مولانا محمد عبد اللہ احمد پور شرقیہ

تقسیم ملک کے بعد بہاولپور کی اعلیٰ دینی درسگاہ "جامعہ عباسیہ" کے بارے میں ماہر تعلیم اور اعلیٰ افیسران کا اجلاس ہو رہا تھا، جس میں سید حسنین احمد (اثنا عشری) چیف انجینیر بھی موجود تھے، سید حسنین نے اس موقع پر اپنا ایک واقعہ سنایا کہ تقسیم سے پہلے میں امریکہ گیا تھا، وہاں کے ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ اونچے درجہ کے دو امریکن آئے اور نشستیں سنبھالنے کے بعد انھوں نے ایک موضوع چھیڑ دیا جو بڑا دلچسپ تھا، ایک بولا: کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں مذہب کا اثر و رسوخ زیادہ ہے؟، حتیٰ کہ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک بھی ہندوستان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

دوسرے نے جواب دیا، مشرق وسطیٰ جغرافیائی لحاظ سے یورپ کے قریب تر ہے اس لئے یہاں یورپ کے اثرات زیادہ پہونچے ہیں، ہندوستان دور رہ جاتا ہے۔

پہلا: نہیں یہ بات نہیں ہے، ہندوستان مکمل طور پر برطانوی حکومت کے زیر تسلط ہے، اور اس تسلط کو تقریبا ایک صدی کا عرصہ گذر چکا ہے، پھر بھی فاتح قوم وہاں کے مسلمانوں سے مذہب کا دامن نہیں چھڑا سکی۔

دوسرا: شاید یہ بات ہو کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے، اس لئے تہذیب نو وہاں قدم نہیں جما سکی

پہلا: یہ بات بھی نہیں ہے، اول تو وہ اتنا غریب نہیں ہے، اور اگر واقعی غریب ہو تو غریب کو اپنی طرف مائل کرلینا زیادہ آسان ہے، پھر بولا۔

جہاں تک میں نے اس مسئلہ میں سوچا ہے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہندوستان میں **دینی تعلیم کا ایک ادارہ ھے جس کا نام دیوبند ھے** وہ تحریر و تقریر کے ذریعہ مذہبی تعلیم کی اشاعت کر رہا ہے، اور وہی ادارہ وہاں پر مذہبی اقدار کی بقا کا ضامن ہے

یہی مرکز وحدت ہے جو آج ایک سو سال سے زائد عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اپنی اسی حیثیت میں موجود ہے اور ملت کی ہر نوع کی رہنمائی اس کے دم قدم سے ہے

۱۸۵۷ء سے پہلے مختلف النوع فتنے اسلامی عقائد کے خلاف سامنے آچکے تھے لیکن اس کے بعد جس طرح چاروں طرف سے تابڑ توڑ حملے شروع ہوئے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی..

..... مکر و فریب کے ہر نو ایجاد طریق سے متاع حیات لوٹی جارہی تھی، عیسائی مشنریز کے ساتھ ساتھ آریہ سماجی وغیرہ اور پھر بعد کے ادوار میں انکار ختم نبوت، انکار حدیث، انکار معجزات نبوی اور بدعات و رسوم جاہلیت کا جو دور دورہ ہوا، اس نے انتہائی خطرناک صورت پیدا کر دی، ساتھ ہی تعلیم جدید کے فتنہ کو بھی شامل کر لیں جسکا ظاہری عنوان تو دلفریب تھا لیکن فی الحقیقت لارڈ میکالے کی تعلیمی اسکیم کو خود .... مسلمانوں کے ہاتھوں پروان چڑھانے کی ایک مکروہ سازش تھی۔

اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ جدید علوم و فنون وغیرہ کے متعلق جو علماء پر طعن و تشنیع کی جاتی ہے وہ سرتاپا غلط ہے، علماء تنگ نظر نہیں کہ وہ اس قسم کے کردار کا مظاہرہ کریں انھوں نے تمام علوم و فنون کی اجازت دیدی جیسا کہ خود سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حوالہ سے تسلیم کیا ہے، اور حضرت مولانا گنگوہی اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ کے فتوے بھی موجود ہیں، البتہ علماء کو جس بات سے اختلاف تھا وہ یہ تھی کہ مذہب و دینیات سے الگ رہ کر جو تعلیمی گھڑاگ رچایا جارہا ہے اس کے برگ و بار انتہائی نقصان دہ ہوں گے اور قوم اپنے مرکز سے دور ہو جائے گی۔

بہر حال بات ان فتنوں کی ہو رہی تھی جو متاع ایمان و اسلام کو مٹانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، لیکن "دیوبند" اور اس کے فرزندوں نے جس طرح ایک ایک فتنہ کے سامنے بند باندھا وہ تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے جھٹلانا کسی کے بس میں نہیں۔

(مولانا مفتی محمودؒ سرحد)
ماہنامہ الرشید دارالعلوم دیوبند نمبر
ص ۵۶۴

دینی مرکز کی تبدیلی

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی

ہر انقلاب اپنے ساتھ ہزاروں تباہیاں لاتا ہے اور چھوڑ جاتا ہے، ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز انقلاب میں بھی یہی ہوا کہ تعلیم گاہیں ختم ہوئیں، مسجدیں مسمار ہوئیں، خانقاہیں لٹیں، آبادیاں ویران ہوئیں اور دہلی کی مرکزیت ختم ہوگئی۔

بارگاہِ نبوت کی وہ امانت یعنی کتاب وسنت کا سلسلۂ روایت جو علمائے راسخین کے سینوں میں پوشیدہ تھی دہلی سے منتقل ہوگئی اس کو آفات سماوی اور حوادث ارضی سے بچا کر اور اپنے سینوں میں چھپا کر لے جانے والے کون تھے؟ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی (قدس اللہ اسرارہم) وغیرہ۔

یہ امانت حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کے ہجرت فرمانے کے بعد حضرت شاہ عبد الغنی مجددی رحمہ اللہ المتوفی ۱۲۹۵ھ کی طرف منتقل ہوئی اور ان سے حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی نے حاصل کی، اس طرح یہ امانت دہلی سے دیوبند، سہارنپور اور گنگوہ کی طرف منتقل ہوگئی، اور اسلامی علوم کا سب سے بڑا مرکز دارالعلوم دیوبند قرار پایا۔

(البلاغ بمبئی ص ۱۰۴)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی تو مسلمانوں کی جمعیت پارہ پارہ ہوگئی مایوسیوں نے گھیر لیا اور سوچا یہ جانے لگا کہ یہ قوم اب کبھی انگڑائی نہ لے سکے گی، لیکن اس علمی تحریک کی داغ بیل نے جس کی پہلی کڑی دارالعلوم دیوبند۔ کا قیام تھا، افراتفری کا شکار دکھی مسلمانوں کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا اور نئے سرے سے ایک مرکزِ وحدت میسر آگیا

دینی تعلیم، بحیثیت نصب العین

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

انسانی دل و دماغ اور اس کی ذہنی قوتوں کے نشوو ارتقاء کا واحد ذریعہ تعلیم و تربیت ہے، پند و نصیحت وعظ و تلقین، تذکیر و موعظت، بلاشبہ نافع اور ضروری ہیں، لیکن ان سے ذہن نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ چیزیں بنے بنائے ذہن میں صرف روحانی انبساط، شگفتگی اور وسعت پیدا کر سکتی ہیں، اس لئے کسی قوم کے ذہن بنانے اور دل و دماغ کو خاص سانچے میں ڈھالنے کے لئے صرف تعلیم ہی ایک مؤثر اور پائیدار ذریعہ ثابت ہوتی ہے جس نے تاریخی طور پر ہمیشہ ہی ذہن سازی کا اثر دکھلایا ہے۔

اس آباد دنیا کی ہر قوم میں حق تعالیٰ شانہ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار مقدسین کا یہ قافلہ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک گھمایا جو اپنے نقطۂ آغاز سے لے کر نقطۂ انتہاء تک ہزار ہا سالہ سفر میں وقتاً فوقتاً انسانی جتھوں میں پہونچتا رہا، لیکن اس کی غرض تعلیم و تربیت کے سوا بھی کچھ تھا؟ نہیں بلکہ اس پاک گروہ کے آخری فرد اکمل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی اس بنیادی غرض و غایت — (تعلیم و تربیت) پر اپنی مہر تصدیق ان الفاظ میں ثبت فرما دی کہ "انما بعثت معلماً"۔ میں بھیجا ہی گیا ہوں معلم بنا کر۔ اور بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"۔ میرے بھیجے جانے کی غرض ہی تکمیلِ اخلاق ہے، پس اگر بعثت انبیاء کی غرض و غایت ہی تعلیم و تربیت تھی اور بلاشبہ یہی تھی تو اندازہ کیجئے کہ رب العالمین نے مکتب عالم میں سوا لاکھ سچے معلموں اور پاکباز استادوں کو بھیج کر مسئلہ تعلیم کو کس درجہ اہم بنا دیا اور کس حد تک اس مسئلہ پر اپنی مخصوص عنایت و عطوفت مبذول فرمائی۔

(البلاغ، بمبئی، تعلیمی نمبر ص ۶)

تعلیم دین کی اہمیت

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
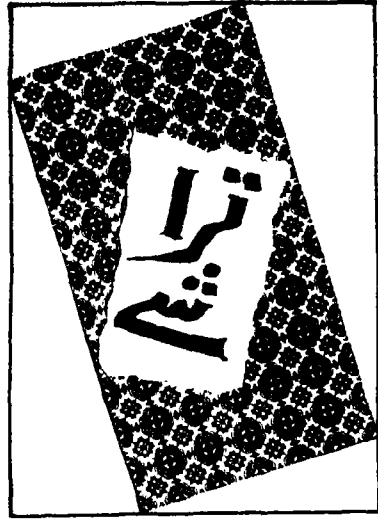
انسان کی انسانیت معراجِ ترقی پر جب ہی پہنچ سکتی ہے جب انسان کے سامنے یہ تصور یقینِ محکم کی حیثیت اختیار کرے کہ ذات واحد کے سوا کائناتِ ہست و بود میں کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے اور ربوبیت اور پروردگاری یا دوسرے لفظوں میں وجود وبقا اور عزت و ذلت اور موت و زندگی سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اگر یہ بیّن حقیقت ہے اور آفتاب کی طرح روشن تو پھر ایک دوسری حقیقت خود بخود نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے وہ یہ کہ جب انسان کی زندگی ایک سب سے بلند طاقت کے ہاتھ میں ہے تو بلاشبہ اس بلند طاقت کو ہی یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ انسان کی ہدایت و گمراہی کا فیصلہ کرے اور وہی یہ رہنمائی دے کہ انسان کس راہ پر چل کر انسانی دنیا میں سچا انسان اور خدا کے بندوں کا صحیح نادم بن سکتا ہے اور بعد الموت سرمدی حیات کے حصول کے لئے دوسرے لفظوں میں معراجِ انسانیت کے مرتبۂ عالی اور مرتبۂ سعادت تک پہونچنے کے لئے کون سا راستہ صحیح اور درست ہے۔ اسی حقیقت کو آشکارا کرنے کے لئے "وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" اور "رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى" کہہ کر انسان کو اس کی سعادت کبریٰ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ تب ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اپنی دنیوی ترقی اور معاشی عروج کی جدوجہد کے ساتھ اس نظام حیات کی تعلیم اور اس کے حصول کی جدوجہد کو بھی فراموش نہ کریں اور اپنا سرمایۂ حیات سمجھ کر اس کے لئے اپنی کوشش صرف کر دیں۔ یہی وہ نظام حیات ہے جس کا دوسرا نام "دین" ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ (البلاغ بمبئی، تعلیمی نمبر ص۲)

الحاصل فاعلیت و قابلیت، اثرانگیزی و اثرپذیری کے لحاظ سے نبوت وصدیقیت میں وہی نسبت ہے جو آفتاب اور آئینہ کے درمیان باہمی تقابل کے وقت ہوتی ہے، جس طرح نبی کو نبی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی باتوں کی خبر دیتا ہے اور انھیں خبردار کرتا ہے، اسی طرح صدیق کو صدیق اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا دل سچائی کو بلا جھجھک قبول کرلیتا ہے اور غلط باتوں کو رد کردیتا ہے، اس سلسلے میں اسے کسی دلیل یا معجزہ کی ضرورت پیش نہیں آتی، شہداء وصالحین ان دونوں طبقوں کے کمالات کی اساس عمل ہے، اور انبیاء وصدیقین کے طبقے کی طرح یہاں بھی طبقۂ شہداء میں فاعلیت کی شان ہوتی ہے، اور طبقۂ صالحین قابلیت کی استعداد رکھتا ہے، شہداء میں اثرانگیزی کی صلاحیت ہے اور صالحین میں اثرپذیری کی اور جب صالحین کی عملی قوت درجۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے تو وہ منصبِ شہادت حاصل کرلیتے ہیں، کیونکہ دوسروں کو وہی متاثر کرسکتا ہے جو خود عزم وعمل کا پیکر ہو۔

شہید کو شہید کے لقب سے اسی بناء پر سرفراز کیا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے اور احکام شریعت کی اتباع میں وہ لوگوں کے حالات سے اس درجہ واقف ہوتا ہے کہ اس کی یہ واقفیت بمنزلۂ مشاہدہ ہوجاتی ہے، اسی لئے اسے قیامت کے دن امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلہ میں سرکاری گواہ کی حیثیت حاصل ہوگی، الغرض شہداء وصالحین کے کمالات کی بنیاد عمل ہے، البتہ شہیدوں میں عمل کے فیضان اور صالحین میں اس فیضان کے قبول کرنے کی استعداد ہوتی ہے۔

بقیہ ص ۲۲ علم عرفان سے .....

آج کے اس دور میں اسی سادگی و بے ساختگی کے ساتھ کہ جس سادگی کا مظاہرہ قرن اول میں ہوا تھا ایک کوشش ساری دنیا میں ہو رہی ہے اور اس نام کی اسی سادگی نے اس کی حقیقت و گہرائی پر پردہ ڈال رکھا ہے اس محنت سے ہم اپنے آپ کو منسلک کردیں اور ان ہزاروں اور لاکھوں میں ہوجائیں جنھوں نے اس راستہ کا فیضان حاصل کیا ہے۔

اساسی کمال

علم و عمل

وہ کمالات جن سے ارباب عقل و خرد متصف ہوتے ہیں ان میں علم و عمل کو اساسی درجہ حاصل ہے، قرآن حکیم نے جن اصحاب کمال کی مدح سرائی کی ہے وہ چار طبقوں میں منقسم ہیں (الف) انبیاء، (ب) صدیقین، (ج) شہداء (د) صالحین۔

اول الذکر دو طبقات کے کمالات کا محور علم ہے اور دوسرے طبقہ کے کمالات میں عمل کو مرکزیت حاصل ہے، البتہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے اوصاف میں شریک ہوسکتا ہے، لیکن ہر طبقہ کو اس کے وصفِ غالب کے لحاظ سے ملقب کیا گیا ہے مثلاً انبیاء کرام علیہم السلام کا وصفِ علم خود ان کے دیگر اوصاف پر غالب ہے، اس لئے ان کے تمام اوصاف میں سے صفتِ علم ہی کو مرکزی درجہ حاصل ہوا، یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اوصاف درجۂ کمال سے خالی ہیں، اسی طرح صدیقین کو صدیقیت کے ساتھ ملقب کیا گیا، اگرچہ وہ شہداء و صالحین کے زمرے میں بدرجۂ اولیٰ شامل ہیں مگر ان کے تمام اوصاف میں صدیقیت ہی کو امتیازی شان حاصل ہے، اسی لئے اسی لقب سے انھیں ممتاز کیا گیا۔

انبیاء و صدیقین میں فرق یہ ہے کہ حضرات انبیاء و رسل منبع علوم اور مؤثر ہوتے ہیں، اور صدیقین وہ سعادت مند لوگ ہوتے ہیں جو ان کے علوم و معارف سے فیض یاب و اثر پذیر رہتے ہیں کیونکہ ان میں کسب فیض کی غیر معمولی استعداد ہوتی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"خدا نے جو میرے سینے میں ڈالا، وہ میں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سینے میں ڈال دیا۔"

کے درس حدیث میں شریک ہونے کی کیا ضرورت تھی، اور مولانا علی میاں نے اپنے بھانجہ مولانا محمد ثانی حسنی کو مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھنے کے لئے کیوں بھیجا، اور مولانا تقی الدین ندوی جنہوں نے کئی سال تک ندوہ میں درس حدیث دیا اور آج کل جامعۃ العین میں مدرس حدیث ہیں، وہ خود اس بات کے معترف ہیں کہ حدیث کے ساتھ مناسبت مظاہر علوم میں حدیث پڑھنے سے ہوئی جنھوں نے موطاً امام مالک بروایت امام محمد پر کام کیا ہے اور اس وقت اوجز المسالک پر کام کر رہے ہیں، جن لوگوں سے فیوض حاصل کئے ان ہی کو ہدف بنایا جا رہا ہے اور ان ہی کو علوم میں ناکام بتایا جا رہا ہے، سچ ہے اِتَّقِ شَرَّ مَنْ اَحْسَنْتَ اِلَیْہِ۔

آخر میں ایک بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ مضمون نگار نے موطا کو موطا ابن مالک لکھ دیا ہے، ہمیں نہیں معلوم یہ کتابت کا سہو ہے یا .... اور تہذیب الاخلاق کا بلوغ المرام سے موازنہ کیا ہے یاد رہے کہ بلوغ المرام احکام کی کتاب ہے۔

بقیہ ص ۲۵ تراشے - یہودیت بنام قادیانیت

④ خلیج کی جنگ کے بعد دنیا میں سیٹلائٹ چینل کا مواصلاتی انقلاب برپا ہوا ہے، اور مواصلاتی ٹکنالوجی میں ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے مغرب نے عالم اسلامی پر مواصلاتی یلغار کر دی ہے تا کہ ساری اسلامی دنیا کو مغربی ثقافت کے رنگ میں غرق کر دیا جائے، ایسی حالت میں ۱۹۹۲ء کے اواخر میں سب سے بڑی مراعات قادیانیت کو دی گئی تاکہ وسطی ایشیا کے تمام ملکوں میں اپنے خیالات وعقائد مصنوعی سیاروں کے ذریعہ پھیلانے اور مسلمانوں کو اسلام کی طرف لوٹنے سے باز رکھ سکے۔

ہیں اگرچہ انھیں عربی لکھنے کی مشق نہیں کرائی گئی۔

صاحب مضمون نے بڑے فخر کے ساتھ ان دو چار کتابوں کے نام لیے ہیں جو بعض ندویوں نے ندوہ سے نکل کر دوسرے جامعات میں جاکر شہادات حاصل کرنے کے لئے لکھیں، ان اکابر کی کتابیں جنھوں نے ندوہ میں ایک دن بھی نہیں پڑھا صاحب مضمون کو نظر نہ آئیں۔ مناسب تھا کہ صاحب مضمون ندوہ کے نصاب کی بھی افادیت بتا دیتے، اور درس نظامی کے کمال اور جمال کا بھی تذکرہ کر دیتے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے سالہا سال کے بعد ندوۃ العلماء قائم ہوا اس کے لئے جو نصاب مقرر کیا گیا اس میں عربی بول چال اور عربی لکھنے کو زیادہ اہمیت دی گئی، جس چیز پر اصحاب ندوہ نے محنت کی اس میں کامیاب ہوئے یعنی جدید عربی کی روانی کے ساتھ بول چال سیکھ کر امارات اور سعودیہ عربیہ اور دیگر ممالک عربیہ میں ملازمت حاصل کرلی، لیکن کوئی محدث مفسر مفتی فقیہ پیدا نہ کر سکے، عموماً ندوہ کے محدث دیوبند و سہارنپور کے فارغ ہی رہے ہیں۔ یہ مولانا منظور نعمانی صاحب اور مولانا حمید الدین صاحب فیض آبادی، اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا عبدالستار اعظمی، مولانا ضیاء الحق اعظمی وغیرہ جنھوں نے ندوہ میں سالہا سال حدیث پڑھائی دیوبند سہارنپور کے ہی فضلاء ہیں، اور مولانا برہان الدین سنبھلی جو آج کل ندوہ میں مفتی اور مدرس حدیث ہیں ندوہ کے فارغ تو نہیں ہیں انھوں نے بھی دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی ہے ندوہ نے اپنی سو سالہ زندگی میں دو ہی شخصیتیں نکالی ہیں اول مولانا سید سلیمان ندوی دوم مولانا ابوالحسن علی ندوی، لیکن یہ معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے جو سیرۃ النبیؐ لکھی تھی اس میں ٹھوکریں کھائی تھیں، جب درس نظامی والے مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی کی خدمت میں پہونچے تب ان اغلاط کو صحیح کیا، اور مولانا علی میاں صاحب میں جو اصلاح وارشاد اور فلاح ونجاح کے احوال ہیں یہ ان میں کہاں سے پیدا ہوئے کیا ان میں مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور مولانا عبدالقادر صاحب رائپوریؒ اور مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیثؒ کے انڈیلے ہوئے اثرات نہیں ہیں ان لوگوں نے تو ندوہ میں نہیں پڑھا۔

آخر میں ایک بات اور یاد آگئی، وہ یہ کہ ندوہ کا نصاب تفسیر اور حدیث سمجھنے اور جاننے کے لئے کافی ہے تو مولانا علی میاں کو حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ

تنقید کا ہدف بنایا جائے، حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے حدیث پڑھی تھی ان سے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما نے حدیث پڑھی، نیز محشی بخاری حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ اور مولانا محمد مظہر صاحبؒ (جو مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے عہد اول کے محدث تھے) ان حضرات نے بھی شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے حدیث پڑھی. ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دس سال بعد دارالعلوم اور مظاہر علوم سہارنپور قائم ہوئے، ان کے مؤسسین نے جس نصاب کو اختیار کیا وہ پہلے سے معروف و مشہور تھا جو مولانا نظام الدین فرنگی محلی کا ترتیب دیا ہوا تھا، اسی لئے اسے درس نظامی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس نصاب میں ان تمام امور کی رعایت رکھی گئی ہے جن سے ٹھوس استعداد پیدا ہو، قواعد صرف و نحو میں طالب علم مضبوط ہو جائے اور معانی و بیان اور بدیع کو سمجھ کر قرآن و حدیث کی فصاحت و بلاغت کو سمجھ سکے، اور علوم قرآن و حدیث میں ماہر ہو جائے، اکابر دیوبند اور اکابر سہارنپور نے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسی نصاب کو اپنے مدارس میں جاری رکھا اور بعد میں بعض کتابیں بھی داخل کر دیں جو درس نظامی میں داخل نہیں تھیں، ان حضرات کے یہاں حدیث شریف کی مکمل دس کتابیں من اولہا الی آخرہا اور تفسیر جلالین، اور تفسیر بیضاوی داخل رہیں، فقہ کی کتابوں میں مکمل ہدایہ کی چار جلدیں اور شرح وقایہ، کنزالدقائق وغیرہ پڑھائی جاتی رہیں۔ ساتھ ہی افتار کی مشق بھی کراتے رہے جس سے کثیر تعداد میں مفسرین محدثین اور محشین اور مفتین و مؤلفین شروح حدیث اور تفاسیر لکھنے والے پیدا ہوتے رہے، یہ سب حضرات عربی بولنے لکھنے میں بھی ماہر تھے، مولانا احمد علی محشی صحیح بخاری شریف اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری مؤلف بذل المجہود اور مولانا شبیر احمد عثمانی مؤلف فتح الملہم شرح صحیح مسلم اور مولانا بدر عالم صاحب مؤلف فیض الباری شرح بخاری شریف اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ شارح ترمذی اور مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ شارح مؤطا و بخاری اور مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ مؤلف حیاۃ الصحابہ و شرح طحاوی، اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ ان حضرات نے متون حدیث اور شروح حدیث، تفسیر میں بڑا کام کیا ہے اور بہت سے حضرات اس درس نظامی کو پڑھ کر محدث اور مؤلف بنے. ان حضرات کی کتابیں عربی میں بھی

اکابر رحمہم اللہ کا نصاب درس

(اور اس کے فوائد)

مولانا اسمٰعیل ابراھیم بدات مدینہ منورہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد!

حال ہی میں تعمیر حیات لکھنؤ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے، مضمون نگار ہیں ع، ع، ن۔ جس میں انھوں نے ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کی بہت زیادہ مدح سرائی کی ہے، اور انداز بیان کچھ ایسا ہے جیسے حضرات علماء کرام کے تجویز فرمودہ دوسرے نصاب کے پڑھانے والوں نے کوئی دینی خدمت ہی نہیں کی یا یہ کہ وہ صحیح مقصد سامنے رکھ کر کوئی کام نہیں کر رہے ہیں، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ عربی زبان کا پڑھنا پڑھانا مقاصد اصلیہ میں سے نہیں ہے، مؤمن کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا قرآن اور حدیث کے جاننے اور اس پر عمل کرنے میں ہے اور یہ قرآن وحدیث عربی زبان میں ہے جو قدیم عربی فصیح وبلیغ زبان میں ہے اس لئے قرآن و حدیث میں معانی اور مفاہیم جاننے اور ان کی فصاحت وبلاغت سمجھنے اور ان کے احکام جاننے اور پہچاننے کے لئے عربی زبان کے قواعد نحو وصرف اور علم معانی اور علم بیان اور علم بدیع کے جاننے کی ضرورت پڑتی ہے، اس ضرورت کے لئے زمانۂ قدیم سے لے کر دور حاضر تک حضرات علماء کرام نے بہت سے نصاب تجویز کئے ہیں، ان سب کا محور یہی رہا ہے کہ قرآن وحدیث کو سمجھیں، ان کے احکام کو جانیں، ان سے مسائل اصول فقہ کے موافق مستنبط کریں اور قرآن وحدیث کے تعلیم فرمودہ احکام اور اخلاق و عادات پر عمل کریں۔

اگر کوئی شخص قرآن مجید صحیح پڑھ سکتا ہو، اس کے معانی ومفاہیم جانتا ہو، تفاسیر کو سمجھتا ہو، متون حدیث اور شروح حدیث سے واقف، اس سے استفادہ کر سکتا ہو، کتب فقہ پڑھ سکتا اور پڑھا سکتا ہو اور فتوی دینے کا اہل ہو، لیکن دور حاضر کے مطابق عربی زبان لکھنے پڑھنے میں ماہر نہ ہو تو ہمارے مشائخ اور اکابر کے نزدیک یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو

(جس میں کفر و شرک رسوم و بدعت حرام امور اور مکروہات شامل ہیں) کے مٹانے کے لئے جماعتی محنت جہاں نہیں ہو رہی ہے اس کو جاری کرنا اور عامہ مسلمین پر اس کے فرض کفایہ ہونے کو ظاہر کرنا۔

(۱۶) اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے کسی اہل حق مصلح سے تعلق اصلاحی قائم کرنا۔

(۱۷) مصلح سے ربط نہ ہونے پر اہل صلاح سے ملاقات کرتے رہنا اور ان کی صحبت اختیار کرنا۔

(۱۸) صحابۂ کرام اور امت کے صلحائے کرام کے حالات کو معلوم کرنا ان کے مواعظ و ملفوظات کا مطالعہ کرنا۔

(۱۹) اپنے اعمال کا اوقات نماز میں محاسبہ کرنا سیّات پر توبہ کرنا اور حسنات پر شکر کرنا۔

(۲۰) دعاء کا خاص اہتمام رکھنا بالخصوص فرائض کے بعد اور آداب دعاء کی مراعاۃ رکھنا اور اپنی امتِ مسلمہ کی اصلاح و حفاظت نیز مراکز دینیہ کی حفاظت کی رو رو کر دعاء کرنا رونا نہ آوے تو رونے کی صورت ہی بنا لینا۔

چند متفرق گزارشات

(۱) کمیتِ طلبہ سے زیادہ کیفیت پر نگاہ رکھنا۔

(۲) تادیب ضربی سے اجتناب کی سخت تاکید کرنا۔ بصورت ضرورت خاص حدود کی رعایت کرنا۔

(۳) جن وجوہ سے معطلی ہوتی ہے ان کے ظہور پر اور عدم اصلاح پر معطلی کی بجائے اسقاط استقلال کا معمول مقرر کرنا اور معتدبہ مدت کے بعد مثلاً کم از کم تین مہینہ کے بعد بحال کرنا۔

(۴) سوال کی مذمت پر ہر طالب علم کے ذہن میں ہے الا نادراً مگر درخواست امداد کو سوال نہیں سمجھتے اس کو اچھی طرح سمجھانا۔

(۵) شرائط مدرسہ کو تسلیم کرنا ان پر عمل کا عہد کرنا ایفائے عہد کی تاکید بار بار کرنا۔

(۶) طلبہ کے گھر جانے پر اپنے حلقہ کی مسجد میں کوئی ایک دین کی بات سنانے کی خصوصی فہمائش کرنا۔

(۷) تربیت معلمین (اس میں طریق تعلیم اور ان کی کمی کو دور کرنا بھی شامل ہے) کا انتظام کرنا۔

(۴) ادعیہ ماثورہ تصحیح اذان واقامت اور نماز کی عملی مشق کا ہر درجہ میں نظم رکھنا اور اس کے لئے کم ازکم پندرہ منٹ وقت مقرر کرنا۔

(۵) امتحان کی بعض کتب میں ان کی دیانت کے امتحان کا بھی نظم کرنا مثلاً ابتدائی کتب کا بھی امتحان تحریری لینا طریق ذیل پر کتابیں تپائی پر رکھوانا اور کسی استاد صاحب کو نگرانی کے لیے مقرر کرنا اور اس کی تذکیر کرنا کہ امانت کے ساتھ ناکام ہونا جنّت کا راستہ ہے اور خیانت کر کے پاس ہونا یا اعلیٰ نمبر حاصل کرنا جہنم کا راستہ ہے۔
حدیث شریف اور تفسیر کے طلبائے کرام کا امتحان اسی اہتمام سے لیا جانا۔ سرسری نگرانی میں خیانت کے ظہور پر اخراج کیا جانا اس سے پہلے آگاہ کرنا۔

(۶) گاہ گاہ ہفتہ عشرہ اور پندرھویں اجتماع طلبہ کا اہتمام کرنا اس میں اتباع سنت کی اہمیت و عظمت اور اس پر عمل کے فوائد کا اظہار کرنا۔ اسی طرح تجوید کی اہمیت کا بیان ہونا نیز اہلِ اخلاص واہلِ تقویٰ کے حالات ومعاملات سے آگاہ کرنا۔

(۷) عبادات میں اشراق، تہجد، اوابین یا قیام لیل کی طرف بھی توجہ دلانا کہ عامۂ مسلمین سے عمل میں ممتاز رہنا۔

(۸) اذان جمعہ سے کم ازکم پندرہ منٹ قبل مسجد کی حاضری کا بہت اہتمام کرنا۔ اذان جمعہ اور دیگر اذان کے احکام سے مدرسہ کے ہر طالب علم کو بھی آگاہ کرنا۔

(۹) عیادت کی سنت کی عملی مشق کرنا اساتذۂ کرام اور منتظمین کرام کے ذریعہ اس کو زبانی بتلانا اور عملاً سکھانا۔

(۱۰) اعمال سنتہ جمعہ اور اعمال خاصہ جمعہ کو محفوظ کرانا

(۱۱) جماعت کے اہتمام کی بار بار تاکید کرنا بالخصوص تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرانا۔

(۱۲) تعدیلِ ارکان کی طرف خصوصی توجہ دلائی جانا کہ طلبۂ کرام کی نماز عامۂ مسلمین کی نماز سے جلد ختم نہ ہونا۔

(۱۳) دارالاقامہ والے مدارس میں فجر کے بعد اور عصر کے بعد کچھ دینی مذاکرہ کا معمول رکھنا۔

(۱۴) عشاء کے بعد کی پڑھائی ختم ہو کر سنن نوم وبیداری کی تلقین کرانا اور طلبۂ کرام سے سنوانا۔

(۱۵) جس طرح ماموراتِ (مثلاً مساجد ومدارس) کے لئے جماعتی محنتیں ہو رہی ہیں اسی طرح منکرات

(۳) ابتدائی کتب تجربہ کار اساتذہ کے پاس ہونا۔

(۴) اساتذہ کا معقول مشاہرہ بقدر حاجت مقرر کرنا۔

(۵) اسباق کی عبارت خوانی کے سلسلہ میں بلاتعین ہر ایک سے پڑھوانا خواہ پوری پوری عبارت ایک طالب علم سے پڑھوائی جائے یا تھوڑی تھوڑی کئی ایک سے پڑھوانا۔

(۶) صحیح عبارت پڑھنے والے سے اعراب وترکیب کی تحقیق کرنا۔

(۷) پچھلا سننے کا اہتمام رکھنا گاہ گاہ متعدد طلبہ سے پوچھ گچھ کرنا۔

(۸) مشکل مقامات کا خلاصہ لکھوانا اور اس کی تقریر کرانا۔

(۹) داخل شدہ طلبہ میں اگر عبارت خوانی کی صلاحیت ظاہر نہ ہو تو اس کمی کے دور کرنے کے لئے کچھ مدت مقرر کرنا۔ مدت مقررہ میں کمی دور نہ ہونے کی صورت میں تنزل کر دینا۔

(۱۰) امتحان ماہانہ کا انتظام اور اعلیٰ نمبر پر انعام مقرر کرنا۔

(۱۱) داخلہ کا امتحان تفصیلی و معیاری ہونا۔

(۱۲) ممتحنہ کتب کے ساتھ اس کے نیچے کی کتب کی بھی جانچ کرنا۔

(۱۳) نصابِ تعلیم میں تصحیح قرآن شریف کو اور کتب تجوید کو بھی شامل کرنا۔

(۱۴) نصابِ تعلیم میں اصلاحِ اخلاق کی کتب کو بھی داخل کرنا اس سلسلہ میں کچھ معاون کتب کو بھی تجویز کرنا۔

(۱۵) اپنے اپنے مدارس کے امتحان و معائنہ کے لئے باہر سے بھی بعض ایسے حضرات کو جو مروت سے مغلوب نہ ہوں بلانا۔

عملی حالت کی درستگی کے سلسلہ میں چند گزارشات

(۱) اساتذۂ کرام کے تقرر میں انکی عملی حالت پر خاص توجہ کرنا بالخصوص وضع قطع اور سر کے بال اور شرعی ڈاڑھی کو خاص اہمیت دینا۔ ایسی کمی پر تقرر نہ کرنا اگر کرنا تو عارضی طور پر ایک ماہ کے لئے تقرر کرنا پھر ذمہ دار کا خصوصی نگرانی بھی رکھنا۔

(۲) داخلہ کے وقت طلباء کی وضع قطع بالخصوص سر کے بال و ڈاڑھی کی دیکھ بھال کرنا۔

(۳) اپنے اپنے مدرسہ میں سنت کے موافق اذان کا نظم کرنا طلبۂ کرام سے بھی اذان دلوانا کبھی کبھی اساتذہ و منتظمینِ کرام کو بھی اس شرف کو حاصل کرنا۔

مکتوبِ گرامی حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقی

٭ خلیفہ حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ ٭

حَامِداً وَّمُصَلِّیاً وَّمُسَلِّماً اَمَّا بَعْدُ۔ مدارس دینیہ کے قیام کا مقصد محض علوم کی منتقلی یا کسی طرزِ تعلیم کا اجراء نہیں ہے بلکہ اسکی تاسیس کا عظیم مقصد میراث نبوی (کتاب وسنّت) کی علمی و عملی حفاظت واشاعت ہے ظاہر ہے کہ اس کے لیے تعلیم وتربیت دونوں ہی ضروری ہیں کیونکہ تعلیم سے علم نبوی اور تربیت سے عمل نبوی کا ظہور ہوگا اور یہی دو چیزیں درحقیقت میراثِ نبوی ہیں یہیں سے مدارس کا جو اصل کام ہے وہ خود بخود متعین ہوجاتا ہے اور وہ ہے تعلیم وتربیت۔ تعلیم و تربیت کے بنیادی عناصر میں نصاب تعلیم ونظام تربیت دونوں ہی ہیں، اسی وجہ سے ہر دور میں یہ دونوں مسئلے بہت اہم اور غور وفکر کا موضوع رہے ہیں بالخصوص اس وقت دینی مدارس میں تعلیمی وتربیتی دونوں ہی لحاظ سے جو تنزل ہو رہا ہے اس کی بناء پر ان دونوں چیزوں پر خصوصی طور پر توجہ اور غور وفکر کی ضرورت ہے۔ نیز دعا کا بھی خاص اہتمام چاہئے تاکہ موجودہ صورتِ حال کے تدارک کی بہتر صورت بفضلہ تعالیٰ ظاہر ہوجائے اور انفراداً واجتماعاً اس میں لگنے کی توفیق بھی مل جائے۔

چنانچہ تعلیمی خامی کے رفع کے لئے چند امور معروض ہیں۔

(۱) نصابِ تعلیم جو بھی طے ہو اس کے لئے ایسے اساتذہ کا جن میں حسبِ ذیل دو باتیں پائی جاتی ہوں ان کا انتخاب کرنا۔

الف جس علم وفن کو پڑھاتے ہوں اس سے مناسبت اور اس میں مہارت ہونا یا اس کی فکر ہونا اور بقدرِ ضرورت استعداد ہونا۔

ب بقدرِ ضرورت تقویٰ ہونا۔

(۲) تقسیم اسباق میں پڑھانے کے لئے اسباق بقدرِ تحمل مقرر کرنا۔

حکیم الامت مولانا تھانوی، حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ ایک منفرد اجتماع تھا جو محض اس لئے اکٹھا ہوا تھا کہ مستقبل میں علوم دینیہ اسلامیہ کی تعلیم و ترویج کے لئے مناسب نظام عمل مرتب کرے، بحمد اللہ اجتماع اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، اجتماع کی مکمل روداد آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیجئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پر پولس کی غیر قانونی یورش ہندوستان کی جمہوری و سیکولر قدروں پر یقین رکھنے والوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے، حکومت کے ذمہ داروں نے اگرچہ اپنی مشینری کی اس بیجا حرکت اور رہا لیا ئی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے، لیکن انگریزی و ہندی پریس اس مسئلہ کو جس انداز سے پیش کر رہا ہے وہ انتہائی خطرناک ہے، پھر حکومت کی اس رویہ سے چشم پوشی ایک بڑے خطرے کی نشاندہی کر رہی ہے، اس مسئلہ کو جو لوگ فرقہ واریت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں وہ نہ صرف صحافت کا خون کر رہے ہیں بلکہ ملک کو جمہوریت کی راہ سے ہٹانے کی کاوش میں مبتلا ہیں۔ ادھر عرصہ سے فرقہ پرست افراد اور پارٹیاں مدارس کو اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ بنائے ہوئے تھیں پولیس نے رات کے اندھیرے میں ندوہ پر چھاپہ مار کر ان کی عملی ہم نوائی کا ثبوت پیش کر دیا ہے، ایک جمہوری ملک میں اس قسم کی غیر جمہوری اور غیر قانونی حرکتیں سب کے لئے باعث شرم ہیں، اور بلا لحاظ مذہب و ملت سب ہی کو اس شرمناک حرکت کا احساس ہونا چاہئے۔ خاص طور پر حکومت اور اس کی مشینری کو اس سلسلہ میں زیادہ حساس رہنے کی ضرورت ہے، تاکہ اس قسم کی غلطی پھر نہ دہرائی جائے، اہل مدارس کو بھی اس خطرے کی گھنٹی کا احساس ضروری ہے۔

جس سے متأثر ہو کر بہت سے لوگ مدارس کے نظام تعلیم کو ناقص اور غیر مفید سمجھنے لگے ہیں۔

ان دونوں طبقوں کے ساتھ خود مدارس کے فضلاء میں ایک طبقہ مروجہ نصاب میں تبدیلی کی آواز بلند کر رہا ہے، جن میں بعض تو بنیادی تبدیلی چاہتے ہیں اور بعض جزوی حذف و اضافہ کے ذریعہ نصاب کو سہل الحصول بنانا چاہتے ہیں، یہ حضرات بھی برملا اپنی رائے کا اظہار و اعلان کرتے رہتے ہیں

مدارس سے متعلق ان مختلف آوازوں نے اہل مدارس کو ایک عجیب طرح کے مخمصے میں ڈال دیا ہے اس لئے ضرورت داعی ہوئی کہ ملک گیر پیمانے پر اہل مدارس کا اجتماع بلایا جائے جس میں مدارس کے مسائل پر کھل کر گفتگو ہو اور ان مختلف آوازوں کے تصادم سے پھیلے غبار کو دور کیا جائے اور باہمی گفت و شنید اور رائے و مشورے سے مدارس کے لئے متفقہ نظام تعلیم و تربیت مرتب کیا جائے

دارالعلوم دیوبند چونکہ ام المدارس کی حیثیت رکھتا ہے، اور کچھ مخصوص مدارس کے علاوہ ملک کے سارے ہی مدارس معنوی طور پر دارالعلوم دیوبند ہی سے مربوط ہیں اس لئے دارالعلوم دیوبند ہی کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ارباب مدارس کے اجتماع کا تکفل کرے، الحمدللہ ثم الحمدللہ دارالعلوم کے ارباب حل و عقد نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور مدارس کا ایک نمائندہ اجتماع ۲۰ / ۲۱ / محرم ۱۴۱۵ھ مطابق ۱ / ۲ / جولائی ۱۹۹۴ء کو بلایا، اس اجتماع نے کل ہند مدارس کے اجتماع کی ضرورت کا شدت سے اظہار کیا، اور کل ہند اجتماع میں زیر بحث آنے والے ضروری مسائل کا ایک خاکہ بھی اتفاقی طور پر مرتب کیا اور کل ہند مدارس عربیہ اسلامیہ کے اجتماع کے لئے اپنی تجویز میں ماہ اکتوبر کو مقرر بھی کر دیا، چنانچہ نمائندہ اجتماع کی تجویز کے مطابق ماہ اکتوبر کی ۲۷، ۲۸، ۲۹ / مطابق ۲۰، ۲۱، ۲۲ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ کو دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام دارالعلوم ہی میں یہ کل ہند مدارس کا یہ اجتماع ہوا جس میں صوبہ جات یوپی۔ بہار، اڑیسہ، مدھیہ پردیس، آسام بنگال، منی پور، گوا، دہلی، گجرات، مہاراشٹر، راجستھان، ہریانہ و پنجاب، ہماچل پردیش، آندھرا پردیس تملناڈو، کرناٹک، کیرالہ، کشمیر، نیپال کے بائیس سو اٹھائیس (۲۲۲۸) مدارس کے نمائندے شریک ہوئے مشاہیر میں ارکان مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے علاوہ حضرت مولانا ابرارالحق خلیفہ حضرت

بالفاظ واضح دارالعلوم دیوبند اور معنوی طور پر اس سے متعلق برصغیر کے مدارس اسلامی کا اساسی کام تعلیم کتاب اللہ، تدریس سنت رسول اللہ، تفقہ فی دین اللہ کے ذریعہ ایسے رجال کار تیار کرنا ہے جو دل و دماغ کے اعتبار سے اسلام کے سچے امین اور فکر و عمل کے لحاظ سے نمونہ کے مسلمان ہوں۔

۱۸۵۷ء سے اب تک کی مسلم تاریخ پر نظر رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ برصغیر میں آج جو دینی چہل پہل ہے وہ انھیں مدارس دینیہ کی دم قدم سے ہے، بلکہ بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کچھ اوپر ایک صدی کے اس عرصہ میں ارباب مدارس علماء ہند نے قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی تعلیم وتشریح اور نشرواشاعت میں جو وسیع تر خدمت انجام دی ہے، مصروشام اور دیگر بلادِ اسلامیہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے، جس کا اعتراف خود مصر کے بعض محققین علماء نے کیا ہے۔

مدارس دینیہ کی ان خدمات جلیلہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم ان کے احسان مند ہوتے اور ان کی تعمیر وترقی کے لئے اپنی کسی کوشش سے باز نہ رہتے، لیکن اپنے مخصوص ذہن وفکر کی بناء پر ملت کا ایک طبقہ ابتدا ہی سے مدارس کی بیخ کنی پر تلا ہوا ہے اور دل سے اس بات کا خواہش مند ہے کہ ان مدارس دینیہ کو ان کے منہاج ومقصد سے ہٹا کر انھیں عصری اسکول وکالج میں بدل دے اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے یہ طبقہ علمائے دین، طلبۂ علوم اسلامیہ پر آئے دن ناروا حملے کرتا رہتا ہے، اور اپنے مقتدایانِ مغرب کی پیروی میں ان پر ضروریات زمانہ سے بے خبری، تنگ نظری بنیاد پرست، قوم کی روٹیوں پر پلنے والے، فقیر وقلاش وغیرہ طعنے اور خود ساختہ الزامات تھوپنے کی بیجا سعی میں مصروف چلا آرہا ہے۔ یہ طبقہ دینی علوم وعلماء کی دشمنی میں اس حد تک آگے جا چکا ہے کہ اس نے اپنے رویہ سے افہام وتفہیم کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔

اس معاند طبقہ کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مادیت کے فروغ سے متاثر ہو کر اخلاص وخیر خواہی کے جذبہ سے یہ چاہتا ہے کہ اہل مدارس دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم بھی اپنے مدرسوں میں پڑھائیں تاکہ مدارس کے فضلاء علوم دینیہ سے واقفیت کے ساتھ روزی روٹی کے ہنر سے بھی بے بہرہ نہ رہیں، اس مخلص مگر سادہ لوح جماعت کے دل ودماغ میں یہ بات بٹھادی گئی ہے کہ علوم عصریہ کے بغیر روزی روٹی کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا، اس لئے بڑی حد تک اسے اپنی رائے پر اصرار بھی ہے اور مختلف طریقے سے اپنی اس رائے کی ترسیل وتبلیغ کرتا رہتا ہے

دارالعلوم دیوبند اور اس کے نہج پر قائم دیگر سارے مدارس دینیہ کا بنیادی تخیل دراصل امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے انقلابی فکر و دعوت کی اساس پر استوار ہے جن کے پیش نظر بقول حضرت شیخ الہند اگر ایک طرف ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی تھی تو دوسری جانب برصغیر میں بقائے اسلام اور تحفظ شریعت کا اہم منصوبہ تھا۔ اگر ایک طرف ان کا مقصد نونہالان قوم کو مغربی فکر و تہذیب کی یلغار سے محفوظ رکھنا تھا تو دوسری طرف ان کا مطمح نظر انھیں اسلامی تعلیمات و احکام سے آراستہ کرنا تھا، چنانچہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ سوانح قاسمی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

" اگر لارڈ میکالے نے یہ کہکر اپنا نظام تعلیم ہندوستان میں پھیلایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور روح و فکر کے لحاظ سے انگریز" تو بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم کی بنیاد ڈالتے ہوئے لسان حال سے یہ عملی صدا بلند کی کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندی و سندھی، ایرانی و افغانی، خراسانی و ترکستانی ہوں، لیکن روح و فکر کے لحاظ سے عربیت و اسلامیت کی روح سے معمور اور بھرپور ہوں (ص ۵)"

روداد اجلاس

نشست اول ۶۵

نشست دوم ۸۷

نصاب تعلیم

نشست سوم ۹۹

نظام تعلیم و تربیت

نشست چہارم ۱۰۹

رابطہ مدارس عربیہ

نشست پنجم ۱۱۹

تحفظ ختم نبوت

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے ، اس لئے وی ، پی میں صرفہ زائد ہوگا
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بدل اشتراک سالانہ	
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ =/۳۰۰ روپے	
پاکستان سے ہندوستانی رقم =/۱۰۰	ہندوستان سے -/۶۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰	

مجاہدین وقائدین ملت

۱۔ امام العصر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ
۲۔ امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ״
۳۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ״
۴۔ حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاری ״
۵۔ حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوری ״
۶۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہانپوری ״
۷۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ״
۸۔ رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ״
۹۔ حضرت مولانا محمد صادق کراچی سندھ رحمہ اللہ
۱۰۔ حضرت مولانا سجاد حسین بہاری ״
۱۱۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری ״
۱۲۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ״
۱۳۔ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ״
۱۴۔ حضرت مولانا مفتی محمود سابق وزیر سرحد ״
۱۵۔ حضرت مولانا احتشام حسین تھانوی ״

مناظرین اسلام

۱۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ
۲۔ حضرت مولانا احمد حسن لاہوری ״
۳۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ״
۴۔ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوری ״
۵۔ حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوری ״
۶۔ حضرت مولانا اسعد اللہ رام پوری ״
۷۔ حضرت مولانا سید ارشاد احمد فیض آبادی ״
۸۔ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی مدظلہٗ
۹۔ حضرت مولانا منظور احمد نعمانی ״
۱۰۔ حضرت مولانا نور محمد ٹانڈوی ״
۱۱۔ حضرت مولانا عبداللطیف اعظمی ״
۱۲۔ حضرت مولانا عبدالسلام فاروقی لکھنوی رحمہ اللہ
۱۳۔ حضرت مولانا عبدالحلیم ״ ״
۱۴۔ حضرت مولانا قاضی محمد مظہر حسین مدظلہٗ
۱۵۔ حضرت مولانا عبدالستار تونسوی ״
۱۶۔ حضرت مولانا لال حسین اختر رحمہ اللہ
۱۷۔ حضرت مولانا محمد حیات فاتح قادیان .
۱۸۔ حضرت مولانا علامہ خالد محمود مدظلہٗ
۱۹۔ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل کٹکی ״
۲۰۔ حضرت مولانا امام علی دانش لکھیم پوری ״

صحافی و اہل قلم

	نام	
۱	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	ایڈیٹر ماہنامہ القاسم دارالعلوم دیوبند
۲	مولانا منظور احمد نعمانی	" " الفرقان بریلی ولکھنؤ
۳	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	" برہان دہلی
۴	مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی	آپ کی ادارت میں دسیوں رسائل جاری ہوئے
۵	مولانا مظہر الدین بجنوری	روزنامہ الامان دہلی
۶	مولانا شائق عثمانی	عصر جدید کلکتہ
۷	مولانا عامر عثمانی	ماہنامہ تجلی، دیوبند
۸	مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی	الحرم میرٹھ
۹	مولانا حبیب الرحمن بجنوری	منصور اور انخلیل ہفتہ دار
۱۰	مولانا عبدالوحید صدیقی	نئی دنیا
۱۱	مولانا ازہر شاہ قیصر	ماہنامہ دارالعلوم دیوبند (سابق ایڈیٹر)
۱۲	مولانا حامد الانصاری غازی	مدینہ بجنور، اور جمہوریت دہلی
۱۳	مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ	البلاغ کراچی۔
۱۴	مولانا سمیع الحق	الحق اکوڑہ خٹک۔
۱۵	مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی	بینات، بنوری ٹاؤن کراچی
۱۶	مولانا عبدالعلی	البدر کاکوری
۱۷	مولانا محمد صادق علی بستوی	نقوش حیات، بستی
۱۸	مولانا اسیر ادروی	ترجمان اسلام بنارس، سہ ماہی۔
۱۹	مولانا اعجاز احمد اعظمی	المآثر مئو، سہ ماہی
۲۰	مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری	ندائے شاہی مرادآباد
۲۱	مولانا نور الحسن راشد	احوال و آثار مفتی الٰہی بخش اکاڈمی کاندھلہ
۲۲	مولانا محمد ہاشم القاسمی	الفیصل، حیدرآباد
۲۳	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی	بحث ونظر پٹنہ، سہ ماہی
۲۴	مولانا رضوان القاسمی	صفا، جامعہ سبیل السلام حیدرآباد
۲۵	حبیب الرحمن قاسمی	ماہنامہ دارالعلوم دیوبند
۲۶	مولانا کفیل احمد کیرانوی	آئینہ دارالعلوم، دیوبند (پندرہ روزہ)
۲۷	مولانا نور عالم امینی	الداعی (عربی)
۲۸	مولانا محمد سالم جامعی فاضل دیوبند	ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی

ایک سرسری جائزہ

مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

شمار	زبان	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	کیفیت
۱	اردو 〃	موضح فرقان مع تفسیری فوائد سورۂ بقرہ ونساء	حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ	یہ ترجمہ طبع زاد نہیں بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ قرآن کا جدید اردو ایڈیشن ہے، حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے الہامی ترجمہ کی تسہیل وتیسیر بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔
۲	〃	تفسیری فوائد	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ	سورۂ بقرہ ونساء کے علاوہ پورے قرآن کے یہ تفسیری فوائد مستند ومعتبر تفسیروں کا سلیس و صاف اردو میں خلاصہ ہے جو کوزہ میں دریا سمو دینے کا مصداق ہے
۳	〃	ترجمۂ قرآن مع حواشی	حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ	ترجمہ نہایت سلیس ہے حواشی میں رابط آیات اور اور ضروری وضاحتیں بڑی وقیع ہیں، اب تک اسکے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
۴	〃	ترجمۂ قرآن مع حواشی	حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ	یہ ترجمہ نہایت سلیس اور صاف اردو میں ہے اور اہل علم میں مقبول ہے اس ترجمہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا ایک ایک حرف حضرت شیخ الہندؒ کی نظر سے گذرا ہے۔
۵	〃	ترجمہ قرآن	حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ	یہ ترجمہ سلاست وضاحت میں اپنی مثال آپ ہے۔
۶	〃	کشف الرحمٰن ترجمۂ قرآن	حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ	نہایت مقبول ومعتبر ترجمہ ہے ادبی ذوق رکھنے والے بطور خاص اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں
۷	بنگلہ	ترجمۂ قرآن	مولانا محمد طاہر خلیفہ حضرت مدنیؒ	بنگال میں یہ ترجمہ بہت مقبول ہے۔
۸	آسامی	ترجمۂ قرآن	مولانا عبدالحق آسامی خلیفہ حضرت مدنیؒ	

شمار	زبان	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	کیفیت
۹	اردو	بیان القرآن	حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رہ	یہ تفسیر بے پناہ ظاہری و معنوی خوبیوں کی حامل ہے اور اہل نظر علماء اسے اہم عربی تفسیروں کے درجہ میں شمار کرتے ہیں
۱۰	"	معارف القرآن ۸ جلدوں میں	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی	قرآنی مسائل و معارف کا بیش بہا خزانہ اور عام فہم فصیح اردو میں ہے اب تک اس کے دسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں
۱۱	"	معارف القرآن	حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی	اس تفسیر میں مؤلف نے حقائق و معارف کے بیش بہا جواہرات جمع کر دیئے، سورۂ حجر تک مولانا موصوف کے قلم سے ہے اور بقیہ حصہ کی تفسیر ان کے خلف رشید مولانا محمد مالک کاندھلوی نے تحریر کی ہے۔
۱۲	"	جواہر القرآن دو جلد	شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان	نہایت عمدہ اور بیش بہا علمی فوائد پر مشتمل ہے، خاص طور پر ان کے استاذ غلام حسین علی تلمیذ حضرت گنگوہی کے افادات کو موصوف نے اس تفسیر میں بڑی خوبی سے جمع کر دیا ہے۔
۱۳	"	بلغۃ الحیران فی تفسیر قرآن	"	یہ تفسیر بھی مولانا علامہ حسین علی کے فرمودات و افادات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔
۱۴	"	تفسیر القرآن	مولانا قاضی شمس الدین حنفی سابق استاذ دارالعلوم دیوبند	اس تفسیر کے بعض اجزاء تسلیم کمپنی پاکستان نے شائع کئے تھے پتہ نہیں مکمل شائع ہوئی یا نہیں۔
۱۵	عربی	مشکلات القرآن	محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری	نام سے اس کا موضوع ظاہر ہے یعنی اس میں قرآنی مشکلات و مبہمات کا حل موجود ہے اہل علم کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے
۱۶	"	احکام القرآن	مولانا مفتی محمد شفیع مولانا محمد ادریس کاندھلوی " ظفر احمد تھانوی اور " محمد جمیل تھانوی	آیات احکام کی فقہی تفسیر ہے، اور اپنے موضوع پر اہم ترین خدمت ہے متعدد ضخیم جلدوں میں ادارۃ القرآن کراچی سے شائع ہو چکی ہیں۔
۱۷	پشتو	انوار القرآن	مولانا سید انوار الحق کاکاخیل فاضل دیوبند	
۱۸	"	انکشاف القرآن	مولانا محمد ادریس طوروی فاضل جامعہ اسلامیہ ڈابھیل	
۱۹	افغانی	تیسیر القرآن	مولانا محمد طاہر مردانی فاضل دیوبند	ترجمہ و تفسیر غیر مطبوعہ
۲۰	عربی	حاشیہ تفسیر بیضاوی	مفسر قرآن مولانا عبد الرحمٰن امروہوی	

شمار	زبان	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	کیفیت
۲۱	اردو	حاشیہ تفسیر جلالین مع ترجمہ	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی	جلالین کا یہ ترجمہ دیوبند سے قرآن کے حاشیہ پر چھپا تھا
۲۲	〃	ترجمہ تفسیر خازن	〃 〃 〃	
۲۳	عربی	منحۃ الجلیل خلاصہ معالم التنزیل	〃 〃 〃	یہ خلاصہ لامع النور پریس آگرہ سے چھپا تھا اب بالکل نایاب ہے۔
۲۴	اردو	ترجمہ تفسیر ابن کثیر	مولانا انظر شاہ کشمیری صاحب	
۲۵	〃	ترجمہ تفسیر مدارک التنزیل	〃 〃 〃	
۲۶	〃	ترجمہ تفسیر جلالین	مولانا محمد نعیم دیوبندی صاحب	
۲۷	ہندی	ترجمہ حضرت شیخ الہند مع فوائد عثمانی	مولانا سید ارشد مدنی صاحب بشرکت ماسٹر محمد سلیمان	ہندی زبان میں ترجمہ کے ساتھ تفسیری تشریحات کی یہ اولین خدمت ہے جو بحمداللہ علمائے دیوبند کے حصہ میں آئی جمعیۃ علماء نے عمدہ کاغذ و طباعت سے مزین کرکے شائع کیا ہے۔
۲۸		ترجمہ و تفسیر	مولانا حبیب احمد کیرانوی	اس تفسیر کو حرفاً حرفاً حضرت تھانوی نے پڑھا ہے اور بعض مقامات کی اصلاح بھی فرمائی ہے۔
۲۹	پشتو	ترجمہ و تفسیر	مولانا فضل ودود مولانا گل رحیم فاضل دیوبند	نصف نصف قرآن کی تفسیر دونوں حضرات نے کی ہے، خازن، معالم التنزیل، جمل اور روح البیان وغیرہ کو سامنے رکھ کر یہ تفسیر مرتب کی گئی ہے
۳۰	اردو	البیان فی علوم القرآن مع ترجمۂ قرآن	مولانا سید ممتاز علی دیوبندی بانی دارالاشاعت لاہور	موصوف نے قرآن مجید کا ترجمہ اور علوم قرآن کی مکمل فہرست بڑی محنت و کاوش سے اس میں جمع کردی ہے یہ قرآنی انڈکس ۱۹۲۹ء میں گیانی پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔
۳۱	〃	تفسیر تعلیم القرآن	مولانا قاضی زاہد الحسینی فاضل دیوبند	
۳۲	〃	درس قرآن مجید	〃 〃 〃	
۳۳	〃	معالم التنزیل	مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی	تیس جلدوں پر مشتمل یہ ضخیم تفسیر درحقیقت تمام مستند و معتبر قدیم و جدید تفسیروں کا خلاصہ ہے

شمار	زبان	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	کیفیت
۳۴	اردو	الہام الرحمٰن	حضرت مولانا عبیداللہ سندھی	تدوین وتہذیب مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی
۳۵	"	تفسیر سورۂ فاتحہ	" " "	یہ جملہ تفاسیر دراصل مولانا سندھی مرحوم کے درسی افادات ہیں جنھیں بعد میں ان کے تلمیذ مولوی بشیر احمد لدھیانوی نے جمع ومرتب کرکے شائع کیا ہے، اس مجموعہ تفاسیر میں بعض باتیں قابل گرفت ہیں جس کی ذمہ داری مرتب پر ہی آتی ہے، مولانا سندھی اپنی تشریحات میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہا کی تحقیقات سے باہر نہیں نکلتے، جیساکہ ان کی خودنوشت تالیفات شاہد ہیں
۳۶	"	تفسیر سورۂ قتال	" " "	
۳۷	"	تفسیر سورۂ فتح	" " "	
۳۸	"	تفسیر سورۂ مزمل ومدثر	" " "	
۳۹	"	تفسیر سورۂ والعصر	" " "	
۴۰	"	تفسیر سورۂ اخلاص	" " "	
۴۱	"	تفسیر سورۂ معوذتین	" " "	
۴۲	"	المقام المحمود تفسیر سورۂ عم	" " "	
۴۳	"	المقام المحمود تفسیر سورۂ بقرہ	" " "	
۴۴	"	درس قرآن کی سات مجلسیں	حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	مرادآباد جیل میں حضرت شیخ مدنیؒ کے درس قرآن کا مجموعہ ہے جو اگرچہ سورۂ فاتحہ سے متعلق ہے پھر بھی علمی لطائف رموز قرآن اور اسرار حکم کا ایک خزینہ ہے جسے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے جمع ومرتب فرمایا ہے۔
۴۵	سندھی	تفسیر القرآن	مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب	
۴۶	اردو	درس سورۃ الفاتحہ	حضرت مولانا شمس الحق افغانی	یہ حضرت مولانا افغانی کے درسی افادات کا مجموعہ ہے جنھیں ان کے تلمیذ مولانا علی اصغر عباسی نے مرتب کرکے شائع کیا ہے، دروس کا یہ مجموعہ علمی نکات کا ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے۔
۴۷	عربی	یتیمۃ البیان	حضرت مولانا محمد یوسف صاحب محدث بنوری	یہ مشکلات القرآن از محدث کشمیری کا مبسوط بلند پایہ مقدمہ ہے، جو بجائے خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، الگ سے کتابی شکل میں اور مشکلات القرآن کے ساتھ متعدد بار شائع ہوچکا ہے

شمار	زبان	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	کیفیت
۴۸	عربی	سبق الغایات فی نسق الآیات	حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ	پہلا رسالہ ربط آیات و سور سے متعلق ہے اور بقیہ سارے تفسیر و ترجمہ سے
۴۹	اردو	احسن الاثاث فی النظر الثانی		
۵۰	"	اصلاح ترجمہ دہلویہ		
۵۱	"	اصلاح ترجمہ حیرت		
۵۲	"	التقصیر فی التفسیر		
۵۳	عربی	سمط الدرر فی ربط الآیات والسور	مولانا محمد طاہر مردانی	موضوع نام سے ظاہر ہے یہ کتاب اہل علم میں مقبول ہے اب تک اس کے چار ایڈیشن سے زائد نکل چکے ہیں۔
۵۴	اردو	علوم القرآن	حضرت مولانا شمس الدین افغانی	علوم قرآن پر بڑی معلومات افزا کتاب ہے اور اہل علم میں معروف ومقبول ہے
۵۵	اردو	علوم القرآن	مولانا محمد تقی عثمانی	علوم قرآن میں مشہور عربی کتاب مناہل العرفان کا عطر اس کتاب میں نچوڑ لیا گیا ہے
۵۶	اردو	معارف القرآن	مولانا قاضی زاہد الحسینی صاحب	علوم قرآن میں جامع ومفید کتاب ہے، اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
۵۷	اردو	منازل العرفان فی علوم القرآن	مولانا محمد مالک کاندھلوی	اپنے موضوع پر نہایت جامع وضخیم کتاب ہے حضرت شاہ ولی اللہ کی مشہور تالیف الفوز الکبیر
۵۸	عربی	العون الکبیر شرح الفوز الکبیر	مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری استاذ دارالعلوم دیوبند	الفوز الکبیر کے حل کیلئے یہ شرح نہایت کارآمد اور علماء وطلبہ میں مقبول ہے
۵۹	اردو	تاریخ القرآن	مولانا عبد الصمد صارم فاضل دیوبند	تاریخ قرآن پر نہایت مستند اور معیاری کتاب ہے مصر وشام کے علماء نے بھی اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے یورپ کے مصنفین اس کا حوالہ دیتے ہیں
۶۰	اردو	البرہان فی اصول القرآن	مولانا محمد طاہر مردانی	مخطوطہ
۶۱		تفسیر ہدایت القرآن	مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند	موصوف اپنے دیگر علمی مشاغل کی وجہ سے چند پاروں سے زائد کی تفسیر اب تک نہیں کر سکے ہیں۔

شمار	زبان	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	کیفیت
۶۲	اردو	تفسیری اشارات	العبد الضعیف حبیب الرحمن قاسمی خادم التدریس دارالعلوم دیوبند	تفسیر سورۂ بقرہ جس میں سورۃ کے عمود اور آیات کے مابین ربط کو ایک خاص انداز سے بیان کیا گیا ہے یہ تفسیر قسط وار ماہنامہ دارالعلوم دیوبند اور ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔
۶۳	اردو	قصص القرآن ۴ جلد	حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی	آیات تاریخیہ کی محققانہ تفسیر و تشریح اپنے موضوع پر یہ کتاب نہایت بلند پایہ اور وقیع ہے اور اہل علم میں مقبول و متداول ہے
۶۴	"	ذیل السائرین فی طبقات المفسرین	مولانا محمد طاہر بردانی	اپنے موضوع پر نہایت مفید ہے۔
۶۵	"	تذکرۃ المفسرین ۲ جلد	مولانا قاضی زاہد الحسینی	مفسرین کے تذکرہ میں ایک عمدہ کتاب ہے تقریبا سات سو مفسرین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
۶۶	"	قاموس القرآن	مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی	قرآن کے لغت میں ایک بہتر کتاب ہے اور علماء و طلبہ میں متداول ہے۔
۶۷	"	لغات القرآن	مولانا قاضی زاہد الحسینی	نام سے موضوع ظاہر ہے۔
۶۸	"	لغات القرآن ۶ جلدیں	مولانا عبدالرشید نعمانی و مولانا سید عبدالدائم جلالی	اپنے موضوع پر نہایت جامع اور تحقیقی کتاب ہے
۶۹	"	جنۃ النعیم فی استخراج لغات القرآن الکریم	مولانا اسد اللہ سندھی فاضل دیوبند	
۷۰	"	اعجاز القرآن	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی	اس رسالہ میں قرآن کے اعجاز سے متعلق بڑی فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔
۷۱	"	مقدمۃ القرآن	حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند	یہ رسالہ الگ سے اور بعض تفسیروں کے ساتھ شائع ہو چکا ہے اس میں قرآنی حقائق و اسرار پر ایک خاص انداز سے گفتگو کی گئی ہے
۷۲	"	محاسن موضع القرآن	مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی	
۷۳	"	مستند موضح القرآن		
۷۴	"	درس تفسیر قرآن	مولانا علامہ حسین علی پنجابی تلمیذ حضرت گنگوہی	مولانا موصوف کے درسی افادات ہیں جنہیں ان کے بعض تلامذہ نے جمع کر دیا ہے۔
۷۵	عربی	حاشیہ تفسیر مدارک	مولانا عبدالقادر بھوپالی فاضل دیوبند	صرف سورۂ بقرہ کا حاشیہ ہے اور بہت خوب ہے

شمار	زبان	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	کیفیت
۷۶		اسرار قرآنی	حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ	معوذتین کی تفسیر میں یہ رسالہ عجیب و غریب معلومات اور اسرار و رموز پر مشتمل ہے
۷۷		تفسیر رشیدی	حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی	اس مجموعہ تفسیر کو مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری نے حضرت گنگوہی کی تصانیف سے اخذ کر کے جمع کیا ہے۔
۷۸	اردو	الحاوی شرح بیضاوی سورۂ بقرہ	مولانا فخر الحسن مرادآبادی	یہ مولانا موصوف کے درسی افادات پر مشتمل ہے جسے مولانا شکیل احمد سیتاپوری نے بوقت درس تحریر کر لیا تھا۔

نوٹ

علمائے دیوبند نے تفسیر قرآن، شرح حدیث، اصول فقہ، فقہ حنفی، توحید و عقائد، سیرت و آداب، تاریخ و تراجم، اخلاق و تصوف اور دیگر علوم و فنون، نیز فرق باطلہ، آریہ سماجی تحریک، عیسائیت، دہریت، قادیانیت، رافضیت کے رد اور دین متین کی حفاظت میں جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان کی تعداد ایک محتاط اندازہ کے مطابق ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی، صرف ایک مصنف حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کی تصنیفات پانچ سو سے زائد ہیں، یہ فہرست تو صرف ایک موضوع پر نمونہ از خروارے کا مصداق ہے، اور بغیر کسی خاص اہتمام کے سرسری طور پر تیار کی گئی ہے۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

از:- مولانا عبدالحمید نعمانی ـــــــ جمعیۃ سنٹرل آفس نئی دہلی ۲

فروغِ اردو میں دارالعلوم دیوبند کا کردار

****

بہت سے لوگ دارالعلوم دیوبند کو ایک مدرسہ/ادارہ کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن واقعتاً دارالعلوم محض ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک فکری، شعوری معتدل تحریک کا نام ہے جس کا دائرۂ اثر زندگی کے مختلف شعبوں میں دور تک پھیلتا چلا گیا ہے، اردو زبان وادب کے فروغ کے تعلق سے بھی دارالعلوم کا ایک زبردست رول رہا ہے، دیوبند اور اس سے ملحق ومتعلقہ مدارس میں زیادہ تر داخل درس کتابیں گرچہ عربی ہیں لیکن ذریعہ تعلیم وتعلم تمام تر اردو میں ہے، امتحانات میں گرچہ طلبہ کو عربی اردو دونوں میں سوالات کے جوابات دینے کی آزادی ہوتی ہے، تاہم تقریباً تمام سوالات اردو ہی میں بنائے جاتے ہیں اور ۸۰ فیصد بلکہ زائد طلبہ امتحاناتی سوالات کے جوابات اردو ہی میں دیتے ہیں جس کا خوشگوار نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اساتذہ وطلبہ کا ابتدار سے انتہا تک لسانیاتی حد تک اردو زبان سے تعلق و رابطہ برقرار رہتا ہے۔

جس وقت دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تھا، اردو زبان ارتقائی مرحلے میں تھی، اور اپنی نوک پلک سدھار رہی تھی، اہل علم کی تحریری زبان اور اظہار خیالات کا ذریعہ عربی یا فارسی تھی اس کے باوجود دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کا ذریعہ اردو زبان کو اپنایا؟ آخر اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ حلقہ دیوبند میں یہ بات گویا ایک تسلیم شدہ حقیقت کی حیثیت سے مانی جاتی ہے کہ دارالعلوم کا قیام الہامی ہے، اس کے پیش نظر ذریعہ تعلیم وتعلم اردو کو بنانا بھی ہمارے خیال میں الہامی ہی ہے، اگر اس روحانیت کو نہ بھی تسلیم کیا جائے تو کم از کم یہ ماننے میں تو کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ اکابر دیوبند کی حالات و زمانے پر بڑی گہری نظر تھی، انھوں نے حالات کی ہوا کا رخ پہچان لیا تھا کہ آئندہ کیسے حالات پیش آنے والے ہیں الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے علوم ومعارف کا صحیح معنی میں وارث دیوبند کو کہا جاسکتا ہے ان کے فرزند ارجمند اور مایۂ ناز شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدین رح کے اردو ترجمۂ قرآن حکیم اور شہید

فی سبیل اللہ سیدنا حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور و معروف اردو کتاب تقویۃ الایمان کی مقبولیت کو دیکھکر اکابر دیوبند نے محسوس کیا ہوگا کہ آنے والے دنوں میں اردو عربی اور فارسی کی جگہ لینے والی ہے، لہٰذا وقت کا تقاضا اور زمانے کا فتویٰ یہی ہے کہ گرچہ دارالعلوم میں پڑھائے جانے والے مختلف علوم و فنون اور درسی کتابوں کی زبان عربی یا فارسی ہے، لیکن ذریعہ درس و تدریس بہرحال اردو ہی ہونا چاہیئے۔ اکابر دیوبند میں سے حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اردو میں لکھنا پڑھنا اہل علم کے لئے معیوب سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اردو میں علمی و فلسفیانہ افکار و خیالات کے اظہار کی صلاحیت نہیں ہے، لیکن جب حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قرآن مجید کی تفسیر بیان القرآن اردو میں لکھی تو اردو کی وسعت دامنی کو فوراً تسلیم کرلیا اور بعد میں اردو زبان کی شیرینی اور اثرانگیزی کے یہاں تک قائل و شیدا ہوئے کہ جب ان کے ایک نامور شاگرد نے ایک عربی تحریر برائے اصلاح خدمت میں بھیجی تو اسے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ:

"مولوی صاحب ہندوستان میں اگر اسلام اور دین کی کوئی خدمت پیش نظر ہے تو اردو میں لکھئے پڑھئے" جب کہ پہلے یہ کہا کرتے تھے کہ "میں نے اپنے علمی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لئے عربی میں لکھا ہے، یا فارسی میں اپنی نجی خط و کتابت کی زبان بھی فارسی ہی کو منتخب کیا۔"

دارالعلوم نے جو ذریعہ درس و تدریس اور تحریر و تقریر کو بنایا اس سے فروغ اردو میں کہاں تک مدد ملی اور اس نے سماج پر لسانی و علمی سطح پر کیا اثرات چھوڑے؟ گرچہ اس کا تحریری ریکارڈ موجود نہیں ہے تاہم ملک و بیرون ملک میں شعوری و غیر شعوری اور محسوساتی طور پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، ہمارے دوست محترم ڈاکٹر نواز دیوبندی نے ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالہ "علماء دیوبند کی صحافتی ادبی خدمات" کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے اس سے کسی حد تک اندازہ ہوسکے گا کہ دارالعلوم کی اردو خدمات کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ ذریعہ تعلیم اردو کو بنانے کی وجہ سے بیرون ممالک میں ان طلبۂ کرام کے توسط سے اردو کو زبردست فروغ ملا جو مختلف ممالک سے دارالعلوم دیوبند حصول علم کی غرض سے ہر سال آتے رہتے ہیں، بات کی وضاحت کے لئے ایک غیر مسلم کا تأثر و مشاہدہ کا حوالہ دوں گا۔

تاریخ دارالعلوم کے مرتب محبوب رضوی نے لکھا ہے کہ ایک غیر مسلم بھائی نے اپنا تاثر ومشاہدہ بیان کیا کہ "جب میں بخارا پہونچا جو وسط ایشیا کا مشہور مقام ہے تو وہاں ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ہمدردانہ لہجے میں اردو میں گفتگو کی، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے اس قدر دور اتنی صاف اردو اس کو کیوں کر آئی ہوگی! میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ "یہ دارالعلوم کا فیض ہے" اور میں ہی نہیں بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اردو سمجھتا اور بولتا ہے، اس شخص نے نہایت اخلاق ومحبت سے میرے ہندو ہونے کے باوجود مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھہرایا اور میرے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا، جس کی یہ خصوصیت میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ اس میں جس نے تقریر کی وہ میری خاطر اردو میں ہی کی"

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم نے اردو کے دائرے کو اپنے طلبہ کے ذریعہ کس قدر اور کہاں تک وسیع کر دیا ہے، جو غیر اردو داں طلبہ دارالعلوم دیوبند حصول علم کی غرض سے آتے ہیں وہ ابتداءً زبان کے حوالے سے تھوڑی دقت ضرور محسوس کرتے ہیں لیکن کچھ دنوں کے بعد اردو خاصی سیکھ جاتے ہیں اور دارالعلوم میں قائم مختلف انجمنوں سے نکلنے والے دیواری پرچے کے توسط سے لکھنے کی بھی مشق ہو جاتی ہے۔

اردو زبان کی توسیع اور اس کی افادیت و اہمیت کا احساس اکابر دیوبند کو ہمیشہ رہا ہے ان میں لسانیاتی شعور تھا کہ علمی مسائل مادری زبان میں جتنی جلدی سمجھ میں آجاتے ہیں وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہوتا ہے، یک رخا لسانیاتی مطالعے کے پیش نظر عام طور پر مشہور یہی ہے کہ ہندوستان میں مادری زبان اردو میں تعلیم وتعلم کی اہمیت کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے محسوس کیا اور اس پر عمل درآمد کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مادری زبان اردو میں درس وتدریس کی اہمیت کا احساس اور عملاً بغیر پروپیگنڈے کے طریقۂ درس اردو کو اپنانے کا سہرا دارالعلوم دیوبند کے سر ہے، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تعلیم اردو کی بات کا تعلق ۱۹۱۹ء سے ہے جب کہ دارالعلوم دیوبند یہ کام بہت پہلے ہی شروع کر چکا تھا۔

یہ ہماری ادبی تاریخ کا المیہ ہے کہ زبان وادب کو غلط طور پر خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور دین پسند شعراء وادباء اور مذہب وتصوف پر مشتمل ادبی شہ پارے اور تحریروں کو وہ اہمیت

نہیں دی گئی جو دینی چاہئے، یورپی فکر اور اشتراکی ادب وتخلیق کے غلبے کے بعد خصوصًا ایسا ہوا، اردو زبان وادب کی ارتقائی تاریخ کا کون ایسا طالب علم ہے جو نہیں جانتا ہے کہ ہمارا قدیم اردو سرمایہ مذہب اور اس سے وابستگی کا ہی شیریں ثمر ہے، صرف افسانے، ناول، ڈرامے اور کہانیاں ہی ادب نہیں بلکہ تاریخ ومذہب کو بھی سلیقے سے تحریری اظہار خیال ادب ہی کے زمرے میں آتا ہے ہندوستان میں جدید وقدیم نظام تعلیم کے حوالے سے نمایاں نمائندگی اور شناخت دیوبند اور علی گڈھ سے ہے، حضرت مولانا قاسم نانوتوی اور سرسید نے ابلاغِ فکر کے لئے جو کچھ لکھا کہا اس میں اسلوب وہیئت کے لحاظ سے فرق تو کیا جا سکتا ہے، معیار کے اعتبار سے نہیں، سرسید کی آثار الصنادید، اسبابِ بغاوت ہند، کی زبان سے حضرت نانوتوی رح کی ہدیۃ الشیعہ، اجوبۂ اربعین، تحذیر الناس کی زبان کا معیار کسی لحاظ سے کم نہیں، یہی بات حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رح اور مولانا رشید احمد گنگوہی رح کی تحریروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، لیکن بڑی حیرت ہے کہ اردو کے فروغ واصلاح میں سرسید، حالی کا نام تو آتا ہے اور لیا جاتا ہے لیکن حضرت امداد رح ورشید رح اور حضرت نانوتوی رح کا نہیں، ایسا کیوں؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یا تو ہمارے اردو ناقد ومؤرخ مذکورہ اکابر دیوبند سے واقف نہیں ہیں یا غلط گروہ بندی اور تعصب کے شکار ہیں، حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت نانوتوی تو شاعری کے لحاظ سے بھی بہت فائق ہیں، سرسید تو شاعر بھی نہیں تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح کی غذائے روح، اور ضیاء القلوب، تحفۃ العشاق، فیصلہ ہفت مسائل کی زبان کتنی سلیس اور شاعری کتنی صاف البیلی اور عام فہم ہے، البتہ حضرت نانوتوی کی ذہنی وفکری پرواز بہت بلند ہے معیاری وگہرائی میں بھی دو رائے نہیں، لیکن فکری بلندی اور انتہائی معیارِ اعلیٰ کوئی جرم تو نہیں کہ فروغِ اردو میں ان کے کردار ہی کو نظر انداز کر دیا جائے۔

اس تعلق سے اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم کے اولین بانیوں میں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی جس وقت بامحاورہ بول چال اور آسان عام فہم اردو میں اپنی متعدد کتابیں لکھ چکے تھے اس وقت سرسید صہبائی مرحوم سے مقفع مسجع زبان لکھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔

سرسید اور علی گڑھ تحریک نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں جو رول ادا کیا اس کا ہمیں پوری طرح احساس ہو۔ اعتراف ہے، سرسید اور ان کے رفقاء نے ادائے مطلب کے لئے اردو کو ہمہ گیر و ہمہ جہت بنانے کی جو خدمات انجام دی ہیں اس سے ہمیں نہ انکار ہے نہ اختلاف ہمیں شکایت و اختلاف صرف اس بات سے ہے کہ ارباب دیوبند کی اردو خدمات کو ایک مخصوص سوچ کے تحت نظر انداز کر دیا گیا ہے، ترقی ہند اور جدیدیت کی تحریک سے وابستہ چھوٹے سے چھوٹے ادیب و شاعر کو قدر اور حد سے زیادہ نمایاں کیا گیا لیکن دیوبند تحریک سے وابستگی رکھنے والے بڑے بڑے شاعر و ادیب کو گمنامی کے غار میں ڈالدیا گیا۔ اگر ذکر بھی کیا گیا تو دیوبند کا حوالہ نکال دیا گیا، احسان اللہ خاں، تاجور نجیب آبادی اور امین الرحمٰن، عامر عثمانی کی قریبی مثال ہے، مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادبی خدمات کا اعتراف عموماً جڑ سے اکھاڑ کر کیا جاتا ہے جب کہ ان کا شمار دیوبند کے نامور و مشہور ترین فضلاء میں ہوتا ہے، حتیٰ کہ تاریخ ـــ دارالعلوم دیوبند کا ایک سنہرا باب بن چکے ہیں، مولانا تاجور لاہور سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ہمایوں اور مخزن کی ادارت میں شریک تھے۔ ادبی دنیا اور شاہکار جیسے انتہائی معیاری اور مؤقر جریدے نکالے، انھیں نظم و نثر دونوں پر یکساں عبور تھا۔

عامر عثمانی مدیر تجلی کے کچھ خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور خود ارباب دیوبند نے شدید اختلاف کیا ہے لیکن ان کی ادبی تخلیقی صلاحیت اور زبان و اسلوب پر عبور سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے جہاں وہ ایک خاص اسلوب تحریر کے حامل تھے وہیں ان میں زبان پر گرفت اور تنقیدی صلاحیت بھی بدرجہ اتم تھی، رسالہ تجلی میں "مسجد سے میخانے تک" کے عنوان سے شائع ہونے والی تحریر پر جدید و قدیم فنی و اصولی نقطۂ نظر سے انگلی رکھنا مشکل ہے، اس کا اعتراف اردو کے بالغ اور باشعور ناقد ڈاکٹر عبدالمغنی نے بھی کیا ہے اور کرنا بھی چاہئے کہ "مسجد سے میخانے تک" طنزیہ مزاحیہ صنف ادب میں ایک منفرد تخلیقی نمونہ ہے۔

ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی کا علمی ادبی لحاظ سے بہت اونچا مقام ہے، تین درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں، اوپر کے بزرگوں میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی زبان دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، قرآن مجید کا شاہکار اردو ترجمہ و تفسیر ثبوت کے لئے کافی ہے ایضاح الادلہ

جو اختلافی مسائل پر مشتمل ایک کتاب ہے، لیکن اس میں بھی ادب و زبان کی چاشنی نظر آتی ہے، مرثیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، آپ کی شعری ادبی صلاحیتوں کا منھ بولتا نمونہ ہے، حضرت تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مدنی، مولانا اعزاز علی امروہی کے اسمار گرامی سے کون پڑھا لکھا آدمی ناواقف ہے، حضرت تھانوی کو نثر و نظم دونوں پر مکمل قدرت تھی، آپ کی تقریباً ایک ہزار تصانیف ہیں جن میں سے کچھ کو چھوڑ کر بیشتر اردو میں ہیں، آپ نے عربی فارسی سے فقہ، تصوف اور حدیث کو بڑی خوبصورتی سے اردو میں منتقل کر دیا ہے، شاید ہی کوئی مسلم گھرانہ ہو جس میں ان کی کتابیں بہشتی زیور، تعلیم الدین، اصلاح الرسوم نہ ہوں، دیوان غالب اور کلیات اقبال سے بہشتی زیور، تعلیم الدین اور اصلاح الرسوم کا صنف موضوع بہت مختلف ہے اور معیار بھی، لیکن جہاں تک نفس فروغ اردو اور دائرہ اثر کا سوال ہے اس میں بہشتی زیور وغیرہ کلیات اقبال وغیرہ سے کسی معنی میں کم نہیں ہے بلکہ بہت وسیع ہے کیونکہ دین پسند حلقہ، ادب پسند حلقے سے ہمیشہ وسیع رہا ہے اور ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے مکتوبات اور خود نوشت سوانح حیات اور دیگر تحریروں اور تقریروں کا اشاعتِ اردو میں زبردست رول رہا ہے، آسام بنگال جہاں کی مادری زبان بنگلہ ہے آسامی ہے وہاں کے حضرتؒ کے بے شمار مریدین و متوسلین آپ کی تحریروں سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں جس سے غیر اردو داں حلقے میں اردو کا چلن اور رابطہ برقرار ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا ایک خاص اسلوب تھا، ان کی خوبصورت اردو زبان دانی کا بین شاہکار حضرت شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن پر اردو میں تفسیری نوٹس ہے، مولانا اعزاز علی امروہیؒ تو شاید پیدائشی ادیب تھے نثر و نظم دونوں خوبصورت لکھتے تھے، آپ کے منظوم کلام خصوصاً غزلوں میں متاثر کن نغمگی اور عشق و محبت کے واردات کا خوبصورت اظہار پایا جاتا ہے مثلاً یہ کہ

پہونچا جو میں بولے کہ پھر آگیا ظالم ؛ دربان اسے کس لئے روکا نہیں کرتے
دل چھین لیا جان کا بھی اب ہے ارادہ ؛ بے کس کو تو یوں چور بھی لوٹا نہیں کرتے

کس نے کہا کہ وادیٔ غربت میں تھے جدا ؛ دل سے بہت قریب تھا گو جسم دور تھا
اس دل میں حسرتوں کے سوا کچھ نہیں رہا ؛ جو دل کہ تم کو دیکھ کے وقفِ سرور تھا
تیری نشیلی آنکھ نے بے خود بنا دیا ؛ اعزاز ورنہ صاحبِ عقل و شعور تھا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے تقریباً ایک صد کتابوں کے مصنف ہیں اور ساری کتابیں زبان و ادب کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی حامل ہیں، حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی جو دلی کی ٹکسالی زبان کے ماہر اور زبان و ادب کے رمز شناش تھے جنھوں نے تاریخ مذہب، بچوں کے ادب وغیرہ موضوعات پر درجنوں کتابیں لکھیں جنھیں آج کے بڑے سے بڑے ادیب کی کتابوں کے مقابلہ پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہم کی اردو خدمات کو کون بھلا سکتا ہے، مولانا گیلانی رہ ایک منفرد اسلوب کے اہل قلم تھے، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی تصانیف قصص القرآن، اخلاق فلسفۂ اخلاق، اسلام کا اقتصادی نظام، مذہب نعمان، سیرت رسول میں جہاں اپنے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہے وہیں انھیں بڑے سے بڑے کسی بھی ادبی شہ پارے اور شاہکار کے بالمقابل فخر سے رکھا جا سکتا ہے، مولانا اکبرآبادی کی اردو خدمات اور فاتحانہ کشورکشائی کا کیا ذکر کیا جائے، فہم قرآن، صدیق اکبر، عثمان ذی النورین، اسلام میں غلامی کی حقیقت، اقبالیات جیسی مستقل تصانیف کے علاوہ ماہنامہ برہان کے اداریئے اور دیگر بہت سی تحریریں شاہد ہیں کہ آپ کیا ہیں، بہت سی شعری تخلیقات بھی ہیں، مولانا حامد الانصاری غازی بھی ایک بلند و معیاری اور منفرد اسلوب نگارش کے مالک تھے مدینہ وغیرہ اخبارات کی فائلیں شاہد ہیں، اسلام کا نظام حکومت مستقل ثبوت ہے، مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ سیدھی سادی اور معیاری زبان کے لئے معروف و مشہور ہیں، اسلام کیا ہے، دین و شریعت، محمد بن عبدالوہاب، اسماعیل شہید، بوارق الغیب اور خوبصورت شاہکار معارف الحدیث (۷ جلدیں) کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

بطور نمونہ مذکورہ بالا ان چند بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کا اردو کے فروغ و عروج میں زبردست رول ہے اور جن کی وابستگی دارالعلوم دیوبند سے ہے ورنہ اشاعت اردو کے حوالے سے دارالعلوم کا فیض بے کراں ایک دریائے ناپید اکنار ہے جس کی گہرائی اور وسعتوں کا اندازہ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ـــــ اسی کے ساتھ یہ ناقابل انکار حقیقت بھی نظر میں رہنی چاہیئے کہ دارالعلوم کے فیض و طفیل میں آج دیوبند ہندوستان کا سب سے بڑا اردو اشاعتی مرکز بن چکا ہے جہاں سے مختلف علوم و فنون کی بیشمار اردو کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں ان تمام حقائق کے پیش نظر اردو کے فروغ میں دارالعلوم دیوبند کے رول کو نظر انداز کرنا لسانیاتی خصوصاً اردو کی تاریخ کے ساتھ ہماری ناانصافی اور مجرمانہ تغافل ہے جسکی ایک حساس، باشعور اور شریف قوم سے بہرحال توقع نہیں کی جا سکتی۔

پروگرام عام اجلاس

کل ہند اجتماع مدارس اسلامیہ عربیہ

مورخہ ۲۰ [illegible] جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ [illegible] ۲۶ [illegible] اکتوبر ۱۹۹۴ء

دارالعلوم دیوبند

پہلا اجلاس	صدارت
۹ بجے صبح تا ۱۲ بجے دوپہر	حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

نظامت :- حضرت مولانا ریاست علی صاحب استاذ دارالعلوم و حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب استاذ دارالعلوم

تلاوت قرآن مجید :- جناب قاری عبدالرؤف صاحب استاذ دارالعلوم۔

ترانۂ دارالعلوم :- مولوی عدنان، مولوی عبدالقیوم متعلمان دارالعلوم۔

خطبۂ صدارت :- حضرت مہتمم صاحب مدظلہ صدر اجلاس۔

خطاب :- حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب استاذ دارالعلوم، حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی۔

اجلاس کا آغاز پروگرام کے مطابق حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی صدارت میں جناب مولانا قاری عبدالرؤف صاحب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، اور پھر مولوی عدنان بجنوری اور مولوی عبدالقیوم مظفر نگری نے دارالعلوم کا ترانہ پیش کیا جسے سامعین نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا، اس کے بعد صدر اجلاس حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کو خطبۂ صدارت پیش کرنے کے لئے مائک پر آپ کو دعوت دی گئی۔

خطبۂ صدارت

کل ہند اجتماع مدارس اسلامیہ عربیہ

مورخہ ۲۰، ۲۱، ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ مطابق ۲۶، ۲۷، ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۴ء

دارالعلوم دیوبند

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ، ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وازواجہ وذریتہ واھل بیتہ اجمعین، امابعد

حضرات علماء عظام میرے ضعیف کاندھوں پر جو بار گراں رکھا گیا ہے میں اس کا ہرگز اہل نہیں ہوں، لیکن یہ سوچ کر رحمتِ خداوندی سے وابستہ امید میں قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ بندہ کے حق میں شھداء اللہ فی الارض کی شہادت ہے نیز یہ کہ مجھے آپ حضرات سے امید ہے کہ حکم نبوی فان کلفتموھم مایغلبھم فاعینوھم کے پیش نظر آپ بھی اپنے خادم کی اعانت ونصرت فرمائیں گے۔

حضرات فضلائے ذی شان کسی تنظیم یا جماعت وادارہ پر بحث وتبصرہ اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب کہ یہ بحث ونظر اس کے پس منظر، نصب العین، مقاصد اور خدمات کے دائرے میں رہ کر کی جائے۔

ہماری دینی درسگاہوں کا بھی ایک تاریخی پس منظر ہے، ان کی تاسیس وقیام ودرس

اور عظیم تر مقاصد سے وابستہ ہے، پھر ان مقاصد کو بروئے کار لانے میں ان کی مسلمہ خدمات ہیں، اس لئے ان مدارس سے متعلق وہی گفتگو صحیح، لائق قبول اور مبنی برصواب ہوسکتی ہے جو ان مذکورہ امور کی روشنی میں کی جائے گی، چونکہ ہمارے اس عظیم اجتماع کا موضوع بحث یہی اسلامی مدارس ہیں، اس لئے اصل موضوع پر قائم رہنے اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے کہ ایک سرسری نظر ان کے پس منظر، نصب العین، مقاصد، و خدمات پر ڈالتے چلیں۔

مدارس کا تاریخی پس منظر

امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جب اپنے قیام حرمین شریفین سے ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں وطن مالوف واپس لوٹتے ہیں تو دہلی کا حال بد سے بدتر تھا، سلطنت مغلیہ ایک لاشۂ بے جان یا شاہ صاحب کے الفاظ میں "لعبۂ صبیان" بچوں کا کھلونا بنی ہوئی تھی، آئے دن کی ہنگامہ خیزیوں سے دہلی کے عوام اس قدر تنگ آگئے تھے کہ خود اپنا وجود ان پر گراں گذر رہا تھا، ان وحشت ناک و ہمت شکن حالات نے امام الہند کے اندر یاس و قنوطیت پیدا کرنے کی بجائے ان کے اشہب ہمت کو مہمیز کا کام دیا۔ انھوں نے کامل دیدہ وری کے ساتھ ماحول کا جائزہ لیا۔ زوال و انحطاط کے عوامل و اسباب کی چھان بین کی اور زندگی کے ان تمام گوشوں کو متعین کیا جو محتاج اصلاح تھے۔

شاہ صاحب نے مسلم معاشرہ اور مغلیہ سلطنت کے انحطاط و زوال کے اسباب علیحدہ علیحدہ متعین کئے تھے۔ مسلم معاشرہ کے زوال کا سبب ان کے نزدیک مذہبی شعار سے بے اعتنائی اور علوم دینیہ سے بے تعلقی تھی، سیاسی زوال کی بنیاد اقتصادی بگاڑ کو ٹھہرایا تھا، حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات الٰہیہ وغیرہ تصانیف سے ان دونوں امور کے متعلق ان کے خیالات کا پتہ لگ سکتا ہے، اس تجویز و تشخیص کے بعد اصلاح کا جامع پروگرام مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ درس و افادہ اور ارشاد و تلقین کے ذریعہ تلامذہ کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جس نے ان کی اصلاحی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی،

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ کی وفات ۱۱۷۶ھ کے بعد ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز کو ان کا جانشین بنایا گیا، تحریک ولی اللّٰہی کا وہ نہالِ تازہ جسے امام الہند نے اپنے ہاتھوں نصب کیا تھا اس جانشین کی تعلیمی وتدریسی سرگرمیوں سے ایک تناور درخت بن گیا جس کی بہار آفریں شاخیں ملک کے گوشے گوشے تک پھیل گئیں۔

سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا صرف یہی کارنامہ نہیں ہے کہ انھوں نے ولی اللّٰہی تحریک کو جو ابھی تک اعلیٰ طبقوں تک ہی پہونچ سکی تھی سہل الحصول بنا کر مقبول خاص وعام بنا دیا بلکہ اپنی تعلیم وتربیت کے ذریعہ رجالِ کار کی ایک ایسی مستعد و بافیض جماعت پیدا کر دی جو علم وعمل، اخلاص وللّٰہیت، صبر واستقامت اور جذبۂ ایثار وجاں سپاری میں اس مقام بلند ومعیار اعلیٰ پر فائز تھی کہ جس خطۂ ارض سے گذر گئی اس میں ایمان ویقین اور جہد وعمل کی لہر دوڑ گئی ؎

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

آہ! تاریخ کا کتنا حسرتناک المیہ ہے کہ ایک بوڑھے نحیف ونزار، مختلف امراض کا شکار، آنکھوں سے معذور قائد وداعی نے ہر قسم کی مشقتیں برداشت کرکے اپنی شب و روز کی جدوجہد اور دعائے نیم شبی سے قوم وملت کی صلاح وفلاح کے لئے مردان باوفا کی ایک جماعت تشکیل کی، اور یہ جماعت جب اس قابل ہوگئی کہ اللہ کی مخلوق کو ظلم و استبداد کے پنجوں سے نکال کر عدل وانصاف فراہم کرے تو خود اپنوں ہی کی بیوفائیوں وچیرہ دستیوں سے بالاکوٹ کے ریگ زاروں میں تحلیل ہوگئی اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس موقعہ پر یہ خیال کرنا کہ سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی وفات اور حادثۂ بالاکوٹ کے بعد ولی اللّٰہی تحریک ختم ہوگئی خلاف واقعہ ہے، کیونکہ کسی تحریک کے اصول ومنہاج کے مطابق جب تک کام کرنے والے افراد موجود رہتے ہیں وہ تحریک حقیقۃً

زندہ رہتی ہے، چنانچہ تحریک ولی اللہی کے اس انتہائی نازک موڑ پر سراج الہند کے جانشین مسند آفاق شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی نے تحریک کی قیادت سنبھال لی اور سراج الہند شاہ عبدالعزیز کے دستور کے مطابق انھیں کے مدرسہ میں تعلیم وارشاد کے کے ذریعہ ذہنی وفکری تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا، اور چار سال کی قلیل مدت میں جماعت کو پھر سے منظم کر کے مولانا سید نصیر الدین دہلوی کی امارت میں سرفروشوں کا ایک قافلہ تبلیغ وجہاد کے لئے تیار کر دیا، لیکن جب انگریزوں کی جانب سے نگرانی بڑھ گئی اور یہاں رہ کر کام کرنا مشکل ہو گیا تو اپنے خاص تلمیذ استاذ الکل مولانا مملوک علی نانوتوی کی صدارت میں تحریک کی نگرانی کے لئے ایک بورڈ مقرر کر کے خود مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور اپنے ایک دوسرے شاگرد مولانا شاہ عبدالغنی مجددی کو اپنا جانشین بنا کر مدرسہ شاہ عبدالعزیز کی مسند تدریس ان کے حوالہ کر دی اس بورڈ کے اہم ارکان میں مذکورہ دونوں بزرگوں کے علاوہ نواب قطب الدین دہلوی صاحب مظاہر حق، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور امیر الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی شامل تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شاہ عبدالغنی مجددی اور حاجی امداد اللہ قدس اسرارہما نے قائدانہ کردار ادا کیا تھا اس لئے شکست کے بعد یہ دونوں حضرات مکہ معظمہ ہجرت کر گئے، اور مدرسہ شاہ عبدالعزیز اور اکبری مسجد کو جو وابستگان تحریک کی تربیت گاہ کی حیثیت سے معروف تھے انگریزوں نے تباہ وبرباد کرادیا۔

دانشمندان ملت

سقوط دہلی کے بعد مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لئے مظالم کے پہاڑ توڑے گئے، دینی علم وعلماء کو مٹا دینے کیلئے وحشت وبربریت کی حد کر دی گئی، سرزمین ہند جس پر انھوں نے صدیوں حکمرانی کی تھی اپنی تمامتر وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ کر دی گئی، مسلم امراء ورؤساء کی جائدادیں ضبط کر کے انھیں نان شبینہ کا محتاج بنا دیا گیا، غرضیکہ ظلم وجبر کی جتنی شکلیں بھی امکان میں تھیں وہ سب مجبور مسلمانوں پر آزمائی گئیں، لیکن خانماں برباد ملت میں ابھی زندگی باقی تھی، سب کچھ لٹ گیا

تھا مگر اسلامی کردار باقی تھا، شان وشوکت مٹ گئی تھی مگر دینی غیرت وحمیت محفوظ تھی، ان ساری وحشیانہ حرکتوں کے باوجود دین ومذہب اور ملک ووطن کے ساتھ ان کی وفاداریاں بدلی نہ جاسکیں تو شاطر حکمرانوں نے بجائے ظلم وتشدد کے ایک دوسری حکمت عملی تجویز کی، جس کی تفصیل مولوی محمد طفیل علیگ کے الفاظ میں یہ ہے۔

"حقیقی نبض شناس انگریزوں کی تشخیص سے گورنمنٹ ہند کی حکمت عملی (پالیسی) ۱۸۷۰ء میں مسلمانوں کے بارہ میں تبدیل ہوئی اور سمجھ لیا گیا کہ مسلمانوں کو دبا کر اور برباد کرکے انھیں سلطنت کا خیر خواہ اور وفادار نہیں بنایا جاسکتا، چنانچہ سال مذکور میں گورنمنٹ ہند نے مسلمانوں کو جدید طریقہ پر تعلیم دینے کا تہیہ کرلیا" (روشن مستقبل ص ۱۲۵)

اس حکمت عملی کے پس پردہ کیا عزائم کارفرما تھے اسے فاش کرنے اور پالیسی کی اصل حقیقت تک پہونچنے کے لئے ہمیں اور پیچھے لوٹنا پڑے گا، یعنی ۱۸۳۴ء کی اس کمیٹی کی روداد کا جائزہ لینا ہوگا جو یہ طے کرنے کے لئے تشکیل دی گئی تھی کہ ہندوستانی طلبہ کو مشرقی زبان میں تعلیم دی جائے یا انگریزی زبان میں۔ اس کمیٹی کا اجلاس، مارچ ۱۸۳۵ء کو لارڈ میکالے کی صدارت میں ہوا، جس میں صدر اجلاس لارڈ میکالے کے ترجیحی ووٹ پر انگریزی) زبان کی تعلیم کا فیصلہ ہوا تھا، لارڈ میکالے کے فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی محمد طفیل علیگ مرحوم لکھتے ہیں۔

"اس فیصلے کی تعریف میں بڑے بڑے راگ الاپے جاتے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ لارڈ میکالے نے اس کے ذریعہ ہندوستان کو آزادی کا فرمان عطا کیا، مگر جو امور اس رائے کے محرک تھے ان میں سے ایک اعلانیہ اور دوسرا خفیہ تھا علانیہ رائے تو وہ تھی جو انھوں نے اپنی رپورٹ میں ان الفاظ میں دہرائی تھی"

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو، اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو"

لارڈ میکالے کی حقیقی رائے جو ان کے قلب کے اندرونی پردوں کے اندر چھپی ہوئی

تھی وہ تھی جو انھوں نے اپنے والد ماجد کو ایک چٹھی میں لکھ کر بھیجی تھی، اسکے الفاظ یہ ہیں۔

" اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے، کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے، کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا، بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں، میرا عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عمل درآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا" (روشن مستقبل ص۱۵۰، ۱۵۱)

سنہ ۱۸۷۰ء میں مسلمانوں کے بارے میں حکمت عملی کی تبدیلی اور انھیں جدید طریقہ پر تعلیم دینے کا مقصد اسی مخفی جذبہ کے تحت تھا جس کا ذکر لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں اپنے مذکورہ مکتوب میں کیا تھا۔

چنانچہ اس پالیسی کے تحت مسلمانوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جانے لگی، مسلمان طلبہ کے لئے وظائف مقرر کئے گئے اور تمام صوبوں نے ابتدائی تعلیم سے لیکر یونیورسٹیوں تک مسلمانوں کے لئے مراعات کا انتظام کیا (روشن مستقبل ص۱۸)

گذشتہ سطور سے یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج کا مقصد و منشا کیا تھا۔ اس موقعہ پر اس تعلیم کی نوعیت کا واضح ہو جانا ضروری ہے، جس کیلئے مسلمانوں پر وظائف اور مراعات کے دروازے کھول دیئے گئے تھے، سر ولیم ہنٹر کی ایک تحریر سے یہ امر بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، یہ تحریر ولیم ہنٹر نے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم سے متعلق لکھی تھی، اس طویل تحریر کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجئے۔

"موجودہ خالص عربی شعبہ کو انگریزی اور عربی کا شعبہ کر دیا جائے تاکہ گورنمنٹ اسکول کا پاس شدہ لڑکا کالج کی اعلیٰ تعلیم سے مستفید ہو سکے، یہ امر مشتبہ ہے کہ شرع محمدی کی باضابطہ تعلیم دی جاتے جو سب پر لازم ہو، یقیناً شرع محمدی کو تعلیم کا مقصد نہ بنانا چاہئے کیونکہ شرع محمدی سے مراد مسلمانوں کا مذہب ہے، اور مذہب بھی اس زمانہ کا جب کہ اس کے پیرو تمام

دنیا کو اپنی جائز شکارگاہ سمجھتے تھے، اور انھوں نے زمانۂ حال کی مسلمان آبادیوں کی طرح عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کرکے یا ان کی رعایا بن کر رہنا نہ سیکھا تھا، سر دست بجائے شرع محمدی کی روزانہ قواعد کرنے کے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی اور فارسی لٹریچر اور اردو میں مغربی سائنس کی تعلیم دی جائے۔" (روشن مستقبل ص۱۸۵)

سر ولیم ہنٹر کی اس تحریر سے صاف عیاں ہے کہ یہ جدید طریقۂ تعلیم دین و مذہب سے بیگانہ بنانے کی ایک خفیہ سازش تھی جس پر "تعلیم" کی خوشنما چادر ڈال دی گئی تھی، ورنہ شرع محمدی سے یہ گریز کیوں ہوتا، پھر مسلمانوں میں اس جدید نظام تعلیم کو نافذ کرنے کے لئے ابتداءً وہ مقامات منتخب کئے گئے جہاں مذہب کا زور تھا، جہاں کے مسلمانوں کو مذہبی مجنون، (آج کل کی مغربی اصطلاح میں بنیاد پرست) اور پشتینی بدخواہ سمجھا جاتا تھا، تاکہ بقول ہنٹر ایک ہی سال میں عام پسند رنگ بدل جائے اور مخالفوں کو اپنا طرفدار بنا لیا جائے۔

سر سید خاں مرحوم نے بھی اپنی مشہور تصنیف "اسباب بغاوت ہند" میں سرکار انگلشیہ سے اس خفیہ سازش کی شکایت کی ہے، وہ لکھتے ہیں

سب کو یقین تھا کہ گورنمنٹ علانیہ مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرے گی، البتہ خفیہ تدبیریں کرکے جس طرح عربی اور سنسکرت کو فنا کر دیا اسی طرح ملک کو مفلس اور جاہل بنا کر اور اپنے مذہب کی کتابیں اور وعظ و تبلیغ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دے گی۔"

اس جدید نظام تعلیم کے بارے میں مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کا یہ تجزیہ بھی قابل ملاحظہ ہے وہ لکھتا ہے کہ۔

"اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں گے۔"

اور بقول خود اس کا یہ لازمی نتیجہ کچھ دنوں میں برآمد ہوگیا وہ اس سلسلے میں لکھتا ہے

"یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جا رہا ہے اسی قدر لوگ ہماری تہذیب وتمدن اور ہمارے اصول مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں، ہندوستان میں تبلیغ مسیحیت کو کامیابی حاصل ہو رہی ہے" (ترجمہ خطبات گارساں ص ۴۰۷ و ۴۰۸)

پاسبانِ ملت!

یہ تھے قوم کے حالات کہ حکومت وسلطنت ایک قصۂ پارینہ ہو چکی تھی، جاہ ومنصب خواب وخیال بن چکے تھے، دولت ثروت کے خزانوں پر افلاس وناداری کا پہرہ تھا، قومی وملی رہنماؤں کی اکثریت موت کے گھاٹ اتار دی گئی تھی یا جیل کی سلاخوں اور انڈمان کے جزیرے میں محبوس کر دی گئی تھی، قسمت سے بچے کھچے افراد بتقاضائے مصلحتِ وقت ہجرت کر گئے تھے، یا اپنے اپنے زاویوں میں روپوشی کی زندگی گذارنے پر مجبور تھے، اس لاچاری وکس مپرسی میں قوم وملت کے لئے اگر کوئی سہارا تھا تو وہ صرف ایمان واعتقاد کا سہارا تھا مگر اب اس پر بھی غارتگر افرنگ ڈاکہ ڈالنے کی خفیہ تدبیریں کر رہے تھے۔

گردشِ وقت وہ بھی چھین نہ لے
اک تری یاد کا سہارا ہے

تحریک ولی اللّٰہی کا مرکز "مدرسۂ شاہ عبدالعزیز" جہاں سے ملت کو علم ومعرفت عزم وحوصلہ اور جرأت واستقامت کا درس ملتا تھا، تباہ کیا جا چکا تھا، جب کہ ولی اللّٰہی تحریک کی رگوں میں خون اسی مدرسہ سے پہونچایا جاتا تھا، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ محمد اسحاق اور آخر میں شاہ عبدالغنی مجددی رحمہم اللہ نے اسی مدرسہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا اور اسی میں بیٹھ کر قوم کی علمی، ذہنی، فکری تعمیر وتشکیل کی خدمات انجام دی تھیں، سقوط سلطنت اور دہلی کی تباہی کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تو بقول مولانا سندھی رحمہ اللہ "شاہ محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت نے جو اب حجاز میں مقیم تھی اور امیر حاجی امداد اللہ کی رہنمائی میں ہندوستانی کام کرتی تھی، فیصلہ کیا کہ اطراف دہلی میں امام عبدالعزیز

کے مدرسہ کے نمونہ پر ایک مدرسہ بنایا جائے، چنانچہ مولانا محمد قاسم (نانوتوی قدس سرہٗ) اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سات سال تک کوشش کرتے رہے، تب کہیں جاکر (۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ یعنی ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) میں سقوط دہلی کے ۹ سال بعد مدرسۂ دیوبند کی تاسیس ہوسکی۔

مولانا سندھی کہنا چاہتے ہیں کہ "دارالعلوم دیوبند" کا قیام کسی وقتی جذبہ یا شخصی حوصلہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی تاسیس طے شدہ منصوبہ، اور ایک جماعت کی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت عمل میں آئی ہے، جس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ "قیام دارالعلوم کے بعد جب شاہ رفیع الدین دیوبندی حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو وہاں سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے عرض کیا کہ ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کے لئے دعاء فرمائیے۔" حضرت حاجی صاحبؒ نے دلچسپ انداز میں فرمایا

"سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر، یہ مدرسہ ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ یہ دیوبند کی قسمت ہے، اس دولت گراں قدر کو یہ سرزمین لے اڑی۔" (علماء حق ص۱۷ ج ۱)

"مدرسۂ عربی اسلامی" یعنی دارالعلوم دیوبند کے قیام سے حضرت حاجی صاحب کو کس قدر مسرت وشادمانی ہوئی تھی اس کا اندازہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا نانوتوی اور مولانا یعقوب صاحب رحمہما اللہ کے نام ان کے مکتوب کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

"واز اجراء مدرسہ علم دین بسعی آں عزیزاں وعزیزم حافظ عابد حسین صاحب چہ خوشیہا رونمود کہ بیان نمی آید، خدائے تعالیٰ ایں امر خیر را مدام جاری دارد وساعیان و باعثان ایں را جزائے خیر دہد۔" (مرقومات امدادیہ ص۴۴)

قیام دارالعلوم کے بعد حضرت نانوتوی اور ان کے رفقاء کی دوڑ دھوپ سے اسی طرز پر سہارنپور میں مدرسہ مظاہر علوم، مراد آباد میں مدرسہ شاہی، گلاوٹھی ضلع بلند شہر میں منبع العلوم کی تاسیس عمل میں آئی، پھر چراغ سے چراغ روشن ہوتے گئے، اور ظلمتکدۂ ہند میں علم و عرفان کی ضیا پاشیاں پھر سے ہونے لگیں۔

کتاب و سنت کے پاسبانو! یہ ہے "مدرسہ عربی اسلامی دیوبند" یعنی ام المدارس دارالعلوم دیوبند کا تاریخی پس منظر، جس سے صاف ظاہر ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور اس طرز و منہاج پر قائم مدارس دینیہ دراصل اسی شجر طوبیٰ کی شاخیں ہیں جسے امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے بافیض مقدس ہاتھوں سے نصب کیا تھا تاکہ شرک و بدعت، جہل و معصیت کی باد سموم سے نڈھال واماندگان راہ اس کے حیات بخش خنک سائے میں آکر تازگی و توانائی حاصل کرسکیں،

کعبہ را ویراں مکن اے عشق کانجا یک نفس
گاہ گہہ واماندگانِ راہ منزل می کنند

مدارس کا نصب العین:۔ مدارس دینیہ کے اس تاریخی پس منظر سے ان کے اغراض و مقاصد کی نشاندہی بھی ہوجاتی ہے، یعنی دینی تعلیمات کے تحفظ، کتاب وسنت کی اشاعت اور مسلم معاشرہ کی اصلاح و حفاظت کے لئے یہ اسلامی گردکل تعمیر کئے گئے ہیں، بالفاظ دگر علم و عرفان کی یہ چھاؤنیاں اس غرض سے قائم کی گئی ہیں کہ ان سے دین کے سچے و مخلص خادم اور اسلام کے جانباز جرأتمند سپاہی تیار کئے جائیں جو اسلامی عقائد و شعائر اور دینی اخلاق و روایات کے داعی و نقیب بنیں، اور باطل طاقتوں کی فتنہ سامانیوں سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کریں، اسی لئے ان مدارس کا نظام تعلیم و تربیت امام الہند کی تحریک دعوت و اصلاح کی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور نصاب تعلیم خالص دینی رکھا گیا ہے اور ان

کا مقصد تاسیس، نصب العین اور مطمح نظر دین اور صرف دین ہے، اور وہ اسلامی تعلیمات کی تدریس و ترویج اور دینی عقائد و مآثر کے احیاء کے لئے قائم کئے گئے ہیں

دینی مدارس کا تاریخی پس منظر اور نصب العین کا

مدارس دینیہ اور عصری علوم :- مختصر جائزہ مُظہر ہے کہ ان کے قیام کا اصل مقصد اسلامی معاشرہ کی دینی ضروریات کی تکمیل ہے، ان کا قیام اس لئے عمل میں نہیں آیا ہے کہ یہ سماج کو سائنسداں، ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ فراہم کریں۔

میری گذارش کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلم سماج کو ان عصری علوم اور ان کے ماہرین کی ضرورت نہیں ہے، بلاشبہ ایسے ادارے ہونے چاہئیں جو ان بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کریں اور بحمد اللہ ملک میں ایسے ادارے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں جو ان ضرورتوں کی تکمیل میں سرگرم عمل ہیں، اس لئے دینی مدارس کے نصب العین اور بنیادی مقاصد کو نظر انداز کرکے انھیں عصری علوم کی تعلیم و تدریس کا مکلف بنانا بظاہر تحصیل حاصل ہے، البتہ اس سلسلے کی اتنی معلومات جو ایک انسان کی بنیادی ضرورت ہیں، ان کے لئے مدرسۂ ابتدائیہ کے نصاب میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، جسے نصاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مدارس دینیہ کے عربی نصاب کے ساتھ علوم عصریہ کو جوڑنے کی تجویز نظری طور پر اگرچہ بڑی خوشنما اور سودمند معلوم ہوتی ہے مگر تاریخ اور مشاہدہ دونوں گواہ ہیں کہ یہ تجربہ کبھی کامیاب اور بار آور نہیں ہوا ہے، اور آزمودہ کو بار بار آزمانا کہاں کی دانشمندی ہے، بعض دانشوران قوم کا یہ خیال کہ علم ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے اسے دین و دنیا کے الگ الگ خانوں میں منقسم کرنا صحیح نہیں، مسلمان اپنے اقبال مندی کے دور میں دونوں علوم کے سالارِ کارواں رہے ہیں۔

اس سلسلے میں گذارش ہے کہ مسلمانوں کے اقبال مندی کا دور بھی دینی اور دنیوی علوم کی تفریق سے خالی نہیں رہا ہے بجز چند مستثنیات کے دونوں علوم کے حاملین

الگ الگ جماعتوں میں منقسم رہے ہیں، قرآن وسنت کے نصوص میں بھی اس تفریق کے واضح اشارے موجود ہیں، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے "انتم اعلم بامور دنیاکم" اور "من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین" فرماکر علم کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ "الدنیا مطیۃ الاخرۃ" کا ارشاد بھی اس تقسیم کی جانب مشیر ہے۔ اس لئے کہ سوار اور سواری کے فرق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، پھر علوم دنیوی کا افادی پہلو اپنی تمامتر ترقیات کے باوجود اس فانی زندگی تک محدود ہے، جب کہ دینی علوم حیات اخروی کی ابدی وسرمدی زندگی کی سعادتوں اور کامرانیوں کا ذریعہ ہیں۔

علاوہ ازیں بیک وقت مختلف زمانوں اور متضاد علوم کی تحصیل کا بار علمی صلاحیتوں کو ابھارنے کی بجائے ان کو دبا دیتا ہے، چنانچہ میر کارواں حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی قدس سرہٗ نے ابتدائے کار ہی میں اس دوعملی اور مخلوط نصاب درس کو بایں الفاظ رد فرمادیا تھا۔

"زمانۂ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعثِ نقصانِ استعداد ہے۔"

(از تقریر حضرت نانوتوی مطبوعہ روداد مدرسۂ عربی اسلامی ۱۲۹۰ھ)

پھر تجربہ بھی بتاتا ہے کہ جس طرح آدھا تیتر آدھا بٹیر نہ اچھا تیتر ہوتا ہے نہ اچھا بٹیر، اسی طرح علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ کی پیوندکاری سے نہ اچھا مولوی بنتا ہے نہ اچھا مسٹر، کیوں کہ دونوں علوم کی سمت سفر اور منزل الگ الگ ہیں، نتیجتاً دو مخالف راستوں پر چلنے والا مسافر درمیان میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ✽ نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

علامہ اقبال لاہوری، جو ایک شاعر ہی نہیں بلکہ مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے بھی علمی حلقوں میں شہرت رکھتے ہیں، جن کی نشو ونما کالجوں اور یونیورسٹیوں ہی میں ہوئی تھی اور آج کل کے دانشوروں کے مقابلہ میں علوم عصریہ پر ان کی نظر وسیع تر تھی، قوم وملت کی اصلاح وترقی کا جذبۂ خیر بھی آج کے ہمدردانِ قوم سے ان میں کم نہیں تھا، بایں ہمہ

وہ مدارس دینیہ کے نظام تعلیم میں تبدیلی کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ حکیم احمد شجاع (جو مدارس کے نصاب میں علوم عصریہ کی شمولیت پر بہت زور دیتے تھے) کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"ان مکتبوں (مدرسوں) کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہی مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملّا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح ہوگا، جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور انکی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملیگا۔"

میری ان گذارشات کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میں انگلش زبان یا علوم عصریہ کی افادیت کا سرے سے انکار کر رہا ہوں، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے مدارس دینیہ کا عربی نصاب تعلیم اکابر رحمہم اللہ کے طرز پر خالص دینی علوم پر مشتمل رہنا چاہئے دیگر غیر متعلق علوم کی اس میں آمیزش طلبہ کی ذہنی کش مکش کا سبب بنے گی، اور ہمارا یہ نظام تعلیم طلب الکل فوت الکل کا مصداق ہوکر غیر مفید و بے حیثیت ہوجائے گا۔

تجدید و احیاء دین میں مدارس کا کردار:- جس طرح درخت پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایک ادارے یا تنظیم کے پرکھنے کی کسوٹی فقط یہی ہے کہ اس نے عملی کام کیا کیا ہے؟ اور اس کے جہد و عمل سے کیا

نتائج برآمد ہوتے ہیں؟ بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دارالعلوم اور اس کے نظام تعلیم سے مربوط دینی درسگاہوں نے برصغیر میں اپنی خدمات کے ایسے واضح روشن اور تابناک نقوش ثبت کر دیئے ہیں کہ مستقبل کا مؤرخ ان کا تذکرہ کئے بغیر اپنی تاریخ مکمل نہیں کر سکتا ہمارے مدارس دینیہ کا یہ پہلو ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس پر ثبوت وشہادت کی قطعاً ضرورت نہیں "عیاں راچہ بیاں" توضیح موضوع کے طور پر تین شہادتیں پیش کی جارہی ہیں، عصر حاضر کے مشہور صاحب نظر مصنف مولانا ابوالحسن ندوی کے الفاظ میں۔

"فضلائے دارالعلوم کا جمہور وعوام سے جو ربط ہے وہ کسی دینی جماعت کا نہیں ہے، سارے ہندوستان میں مدارس عربیہ کا جال بچھا ہوا ہے اور اس درس گاہ کے علماء وفضلاء وہاں مسند تدریس پر متمکن ہیں، وہ عام مسلمانوں میں ذی اعتبار اور مساجد ومحلوں میں بااثر ہیں" (عصر جدید کا چیلنج ص۳۶)

پیام ندوۃ العلماء کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"تاہم اس حقیقت سے کوئی ہوشمند انسان انکار نہیں کر سکتا کہ (دارالعلوم) دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام وبقاء اور استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے، اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے"

"عصر جدید" کلکتہ نے دارالعلوم اور اس کے فضلاء کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی خدمات انجام دے رہا ہے اور مغربی تہذیب وتمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی

عمارت کو محفوظ رکھا ہے، ہندوستان کے طویل وعریض براعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے، ایسے وقت میں جب کہ علوم جدیدہ کی روشنی نے ظاہر بیں نظروں کو خیرہ کردیا تھا جب کہ دنیوی عزت اور مناصب کی کشش اچھے اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، جب کہ لوگ مذہب سے بے پروا اور مذہبی تعلیم سے غافل ہوچکے تھے، اور "قال اللہ وقال الرسول" کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقارخانہ میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم وتمدن کے شور وغوغا سے مغلوب ہوچکی تھی، اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا جو قرآن وحدیث کے علم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا، حوادث کی آندھی نے رہ رہ کر اس کو گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا، فاتح تہذیب کی خندہ زنی اس کو اپنی قدامت سے منحرف نہ کرسکی، نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اپنی رو میں اسے بہالے جائے مگر کس مپرسی کے باوجود وہ ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچاتا رہا، یہاں تک مسلسل جد وجہد کے بعد آج نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز، موصل، بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے فدائیان قرآن وحدیث آآکر پروانہ وار اسکے گرد جمع ہیں (عصر جدید ۳ راکتوبر ۱۹۳۶ء بحوالہ ماہنامہ دارالعلوم، اگست ۱۹۹۴ء)

یہ مذکورہ حوالے ببانگ دہل شہادت دے رہے ہیں کہ دارالعلوم اور اس کے فضلاء کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے جس کا ایک زمانہ معترف ہے اور اپنے وپرائے سب مانتے ہیں کہ دارالعلوم اور اس سے مربوط دینی درس گاہیں اپنے قیام کے مقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب وکامراں ہیں، اب اگر کسی جانب سے گرد وغبار اڑا کر ان کی روشن خدمات کو دھندلا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، تو اس سے چیں بہ جبیں ہونے کی کوئی وجہ

نہیں ہے، آپ اپنا سفر جاری رکھئے، انشاء اللہ یہ غبار از خود فضاؤں میں تحلیل ہو کر فنا ہو جائیں گے۔

عنوانِ ترقی ہے یہ تیرہ فضائی بھی
کچھ گرد سی اٹھتی ہے جب قافلہ چلتا ہے

البتہ ماضی کی ان فتحمندیوں پر غیر متوازن اعتماد سے اگر ہماری قوتِ عمل میں اضمحلال پیدا ہو جائے تو یہ صورت حال ضرور پریشان کن ہے، ماضی میں بہت سی کامیاب شخصیتیں اور فتحمند جماعتیں اس مزمن مرض میں مبتلا ہو کر کارگاہ حیات میں اپنا اعتبار و وقار کھو چکی ہیں، اس لئے ہوش مندی و بیدار مغزی کا تقاضا یہ ہے کہ مدارس دینیہ کے شاندار ماضی کو چراغ راہ بنا کر ان کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے کی فکر کریں، آج ان مدارس کی تمامتر ذمہ داری ہمارے اوپر ہے، خدانخواستہ ہماری غفلت اور بے اعتنائی سے ان میں فتور آگیا تو تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی۔

علمائے ذی مرتبت:- یہ خدائے بزرگ و برتر کا کتنا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں توفیق بخشی کہ ایک جگہ سر جوڑ کر مدارس دینیہ کی تعمیر و ترقی کے بارے میں غور و فکر، بحث و تحقیق کر رہے ہیں، لہذا اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کریں۔

حضرات! ہمارے مدارس دینیہ کا نظام عمل چار اجزاء پر مشتمل ہے (۱) طلبہ (۲) اساتذہ (۳) نصاب (۴) انتظامیہ، جس طرح جسمانی صحت کے لئے اخلاط اربعہ میں اعتدال ضروری ہے اسی طرح مدارس کے بارآور اور نفع بخش ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس کے چاروں اجزاء درست، صحیح اور معتدل ہوں لہذا ہمارے لئے یہ مناسب نہ ہوگا کہ ان اجزاء میں سے کسی ایک جزء پر اپنا سارا زور اور پورا وقت صرف کر دیں، بلکہ ہمارا دائرہ فکر و نظر چاروں اجزاء پر محیط ہونا چاہئے۔

اصلاح و تربیت:- مادیت کے فروغ اور مغربیت کے عروج سے آج ہمارا پورا معاشرہ زوال کی زد میں ہے، اس لئے اصلاح و تربیت کی اہمیت وضرورت پہلے کے اعتبار سے اب بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، طلبہ کے مزاج و مذاق جس تیزی کے ساتھ تغیر پذیر ہیں اس سے کون ناواقف ہوگا، اس لئے یہ مسئلہ نہایت دل سوزی و بالغ نظری کے ساتھ غور وفکر کا طالب ہے، اس سلسلہ کا ابتدائی خاکہ آپ کے ملاحظہ میں آئے گا، اس پر بحث و نظر کے بعد قرارداد منظور کریں اور اپنے اپنے مدرسوں میں اس کا نفاذ فرمائیں

اصلاحِ نصاب:- اس مشینی دور میں عام طور پر طبیعتیں محنت و مشقت کی بجائے سہولت پسند ہوگئی ہیں، جس سے مدارس کے طلبہ مستثنیٰ نہیں ہیں، علاوہ ازیں نہ اب پہلے جیسے دل ودماغ ہیں، نہ پرسکون ماحول، اس لئے عرصہ سے یہ مطالبہ تھا کہ فن کی بعض وہ کتابیں جو ذہنی ریاضت کو چاہتی ہیں ان کی متبادل آسان کتاب تلاش کی جائیں، فن تاریخ وسیرت جو خالص اسلامی فن ہے ہمارا نصاب اس سے خالی تھا کسی طرح اسے نصاب میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے، اسی طرح کی بعض جزوی اصلاحات کی گئی ہیں، نصاب تعلیم ہمارے نظام کا اہم ترین جزء ہے لہذا اس میں بھی مستعدی کے ساتھ غور وفکر کی ضرورت ہے، اگر اس کل ہند اجتماع میں نصاب کی یکسانیت پر ہم متفق ہوجائیں تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہوگی۔

مدارس کا باہمی رابطہ:- ہمارے مدارس دینیہ کے اکثر اساتذہ دارالعلوم دیوبند سے سلسلۂ اسناد رکھنے کی بنا پر علمی طور پر دارالعلوم سے مربوط ہیں، ہمارا یہ عہد اجتماعیت کا عہد ہے، آج سیاست، تجارت، ملازمت صنعت وغیرہ سب شعبے تنظیم کے دائرے میں اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں اگر

مدارس دینیہ بھی باہم مربوط ہو جائیں تو ان کا یہ باہمی رابطہ اخذ و استفادہ میں مفید ہوگا اور اس رابطہ سے تعاون و تناصر کی فضا ہموار ہوگی، مدارس کے اساتذہ میں علمی افادہ و استفادہ کا ماحول بن جائے اور مدارس میں باہمی رقابت کی جگہ ایک دوسرے کی اعانت و نصرت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو مدارس کے علمی و انتظامی مسائل کے حل میں بڑی مدد ملے گی اور عوام پر بھی اس کا اچھا اثر پڑے گا "رابطہ مدارس عربیہ" کا ایک ابتدائی دستوری خاکہ حسب تجویز نمائندہ اجتماع مورخہ ۲۰ر۲۱ محرم ۱۴۱۵ھ آپ کے سامنے آئے گا، اس خاکہ میں رنگ بھرنا آپ حضرات کا کام ہے۔

مہمانانِ عالی منزلت

میں آپ کا بے حد شکر گذار ہوں کہ آپ نے میری دراز نفسی و سمع خراشی کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت فرمالیا۔

فجزاکم اللہ احسن الجزاء واللہ معکم اینما کنتم

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

والصلوٰۃ والسلام علی سید

المرسلین و صحبہ

واتباعہ

اجمعین

⁂

خطاب مولانا سعید احمد صاحب

خطبۂ صدارت کے بعد مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم نے افتتاحی تقریر فرمائی، آپ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ اس اہم اجتماع کا مقصد آپ حضرات کو معلوم ہے۔ ہمارے مدارس اسلامیہ کا کیا مقصد ہے اور ہم اس کی تکمیل میں کہاں تک کامیاب ہیں؟ انھی بنیادی باتوں پر غور وفکر کے لئے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں، احادیث کی روشنی میں مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت کا ہونا ضروری ہے جسے دینی امور اور فقہ اسلامی میں دسترس حاصل ہو، یہ کام اہم بھی ہے اور مشکل بھی، اس کو آسان نہیں کہا جاسکتا قرآن کریم میں ہے یعلمھم الکتاب والحکمۃ، تعلیم کے ساتھ حکمت کا لفظ بھی موجود ہے، حکمت کی تشریح حضرت نانوتویؒ نے اپنی کتاب "آب حیات" میں وضاحت سے فرمائی ہے، جس کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ علت اور حکم کے درمیان جو نسبت ہے اس کو جان لینے کا نام حکمت ہے۔ اور یہی حصول علم کا مقصد ہے۔

مولانا سعید احمد صاحب، نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یا اھل القریۃ کہکر فرمایا تھا کہ اگر تم سیدھی راہ پر چلتے رہے تو سلامتی کے ساتھ آگے بڑھ جاؤگے اور اگر شمالاً وجنوباً گئے، تو بس گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدھی راہ پر گامزن رہنا بہت ضروری ہے ــــ آپ حضرات بھی تعلیم کے معاملہ میں سیدھی ہی راہ پر چلیں، قرآن وحدیث فقہ اور اصول فقہ وغیرہ بنیادی علوم کے ساتھ یعنی ایک ہی وقت میں ہندی بھی پڑھیں، انگریزی بھی اور حساب وجغرافیہ بھی سیکھ لیں، یہ شمالاً وجنوباً چلنا ہوگا

علوم عصریہ کے تعلق سے آپ نے فرمایا کہ اگر ہم سیدھی راہ سے ہٹ گئے تو تھوڑا بہت جو کام ہو رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائیگا۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں جو علمی فیضان جاری ہے وہ سب اسی دارالعلوم کا فیض ہے۔ ویسے تو دارالعلوم کا یہ فیض دنیا کے تمام ہی ممالک میں پہونچ رہا ہے لیکن اس علمی فیضان کا جس قدر اثر ان تینوں ممالک میں ہے اتنا اور کہیں نہیں ہے۔ اس اجلاس میں وہ حضرات موجود ہیں

جو دنیا بھر کے اسفار کئے ہوئے ہیں، آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں، سید رشید رضا مصری جو بہت بڑے عالم ہیں، اور بہت سی اہم کتابوں کے مصنف ہیں، ایک مرتبہ دیوبند آئے تھے، انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار یہاں بھی کیا تھا اور پھر تفصیل کے ساتھ ایک مضمون میں لکھا بھی تھا کہ اگر دارالعلوم اور اس سے متعلق مدارس اسلامیہ نے موجودہ صدی میں حدیث کی مخلصانہ خدمت انجام نہ دی ہوتی تو یہ علم ختم ہوگیا تھا۔

مولانا سعید احمد صاحب نے علمی انحطاط پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ کیفیت میں بڑی کمی آرہی ہے۔ ان مدارس سے رجال کار کی تیاری کا جو کام ہو رہا تھا اس میں بہت کمی آگئی ہے، اور زمانہ ماضی میں جیسے افراد تیار کئے جاتے تھے اب اس معیار کے افراد تیار نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ پہلو انتہائی تکلیف دہ ہے۔ جہاں تک کمیت کا تعلق ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہے طلبہ کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔۔۔

آپ نے فرمایا کہ جو لوگ علوم عصریہ کو دینی مدارس میں اور جس انداز میں داخل کرانا چاہتے ہیں وہ بہت نقصان دہ ہے، ہم علوم عصریہ کے مخالف نہیں ہیں بلکہ فی زمانہ ان کی ضرورت کا احساس رکھتے ہے مگر ان کو اصل کا درجہ نہیں دیتے۔ ہمارے نزدیک ان علوم کا تعلق ابتدائی درجات سے ہے جس کا ہم پہلے بھی اظہار کر چکے ہیں، ابتدائی درجات میں یہ علوم پڑھائے جاتے ہیں، خود دارالعلوم کے شعبۂ دینیات و فارسی میں ہندی، انگریزی، حساب اور جغرافیہ وغیرہ موجود ہے، ہمارے یہاں عام طور سے نظام کا نقص یہ ہے کہ داخلہ کے وقت ان چیزوں پر غور نہیں کیا جاتا، مثلاً سال چہارم یا پنجم میں داخلہ کے وقت نیچے کی استعداد کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا جاتا، اسی طرح کے مسائل پر غور وفکر کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح کے اجتماعات ہر سال منعقد ہونے چاہئیں انشاءاللہ ان کے مفید نتائج نکلیں گے۔

آخر میں آپ نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی ہے کہ ہماری کمزوریوں کے باوجود آج بھی دنیا یہ ماننے پر مجبور ہے کہ دین کی بقا و ترقی میں مدارس اسلامیہ بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے طلبہ کی تعلیم و تربیت پر جتنا ہو سکتا ہے اتنا زور صرف کریں، اور اس کام کے لئے اجتماعی فکر و عمل کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ کی تقریر

مولانا سعید احمد صاحب کے بعد حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے خطاب کے لئے درخواست

درخواست کی گئی، آپ نے حمد وثنا اور تمہید کے بعد فرمایا کہ ۱۸۵۷ء سے قبل یہ ملک دینی و علمی اعتبار سے پستی کی حالت میں تھا جو صحیح یا غلط باتیں رواج پا گئی تھیں بس انھی کو دین سمجھا جاتا تھا، اس زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز مقدس کا سفر کیا، اور وہاں طویل مدت قیام کے دوران جلیل القدر علماء سے علمی مذاکرات کئے اور حدیث کی سندیں حاصل کیں، پھر ہندوستان آکر اس علم کو فروغ دینے کی جدوجہد میں مصروف ہوگئے، اس وقت ملک میں فارسی زبان کا چلن تھا، سرکاری زبان بھی فارسی تھی اور ملک کے طول وعرض میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی تھی، حضرت شاہ صاحب نے اسی زبان میں جب قرآن کریم کا ترجمہ کیا تو ان کے خلاف ہنگامہ برپا کیا گیا، اس سلسلے میں شاہ صاحب کو سخت ترین حالات سے گذرنا پڑا تاہم حضرت مرحوم نے ہر طرح کے خطرات سے بے نیاز ہو کر ملت اسلامیہ کو صحیح سمت دینے کی اپنی کوشش جاری رکھی، آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادگان اسی روش پر چلتے رہے۔

حضرت مولانا مدنی مدظلہ نے فرمایا سقوط دہلی کے بعد طائفۂ دیوبند نے دین کی خدمت کا بیڑا اٹھایا اور ناموافق حالات میں ظاہری اسباب ووسائل کے بغیر خلوص وللہیت کے جذبہ سے دین کی خدمات انجام دیں اور اسباب ووسائل پر نظر رکھنے کی بجائے اللہ پر اعتماد وتوکل کو اپنا زادِ سفر بنایا، آپ نے فرمایا ہمیں بھی یہی اسوہ اختیار کرنا چاہئے۔

حضرت مولانا مدنی نے بنیادی طور پر نصاب تعلیم میں تبدیلی کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم لوگ جس دور سے گذر رہے ہیں وہ بڑا خطرناک ہے، قدم قدم پر سازشوں کے ہم رنگ زمین جال بچھائے جارہے ہیں، عیسائی اور یہودی طاقتیں اپنے بھرپور وسائل کے ساتھ اسلام کو مٹانے پر تلی ہوئی ہیں، مسلمانوں کے خلاف ان کی عیارانہ سازشیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں ان کا نشانہ خاص طور سے دینی مدارس ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مدارس ہی علوم دینیہ کے سرچشمے ہیں جب تک انھیں گربڑ نہیں کیا جائے گا ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوگی، ہمارے مدارس کو بدنام کرنے کے لئے ان پر بنیاد پرستی کے الزامات لگائے جارہے ہیں اور تمام اسلام دشمن طاقتیں ان کی ہاں میں ہاں ملارہی ہیں، مدارس عربیہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلیوں کی بات بھی ایسی ہی سازشوں کا ایک خطرناک حصہ ہے اس لئے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا شاہ ابرارالحق ہردوئی مدظلہٗ کی تقریر

حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی صاحب کے بعد حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب خلیفہ حضرت تھانویؒ سے نصائح فرمانے کیلئے درخواست کی گئی، آپ نے تعلیم و تربیت کی اہمیت و ضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور طلبہ کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور انھیں حسن و خوبی کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی تلقین فرمائی، بطور خاص سنت کی پیروی اور عالمانہ وقار کے تحفظ پر موصوف نے توجہ دلائی، وضع قطع، شرعی ڈاڑھی، نماز باجماعت کی پابندی اور اسلامی اعمال و افعال کی اہمیت و افادیت پر تفصیلی روشنی ڈالی اور فرمایا کہ میری گذارش حضرات اساتذہ سے بھی ہے کہ وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور طلبہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ شفقت کا برتاؤ کریں۔ حضرت مولانا ہردوئی صاحب کی تقریر کو سامعین نے نہایت سکون خاطر سے سماعت کیا۔ موصوف ہی کی دعا پر پہلی نشست کا اختتام عمل میں آیا۔

دوسرا اجلاس	صدارت
۶ ½ بجے شام تا ۱۰ بجے شب	حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند

موضوع ـــــــ نصاب تعلیم

نظامت ـــــــ حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

تلاوت قرآن مجید ـــــــ جناب قاری شفیق الرحمٰن صاحب 〃 〃

خطاب ـــــــ حضرت مولانا ریاست علی صاحب 〃 〃

اظہار رائے ـــــــ حضرات مندوبین اجلاس

خطاب مشاہیر ـــــــ حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب

ـــــــ حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب

حسب پروگرام دوسرا اجلاس حضرت مہتمم صاحب کی زیر صدارت جناب قاری شفیق الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند کی قرأت قرآن حکیم سے شروع ہوا اور موضوع سے متعلق وضاحتی تقریر حضرت مولانا ریاست علی صاحب نے فرمائی۔

تقریر حضرت مولانا ریاست علی صاحب مولانا موصوف نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ کل بندا جتماع مدارس عربیہ کی دوسری نشست میں نصاب تعلیم کے موضوع پر بحث و گفتگو بھی کرنی ہے، یہ اجتماع اپنے موضوع و مقاصد کے لحاظ سے نہایت اہم ہے ہمارے مدارس کے مقاصد و موضوع اگرچہ متعین و معلوم ہیں پھر بھی اس سے متعلق تبادلۂ خیال بھی خیر و خوبی اور اہمیت و افادیت سے خالی نہیں، —— نصب العین اور مقاصد کی تکرار اور باہم مل بیٹھ کر ہمارے اکابر دیوبند کے مدرسہ کے قیام کے بعد اسی نہج پر تمام ہندوستان میں ادارے قائم کرنا چاہتے تھے، چنانچہ دارالعلوم کو مثال بناکر بہت سے ادارے قائم بھی کئے، اس رشتے سے تمام بزرگوں اصحاب اور رفقاء کار کو ایک جگہ جمع کرکے گفتگو ضروری تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے اسلام کی بقاء کی خاطر یہ ادارہ قائم کیا اور اس کے لئے ایک نصاب تعلیم مرتب کیا، حضرت نانوتوی کی مختلف تقریروں میں یہ کہا گیا ہے کہ اس نصاب میں وہ فنون شامل نہیں کئے گئے ہیں جو عصری تقاضوں سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ عصری علوم کے نئے ادارے ہیں، اس لئے امت میں جس علم وفن کی کمی تھی یعنی دینی علوم اس کی رعایت کرتے ہوئے اس کے نصاب کو خالص دینی بنیادوں پر قائم کیا گیا۔

آپ نے کہا کہ بعض حضرات سائنس اور علوم جدیدہ کو دینی مدارس کے نصاب میں شامل کرانا چاہتے ہیں اور ان کی ضرورت پر بہت زور دیتے ہیں، ہمیں بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں لیکن اس اضافے کو ہم دینی مدارس کے مذاق و مزاج کے حق میں نقصان دہ باور کرتے ہیں۔

مولانا ریاست علی نے فرمایا کہ اس سلسلے میں میڈیا کا مسلسل مطالبہ بظاہر ایک سازش ہے۔ اس طرح انسان کو مذہب سے غافل اور دین سے دور کرنا چاہتے ہیں موصوف نے مروجہ نصاب میں جزوی اصلاحی ترمیم و اضافہ کے سلسلے میں نصاب کمیٹی کی مساعی کا ذکر کیا اور مجوزہ نصاب کی تفصیلات پر روشنی ڈالی۔

مولانا موصوف کی وضاحتی تقریر کے بعد حضرات مندوبین کرام نے نصاب سے متعلق اپنی آراء پیش کیں، عموماً لوگوں کا رجحان یہی رہا کہ مجوزہ نصاب مدارس عربیہ کے نصب العین کے مناسب اور موزوں و مفید ہے، اظہار رائے کا سلسلہ پورا ہوگیا تو پروگرام کے مطابق

خطاب مشاہیر کا سلسلہ شروع ہوا۔

تقریر مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب کو تقریر کیلئے مائک پر آنے کی دعوت دی گئی۔ موصوف نے حمد و ثنا کے فرمایا کہ مجوزہ نصاب کی کاپی میرے پاس پہونچی تھی جسے میں نے بغور پڑھا اور بعض ترمیمات ذہن میں آئیں مگر یہاں آنے پر حضرات اساتذہ اور نصاب کمیٹی کے بعض ارکان سے گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس میں کچھ ترمیمات پہلے ہی کردی گئی ہیں جو دو صفحات میں شائع بھی ہو گئی ہیں، اس پر میں مطمئن ہو گیا، انشاء اللہ معلومات عامہ وغیرہ پر بھی غور کیا جائیگا، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے بقول نصاب تعلیم کا اصل مقصد طلبہ میں استعداد اور صلاحیت پیدا کرنا ہوتا ہے، معلومات کا دائرہ تو بہت وسیع ہے، دنیا بھر کی معلومات ایک مختصر نصاب میں نہیں سموئی جاسکتیں، اپنی صلاحیت کے مطابق انھیں خارجی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کرنا چاہئے ہمارے اکابر نے یہی نصاب پڑھا تھا مگر چونکہ صلاحیت جو اصل میں نصاب کا مقصد ہے حاصل تھی اس لیے جس علم پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کردیا، یہ سب آپ کے سامنے ہے، حضرت مدنی کی نقش حیات " مختلف صدارتی خطبات اور دوسری کتابیں آپ نے پڑھی ہیں، نہیں پڑھیں تو انھیں پڑھ کر دیکھئے، مولانا حفظ الرحمن صاحب کی کتابیں پڑھیئے، مولانا سید محمد میاں وغیرہ اکابر کی تصنیفات دیکھئے یہ حضرات اسی نصاب کی تکمیل کئے ہوئے تھے...... سارا قصور ہے ہمارے نصاب کا سمجھنا میرے خیال میں درست نہیں ہے، حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاوی ؒ فرمایا کرتے تھے کہ علم کی گاڑی تین پہیوں پر چلتی ہے اساتذہ، طلبہ، نصاب۔ آپ حضرات کی توجہ اس وقت صرف نصاب پر مبذول ہے نظام تعلیم کی طرف توجہ نہیں ہے یا ہے تو بہت کم ہے جبکہ زیادہ ضرورت اس کی ہے، اگر طلبہ چھوٹے مدارس سے ابتدائی درجات کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پوری تیاری کے ساتھ بڑے مدارس میں آئیں تو اس کا بہت بڑا فائدہ ہوگا، پھر یہ شکایت نہیں ہوگی کہ ہمارے فارغین حساب نہیں جانتے، یا انھیں جغرافیہ نہیں معلوم، یا وہ ہندی انگریزی ہندی میں زیرو ہیں۔

تقریر حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی

حمد و ثنا کے بعد۔ میرے نزدیک نصاب تعلیم میں تبدیلی نہ پہلے کوئی گناہ تھی، نہ

آج ہے اور نہ آئندہ ہوگی، مسئلہ دراصل مدارس اسلامیہ کے وقار کو باقی رکھنے کا ہے، زمانہ بدل رہا ہے، حالات بدل رہے ہیں، قدریں بدل رہی ہیں، ان حالات میں ہمیں کس طرح چلنا ہے سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے، آپ دریا کے رُخ پر بہنے کے لئے نہیں آئے ہیں، دریا کا رخ بدلنے کے لئے آئے ہیں۔ مجھے اس وقت نصاب کے سلسلے میں کچھ نہیں کہنا ہے، جو نصاب آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے یہ ترمیم شدہ ہی ہے اگر آپ حضرات نے صحیح فکر سے کام نہیں لیا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طرز پر اپنے اداروں کو ڈھالنے کی کوشش کی تو کل آپ کو قرآن وحدیث کے معنی ومفہوم کو بھی بدلنا پڑے گا، اس وقت تو آپ یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم قرآن وحدیث کو تبدیل کرنا نہیں چاہتے ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے، لیکن اس کا انجام وہی ہوگا میں جس کا خطرہ محسوس کر رہا ہوں، ہمیں اور آپ کو ہر حال میں ایسے اکابر کی روش پر ہی قائم رہنا چاہئے اسی میں عافیت مضمر ہے۔ جدید تعلیم کے تعلق سے مولانا نے فرمایا:

میں جدید تعلیم کا ہرگز مخالف نہیں ہوں بلکہ میری تو دلی تمنا ہے کہ مسلمان ڈاکٹر بنیں، انجینیر بنیں سائنس داں بنیں لیکن اس کے لئے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ دینی مدارس کے طلبہ کو ڈسٹرب کیا جائے اور آج تو ہمارے تقریباً اٹھانوے فیصد بچے مدارس دینیہ کے بجائے اسکول کالج اور یونیورسٹیوں ہی کا رخ کر رہے ہیں اور اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق جو بننا چاہتے ہیں بن رہے ہیں، لہٰذا ان دو فیصد بچوں کو آپ خالص علوم دینیہ ہی حاصل کرنے دیں

مولانا موصوف کی تقریر کے بعد دعا ہوئی اور اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نصابِ تعلیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ! امّا بعد۔ آپ حضرات کی خدمت میں مجوزہ "نصابِ تعلیم" کا مسودہ پیش ہے۔ عربی درجات کا یہ آٹھ سالہ نصاب، اندرونِ دارالعلوم کی نصاب کمیٹی نے متعدد مجلسوں میں غور و فکر کرنے کے بعد مرتب کیا ہے۔ پھر اس کو نظرِ ثانی کے لئے "نمائندہ نصاب کمیٹی" کے سامنے پیش کیا گیا جس کی کئی نشستیں مؤرخہ ۲۲/۲۳ ستمبر ۱۹۹۴ء کو دارالعلوم میں ہوئیں، نیز یہ کہ ابھی "نظرِ ثالث" کے لئے "نصاب کمیٹی" کے سامنے پیش ہونا باقی ہے تاکہ اس کے بعد اس کو آخری شکل دیدی جائے۔

یہ مجوزہ نصابِ تعلیم، دراصل وہی قدیم نصاب ہے جس میں مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے کہیں کہیں ردّ و بدل کیا گیا ہے، لیکن کی جانے والی جزوی تبدیلیوں کی نشاندہی سے پہلے اس موضوع کا کسی درجہ میں جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مقصدِ تاسیس — اور — نصابِ تعلیم

تعلیم گاہوں میں نصابِ تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہئے، لیکن یہ بھی واضح حقیقت ہے کہ تمام تعلیم گاہیں، اپنے مقاصد کو سامنے رکھ کر نصاب مرتب کرتی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند، اپنے قیام کے پسِ منظر میں صرف ایک تعلیم گاہ نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد اسلام کو نیست و نابود کرنے کی سازشوں کے درمیان، اسلام اور مسلمانوں کی بقاء و تحفظ کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا ہے۔

اس مقصدِ عالی کو حاصل کرنے کے لئے تعلیم کو ذریعہ بنایا گیا ہے، اور اس کے لئے ایک نصابِ تعلیم

جسے درسِ نظامی کہتے ہیں۔ قدرے تغیر کے ساتھ نافذ کر دیا گیا ہے، اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس نصابِ تعلیم نے ماضی قریب تک شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر صرف ایک نسل پہلے حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ پر نظر ڈالی جائے تو علماء کبار اور مشائخ عظام کی ایک ایسی جماعت نظر آئے گی جس کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ نصابِ تعلیم کی شاندار کارکردگی کے عہد میں بھی نصابِ تعلیم میں تبدیلی کے مطالبات ہوا کرتے تھے اور اسی لئے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کی تقریروں میں نصابِ تعلیم میں تبدیلی کے لئے مقاصد سے ہٹ کر دئے جانے والے مشوروں کا جواب دیا گیا ہے۔

اور اب تو یہ ایک تلخ حقیقت ہے ۔۔ اسباب کچھ بھی ہوں۔ کہ نصابِ تعلیم کی کارکردگی اتنی شاندار نہیں ہے، اس لئے نصاب میں تبدیلی کے مطالبہ کی آواز میں قوت پیدا ہو گئی ہے۔ موجودہ صحافت اور ذرائع ابلاغ نے نصابِ تعلیم پر غور و فکر کو ایک منصوبہ بند تحریک کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔

نصابِ تعلیم میں تبدیلی کے مطالبہ کے اسباب و عوامل

اگر تبدیلی کا مطالبہ کرنے والوں کا نقطۂ نظر، نصابِ تعلیم کو مدارس عربیہ کے مقصدِ تاسیس سے ہم آہنگ رکھتے ہوئے موجودہ کمزوریوں کا تدارک ہوتا تو یہ ایک خوش آئند بات ہوتی اور اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے تھا۔ لیکن اگر تبدیلی کا مطالبہ دیگر مقاصد کے پیشِ نظر ہو تو ظاہر ہے کہ اس کو قبول کرنا اپنے مقاصد سے غفلت کے بعد ہی ممکن ہے۔ جب کہ مطالبہ کرنیوالوں کی ذہنیت یہ نہیں ہے کہ وہ مدارس کے مقصدِ قیام سے ہم آہنگ تبدیلیوں اور تغیرات کی بات کہتے ہوں، ان کا ذہن یہ ہے کہ ان مدارس میں عصری فنون کا اسلئے انتظام ہونا چاہئے کہ کسی بھی عالم دین کو ان چیزوں میں بھی پوری بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ کہ عصری علوم کو ان مدارس میں داخل کئے جانے کے بعد، یہاں کی اسناد کو عصری تعلیم گاہوں میں داخلے یا ملازمتوں کے حصول کیلئے قابلِ [illegible] بنایا جاسکے گا۔ یہ حضرات اس تبدیلی کے بڑے فوائد بیان کرتے ہیں کہ علماء کے لئے معاش کی [illegible] راہیں کھل جائیں گی۔ ان کی خدمت کا میدان وسیع ہو جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ مدارس عربیہ کے مقاصد تاسیس کو اہمیت دینے والوں کے نزدیک یہ نظریات قابلِ قبول نہیں ہیں کیونکہ قرآن کریم میں امت کے ہر بڑے گروہ سے ایک چھوٹی جماعت کو صرف علوم دینیہ میں تفقہ حاصل کرنے اور پھر اپنی قوم کے درمیان مذہبی کام کرنے کیلئے مختص کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

ماکان المؤمنون لینفروا کآفۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم۔ (سورۃ التوبۃ آیت ۱۲۲)

یہ نہیں کہ سب مسلمان سفر کریں، ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ نکلے، تاکہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور تاکہ جب ان کی طرف لوٹ کر آئیں تو ان کو ڈرائیں۔

آیتِ کریمہ کا تقاضا ہے کہ گویا ایک جماعت صرف اسی کام کیلئے ہونی چاہئے کہ وہ پہلے دین میں تفقہ پیدا کرے۔ پھر واپسی کے بعد اپنی قوم میں انذار اور احکام خداوندی کی تبلیغ کا کام کرے، اسی لئے علماء نے بیان کیا ہے کہ اگر کسی قوم میں علماء نہیں ہیں، یا علماء ہیں مگر وہ بقدر کفایت وعظ وارشاد اور امر بالمعروف کا کام نہیں کر رہے ہیں تو سب گنہ گار ہوں گے۔

مدارس عربیہ میں تعلیم پانے والے طلبہ اسی خائص [illegible] کے مصداق ہیں، اب اگر انہی طلبہ کو دوسرے کاموں میں بھی لگا دیا جاتے تو یہ دوسرے کاموں کے لائق ہوں یا نہ ہوں لیکن دین کی اس خدمت کے لائق بہرحال نہیں رہیں گے جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے، پھر یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہئے کہ خود اس تبدیلی کا مطالبہ کرنے والوں کو بھی اعتراف ہے کہ نصابِ تعلیم میں جزوی طور پر ان چیزوں کو داخل کر لینے سے کوئی اختصاص پیدا نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہی سامنے آئے گا کہ جدید وقدیم کے مخلوط نصاب سے تیار ہونے والی نسل اتنی ناقص الاستعداد ہوگی کہ دین یا دنیا کے کسی میدان میں قابلِ ذکر خدمات انجام نہیں دے سکے گی اس لئے اس نقصان دہ تجویز سے بچتے ہوئے علومِ عصریہ کو عربی نصابِ تعلیم سے الگ رکھا گیا ہے البتہ ایسی جزوی تبدیلیاں کی گئی ہیں جو مقصد سے ہم آہنگ ہوں

****

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجوزہ نصاب تعلیم

درجات عربیہ

سال اول عربی

ساعت	فن	اسماء کتب
۱	سیرت	رسول کریم (حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ) مع املاء و تحسین خط)
۲	صرف	میزان منشعب (فارسی یا اردو) بعدہ کتاب الصرف مکمل (صیغوں کی مشق کرائی جائے)
۳	نحو	علم النحو، بعدہ نحو میر فارسی یا اردو شرح مأۃ عامل (ہر جملہ کی ترکیب الگ الگ کی جائے)
۴۔۵	تمرین عربی	اسی معیار کا کوئی رسالہ تیار کر کے پڑھایا جائے تاختم صفر اسکے بعد القراءۃ الواضحۃ اول دلیل کی روشنی میں تمرین کیساتھ پڑھائی جائے (تحریری مشق بھی کرائی جائے)
۶	قراءت	پارۂ عم حفظ، تصحیحِ مخارج کے ساتھ مشق رُبع اول۔

ھدایت

(۱) تحسینِ خط اور قرارت کے لئے درسگاہ ہی میں نظم کیا جائے۔

(۲) تحسینِ خط کے گھنٹہ میں طلبہ کی تعداد ۸ سے زائد نہ ہو، طلبہ زائد ہوں تو جماعتیں متعدد بنائی جائیں۔

(۳) عربی سالِ اول میں صرف ان بچوں کو داخل کیا جائے جو درجہ پنجم دینیات کی استعداد کے حامل ہوں۔

سال دوم عربی

ساعات	فن	اسمائے کتب
۱	نحو	ھدایۃ النحو مکمل، بعدہٗ کافیہ بحث فعل وحرف (کافیہ میں صرف حل عبارت پر اکتفاء کیا جائے، طویل تقریروں سے احتراز کیا جائے)
۲	صرف	علم الصیغہ (اردو یا فارسی) فصول اکبری (خاصیات)
۳	تمرین عربی	القراءۃ الواضحۃ دوم (مع تمرینات تاختم محرم بعدہٗ نفحۃ الأدب
۴	فقہ	نور الایضاح تمام بعدہ قدوری تا کتاب البیوع
۵	منطق	تیسیر المنطق یا اسکے معیار کا کوئی اور رسالہ، مرقات
۶	تجوید	جمال القرآن مع مشق بقیہ پارہ عمّ ۳۰
خ	خوشنویسی	خوش نویسی

سال سوم عربی

ساعات	فن	اسمائے کتب
۱	ترجمہ	ترجمۃ القرآن (سورۃ ق سے آخر تک، پہلے پارہ عم پڑھائیں پھر سورۃ ق سے شروع کریں اور حل لغات نحو وصرف کی ضروری چیزوں اور ترجمہ پر اکتفا کریں
۲	فقہ	قدوری از کتاب البیوع تا ختم،
۳	نحو	شرح شذور الذھب مکمل بعدہٗ کافیہ بحث اسم۔ (کافیہ میں صرف حل عبارت پر اکتفار کیا جائے غیر ضروری بحثوں سے احتراز کیا جائے)
۴	عربی ادب وحدیث	نفحۃ العرب تا ختم عنوان "نبذۃ من ذکاوۃ العرب" اس کے بعد مشکوٰۃ الآثار تمام
۵	تمرین عربی و اسلامی اخلاق	القراءۃ الواضحۃ سوم مکمل مع تمرین، اسکے بعد تعلیم المتعلم مکمل۔ ہفتہ میں ۴ دن اور تعلیم المتعلم ۲ دن، دونوں ایک ہی استاد سے متعلق کیجائیں
۶	منطق	شرح تہذیب مکمل
خ		تجوید اجراء پانچ پارے اور ان کا سالانہ امتحان لیا جائے۔
خ	مطالعہ	تاریخ ملت۔ خلافت راشدہ (اس کا امتحان بھی لیا جائے۔)

سالِ چہارم عربی

نمبر	فن	کتب
۱	تفسیر	ترجمۃ القرآن (سورۂ یوسف سے سورۂ ق تک
۲	فقہ	شرح وقایہ جلد اول مکمل بعدہٗ جلد ثانی تا کتاب العتاق
۳	البلاغۃ و الحدیث	دروس البلاغۃ مکمل بعدہٗ الفیۃ الحدیث از ابتدا تا کتاب العلم پھر ابواب النکاح تا ختم کتاب۔
۴	اصول فقہ	اصول فقہ پر کوئی آسان کتاب ایک ماہ اس کے بعد اصول الشاشی مکمل
۵	منطق	قُطبی مکمل
۶	تاریخ و فنونِ عصریہ	سال کے نصف اول میں خلافت بنی امیہ، خلافت عباسیہ، خلافتِ ترکیہ (تسہیلی انتظام اللہ) ؍؍ نصف دوم میں مبادی علم مدنیت، جغرافیہ عالم، جغرافیہ جزیرۃ العرب داخل امتحان
		ہدایات:- الفیۃ الحدیث کی تعلیم میں مشکل الفاظ کی تشریح اور مشکل ترکیب کے حل پر اکتفاء کریں، مضامین میں بسط سے کام نہ لیں۔ تجوید اجراء پانچ پارے امتحان بھی لیا جائے۔

سالِ پنجم عربی

نمبر	فن	کتب
۱	فقہ	ھدایہ جلد اول مکمل
۲	تفسیر	ترجمۃ القرآن از ابتداء تا ختم سورۂ ھود
۳	معانی	مختصر المعانی فن اول مکمل اس کے بعد تلخیص فن ثانی وثالث
۴	اصول فقہ	نور الانوار تا ختم کتاب اللہ بعدہٗ متن المنار از مباحث السنۃ تا ختم کتاب
۵	عربی ادب	مقامات ۱۵ مقامے۔
۶	منطق	سلم العلوم تا شرطیات، اس کے بعد عقیدۃ الطحاوی مکمل،

خ	مطالعہ	تاریخ سلاطین ہند، سلطان محمود غزنوی سے ۱۸۵۷ء تک (انتظام اللہ شہابی) اس کا امتحان بھی لیا جائے، ہفتہ میں کوئی ایک گھنٹہ اس کیلئے مختص کیا جائے جس میں کوئی استاذ طلبہ کی رہنمائی کریں۔ تجوید، اجراء پانچ پارے جسکا امتحان لیا جائے

سال ششم عربی

۱-۲	تفسیر	تفسیر جلالین مکمل
۳	فقہ	ھدایہ جلد ثانی مکمل (بشمول کتاب العتاق)
۴	اصول تفسیر اصول فقہ	الفوز الکبیر بعدہ حسامی مکمل
۵	عربی ادب	دیوان المتنبی (منتخب حصہ انتخاب میں ترتیب زمانی ملحوظ رکھی جائے
	"	اس کے بعد دیوان الحماسہ کا باب الادب مکمل
۶	فلسفہ	فلسفہ کی ایک آسان کتاب جو صرف اصطلاحات پر مشتمل ہو اس کے بعد میبذی
خ	مطالعہ سیرت	اصح السیر اس کا امتحان بھی لیا جائے اور ہفتہ میں ایک گھنٹہ اس کے لئے رکھا جائے جس میں کوئی استاذ طلبہ کی رہنمائی کریں۔ تجوید اجراء ۵ پارے

سال ہفتم عربی

۱-۲	حدیث شریف	مشکوٰۃ المصابیح مع شرح نخبہ و مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مشکوٰۃ شریف کے تین حصے ہوں حصہ اوّل تا ختم کتاب الصلوٰۃ اسی کے ساتھ پہلے مقدمہ شیخ عبدالحقؒ، پھر اس کے بعد شرح نخبہ مکمل، حصہ دوم از کتاب الزکوٰۃ تا ختم کتاب الاشربہ، حصہ سوم از کتاب اللباس تا ختم کتاب،
۳	تفسیر	تفسیر بیضاوی شریف، ۷۰ صفحات از ابتداء تا نصف پارہ الٓمٓ

۴ و ۵ و ۶	فقہ	ھدایہ اخیرین
	عقائد و فرائض	شرح عقائد مکمل بعدہٗ سراجی تا باب ذوی الارحام ، شرح عقائد کو ۱۵ رجمادی الاولیٰ تک ختم کردیں، اس کے بعد سراجی پڑھائیں۔
خ	مطالعہ	تاریخ المذاھب الاسلامیہ (شیخ ابوزہرہ مصری) اس کا امتحان بھی لیا جائے اور ہفتہ میں ایک گھنٹہ اس کے لئے خاص کیا جائے جس میں کوئی استاذ طلبہ کی رہنمائی کردیا کریں۔

سال ہشتم (دورۂ حدیث شریف)

کتب		
حدیث شریف	○ بخاری شریف مکمل	
	○ مسلم شریف "	
	○ ترمذی شریف "	
	○ ابوداؤد شریف "	
	○ نسائی شریف "	
	○ ابن ماجہ شریف "	
	○ طحاوی شریف "	
	○ شمائل ترمذی شریف "	
	○ موطا امام مالکؒ "	
	○ موطاء امام محمدؒ "	
تجوید ومشق	تجوید ومشق	

ھدایات:- ● دورۂ حدیث شریف کی کتابوں میں تکرار مضامین ومباحث سے احتراز کیا جائے۔
● تمام کتابیں مکمل کرانے کا اہتمام کیا جائے۔

نوٹ:- یہ مجوزہ نصاب کل ہند اجتماع مدارس عربیہ میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور منظور ہو

تیسرا اجلاس
۸ بجے صبح تا بارہ بجے

صدارت
حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند

موضوع ——— نظام تعلیم و تربیت

نظامت ——— حضرت مولانا ریاست علی صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

تلاوت قرآن مجید ——— جناب قاری جہانگیر صاحب " "

خطاب ——— حضرت مولانا عبدالحق صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

اظہار رائے ——— حضرات مندوبین کرام

خطاب مشاہیر ——— حضرت مولانا ابرارالحق حقی صاحب، حضرت مولانا مفتی منظور احمد مظاہری صاحب حضرت مولانا رشید الدین حمیدی صاحب

تقریر مولانا عبدالحق صاحب

جناب قاری جہانگیر صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند کی تلاوت قرآن پاک سے تیسرے اجلاس کا آغاز ہوا، حضرت مولانا عبدالحق صاحب استاذ حدیث دارالعلوم سے مائک پر آنے کی درخواست کی گئی۔ مولانا نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ پیش نظر موضوع پر گفتگو کے لئے یہاں لائق حضرات موجود ہیں، احقر تو بیمار بھی ہے اور صحیح معنی میں اس لائق نہیں ہے لیکن اکابر کے حکم سے انحراف بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے تعمیل بھی ضروری ہے ——— حق تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات پر حتیٰ کہ فرشتوں پر بھی انسانوں کو فضیلت بخشی ہے جیسا کہ احادیث میں موجود ہے کہ عام انسان عام فرشتوں سے افضل ہیں اور خاص انسان (انبیاء علیہم السلام) خاص فرشتوں پر فوقیت و افضلیت رکھتے ہیں، اور اس برتری کی اصل وجہ علم ہے، اسی علم کے حصول اور فروغ کے لئے ہمارے یہ مدارس قائم ہیں، علم ایک نور ہے جو مومن کے قلب میں آتا ہے، کیسے آتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و ارشادات کو جاننے سے آتا ہے، مستحضر رہنے سے آتا ہے، اس علم کے ذریعہ بندۂ مومن اپنے خالق کے احکامات کو جانتا ہے اس کے مطابق عمل کرتا ہے اگر اس علم کو نظرانداز کر دیا جائے تو حق تعالیٰ کی معرفت کا پوزیشن

سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کا بہتر سے بہتر کیا طریقہ ہونا چاہئے، اسی پر غور وفکر کے لئے ہم اور آپ جمع ہوئے ہیں۔ دراصل دنیاوی علم حاصل کرنے کا اور طریقہ ہے اور دینی علوم کے حصول کا اور۔ محسن انسانیت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم کے حصول کا طریقہ بتا دیا ہے جس پر ہمارے اکابر رحمہم اللہ عمل پیرا رہے۔ ان کا معمول تھا کہ درسگاہ میں باوضو آکر خلوص کے ساتھ مسند درس پر متمکن ہوتے تھے اور پورے سوزِ قلب کے ساتھ درس دیتے تھے۔ ان کا کوئی درس بغیر وضو کے نہیں ہوتا تھا آج ہم شدت کے ساتھ اس کمی کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ آپ نے طریقۂ تعلیم کے تعلق سے فرمایا کہ آج ہمارا طریقہ درست نہیں ہے پہلے حضرات کتابیں حل کرانے کی کوشش کرتے تھے اور آج ہم حلِ کتاب سے زیادہ عموماً طویل تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تقریریں ہوائی ہوتی ہیں اور فضا میں تحلیل ہوکر رہ جاتی ہیں۔ طلبہ جیسے تہی دامن درس میں آئے تھے ویسے ہی خالی دامن واپس ہو جاتے ہیں۔ جو طلبہ شوقین اور محنتی ہوتے ہیں اور جو مطالعہ کرکے آتے ہیں جن کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ انہیں تھوڑا بہت ضرور فائدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن عام طلبہ اس انداز کے درس سے مستفید نہیں ہو پاتے۔ اس طریقۂ درس کو بدلنے کی سخت ضرورت ہے ہمیں صرف کتاب کے دائرے میں رہنا چاہئے طلبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی درس بغیر مطالعہ کے نہ لیں اور جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کو استاذ سے پوچھیں۔ اس میں کوئی بھی شرم محسوس نہ کریں۔ استاذ بھی ان کو پوری طرح سمجھائیں۔ ایک انداز سے اگر بات سمجھ میں نہیں آئی تو دوسرا انداز اختیار کریں مثالوں سے مدد لیں اور جواب میں ایسا انداز اختیار نہ کریں جس سے طلبہ کی حوصلہ شکنی ہو۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کبھی سوالات کرنے پر ناراض نہیں ہوتے تھے اور نہ ان کو شرمندہ کرتے تھے۔ بلکہ خندہ پیشانی کے ساتھ سنتے تھے اور وضاحت کے ساتھ تسلی بخش جواب دیتے تھے۔

میرے نزدیک ضروری ہے کہ تمام اساتذہ اس کا التزام کریں کہ سبھی طلبہ سے عبارت پڑھوائی جائے اس کے لئے چند ہی طلبہ کو مخصوص نہ کیا جائے۔ ابتدائی سالوں میں صرف اسباق پڑھانے پر اکتفاء نہ کیا جائے بلکہ ان کے سبق سنے بھی جائیں۔ اور تمام طلبہ کو تکرار و مطالعہ کا پابند کیا جائے بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے اور یہی ہمارا ہونا چاہئے۔

اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ پوری تیاری کرکے درس میں آئیں اور نہایت دلنشیں

انداز میں درس دیں۔ دوسری بات یہ بھی میرے نزدیک بہت ضروری ہے کہ پورے سال کے اسباق متوازن رہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ شروع سال میں اسباق تھوڑے پڑھائے جائیں اور سال کے آخر میں تیز رفتاری سے کتابیں ختم کرائی جائیں۔ آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ایک ہی وقت میں کئی کام نہیں ہوسکتے۔ کہا جارہا ہے کہ ہم قرآن وحدیث وغیرہ علوم کے ساتھ ہندی انگریزی وغیرہ بھی پڑھائیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بھی علم صحیح طور سے نہیں پڑھایا جاسکتا۔ آپ حضرات کے سامنے جو مجوزہ نصاب تعلیم پیش کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ کافی ہے البتہ اس کو محنت اور دلچسپی سے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ میری گذارش ہے کہ آپ حضرات اپنے مدارس میں اس نصاب کو جاری کریں۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیں کہ جو ذمہ داریاں اساتذۂ کرام کی ہیں وہ انہیں پورا کریں اور جو طلبہ کی ہیں وہ انہیں پورا کریں۔ طلبہ کو یہ بات ہر وقت ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جو تعلیم وہ حاصل کررہے ہیں اس کا مقصد حصول دنیا ہرگز نہیں ہے، اس کا مقصد تو اللہ اور رسول کے فرمودات کو فروغ دینا ہے۔ اگر کسی کا مقصد مدرسہ قائم کرنے یا چلانے سے یہ ہے کہ چندہ وصول ہوگا زندگی عیش سے گزرے گی، تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے چاہے وقتی طور سے فائدہ پہنچ جائے مگر انجام اچھا نہیں ہوگا۔ اولاد بھی برباد ہوجائے گی اور آخرت بھی ایسا ہرگز نہیں سوچنا چاہئے۔ آپ نے آخر میں فرمایا عفت، شفقت اور علم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ہیں جنھیں اپنانے کی ضرورت ہے۔ تربیت میں ان حقیقتوں کا بڑا دخل ہے۔ اگر ہم ان کو اپنالیں تو پھر آپ دیکھیں گے کہ ہمارے طلبہ جن کے بارے میں شکایت ہے کہ انھیں کچھ نہیں آتا، ان میں کتنی اعلیٰ صلاحیتیں پیدا ہوئی ہیں اور ان کے ذہنی افق کس قدر روشن ہوتے ہیں۔

تقریر حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب مدظلہ

اس نشست میں بھی حضرت مولانا ابرار الحق صاحب سے نصائح کے لئے درخواست کی گئی۔ آپ نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا کہ یہاں آپ سب حضرات کی تشریف آوری علم کی وجہ سے ہے اور اس پر غور کرنے کے لئے ہے کہ ہمارے مدارس کی علمی زندگی میں انحطاط کیوں آرہا ہے؟ میں نے اس سلسلے میں چند باتیں مرتب کی ہیں جن میں سے کچھ پیش کررہا ہوں۔ تعلیمی سلسلے میں جب اساتذہ کا تقرر کیا جائے تو بقدر ضرورت تقویٰ اور ان میں بھرپور صلاحیتوں کا جائزہ بھی لیا جائے۔ اساتذہ کے لئے ایک تربیت گاہ کی بھی شدید ضرورت ہے۔ ماہانہ امتحان کا التزام بھی ہونا

چاہئے۔ اچھے نمبروں پر طلبہ کو انعام سے بھی نوازا جائے۔ اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ باری باری تمام طلبہ سے عبارت پڑھوائی جائے۔ قرآن کریم کی تعلیم پر خصوصی توجہ مبذول رہنی چاہئے۔ میں نے بعض مدارس میں معاملہ الٹا دیکھا ہے کہ فارسی اور عربی میں تو طلبہ کی استعداد اچھی ہے لیکن قرآن کریم کی تعلیم پر پوری توجہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بڑی خامی نظر آئی جس سے بہت افسوس ہوا۔ جو اصل ہے اس میں کمزوری اور جو وسائل ہیں ان میں پختگی۔ طلبہ کے لئے آپ نے فرمایا کہ داخلہ کے وقت طلبہ امداد کی درخواست دیتے ہیں جبکہ وہ امداد کے بالکل مستحق نہیں ہیں۔ ایسے طلبہ آگے چل کر کیا کریں گے؟ ہمارے یہاں اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ امداد صرف مستحق طلبہ کو ملنی چاہئے۔ غیر مستحق کو نہیں، ذمہ داران مدارس کو متوجہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: کہ طلبہ کے آرام کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کی فوراً کوشش کی جائے۔ اس میں بعض جگہ ذمہ داران مدارس کی طرف سے بڑی کوتاہی ہوتی ہے جو نہیں ہونی چاہئے۔ آپ چندہ کے وصولیابی کے لئے تو اشتہارات میں ان کو مہمانانِ رسول لکھتے ہیں مگر ان کے ساتھ معاملہ دوسرا کیا جاتا ہے۔ یہ بات بڑی غلط ہے ان پر شفقت کی نظر رکھی جائے۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر تعلیم کے لئے آپ کے پاس آئے ہیں، ان کی قدر کی جائے۔ وہ آپ کے محسن معاش بھی ہیں۔ اگر تمام طلبہ چلے جائیں، مدرسہ خالی ہو جائے تو کون آپ کو چندہ دیگا؟ اور آپ کس منہ سے چندہ مانگیں گے؟ آج ملت اسلامیہ دل کھول کر اللہ کے راستے میں خرچ کر رہی ہے، ہمارے مدارس انہی کے عطا کئے ہوئے سرمایہ سے چل رہے ہیں، آپ قادیانیت کی تردید میں کام کر رہے ہیں جو ضروری ہے۔ دوسری لائنوں میں کام ہو رہا ہے اور ہونا چاہئے، لیکن اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے مدارس میں اصلاحی کام کتنے ہو رہے ہیں؟ عام طور پر پھیلی ہوئی برائیوں کی روک تھام کے لئے ہم کیا کر رہے ہیں؟ بلاشبہ انفرادی تو کام ہو رہا ہے لیکن اجتماعی طور سے نہیں اس کی سخت ضرورت ہے۔

تقریر حضرت مولانا مفتی منظور احمد صاحب رکن مجلس شوریٰ

آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ آج اعتراض کیا جا رہا ہے کہ ہمارے مدارس میں ذی استعداد طلبہ پیدا نہیں ہو رہے ہیں یہ اعتراض غیروں کی جانب سے بھی کیا جا رہا ہے اور اپنوں کی جانب سے بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ دور جس سے ہم اور آپ گذر رہے ہیں انحطاط کا دور ہے۔ خود سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹوں میں بھی تعلیم کا معیار گرتا جا رہا ہے

ان کے نتائج ۵۰ فی صد بھی مشکل سے رہتے ہیں یا بوجہ بے تارتک نہیں پڑھا جاتا، فارموں کی ٹھیک سے خانہ پری نہیں کی جاتی۔ آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ مدارس کے خلاف زبردست پروپگنڈے سے ہم خود یہ سمجھنے لگے ہیں کہ واقعی اب ہمارے یہاں کچھ نہیں ہو رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ پہلے بھی تمام طلبہ یکساں طور پر ذی استعداد نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں فرق رہتا تھا، ذی استعداد کی تعداد زیادہ ہوتی تھی، کم استعداد کی تھوڑی۔ اب معاملہ اُلٹا ہوگیا ہے۔ اس میں تنہا طلبہ ہی قصوروار نہیں ہیں، اساتذہ کی کمزوریاں بھی ہیں۔ جب تک خشیت اور احساس ذمہ داری اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی فکر نہیں ہوگی بات نہیں بنے گی۔ چاہے آپ کتنی ہی کمیٹیاں تشکیل دے لیں، کچھ نہیں ہوگا۔ نصاب پر اعتراض صحیح نہیں ہے، اصل تو پڑھانے کی بات ہے اور پڑھنے کی۔ اگر اساتذہ یہ یقین رکھیں کہ ان سے ایک ایک بات کی بازپرس ہوگی کہ تم نے تعلیم میں کتنا وقت لگایا ہے طلبہ پر کتنی شفقت کی ہے۔ اسباق ٹھیک سے اور خلوص سے پڑھائے یا نہیں۔

میرے دوستو! ہمارے دلوں سے آخرت کی جواب دہی کا احساس بہت کم ہوگیا ہے۔ ساری خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔ ہمارے اندر حب دنیا زیادہ ہوگئی ہے چھوٹے چھوٹے مدرسے والے تعارف کراتے وقت اپنے مدرسہ کو دارالعلوم بتائیں گے، اس کی اہمیت جتائیں گے اور کام ان کے یہاں دیکھا جائے تو کچھ نہیں، بہت معمولی سا ۔۔۔۔۔۔ علاوہ ازیں مدارس میں جتنا سرمایہ تعمیرات پر صرف کیا جا رہا ہے اتنا تعلیم پر نہیں ہو رہا ہے، یہ تعلیم سے بے توجہی کی تو بات ہے کہ معاملہ کو برعکس کر دیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں سوچا جاتا کہ تعمیرات پر صدقات و زکوٰۃ کی جو رقمیں لگائی جا رہی ہیں اس کا جواز ہے بھی یا نہیں؛ اس پر کوئی غور نہیں۔ بس یہیں تو لوگوں کو دکھانے کے لئے شاندار عمارتیں چاہئیں، اصل کام ہو یا نہ ہو، آپ نے علوم عصریہ کے تعلق سے کہا کہ ہمارے مدارس کا اصل مقصد کتاب وسنت کی تعلیم ہے، اب جو جدید و قدیم کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی بات ہو رہی ہے یہ درست نہیں ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جدید عربی پر خصوصی توجہ کی جائے اور جدید عربی ادب کی کتابیں شامل نصاب کی جائیں۔ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لئے تو قدیم عربی ہی زیادہ معاون ہے بہ جدید عربی نہیں۔ آج مدارس کو اچھے مدرسین کی ضرورت ہے جو نہیں مل رہے ہیں یا بہت کم مل رہے ہیں۔ عربی استعداد کے فارغین تو عرب ممالک میں چلے جاتے ہیں یا ریڈیو وغیرہ کے محکموں میں ملازمت کر لیتے ہیں، یہ ایک افسوسناک پہلو ہے۔ آخر میں عرض کروں گا کہ ہمیں اپنے اندر

اخلاص پیدا کرنا چاہیئے اور اخلاص ہی کے ساتھ تعلیمی سلسلہ میں مصروف رہنا چاہیئے ۔

حضرت مولانا رشید الدین صاحب

مولانا رشید الدین صاحب مہتمم مدرسہ شاہی نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ آپ ملک کے کونے کونے سے آکر یہاں جس مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں وہ ظاہر ہے ، سب کے علم میں ہے ۔ آج ہمارے مدارس کے خلاف جو منظم کوششیں کی جارہی ہیں ، آپ کو انکا علم ہے ، مدارس کو بیکار بتایا جارہا ہے ، کہا جارہا ہے کہ مدارس اسلامیہ کے فارغین ملت کے دوش ناتواں پر بار بنے ہوئے ہیں ان میں تبدیلیاں لانیکی سخت ضرورت ہے ، اللہ کا فضل ہے کہ ہم سب اسی موضوع پر غور و فکر کے لیئے اکٹھے ہوئے ہیں ۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ملک میں بہت سے اسکول ہیں ، کالج ہیں لیکن یہ طلبہ ان سب کو چھوڑ کر مدارس دینیہ میں آتے ہیں ان کا اصل مقصد کتاب وسنت کی تعلیم حاصل کرنا ہے ۔

حق تعالیٰ جس کسی کے ساتھ خیر کا معاملہ فرماتے ہیں تو اس کو دین کی طرف مائل کر دیتے ہیں ۔ اس میں دین کی سمجھ پیدا کر دیتے ہیں ۔ میں تو بڑے فخر سے کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے ہمیں اپنے فضل سے علم دین کی تدریس پر لگایا ہے ۔ بلاشبہ ہمارے اندر کمزوری ہے ، اس کو دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہیئے ، مجھے اس کے اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی کہ ہم اپنے اسلاف کے طریقوں سے ہٹ گئے ہیں اس پر غور کرنے کی اور صحیح راہ پر آنے کی ضرورت ہے ، ہمارے اکابر جہاں جہاں بھی رہے ان کے خلوص اور ان کے نیکیوں کو سراہا گیا ، ان کی پیروی کی گئی ۔ آج ہمارا طرز عمل کیا ہے ہمیں اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھنے کی ضرورت ہے ہماری اولاد کالجوں میں جارہی ہے اور ہم انہیں روک نہیں پارہے ہیں یا اس کو ضروری نہیں سمجھ رہے ہیں آپ سمجھتے ہیں کہ قوم ایسی حالت میں بھی آپ کو اپنا مقتدا سمجھے گی ؟ کیا ایسی حالت میں بھی آپ کی پیروی کی جائیگی ؟ حق تعالیٰ پوچھیں گے کہ تم نے اپنے متعلقین کو غلط راستوں سے کیوں نہیں روکا ؟ آپ کیا جواب دیں گے ؟ ضرورت ہے کہ طلبہ کو اکابر کتابیں پڑھائی جائیں ۔ صرف کتابوں کی نشان دہی کافی نہیں ۔

آپ اپنی قوم کے مقتدا ہیں ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا چاہیئے ۔ علوم ظاہری سے فراغت کے بعد علوم باطنی کا درجہ ہے اس کی طرف ہماری کوئی توجہ نہیں ، اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہوگا تو پھر ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے گا ۔ آج ہمارے قلوب کی بات تو یہ ہے کہ تعلق مع اللہ سے خالی ہیں ۔ آپ نے تربیت اساتذہ کے تعلق سے فرمایا کہ ہمارے فضلاء اپنے طور پر بھی درس وتدریس کا کام شروع کر دیتے ہیں جو فی زمانہ درست نہیں ہے ۔ ہونا یہ چاہیئے کہ ایک ایسا انتظام کیا جائے جس میں فاضلین کو بتایا جائے کہ

نحو پڑھانے کا طریقہ یہ ہے، منطق کا یہ ہے اور قرآن و حدیث وغیرہ کا یہ۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ان میں ہر فن کی کتابیں پڑھانے کا سلیقہ پیدا ہو جائے گا، آخر میں آپ نے دعا کی کہ حق تعالیٰ، آپ کو اور تمام مسلمانوں کو شرور و فتن سے محفوظ رکھے اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، مولانا محترم کی تقریر پر یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظامِ تعلیم و تربیت

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ! امّا بعد۔ مدارس عربیہ کو اپنے مقاصدِ تاسیس میں کامیابی کے لئے تعلیم سے کہیں زیادہ تربیت پر زور دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اگر تربیت میں کمی رہ گئی تو بعید نہیں کہ علم کا استعمال ان مقاصدِ عالیہ کیلئے نہ ہو سکے جو دارالعلوم کا نصب العین ہیں۔ پھر یہ کہ حصولِ علم میں بھی تربیت کا بڑا دخل ہے، اگر علم کی پرورش کے ساتھ، مقاصدِ عالیہ سے ہم آہنگ کرنے کی جد وجہد میں کامیابی حاصل ہو جائے تو شمعِ علم پر پروانہ وار نچھاور ہونے اور مقصد کیلئے انتھک کام کرنے کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔

ہمارے اسلاف و اکابر کی زندگی میں علم و فن کی فضائے لامحدود میں بلند پروازی کی صفت کے ساتھ، علم کے تقاضوں پر پورا اور مخلصانہ عمل کرنے کا جوہر بھی نمایاں ہے۔ اس لئے استفادہ کرنے والے طلبہ کے لئے تو وہ اسوۂ حسنہ تھے ہی مگر اس کے علاوہ وہ عام مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی پیشوائی بھی کرتے تھے۔

بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جس طرح ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے ہمارے اسلاف و اکابر نے بھی ہمیں ایک مزاج دیا ہے، یہ مزاج قرآن کریم سے مستعار ہے، تفقہ اور انذار، تفقہ کے معنیٰ میں علم کی گیرائی و گہرائی، اور انذار کے وسیع مفہوم میں امر بالمعروف نہی عن المنکر، اسلامی اقدار کی حفاظت، صحیح عقائد کی اشاعت اور ان اوصاف کو دوسری نسل میں منتقل کرنے کی جدوجہد شامل ہے۔

ان تمام کاموں کے لئے صرف سبق پڑھانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اکابر نے اس مزاج کو پیدا کرنے، اس کو طاقت پہنچانے اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کی رُوح کو بیدار کرنے کیلئے پوری زندگی کو وقف کر دیا۔

ہمارے اکابر کی نشست و برخاست، گفتگو، رہن سہن اور ان کی مجلسیں سب ہی طلبہ کی زندگی پر اثر انداز ہوتی تھیں اور تربیت کا باقاعدہ نظام نہ ہونے کے باوجود وہ منظم پروگرام سے کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ طلبہ کی تربیت میں کامیاب تھے۔

افسوس کہ ہماری نئی نسل تربیت سے محرومی کی بنیاد پر علم میں کمزور اور مقاصد سے دور ہوتی جارہی ہے، حصولِ سند اور حصولِ معاش کے ذہن سے تعلیم حاصل کرنے والوں کی کثرت، ہمارے تربیت میں ناکام ہونے کی علامتیں ہیں، طلبہ کے درمیان طرح طرح کی برائیوں کے واقعات روز افزوں ہیں، اگر حالات کو سنجیدگی سے قابو میں رکھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی تو مدارس عربیہ کا ماحول بھی جدید تعلیم گاہوں کے ماحول کی طرح پاکیزہ اخلاق کی تربیت کے لائق نہیں رہ پائے گا۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ اس زمانہ میں علم کا پھیلاؤ بہت ہے۔ مدارس کی تعداد روز افزوں ہے۔ طلبہ کی تعداد ماضی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے، مگر علمی اعتبار سے جو انحطاط آیا ہے اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے، وجہ یہی ہے کہ ہمارے کاموں میں اخلاص کی رُوح نہیں، اور نہ ہمارے اندر اسلاف کی وراثت کو دوسری نسل میں منتقل کرنے کی لگن ہے۔

اس لئے شدید ضرورت ہے کہ ہم محض ماحول پر اعتماد نہ کرتے ہوئے مدارس عربیہ میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا باقاعدہ نظام قائم کریں، نصاب کمیٹی نے تعلیم و تربیت کا جو مجوزہ پروگرام پیش کیا ہے اس کو ملاحظہ فرمائیں، اور جہاں ضرورت ہو اس کو نافذ کرنے کی کوشش کریں۔

✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤

مجوّزہ نظامِ تعلیم و تربیت

بذریعہ مختصر نصاب کمیٹی دارالعلوم دیوبند

نظرِ ثانی شدہ مختصر نمائندہ نصاب کمیٹی

دراجلاس منعقدہ ۲۲، ۲۳ ستمبر ۱۹۹۴ء/ ۱۶، ۱۷ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ

بمقام دارالعلوم دیوبند

نظامِ تعلیم :- (برائے نظرِ ثالث، نمائندہ نصاب کمیٹی)

① دورانِ تدریس اختصار کے ساتھ کتاب حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ کتاب کے مشکل مقامات حل کرنے میں پوری توجہ سے کام لیا جائے، مشکل مقام کی تحقیق میں حل پیش کرنے والے مصنفین اور اسلاف کا حوالہ دیا جائے، طلبہ کو مآخذ سے روشناس کرانے کا اہتمام کیا جائے اور غیر ضروری بحثوں سے احتراز کیا جائے۔

② نصاب کی تکمیل کرائی جائے۔ تدریس میں یکسانیت ہو، ماہانہ، سہ ماہی اور ششماہی مقدار خواندگی مقرر کی جائے۔

③ جس استاذ کو جس فن سے زیادہ مناسبت ہو تدریس کے لئے اسی فن کی کتاب اس کے حوالہ کی جائے۔

④ امتحانات پوری احتیاط سے لئے جائیں درجۂ چہارم تک کے امتحانات میں بالخصوص پوری احتیاط برتی جائے اور ان جماعتوں میں طلبہ کا اوسط حاضری دوسرے درجات سے بڑھا دیا جائے۔

⑤ ابتدائی تعلیم اچھے اور تجربہ کار اساتذہ کے سپرد کی جائے۔

⑥ اوّل، دوم اور سوم عربی کے طلبہ کا ماہانہ امتحان لیا جائے۔

(۷) سالِ چہارم عربی تک عربی تمرین وانشاء پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جائے۔
(۸) مدرسین کو اسباق اتنے دیئے جائیں کہ وہ تدریس کی ذمہ داریوں سے صحیح طریقہ سے عہدہ برآ ہوسکیں۔
(۹) مدرسین کے انتخاب میں صلاح وتقویٰ، علمی استعداد، بلند اخلاقی، معیار، سلامتی طبع، تدریس اور طلبہ کی تربیت سے دلچسپی کو ملحوظ رکھا جائے۔
(۱۰) اساتذہ اعلیٰ کتابوں کی طرف مراجعت کر کے طلبہ میں اعلیٰ علمی معیار پیدا کرنے کی جدوجہد کریں۔
(۱۱) سالِ ششم عربی سے دورۂ حدیث شریف تک امتحانات کے دو پرچوں کا حل عربی میں کرنا لازم قرار دیا جائے۔
(۱۲) طلبہ میں عربی ذوق پیدا کرنے کے لئے عربی مجلات وصحف منگائے جائیں۔ اور دارالمطالعہ قائم کیا جائے۔
(۱۳) طلبہ میں تقریر وخطابت کا ذوق پیدا کرنے کے لئے جمعہ کی رات میں خطابت کی مجلسیں منعقد کرنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے۔

نظامِ تربیت :-

(۱) طلبہ کو راحت وآسائش پہونچانے کے ساتھ ان کی نگرانی درس میں حاضری رات کے مطالعہ اور ان کے حالات کا جائزہ لیا جائے، امتحانات میں سختی کی جائے، اور ان تمام چیزوں کا باقاعدہ نظم کیا جائے۔
(۲) طلبہ کی اخلاقی نگرانی، عادات واخلاق کی اصلاح اور دینی وضع کی پابندی بہت ضروری ہے، نماز باجماعت کی پابندی، سیرت وصورت کی تربیت و اصلاح کی طرف توجہ کی بیحد ضرورت ہے۔ اور ان امور میں کوئی رعایت نہ ہونی چاہئے۔

نوٹ: کل ہند اجتماع مدارس عربیہ نے نظام تعلیم وتربیت کے اس مجوزہ خاکہ کی متفقہ منظوری دیدی اور اسی کی روشنی میں اپنے اپنے اداروں میں تعلیم وتربیت کا نظام قائم کرنے کے فیصلہ کا اظہار کیا، وللہ الحمد والشکر۔

چوتھا اجلاس
۶½ شام تا ۱۰ بجے شب

صدارت
حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند

موضوع ——— رابطہ مدارس عربیہ

نظامت ——— حضرت مولانا ریاست علی صاحب و حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب

تلاوت قرآن حکیم ——— جناب قاری عبدالرؤف صاحب بلند شہری استاذ دارالعلوم دیوبند

نظم ——— مولوی قمرالہدیٰ متعلم دارالعلوم دیوبند

خطاب ——— حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

اظہار رائے ——— حضرات مندوبین عظام

تجاویز ——— حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند

خطاب مشاہیر ——— حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رکن شوریٰ، حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب شیخ الحدیث ندوہ لکھنؤ، حضرت مولانا غلام رسول خاموش صاحب رکن شوریٰ

جناب مولانا عبدالرؤف صاحب بلند شہری کی تلاوت سے اس اجلاس کا آغاز ہوا، حضرت مولانا سید ارشد مدنی نے اجلاس کے موضوع پر بڑی پرمغز تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اجتماع کا چوتھا اجلاس ہے، مدارس اسلامیہ ملک کے گوشے گوشے میں دین کی بقا اور اسے پھیلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر آج انھیں دہریت پسندوں اور اسلام دشمن عناصر کا سب سے زیادہ سامنا کرنا پڑ رہا ہے، مغرب نواز اسلامی تہذیب و ثقافت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں، اس ماحول میں رہ کر دنیا کو دین سے روشناس کرانا انھیں دینی مدارس کا کام ہے، دہریت جس قدر آج کے دور میں پروان چڑھی، اور جس طرح آج یورپ اسلام دشمنی پر آمادہ ہے، وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے، اس کے بکھر جانے کے بعد بڑی طاقتیں اس بات کا اقرار کر چکی ہیں کہ اب انھیں کمیونزم سے نہیں بلکہ اسلام سے خطرہ ہے۔

اس لئے طاقتیں جہاں کہیں اسلام ہے وہاں اسے ختم کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہیں، مصر کی علمی خدمات پورے عالم عرب میں مشہور ہیں، مگر وہاں فیملی پلاننگ کے موضوع پر کانفرنس بلا کر مسلمانوں کی شہ رگ کاٹنے کی کوشش کی گئی، یہ لوگ حرام اور حلال

کا فرق مٹانا چاہتے ہیں، مسلمان کا رشتہ حرام اور حلال کے درمیان تمیز سے توڑنا چاہتے ہیں، چوں کہ اسلام سے انھیں خطرہ ہے، اس لئے مسلمانوں کا رشتہ مذہب سے توڑنا چاہتے ہیں، لہذا آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان اسلام مخالف عزائم کا منظم ہو کر مقابلہ کیا جائے، انفرادی کام کے مقابلہ میں جماعتی کام میں برکت و نفع زیادہ ہوتی ہے، پھر باہمی رابطہ سے ایک دوسرے کو تقویت پہونچتی ہے، انھیں مقاصد کے تحت رابطہ مدارس عربیہ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

مولانا موصوف کی موضوع سے متعلق وضاحتی تقریر کے بعد حضرات مندوبین نے موضوع کے تعلق سے اپنی اپنی آرا پیش پیش کیں، اور تقریباً سب ہی حضرات نے رابطہ مدارس کی تجویز کو پسند کیا، بعد ازاں مشاہیر نے خطاب فرمایا۔

رَابطۃُ المَدارِسِ العَربیّۃ

الحمدُ للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ! اما بعد۔ ایک مقصد کے تحت کام کرنے والے مختلف اداروں کے درمیان ربط و تعلق کی اہمیت محتاج دلیل نہیں ہے خصوصاً دارالعلوم اور اس کے نہج پر کام کرنے والے ادارے کہ ان کا نصب العین محض تعلیم نہیں بلکہ یہ تعلیم کے ساتھ اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی ہمہ جہت اصلاح کیلئے قائم کئے گئے ہیں۔ اور اسی لئے ماضی میں بھی یہ ادارے ایک دوسرے سے مربوط رہے ہیں۔

البتہ دارالعلوم کی تاسیس کے ابتدائی ایام میں اس ربط کے اظہار میں بڑے خطرات تھے، حکمراں انگریز، مسلم علماء کے ساتھ جو وحشتناک سلوک کر رہا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ اس ربط کا اظہار نہ ہو۔

اسلاف و اکابر میں ایسی عظیم المرتبت شخصیات موجود تھیں کہ ان کی سرپرستی ہر طرح کے اتحاد اور تعاون کی ضمانت تھی مگر اسکے باوجود کبھی سالانہ امتحان اور کبھی سالانہ اجتماع میں شرکت کے ذریعہ اس ربط کو مستحکم کیا جاتا تھا، اور کبھی نصاب و کتاب میں یکسانیت کے عمل کے لئے ایک دوسرے سے تعلقات کو مضبوط کیا جاتا تھا، دارالعلوم کی قدیم روداد وں سے ان حقائق کا یقین حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مگر اب صورتِ حال دونوں اعتبار سے بالکل دگرگوں ہے، اب ہمارے درمیان ایسی

شخصیات نہیں ہیں کہ ان کے سایہ میں اتحاد کا یہ عمل خود بخود وجود میں آجائے، اور اب اتحاد اور ربط کے اظہار میں بھی کسی طرح کا اندیشہ یا خطرہ نہیں ہے، اور یہ کہ ربط واتحاد کی ضرورت اب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

(۱) باہمی رابطہ کی یہ ضرورت اس طرح پوری کی جائے کہ کسی بھی ادارے کی خود مختاری متاثر نہ ہو

(۲) رابطہ کے استحکام کے جملہ امور باہمی مشورے سے انجام پائیں۔

(۳) سالانہ اجتماعات میں زیر بحث آنے والے وہ بنیادی نقاط متعین ہو جائیں جو مدارس عربیہ کی ضرورت یا ان کے فرض منصبی سے متعلق ہیں اس مختصر تمہید کے بعد مجوزہ مسودہ ملاحظہ فرمائیں۔

رابطۂ مدارس عربیہ کے

مجوزہ اصول

بذریعہ نصاب کمیٹی (اندرون دارالعلوم) منعقدہ ۲۹؍۴ ؍ ۱۴۱۵ھ

(۱) نمائندہ اجتماع کی تجویز ۴ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مدارس عربیہ کے درمیان رابطہ کی شدید ضرورت ہے۔ نمائندہ اجتماع نے اس سلسلہ میں ایک کمیٹی کی تشکیل اور ایک دفتر کے قیام کی ضرورت ظاہر کی تھی چنانچہ یہ کام نصاب کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔

(۲) نصاب کمیٹی کی مجلس مؤرخہ ۲۹؍۴؍ ۱۴۱۵ھ کو دفتر اہتمام میں منعقد ہوئی، مجلس کے علم میں ہے کہ قدیم سے ہندوستان کے مدارس عربیہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کے پیش نظر دارالعلوم سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی لئے مدارس عربیہ کے دارالعلوم سے الحاق کیلئے ماضی قدیم سے [illegible] ہوتا رہا ہے مجلس ان حقائق کے پیش نظر طے کرتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نگرانی سے وابستہ مدارس

کا ایک مربوط نظم زیر سرپرستی دارالعلوم دیوبند قائم کیا جائے۔

(۳) اس مربوط نظم کا نام " رابطۂ مدارسِ عربیہ" ہوگا۔

(۴) رابطہ مدارسِ عربیہ کا مرکزی دفتر دارالعلوم دیوبند میں ہوگا۔

(۵) دارالعلوم دیوبند کے نہج پر تعلیم دینے والے عربی مدارس اس کے رکن ہوں گے۔
اور رکنیت کی کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔

(۶) رابطۂ مدارس عربیہ کا سالانہ اجتماع ہوا کرے گا۔

(۷) اس سالانہ اجتماع میں مندرجہ ذیل موضوعات زیر بحث آئیں گے۔

الف۔ نظام تعلیم وتربیت۔ ب۔ نصاب تعلیم۔

ج ۔ مسلم معاشرہ کی اصلاح اور اسلام کی حفاظت میں مدارس کا کردار

د ۔ ربطِ باہمی کے استحکام کی تجاویز

و ۔ مدارس کے لئے ضابطۂ اخلاق۔

(۸) مرکزی دفتر مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کرے گا۔

الف۔ سالانہ اجلاس کا انعقاد

ب ۔ مربوط مدارس کے فارغ التحصیل حضرات کی فہرست کی فراہمی۔

(۹) مربوط مدارس مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کریں گے،،

الف۔ فارم رکنیت کا پُر کرنا جسے مرکزی دفتر سے حاصل کیا جاسکے گا۔

ب ۔ اپنے فضلاء کی مکمل فہرست مرکزی دفتر کو بھیجنا۔

ج ۔ سالانہ اجتماع کے موقعہ پر ایک نمائندہ اپنے مصارف پر بھیجنا۔

نوٹ: کل ہند اجتماع مدارس عربیہ نے باتفاق اس مجوزہ اصول کو منظور کرلیا، اور ایک بڑی تعداد نے اسی وقت فارم رکنیت پُر کرکے " رابطہ مدارس عربیہ،، سے اپنے اداروں کو منسلک کرلیا۔ فالحمدللہ علی ذلک۔

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب

سب سے پہلے حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند سے خطاب کی درخواست کی گئی۔ موصوف نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ یہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ آج ہم اجتماعی طور صلاح و مشورہ کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں مسئلہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی اشاعت کیسے ہو۔ آپ نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے کہ دینی مدارس کن حالات میں اور کیوں قائم کئے گئے۔

میرے دوستو! دارالعلوم دیوبند ایک استاذ اور ایک شاگرد سے قائم ہوا۔ اور یہاں افراد سازی کا جو کام کیا اور جس کے نتائج دور رس سامنے آئے، وہ آپ کے سامنے ہیں، ساری علمی دنیا کے سامنے ہیں۔ پہلے اساتذہ تلامذہ کو اپنا جانشین بنانے کے لئے تیار کرتے تھے تاکہ وہ آگے چل کر دین کی اشاعت اور اس کے تحفظ کی خدمت انجام دیں اور ضرورت پڑنے پر ان تمام طریقوں کو اختیار کریں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ کے صحابہ رض نے اختیار کیا ہے، تاریخی شہادت موجود ہے کہ جب ہمارے طلبہ کسی مناظرہ میں جاتے تھے تو اساتذہ اُن کے پیچھے رہتے تھے۔ یہ دراصل افراد سازی ہی تو تھی طلبہ پر ذمہ داریاں ڈالتے تھے، چوک ہو جانے پر شفقت سے انہیں سمجھاتے تھے۔ یہ سب تعلیم و تربیت ہی کے طریقے تھے۔

آپ نے مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر مسلمان اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلیں اور منتشر نہ رہیں تو ان کی ایک زبردست اجتماعی طاقت بنے گی اور پھر آسانی سے کوئی ان کی طرف غلط انداز سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ آج ہم منتشر ہیں اسی لئے گوناگوں مصائب کا شکار ہیں۔ اجتماعیت کی تمام توانائیاں ہم نے کھو دی ہیں اور انتشار کی تمام کمزوریاں ہمارے اندر آگئی ہیں۔

میرے دوستو! آج ہمارے مدارس میں افراد سازی کا عمل نہیں ہو رہا ہے، اچھے عالم، اچھے محدث اور اچھے مدرس نہیں ہو رہے ہیں، یا ملتے ہیں تو بہت مشکل سے، تعلیم کے سلسلے میں آپ نے فرمایا کہ جو علوم پڑھائے جائیں وہ پوری محنت اور خلوص کے جذبہ سے پڑھائے جائیں، طلبہ کے ذہنوں میں اُتار دینے کی ممکن حد تک کوشش کی جائے۔ علامہ ابراہیم رح نے منطق میں صرف سلّم پڑھی تھی، ان کے استاذ شیخ الہند رح نے انہیں فن منطق ہی کی بڑی کتابیں پڑھانے کے لئے باہر بھیج دینا چاہا، علامہ نے ادب سے عرض کیا کہ حضرت یہ کتابیں تو میں نے پڑھی نہیں پھر وہاں جا کر کیا کروں گا۔ شیخ الہند رح نے فرمایا نہیں تم وہاں جاؤ اور محنت سے پڑھاؤ، گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اللہ پر بھروسہ رکھو، مطلب یہ ہے کہ پہلے اساتذہ

چاہے ایک یا دو ہی کتابیں پڑھاتے تھے لیکن اتنی محنت کرتے تھے کہ طلبہ کو فن سکھا دیتے تھے۔ پھر ان کے لئے کوئی مشکل نہیں رہتی تھی۔ آپ نے مدارس میں پائے جانے والی ایک نہایت افسوسناک کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آج ہمارے بعض اساتذہ طلبہ کے سامنے دوسرے اساتذہ کی خامیاں بیان کرتے ہیں جس سے طلبہ کے دلوں سے ان اساتذہ کی وقعت نکل جاتی ہے اور ان کا احترام باقی نہیں رہتا۔ یہ ایک بڑی غلط حرکت ہے۔ اگر کوئی باہمی اختلاف ہے بھی تو اس کا اظہار تلامذہ کے روبرو ہرگز نہیں ہونا چاہئے جہاں طلبہ کے لئے ضروری ہے کہ اپنے تمام اساتذہ کا، نظماء کا اور ذمہ داران کا احترام کریں وہیں اساتذہ کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو احترام کی نگاہ سے دیکھیں، حصول علم میں ادب واحترام کو بڑا دخل ہے۔ ایسے ہی یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ پر شفقت و مہربانی کی نظر رکھی جائے۔ ان کی ضرورتوں اور راحتوں کا خیال رکھا جائے۔ وہ آپ کی ذمہ داری میں ہیں، ان کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا جائے جیسا اپنی حقیقی اولاد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

میرے دوستو! ہماری ذمہ داری اتنی ہی نہیں کہ ہم صرف طلبہ کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہیں بلکہ ہماری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ہم اپنے قصبہ، شہر اور گاؤں کے لوگوں کی اصلاح کی بھی کوشش کریں۔ آپ نے فرمایا کہ مدارس میں رابطہ کی جو بات چل رہی ہے وہ بہت مفید ہے اس کے نتائج خوشگوار ثابت ہوں گے انشاء اللہ۔

حضرت مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ مجھے اچانک معلوم ہوا کہ مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ میں خالی الذہن تھا، حکم کی تعمیل میں، میں مائک پر آگیا ہوں، وقتی طور سے جو باتیں ذہن میں آئی ہیں، انہیں پیش کر رہا ہوں، قرآن کریم کی آیت ہے۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ہم نے ایسے نبی کو بھیجا ہے کہ کتاب کی تعلیم دیتے رہیں، حکمت کی باتیں بتاتے رہیں اور تزکیہ کرتے رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد اب یہ تمام ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے جسے الحمد للہ انجام دیا جارہا ہے، تلاوت کتاب کی ذمہ داری ہمارے حفاظ انجام دے رہے ہیں جو ان کے لئے فخر کی بات ہے۔ کتاب کی تشریح وتفسیر کی خدمت علماء کے سپرد ہے جسے وہ انجام دے رہے ہیں۔ اقیموا الصلوٰۃ کا مطلب اور تعین بغیر تشریح وتفسیر کے نہیں کیا جاسکتا، حکمت کا مطلب قرآن کریم کی آیات واحادیثِ رسول اور آپؐ کی سنت کو سمجھنا ہے یہ کام عربی مدارس کر رہے ہیں۔

تیسری ذمہ داری تذکیہ سے متعلق ہے بعض علماء کہتے ہیں کہ تذکیہ پہلے ہونا چاہئے۔ لیکن قرآن کریم کی ترتیب میں تذکیہ تیسرے نمبر پر آیا ہے۔ تذکیہ بہت ضروری ہے۔ اگر خراب برتن میں اچھی غذا رکھدی جائے تو وہ خراب ہو جائیگی۔ اسی طرح علم کی بات ہے۔ اگر قلب کی صفائی نہیں ہے۔ تذکیہ نہیں ہے تو حصول علم سے فائدہ نہیں ہوگا، صرف الفاظ کے معنیٰ سمجھ لینا کافی نہیں ہے۔ عیسائیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے عربی لغات کی اتنی عظیم کتابیں لکھی ہیں جن کا جواب نہیں، مگر قلب کی صفائی اور تذکیہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ حق شناسی سے محروم رہے ہیں۔ پہلے ہمارے اساتذہ معلم ہونے کیساتھ مذکی بھی ہوتے تھے جس کے اچھے نتائج نکلتے تھے۔ آج اس کی بڑی کمی ہے۔ یہ سب باتیں آپ حضرات مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ میرا مقصد تو صرف ان کی یاد دہانی ہے۔

حضرت مولانا غلام رسول صاحب رکن مجلس شوریٰ

حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا کہ مجھے اس مجمع کو دیکھکر خوشی ہو رہی ہے، یہ اجتماع درحقیقت ایک مبارک اجتماع ہے جس کی تہہ دل سے قدر کی جانی چاہئے، دراصل جب اللہ تعالیٰ کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو لوگوں کے دلوں میں اس کا احساس بیدار کر دیتے ہیں، موجودہ حالات نے ہمارے قلوب میں بیداری پیدا کی ہے۔ ہم اجتماعی طور پر وقت کی نزاکت محسوس کر رہے ہیں اور آنے والے خطرات سے بچنے کے لئے تدابیر اختیار کر رہے ہیں، ہمارے یہاں جمع ہونے کا اصل مقصد یہی ہے خطرات اصل میں لوگوں کو جگانے کے لئے آتے ہیں، جو جاگ جاتے ہیں وہ فائدہ میں رہتے ہیں، خطرات سے بچ جاتے ہیں اور جو نہیں جاگتے وہ نقصان اٹھاتے ہیں، ہم لوگوں کو چاہئے کہ ہم اس پر غور کریں کہ ہم سے کیا کوتاہی ہو رہی ہے جس کی وجہ سے خطرات پیدا ہو رہے ہیں اور مصائب آرہے ہیں۔

میرے نزدیک تحفظ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم سب متحد ہو جائیں، اتحاد کی بہت بڑی طاقت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے کہ مسلمانو تم اللہ کی رسی مضبوطی سے پکڑلو۔ اس کا مقصد اتحاد ہی کی تعلیم ہے، واقعات شاہد ہیں کہ جب تک مسلمان متحد رہے۔ ان کے غور وفکر کا انداز ایک رہا وہ کامیاب و کامراں رہے۔ دنیا کی بڑی سی بڑی طاقت بھی انہیں زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی، آپ کی شاندار تاریخ موجود ہے جس سے عروج وزوال کے اسباب معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے مدارس میں اختلافات نہیں ہونے چاہئیں، جب سب کا مقصد ایک ہے تو پھر اختلافات کا کیا مطلب؟ پوری لگن

اورخلوصِ دل کے ساتھ اپنے کاموں میں لگے رہنا چاہئے۔ آج جگہ جگہ مدارس قائم ہورہے ہیں یہ ایک اچھی بات ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے یہاں خلوص کی کمی ہے۔ خلوص سے زیادہ نمائش اور دنیاداری ہے۔ عموماً ایسا ہورہا ہے کہ اگر کوئی سفیر اپنے مہتمم سے کسی بات پر ناراض ہوگیا یا اس کی کوتاہی پر مہتمم نے اسے نکال دیا تو وہ اپنا مدرسہ الگ قائم کرلیتا ہے۔ یہ شکایت بھی عام ہوتی جارہی ہیں کہ طلبہ ایک مدرسہ کو چھوڑ کر دوسرے مدرسہ میں اور پھر دوسرے کو خیرباد کہہ کر تیسرے مدرسہ میں داخلہ لے لیتے ہیں۔ اور مدرسے انہیں قبول کرلیتے ہیں چاہے سالانہ امتحان میں ایک ہی مہینہ باقی کیوں نہ ہو۔ اس صورتِ حال میں ظاہر ہے کہ نہ تو طلبہ میں استعداد پیدا ہوسکتی ہے اور نہ مدارس کا کوئی معیار بن سکتا ہے۔ داخلوں کے لئے تمام مدارس میں ایک وقت متعین ہونا ضروری ہے۔ اس کی پابندی ہونی چاہئے۔ دراصل یہ ہماری اپنی کوتاہیاں ہیں انہیں دور کیا جانا ضروری ہے۔ ہم اگر خلوص کے ساتھ کوشش کریں گے تو مجھے یقین ہے حق تعالیٰ خود حالات ٹھیک فرمادیں گے۔

بہر حال میں پھر گذارش کرتا ہوں کہ ہمیں سب کو زیرِ غور معاملات میں خاص طور پر اور ویسے ہر معاملہ میں پوری طرح متحد رہنا چاہئے۔ اچھی تعلیم اور اچھی تربیت کے لئے کوشش جاری رکھنی چاہئے۔ طلبہ و اساتذہ کے درمیان لازمی طور سے ربط رہنا ضروری ہے۔ اور مدارس کے باہمی رابطے کی جو بات چل رہی اور جسے آپ سب حضرات پسند فرمارہے ہیں اس کو ٹھوس شکل دیدنی چاہئے۔ اس طرح کے روابط کے ساتھ ساتھ ہمارا رابطہ اللہ تعالیٰ سے بھی رہنا ضروری ہے اور یہی اصل ہے اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ نیز ہمارا رابطہ عوام سے بھی رہنا چاہئے۔ تقریروں کا سلسلہ مکمل ہوجانے کے بعد حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری نے مدارس عربیہ کے نظامِ تعلیم و تربیت سے متعلق پانچ قرار دادیں پیش کیں جنہیں متفقہ طور پر اجتماع نے منظور کرلیں اور یہ اجلاس اسی پر ختم ہوا۔

قرار دادوں کا متن یہ ہے۔

تجاویز

منظور شدہ کل ہند اجتماع مدارسِ عربیہ دارالعلوم دیوبند

منعقدہ ۲۰ تا ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ مطابق ۲۶ تا ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۴ء بدھ جمعرات جمعہ

تجویز (۱) برائے نصاب تعلیم

کل ہند مدارس دینیہ کا اجتماع اس عقیدہ پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ دینِ اسلام ایک مکمل دین ہے اور تا قیامت انسان اسی دین کا مکلف ہے لہٰذا لازمی طور پر حیات انسانی میں جو حالات و واقعات بھی پیش آئیں گے۔ کتاب و سنت کی تعلیمات و احکامات ان پر حاوی ہوں گے۔

اس لئے عصرِ حاضر کے چیلنجوں کا مقابلہ مغربی علوم فنون اور تہذیب و ثقافت کے ذریعہ نہیں بلکہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے، اور بحمد اللہ تعالیٰ علماء دین اپنے اپنے عہد میں ان چیلنجوں کا کامیاب مقابلہ کرتے آئے ہیں اور کر رہے ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ دین اسلام بغیر کسی ادنیٰ تحریف و تغیر کے اپنے تمام تر محاسن و برکات کے ساتھ انسانیت کی رہنمائی اور نجاح و فلاح کے لئے موجود ہے، چونکہ مدارس دینیہ کا بنیادی نصب العین تحفظ دین و احیاء شریعت ہے۔ جس کی اہمیت و ضرورت ہی نہیں بلکہ وجوب و فرضیت سے کسی فرد مسلم کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اِن حقائق کے پیش نظر:

(الف) کل ہند مدارس عربیہ کا یہ اجتماع مدارس کے نظامِ تعلیم میں ایسی تبدیلی کو متفقہ طور پر رد کرتا ہے جس سے مدارس کے بنیادی نصب العین اور اغراض و مقاصد مجروح و پامال ہوتے ہوں۔

(ب) کل ہند مدارس عربیہ کا یہ اجلاس مقرر کمیٹی کے پیش کردہ نصاب تعلیم کو بنظر استحسان دیکھتا ہے اور ارباب مدارس سے سفارش کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے مدارس میں اس نصاب کو جاری کرنے

کی پوری سعی کریں۔

(ج) کل ہند مدارس عربیہ کا یہ اجلاس مسلمانانِ ہند سے گذارش کرتا ہے کہ وہ مکاتب کے نظام کو مزید مستحکم اور ہمہ گیر بنائیں۔ بچوں کی دینی ماحول میں علمی و ذہنی نشو و نما کے لئے یہ مکاتب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مکاتب میں دینی تعلیم کے ساتھ اُردو زبان، ہندی زبان، انگریزی زبان، ریاضی، جغرافیہ اور معلومات عامہ وغیرہ مضامین کو ضرور پڑھائیں تاکہ عملی زندگی میں انہیں اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے میں دشواری نہ ہو۔ اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ دینیات کو نمونہ بنایا جاسکتا ہے

تجویز (۲) برائے تربیت طلبہ

کل ہند مدارس عربیہ کا یہ اجلاس اپنے متفقہ خیال کا اظہار ضروری سمجھتا ہے کہ بغیر تربیت کے تعلیم بے نتیجہ ہے۔ اس لئے مدارسِ عربیہ طلبۂ عزیز کی تربیت پر خصوصی توجہ دیں، مادیت کا فروغ دور مغربیت کے عروج کی بنا پر ماضی کے مقابلہ میں تربیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس لئے پہلے کے مقابلہ میں اس طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں مطبوعہ نظامِ تعلیم و تربیت مرتبۂ نصاب کمیٹی کو رہنما بنایا جائے۔

تجویز (۳) برائے نظامِ تعلیم

کل ہند مدارس عربیہ کا یہ اجلاس نصاب درس سے زیادہ طریقہ درس کی اصلاح کو ضروری سمجھتا ہے اور تمام مدارس سے یہ اپیل کرتا ہے کہ اپنے اداروں میں تکمیلِ نصاب کو امر لازم قرار دیں۔ تدریس میں طویل تقریروں کے بجائے حلِ مطالب کی کوشش کی جائے۔ اور پورے سال مقدار درس میں اعتدال کا لحاظ رکھا جائے۔ اور استعداد سازی کی پوری کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں مقررہ نصاب کمیٹی نے جو ابتدائی خاکہ مرتب کیا ہے اسے رہنما بنایا جائے۔

تجویز (۴) عصری اداروں میں دینی تعلیم کی ضرورت

کل ہند مدارس عربیہ کا یہ اجلاس مسلمانوں سے یہ بھی اپیل کرتا ہے کہ ان کے زیرِ نگرانی جو عصری ادارے چل رہے ہیں ان میں دین کی بنیادی تعلیمات یعنی اسلامی عقائد نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ضروری مسائل۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ۔ خلفائے راشدین کی سیر اور اسلامی اخلاق و معاشرت وغیرہ کی تعلیم کا نظم ضرور کریں تاکہ بچے عصری علوم کے ساتھ

دینی ضروریات سے واقف رہیں ۔

تجویز (۵) برائے رابطۃ المدارس العربیہ اگرچہ مقصد اور نصب العین کے اتحاد کی وجہ سے دارالعلوم اور اس کے منہاج پر کام کرنے والے تمام مدارس کے درمیان فطری ربط پہلے سے موجود ہے مگر کل ہند مدارس عربیہ کا یہ اجتماع عصرِ حاضر میں مدارسِ عربیہ کے باہمی رابطہ کو مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور ابتدائی طور پر جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اس کے رہنما اصول کے مطابق کام کا آغاز کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور اربابِ مدارس سے گذارش کرتا ہے کہ وہ فارم رکنیت پُر کرکے باقاعدہ نظام میں منسلک ہوں ۔ تاکہ کام کا باقاعدہ آغاز کردیا جائے ۔

پانچواں اجلاس

۸ بجے صبح تا ۱۱ بجے بروز جمعہ

صدارت

حضرت مولانا سید اسعد مدنی امیر الہند

موضوع ــــــــــ تحفظ ختم نبوت

تلاوت قرآن پاک ــــــــــ مولوی قاری آفتاب احمد مرادآبادی متعلم دارالعلوم

نظم ــــــــــ مولوی محمد عدنان متعلم دارالعلوم دیوبند

ہشت سالہ خدمات کی رپورٹ ــــــــــ حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم

خطاب ــــــــــ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل کٹکی رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

" ــــــــــ حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری ناظم اعلیٰ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم

تجویز ــــــــــ جناب مولانا مفتی محمد معصوم ثاقب استاذ دارالعلوم رائے چوٹی

صدارتی خطاب ــــــــــ حضرت صدر اجلاس مدظلہ العالی

آٹھ سالہ خدمات کا اجمالی تعارف

مولانا قاری محمد عثمان صاحب
ناظم مجلس تحفظ ختم نبوت ۔

فتنۂ قادیانیت ہندوستان میں مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۴۰ء ـ ۱۹۰۸ء) کے دعویٰ مسیحیت

ونبوت کی شکل میں ۱۸۸۰ء کے بعد ظاہر ہوا جس کی سرکوبی کے لئے سنت صدیقی پر عمل پیرا ہو کر امتیازی شان سے کام کرنے کی توفیق اکابر و منتسبین دارالعلوم کو میسر ہوئی جس کے نتیجہ میں یہ فتنہ تقریباً دفن ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد قادیانیوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ربوہ (پاکستان) بنالیا مگر فضلاء و منتسبین دارالعلوم کی مسلسل تگ و دو کی وجہ سے پاکستان کی قومی اسمبلی نے انھیں ۱۹۷۴ء میں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

جب اپریل ۱۹۸۶ء میں مرحوم صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے پاکستان میں امتناع قادیانیت آرڈی ننس جاری کر دیا اور اس کی بنا پر مرزا طاہر قادیانی نے (قادیانیوں کا موجودہ سربراہ) پاکستان سے فرار ہو کر لندن میں پناہ لی تو قادیانیوں نے ہندوستان کی جانب دوبارہ رخ کرنا شروع کیا اور دجل و فریب سے پُر روایتی انداز میں اپنی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں غالباً اس کی ہمت ان کو اس وجہ سے بھی ہوئی کہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ یہاں عوام تو عوام علماء کرام کا طبقہ بھی عموماً قادیانی افکار و نظریات اور ان کے لٹریچر کے مغالطوں سے ناواقف ہے، کیونکہ تقسیم کے بعد قادیانیت ہندوستان میں عام طور پر موضوع بحث نہیں رہی۔

اکابر کے نقش قدم پر

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے دارالعلوم کے موجودہ ارباب حل و عقد کو کہ انھوں نے دارالعلوم کے مقصد تاسیس اور حضرات اکابر رحمہم اللہ کے طرز عمل کے مطابق اس ارتدادی فتنہ کے دوبارہ سر اٹھانے کو بروقت بھانپ لیا اور اس کے تعاقب کے لئے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت کا احساس مسلمانوں میں عموماً اور ذمہ داران مدارس میں خصوصاً پیدا کرنے کے لئے ۲۹ تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء سہ روزہ عالمی اجلاس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم میں منعقد کیا جس کی اہمیت کا اعتراف ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی) نے اجلاس کی اختتامی تقریر میں یوں فرمایا تھا۔

"میں دارالعلوم دیوبند کو اس اہم ترین اقدام کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں، درحقیقت دارالعلوم کے بزرگوں نے ہندوستان میں قادیانیت کے مہیب فتنہ اور اس کی از سرِ نو کوششوں کو ختم کرنے کے لئے عالمی سطح پر یہ اجلاس منعقد کر کے اپنی بیدار مغزی کا مظاہرہ کیا ہے، میں اس تاریخی اجلاس میں شرکت کو اپنی خوش نصیبی تصور کرتا ہوں۔"

بفضلہ تعالیٰ یہ کانفرنس بیحد کامیاب رہی اور اس کے مفید ثمرات مرتب ہوتے، شرکاء اجلاس میں قادیانی فتنہ کے تعاقب کیلئے نیا عزم و حوصلہ پیدا ہوا اور وہ یہ تجویز پاس کرکے واپس گئے کہ۔

"اس فتنہ کی ہلاکت خیزیوں کی بناء پر منظم ہوکر ملک گیر پیمانہ پر اس کا مقابلہ کیا جائے گا"

نیز یہ کہ "یہ اجلاس دارالعلوم دیوبند اور اس کے ارکان سے اپیل کرتا ہے کہ مجلس تحفظ ختم نبوت الہند کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔"

بہرحال کل ہند سطح پر مجلس تحفظ ختم نبوت کا قیام عمل میں آیا، جس کے صدر محترم مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند اور ناظم عمومی حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند منتخب ہوتے اور ناظم کی خدمات راقم الحروف کے سپرد کی گئیں، ۲۳ ارکان پر مشتمل مجلس عاملہ تشکیل دی گئی۔

عالمی اجلاس کے معاً بعد سے دارالعلوم کی عمارت میں کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کا مرکزی دفتر قائم ہے جو بفضلہ تعالیٰ تسلسل کے ساتھ قادیانیت کی تردید و بیخ کنی کے لئے دارالعلوم کی سرپرستی میں حتی الوسع خدمات انجام دے رہا ہے جن کی رپورٹیں دارالعلوم کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ میں پیش ہوتی رہی ہیں اور موقر ارکان مجلس شوریٰ ان پر اظہار اطمینان فرماکر آئندہ کیلئے راہنمائی فرماتے رہے ہیں، اسی کے مطابق دفتر اپنی خدمات کے دائرہ کو حتی الامکان وسیع کرنے کی کوشش کرتا ہے اور رد قادیانیت کے کام کو مزید استحکام بخشنے کیلئے مجلس شوریٰ منعقدہ شعبان ۱۴۱۱ھ نے اپنی تجویز ۴ بضمن الف کے ذریعے طے کیا کہ

"مجلس تحفظ ختم نبوت کی حیثیت مجلس شوریٰ کے تحت دارالعلوم کے ایک مستقل شعبہ کی ہوگی، اور سابق میں جو اس کی مجلس عاملہ تھی، اس کی حیثیت ایک ذیلی مشاورتی کمیٹی کی ہوگی تاکہ اس ذیلی کمیٹی کے ذریعہ اس کا دائرہ کار وسیع ہو اور اس کی افادیت میں اضافہ ہو۔"

بہرحال پچھلے آٹھ سالوں (از اکتوبر ۱۹۸۶ء تا اکتوبر ۹۴ء) میں مرکزی دفتر کی خدمات کی مختصر رپورٹ درج ذیل ہے۔

(۱) فتنۂ قادیانیت کی حقیقت سمجھنے کے لئے اور علیٰ وجہ البصیرت رد قادیانیت کے موضوع پر کام کرنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت کتابوں کی ہے، چنانچہ عالمی اجلاس کے

موقع پر ہی اس موضوع کی دس منتخب کتابیں طبع کرائی گئی تھیں اور ان کا ایک ایک سیٹ ہر مندوب اجلاس کو ہدیہ کیا گیا تھا، اس کے بعد بھی تدریجاً یہ سلسلہ جاری ہے اور اب تک سینتیس کتب و پمفلٹ اردو ہندی طبع کرائے جا چکے ہیں جن میں سے اکثر کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔
یہ کتب مکتبہ دارالعلوم سے رعایتی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں اور متأثرہ مقامات پر حسب ضرورت مرکزی دفتر برائے تقسیم بھی ارسال کرتا ہے۔

(۲) اس سلسلہ میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے گروہ کی کتابوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے چنانچہ مرزا قادیانی کی ۸۰ رکتب و ملفوظات پر مشتمل ۲۳ رجلدوں کا پورا سیٹ (جو روحانی خزائن کے نام سے موسوم ہے) پانچ سال پیشتر حاصل کیا جا چکا ہے، اور اس کا مجموعہ اشتہارات (۳ رجلدوں میں) و دیگر بعض اہم کتب بھی دستیاب ہو گئی ہیں۔

(۳) دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے ہر سال دو طالب علموں کو خصوصی ترغیبی وظائف دے کر سال بھر رد قادیانیت کی مشق کرائی جاتی ہے۔

(۴) تکمیل تفسیر، تکمیل علوم، تکمیل ادب و افتاء و دراسۃ المعارف کے طلبہ کو (جن کی تعداد ایک سو سے زائد ہوتی ہے) ہر سال رد قادیانیت کی منتخب کتابوں کا مطالعہ کرانے کے بعد باقاعدہ تحریری امتحان لیا جاتا ہے، اور ان کو خصوصی و عمومی انعامات دیئے جاتے ہیں۔

(۵) دارالعلوم کے اساتذۂ کرام و مبلغین وقتاً فوقتاً دفتر میں تشریف لاتے ہیں اور اپنا معتدبہ وقت موضوع سے متعلق کتب کے مطالعہ وغیرہ میں صرف فرماتے ہیں۔

(۶) واردین و صادرین کو رد قادیانیت کی اہمیت سمجھائی جاتی ہے اور ان کے علاقوں میں اگر یہ فتنہ ہو تو اس کی سرکوبی کے لئے مناسب حکمت عملی اپنانے کی ترغیب دی جاتی ہے اور ان کو لٹریچر پیش کیا جاتا ہے۔

(۷) برائے ردّ قادیانیت تربیتی کیمپ کا سلسلہ

۱۔ دارالعلوم میں تربیتی کیمپ

دفتر کے باضابطہ قیام کے بعد چونکہ ملک کے مختلف علاقوں سے اس کا رابطہ قائم ہوا اور قادیانی فتنہ

ـــــ کی ریشہ دوانیوں سے بہت سے دیہات وقصبات اور شہروں کے متاثر ہونے کی اطلاعات موصول ہونے لگیں تو رد قادیانیت پر ماہر رجالِ کار کی تیاری کے کام کو وسعت دینے کے لئے ارباب دارالعلوم نے دسمبر ۱۹۸۸ء میں دس روزہ تربیتی کیمپ کا اہتمام کیا جس میں بحیثیت مربی خصوصی کے مناظر اسلام فاتح قادیانیت حضرت مولانا سید محمد اسماعیل صاحب کٹکی مدظلہ، کو دعوت دی گئی تھی، حضرت موصوف اس موضوع پر ہندوستان میں متخصص شخصیت ہیں۔

دارالعلوم میں تربیتی کیمپ کا پہلا تجربہ تھا اس لئے پہلے مرحلہ میں صرف مغربی اضلاع (میرٹھ مظفرنگر، سہارنپور، بجنور، مرادآباد، غازی آباد) کے بڑے مدارس کے نمائندگان کو دعوت دی گئی، ذمہ داران مدارس نے اس اقدام کو بہت سراہا اور اپنے نمایاں اساتذہ کو رخصت دے کر کیمپ میں شرکت کیلئے روانہ فرمایا کیمپ کا پروگرام اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ شرکاء حضرات کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہو۔

تربیتی کیمپ ۲

جزء اول برائے رد قادیانیت

پہلے کامیاب تربیتی کیمپ کے تجربہ کی وجہ سے ارباب دارالعلوم نے بڑے پیمانہ پر رد قادیانیت کے دس روزہ تربیتی کیمپ کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور اس میں بحیثیت مربی خصوصی تشریف لانے کے لئے دعوت قاطع مرزائیت حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی مدظلہ (پاکستان) کو دی گئی، آپ رد قادیانیت کے موضوع پر مسلّمہ شخصیت ہیں۔

جزء دوم برائے رد شیعیت

رد قادیانیت پر پہلے تربیتی کیمپ کے فوائد سامنے آنے کے بعد ارباب دارالعلوم نے ضرورت محسوس کی کہ اس طرح کے پروگرام دیگر موضوعات پر بھی منعقد کئے جائیں، چنانچہ اس مرتبہ ردّ شیعیت کے عنوان پر بھی شرکاء کیمپ کو بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لئے حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی دارالمبلغین لکھنؤ کو دعوت دی گئی، موصوف نے تین روز کئی گھنٹے ردشیعیت پر شرکاء کیمپ کو مستفید فرمایا

تربیتی کیمپ ۳ گوہاٹی

دارالعلوم کے تربیتی کیمپوں میں شرکت فرمانے والے مندوبین اور فارغ التحصیل طلبہ نے اپنی اپنی جگہ پہونچ کر

اس کی زبردست افادیت کو واضح کیا، انھوں نے بھی اپنے علاقہ میں تربیتی کیمپ کے پروگرام بنائے اور مرکزی دفتر مجلس سے اس بارے میں خصوصی رہنمائی حاصل کی چنانچہ جب ۱۴۱۲ھ میں ڈاکٹر ظہور الحق قادیانی مبلغ نے بنگلہ زبان میں قرآن حکیم کی تفسیر لکھ کر مغربی بنگال، آسام، منی پور، میگھالہ وغیرہ میں خوب اس کو پھیلایا تو اس فتنہ کے سدباب کیلئے حضرت مولانا احمد علی صاحب مدظلہٗ اور حضرت مولانا عبدالحق صاحب زید مجدہم نے اپنے رفقاء کے ساتھ قادیانیت سے متأثر دیہات کا دورہ کیا اور متعدد کتابچے بھی شائع کئے، اس سلسلہ میں ان حضرات نے ایک ۵ روزہ (۲۱ تا ۲۶ شعبان ۱۴۱۲ھ) تربیتی کیمپ کا اہتمام کیا، چنانچہ دارالعلوم گوہاٹی میں مذکورہ بالا صوبوں کے ارباب مدارس وعلماء کو شرکت کی دعوت دی گئی، بفضلہ تعالیٰ ڈیڑھ سو سے زائد علماء نے تربیت حاصل کی۔

بحیثیت مربی خصوصی حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی مدظلہ تشریف لائے اور دارالعلوم سے جناب مولانا مفتی محمود حسن بلند شہری استاذ دارالعلوم دیوبند اور جناب مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری جناب قاری شفیق الرحمٰن صاحب تشریف لے گئے اور اس موضوع پر شرکاء کو ضروری مواد فراہم فرمایا، کیمپ کے منتظمین نے آخری دن اجلاس عام کا اہتمام کیا، جس میں حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب امیر الہند و صدر جمعیۃ العلماء ہند نے بھی شرکت فرمائی، مندوبین کو حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی کی کاپی ردمرزائیت (نقش اول) تقسیم کی گئی تھی

تربیتی کیمپ، مدراس

تاملناڈ میں قادیانی سرگرمیوں میں تیزی کیساتھ اضافہ کی بناء پر ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۹۹۲ء میں مقامی ذمہ داران حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدظلہ صدر مجلس تحفظ ختم نبوت تاملناڈ وغیرہ نے ضرورت محسوس فرمائی کہ تاملناڈ میں ۳ روزہ تربیتی کیمپ منعقد کیا جائے چنانچہ مرکزی دفتر سے رابطہ ومشورہ کے بعد ۲۶ تا ۲۸ محرم ۱۴۱۳ھ مطابق ۲۵ تا ۲۷ جولائی ۹۲ء اس تربیتی کیمپ کا پروگرام جامع مسجد پیریس واکم شہر مدراس میں طے کیا گیا، اس کیمپ میں تاملناڈ وغیرہ کے تقریباً ڈیڑھ سو باقاعدہ نمائندگان نے شرکت فرمائی، مربی خصوصی کے فرائض حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی مدظلہ نے انجام دیئے۔ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے کلیدی خطاب فرمانے کے علاوہ متعلقہ موضوعات پر ٹھوس علمی انداز میں بنیادی نکات پر توجہ دلائی۔

حضرت موصوف کے علاوہ دارالعلوم سے مندرجہ ذیل حضرات کو دعوت دی گئی تھی جناب مولانا مفتی محمود حسن صاحب بلندشہری، جناب مولانا شاہ عالم صاحب مبلغ مجلس، جناب مولانا محمد عرفان صاحب بہرائچی مبلغ دارالعلوم، کاتب الحروف محمد عثمان، نیز حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی، حضرت مولانا سراج الساجدین کٹکی منتظمین کی دعوت پر تشریف لے گئے، اور اپنے افادات سے شرکاء کیمپ کو مستفید فرمایا۔ خوش قسمتی سے امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ، نے بھی ۲۶، ۲۷ر جولائی کی تاریخیں عنایت فرمائیں۔

حضرت امیر الہند نے دو روز مدراس میں قیام فرما کر ایک شب شہر کی مسجد میں دیگر علماء کرام کے ساتھ رد قادیانیت پر خطاب فرمایا، اور مسجد پرس واکم میں کیمپ کی آخری نشست میں خطاب فرمایا اور منتظمین کو مبارکباد دی، کیمپ کے موقعہ پر منتظمین نے "قادیانی چہرہ" "مرزا طاہر پر آخری اتمام حجت" کتابچے ٹمل زبان میں شائع کئے، جب کہ "قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ" کتابچہ ٹمل زبان میں پہلے شائع کیا جا چکا ہے۔

تمام مندوبین کو رد قادیانیت کی کتب بیس عدد کا وقیع سیٹ منجانب مجلس تحفظ ختم نبوت ٹاملناڈ ہدیہ کیا گیا جو مکتبہ دارالعلوم سے قیمتاً منگوائی گئی تھیں۔

رد قادیانیت کے کام کو وسعت دینے کے لئے چند اہم تجاویز بھی منظور کی گئیں۔

تربیتی کیمپ (الوائی) کیرالہ

کیرالہ میں قادیانی مشنری زیادہ منظم ہے اور سادہ لوح مسلمانوں کو کفر وارتداد کے فتنہ میں مبتلا کرنے کے لئے سرگرم عمل ہے، اس لئے حضرت مولانا محمد صالح نوح قاسمی نے مدرسہ حسینیہ الوائی میں ۲۹ر جولائی ۱۹۹۲ء کو ایک روزہ تربیتی کیمپ کا اہتمام فرمایا اور پورے صوبہ کے تقریباً ایک سو نمائندگان مدارس کو برائے حصول تربیت دعوت دی، اس پروگرام میں شرکت کے لئے حضرت امیر الہند مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ، حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی مدظلہ، جناب مولانا شاہ عالم صاحب، جناب مولانا محمد عرفان صاحب اور راقم الحروف الوائی پہونچے۔

۲۹ر جولائی کی صبح سے مغرب تک یہ کیمپ چلتا رہا حضرت امیر الہند کے خطاب و دعائیہ کلمات پر بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا اسی موقعہ پر مجلس تحفظ ختم نبوت کیرالہ کا قیام عمل میں آیا۔

الوائی سے پہلے ۲۸ جولائی کو مدرسہ حسینیہ کایم کلم اور مدرسہ فاروقیہ چندردر میں بھی اہتمام کیساتھ رد قادیانیت کے پروگرام ہوئے جن میں حضرت امیر الہند اور راقم الحروف نے شرکت کی۔

تربیتی کیمپ فیروز آباد یوپی

فیروز آباد شہر اور قرب وجوار میں قادیانی فتنۂ ارتداد بڑھتا ہوا دیکھ کر وہاں کے ذمہ دار علماء جناب مولانا محمد شفیع صاحب قاسمی مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم وغیرہ نے ایک روزہ ۵ر جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ تربیتی کیمپ کا اہتمام فرمایا، اور قرب وجوار کے مدارس کے اساتذہ و ذمہ دار حضرات کو مدعو فرمایا، رد قادیانیت پر خصوصاً گفتگو کے لئے دارالعلوم دیوبند کے مندرجہ ذیل حضرات اس پروگرام میں تشریف لے گئے۔

حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا محمد عرفان صاحب بہرائچی، جناب مولانا شاہ عالم صاحب اور راقم الحروف محمد عثمان۔

صبح ۸ بجے سے ایک بجے تک یہ خصوصی تربیتی پروگرام چلتا رہا جس میں تقریباً دو سو حضرات نے شرکت فرمائی پھر شب میں اجلاس عام کے اندر اس موضوع پر تقریریں ہوئیں، نیز مجلس تحفظ ختم نبوت فیروز آباد کا قیام عمل میں آیا

دوروزہ تربیتی کیمپ میل پالیم تاملناڈ

مجلس تحفظ ختم نبوت (تاملناڈ) کی تحریک پر اس کی شاخ ضلع ترنل ویلی کی جانب سے بمقام میل پالم ۹ر ۱۰ر جون ۱۹۹۳ء دوروزہ تربیتی کیمپ کا انعقاد ہوا جس کی کل چھ نشستیں ہوئیں، اس کیمپ میں اس علاقہ کے تقریباً ڈیڑھ سو علماء مختلف مکاتب فکر کے شریک ہوئے حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی مدظلہ نے مربی خصوصی کے فرائض انجام دیئے، اور دارالعلوم سے جناب مولانا محمد عرفان صاحب اور جناب مولانا شاہ عالم صاحب تشریف لیگئے اور ردّ قادیانیت پر تقریریں فرمائیں، اور باتفاق آراء قادیانیوں سے مکمل بائیکاٹ کی تجویز پاس ہوئی

تربیتی کیمپ بھاگلپور بہار

بھاگلپور کے محلہ برہ پورہ میں قدیم زمانہ سے کچھ قادیانی گھر آباد ہیں، پچھلے دنوں جب انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کیا تو محلہ کے دانشوروں اور مقامی علماء کرام نے تربیتی

کیمپ کا ارادہ کیا چنانچہ مجلس تحفظ ختم نبوت بھاگلپور اور مسلم ایسوسی ایشن برہ پور کے زیر اہتمام ۱۵ر تا ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء سہ روزہ تحفظ ختم نبوت کانفرنس اور تربیتی کیمپ قائم کیا گیا، جس میں قرب وجوار کے تقریباً تین سو علماء ومسلمان شریک ہوئے جس میں مربی خصوصی کی حیثیت سے حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نے شرکت فرمائی، جامع مسجد برہ پورہ میں روزانہ تربیتی کیمپ کی دو نشستیں منعقد ہوتی تھیں اور رات کو عیدگاہ برہ پورہ میں بنائے گئے ایک وسیع وعریض پنڈال میں روزانہ عام اجلاس ہوتے رہے، ان اجلاسوں میں مذکورہ بالا دونوں حضرات کے ساتھ مندرجہ ذیل حضرات نے بھی رد قادیانیت پر قیمتی معلومات پیش فرمائیں اور قادیانی ٹولہ کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا ازالہ کیا۔

(۱) جناب مولانا محمد یامین صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند (۲) مولانا محمد عرفان صاحب بہرائچی، (۳) جناب مولانا مفتی محمود حسن صاحب بلند شہری (۴) جناب مولانا محمد یوسف صاحب امروہوی (۵) جناب مولانا طاہر حسن ہرسولوی استاذ جامعہ حسینیہ تاؤلی مظفرنگر (۶) جناب مولانا شاہ عالم صاحب مبلغ مجلس تحفظ ختم نبوت، اور راقم الحروف محمد عثمان۔

اس موقعہ پر جملہ مندوبین کو منتظمین کی جانب سے رد قادیانیت کا لٹریچر جو ۲۸ کتب پر مشتمل تھا ہدیہ کیا گیا، یہ کتب مکتبہ دارالعلوم سے قیمتاً منگوائی گئی تھیں۔

سہ روزہ تربیتی کیمپ، بنگلور، کرناٹک

ریاست کرناٹک کے شہر بنگلور و قرب وجوار میں قادیانی سرگرمیوں کے تشویشناک حد تک بڑھ جانے کی وجہ سے کئی سال سے علماء وعمائدین شہر سہ روزہ تربیتی کیمپ اور اجلاس عام کا پروگرام کرنا چاہتے تھے، جمعیۃ علماء کرناٹک اور مجلس تحفظ ختم نبوت کرناٹک کے ذمہ داران نے مرکزی دفتر مجلس سے رابطہ قائم کیا، آخر کار ۲۵ تا ۲۷ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ مطابق ۲ تا ۴ ستمبر ۱۹۹۴ء کی تاریخیں طے کردی گئیں، جس کے بعد ان حضرات نے بھرپور تیاری شروع کردی اور دارالعلوم سے مندرجہ ذیل حضرات کو تشریف آوری کی دعوت دی گئی۔

(۱) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (۲) حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب

(۳) جناب مولانا مفتی محمود حسن صاحب بلند شہری (۴) جناب مولانا محمد یامین صاحب (۵) جناب مولانا محمد عرفان صاحب (۶) راقم الحروف محمد عثمان ۔

ان حضرات کے علاوہ منتظمین کی دعوت پر درج ذیل حضرات بھی بنگلور تشریف لائے ۔

(۱) حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی (۲) حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی (۳) حضرت مولانا سید سراج الساجدین صاحب کٹکی (مرکز العلوم سونگھڑہ کٹک) (۴) جناب مولانا محمد علی صاحب کٹک (۵) جناب مولانا محمد یوسف صاحب امروہوی (۶) مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری (دارالعلوم الاسلامیہ بستی) (۷) جناب مولانا مفتی محمد اسرار صاحب استاذ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (دارجدید) (۸) جناب مولانا محمد طاہر گیاوی مہتمم جامعہ حسینیہ ڈنڈیلہ کلاں (پلاموں)

تربیتی کیمپ کے خصوصی پروگراموں کی دو نشستیں روزانہ مسجد جمیل مدرسہ شاہ ولی اللہ ٹیانری روڈ بنگلور میں منعقد ہوتی تھیں جن میں مربی خصوصی کے فرائض حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب زیدمجدہ اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زیدمجدہ انجام دیتے تھے ، البتہ ۲ ستمبر کی افتتاحی نشست میں حضرت مولانا ابوالسعود صاحب مدظلہ مہتمم مدرسہ سبیل الرشاد بنگلور نے صدارتی کلمات ارشاد فرمائے ۔

اور ۴ ستمبر کی پہلی نشست میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب نے بھی خصوصی خطاب فرمایا اور اس طرح کے تربیتی کیمپ کی اہمیت وضرورت واضح فرمائی ، اور آخری نشست میں شرکاء کیمپ کو اسناد شرکت دی گئیں جن کی تعداد چھ سو کے قریب تھی ، نیز جملہ شرکاء کو رد قادیانیت پر مشتمل کتابوں کا ایک ایک سیٹ منتظمین کی جانب سے تقسیم کیا گیا ۔

۴ ستمبر کی شام کو بعد نماز عصر سے ۱۰ بجے رات تک " چھوٹے میدان " کے وسیع وعریض پنڈال میں عام اجلاس منعقد ہوا ، بنگلور کی تاریخ میں یہ اجلاس عدیم المثال تھا ، محتاط اندازہ کے مطابق تقریباً تیس ہزار سے زائد فرزندان توحید نے اس میں شرکت کی ، اجلاس میں کیمپ کی منظور کردہ اہم تجاویز پڑھ کر سنائی گئیں جن کی تائید پورے مجمع نے کی ، منتظمین نے یکم ستمبر سے ہی عام مسلمانوں کے استفادہ کے لئے شہر کی مساجد میں دارالعلوم دیوبند و دیگر مدارس کے علماء کے بیانات طے کرکے اخبارات و پوسٹروں سے ان کی تشہیر کردی تھی ، بفضلہ تعالیٰ یہ بیانات بھی

ہزاروں مسلمانوں نے سنے جن کی وجہ سے قادیانیت کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو کر عام مسلمانوں کے سامنے آگیا۔ اب امید ہے کہ وہ قادیانی مکر و فریب سے محفوظ رہیں گے۔

مقامی قادیانیوں نے نقض امن کا ہوّا کھڑا کر کے چھوٹے میدان کی اجازت شہری انتظامیہ کے ذریعہ منسوخ کروادی، لیکن منتظمین کیمپ کے بروقت اقدام اور مبنی بر حقیقت وضاحتوں سے مطمئن ہو کر انتظامیہ نے دوبارہ اجازت بھی دی اور پورا اطمینان بھی دلایا کہ قادیانی لوگ آپ کے پروگراموں میں کوئی رخنہ اندازی نہیں کر سکیں گے، چنانچہ اجلاس کے جملہ پروگرام انتہائی پرسکون ماحول میں پایہ تکمیل کو پہنچے۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

تربیتی کیمپوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً قادیانی فرقہ کے مناظروں سے مناظرہ کر کے انھیں شکست فاش بھی دی گئی اور بعض مقامات پر خود مناظرہ کا چیلنج کرنے کے بعد راہِ فرار اختیار کرنے ہی کو غنیمت سمجھا، چنانچہ خامنی ضلع متھرا، آگرہ، موضع رہتا آگرہ، میل پالیم تامل ناڈو وغیرہ مقامات میں خدام تحفظ ختم نبوت کے مقابلہ میں قادیانی مبلغوں نے فرار کی رسوائی قبول کی، رپورٹ کے بعد مندوبین نے اپنے اپنے علاقوں میں تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں کام کی رپورٹ پیش کی۔

تقریر حضرت مولانا سیّد محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی

حضرت مولانا نے ابتداءً اپنی سرگذشت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ فراغت کے بعد میں نے سرکاری اسکول میں ملازمت کر لی تھی، لیکن حضرت الاستاذ شیخ الاسلام" کے حکم سے ملازمت ترک کر کے ۱۹۴۴ء سے تردید قادیانیت کو اپنا مشغلہ بنالیا۔ اسی سلسلہ میں اپنے آخری مناظرہ "یادگیر" کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ قادیانیوں کی جانب سے مناظرے کے چیلنج کے بعد وہاں کے لوگوں نے جب علماء سے رابطہ قائم کیا تو انھیں مایوسی ہوئی، لیکن اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے حضرت امیر الہند کو جنھوں نے ذمہ داری لی اور فرمایا کہ مناظرہ ہوگا، چنانچہ وہ مناظرہ ۱۹۶۳ء میں ہوا اور قادیانیوں کو شرمناک شکست ہوئی اور اسی مجلس میں تقریباً ۳۱ قادیانی مولویوں نے اسلام قبول کیا۔

مولانا نے اپنی تقریر میں مناظرے کے کچھ خاص گر بتلاتے ہوئے فرمایا کہ قادیانیوں سے بحث ہو تو سب سے پہلے مرزا کی شخصیت متعین کرائی جائے کہ مرزا کیا تھا؟ مرزا نے گوبر ہونے سے

لے کر خدا کے باپ ہونے تک کا دعویٰ کیا ہے
حیات عیسیٰ کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ مرزا کا عقیدہ اولاً یہی تھا کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں اور اس عقیدے کو اس نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، لیکن ایک روز اس کی بیوی نصرت بیگم نے خواب دیکھا اور مرزا سے بیان کیا پھر مرزا نے صبح ہوتے ہی اعلان کردیا کہ حضرت عیسیٰ مرگئے، معلوم ہوا کہ قادیانیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ کو مرزا کے الہام یا اس کی بیوی کے خواب نے مارا ہے۔

اجرائے نبوت پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ آپ قادیانیوں سے کہئے کہ حضرت آدم پہلے نبی ہیں تو آخری نبی بھی کوئی آئے گا تو وہ آخری نبی کون ہوگا۔ نیز ان سے یہ بھی معلوم کیا جائے کہ مرزا کے بعد بھی کوئی نبی آئے گا تو بلا شبہ وہ یہی کہیں گے کہ نہیں تو معلوم ہوا کہ بحث اجراء نبوت کی نہیں بلکہ جھگڑا یہ ہے کہ خاتم النبیین مرزا غلام احمد ہے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

تقریر حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبي الا اذا تمنّٰى القى الشيطان فى امنيته فينسخ الله ما يلقى الشيطان ثم يحكم الله اياته والله عليم حكيم۔

(ترجمہ) اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا، پھر پکی کر دیتا ہے اپنی باتیں اور اللہ سب خبر رکھتا ہے حکمتوں والا۔ (ترجمہ شیخ الہند)

حضرت مفتی صاحب نے آیت کریمہ وما ارسلنا من قبلك،الآیہ کی تشریح کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ جب کوئی تحریک چلتی ہے تو ابتدائی دور میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں مگر عزم وہمت کے ساتھ کام کرتے رہنے کے بعد جب کامیابی آتی ہے تو اسے ناکام بنانے کے لئے شیطان ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے، لیکن جب آدمی ہمت مردانہ کے ساتھ ڈٹا رہتا ہے تو پھر نصرت خداوندی آتی ہے اور شیطان کے تمام منصوبوں پر پانی پھر جاتا ہے (تمنّٰی کے معنی بیان کرنے میں لوگ عام طور سے غلطی کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلعم سورۂ نجم کی تلاوت فرما رہے تھے کہ شیطان بھی آپ کی آواز میں آواز

ملاکر پڑھنے لگا، اس گڑھے ہوئے قصہ کو بنیاد بناکر دو چار سال قبل رشدی نے شیطانی آیات کتاب لکھی تھی) اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ دین اسلام کی تحریک کو کمزور کرنے کے حربے حضور صلعم کے زمانہ ہی سے شروع ہوگئے تھے، آپ بنفس نفیس تشریف فرما ہیں اور مسیلمہ اسود عنسی بے شرمی کے ساتھ نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں، چاروں طرف بے چینی چھائی ہوئی تھی حالات بدتر ہوتے جا رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت آئی اور حالات قابو میں آتے، جھوٹے نبیوں کا سلسلہ زمانۂ نبوت سے ہی شروع ہوچکا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق نامعلوم کتنے جھوٹے نبی ابھی اور پیدا ہوں گے۔

آج سے تقریباً ایک صدی قبل قادیانی فتنہ پیدا ہوا تھا جس نے سارے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے لہٰذا ہم ہندوستان والوں کی ذمہ داری ہے کہ اس فتنہ کا تعاقب کریں کیونکہ صاحب البیت ادریٰ بما فیہ نیز اس سلسلہ میں شعبۂ تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند قابل تعریف خدمات انجام دے رہا ہے لیکن آپ حضرات کے تعاون کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ یہ ساری امت کا مسئلہ ہے، حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ قادیانیت تین طریقے سے پھیلتی ہے۔ ایک تو جہاں جہالت ہو یا ایسے انگریزی تعلیم یافتہ جو دین کے مبادیات تک سے بھی ناواقف ہوں وہاں اسے پھیلنے کا موقع ملتا ہے، لہٰذا ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ دین کی بنیادی تعلیمات مسلمان کے گھر گھر پہونچا دیں، اور اس کی ترویج کا دوسرا طریقہ یہ ہے، یعنی غریب مسلمانوں کا ہمدردانہ تعاون کرکے آہستہ آہستہ اپنی لائن پر لاتے رہیں، اور تیسرا طریقہ زن کا ہے، یعنی گمراہ کرنے کے لئے نوجوانوں کے سامنے خوبصورت لڑکیاں پیش کرتے ہیں۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو آگاہ کیا جائے کہ یہ سفید پوش تمہارے ہمدرد نہیں بلکہ ایمان کے ڈاکو ہیں لہٰذا اس سے بچو اور ان کا سماجی بائیکاٹ کرو اور ہر شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس موضوع پر اتنا عبور حاصل کرے کہ اس کے علاقے سے گذرتے ہوئے قادیانیوں کو پسینہ آجائے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حضرت مولانا سید اسعد مدنی کا صدارتی خطاب

حضرت مولانا اسعد صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ انگریزوں نے ایک صدی قبل سیاسی مصلحت کے پیش نظر ایک بناسپتی نبی تیار کرکے قصر نبوت پر حملہ کیا، حالانکہ قادیانی ایسا پست کیرکٹر ہے کہ آپ اسے شریف آدمی بھی کہنے میں تامل کریں گے چہ جائیکہ نبی اور رسول، کچھ لوگ تو دیدہ و دانستہ اور کچھ لوگ انجانے پن میں اس فتنہ کا شکار ہورہے ہیں اور ہم غافل بیٹھے ہیں کہ اب قادیانیت ہمارے ملک کا مسئلہ نہ رہا بلکہ ہم نے تو انھیں یہاں سے بھگا دیا، ہماری اس غلط فہمی کی وجہ سے انھیں ترویج کا موقع ملا اور ہم خواب خرگوش میں مست رہے تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں انھیں بڑا عروج حاصل ہوا اور انھوں نے مستقل شہر آباد کرلیا جہاں غیر قادیانی کا گذرنا محال تھا سیاسی اثر و رسوخ کے ذریعہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوگئے۔ ہر اہم شعبے میں قادیانی گھس گئے حتیٰ کہ ان کا سالانہ اجلاس سرکاری اعزاز کے ساتھ ہوتا اور بازسلامی دیتے تھے، لیکن لوگوں میں بیداری آئی جس کے نتیجہ میں تحریک دوبارہ زندہ ہوئی اور بڑی کوششوں کے بعد انھیں کافر قرار دیا گیا۔ اور اب اس نام پر یہ پاکستانی مظلوم ہیں اور ملک میں دوبارہ انھیں پناہ مل رہی ہے اور اس قدر سہولتیں دستیاب ہیں کہ مغربی بنگال میں انھوں نے ریڈیو اسٹیشن قائم کرلیا ہے، جس کے ذریعہ علاقائی زبان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔

لہذا ہم تمام اہل مدارس کو چاہیئے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے توجہ دیں اور اپنی استطاعت کے مطابق قادیانیت کی تردید میں حصہ لیں۔

حضرت صدر اجلاس کی اختتامی تقریر اور دعا پر یہ سہ روزہ اجلاس بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک

✱

تجویز برائے تحفظِ ختمِ نبوت

قادیانیت اس صدی کا سب سے عظیم فتنہ ہے جو صیہونی طاقتوں کی سرپرستی میں پروان چڑھا اور جس نے ہزارہا ہزار فرزندان اسلام کے ایمان کو تار تار کرکے رکھ دیا، اس فتنہ کی زہرناکی کو محسوس کرکے روز اوّل ہی سے علماء دیوبند اس کی سرکوبی کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے ہیں، ناموس ختم نبوت کی حفاظت کے لئے دیوبند سے فکری انتساب رکھنے والے علماء کی خدمات برصغیر کی اسلامی تاریخ میں سنہرے حروف سے نقش ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد اس تحریک نے اپنا مستقر پاکستان کو بنا لیا تھا، مگر وہاں بھی علماء نے اس کا بھرپور تعاقب جاری رکھا تا آنکہ قادیانیوں کو سعودیہ وغیرہ ممالک اسلامیہ نے قانونی طور پر غیر مسلم قرار دیدیا۔ سرزمین پاکستان کو تنگ ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ تحریک گذشتہ دس سالوں سے دوبارہ ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہے، وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس خطرناک، ایمان سوز تحریک کی سرگرمیاں تشویشناک حد تک بڑھتی جا رہی ہیں، کل ہند مجلس تحفظِ ختمِ نبوت الحمدللہ امکانی حد تک اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے مصروفِ عمل ہے، تاہم ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ذمہ داران مدارس اور ائمہ و خطباء مساجد کا یہ منصبی فریضہ ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے دفاع دین کی خاطر ہر طرح کی قربانی پیش کریں، اور باطل کے تعاقب کی شاندار روایات کی پاسداری کرتے رہیں۔ اس لئے کل ہند اجتماع مدارس عربیہ دارالعلوم دیوبند اس فتنۂ ارتداد کے مؤثر دفاع اور رجال کار کی تیاری کے لئے یہ تجویز کرتا ہے کہ۔

۱۔ تمام مدارس کے اساتذہ و معلمین مہینہ میں کم از کم ایک دن اپنے اسباق میں طلبہ کو رد قادیانیت کے مضامین سمجھائیں، یعنی اسے اپنے نصاب کا جزو بنا لیں۔

۲۔ اساتذہ مبلغین اور ذمہ داران مدارس پروگرام بنا کر اپنے اطراف و جوانب کے قصبات و مواضعات کی مساجد میں جا کر ختم نبوت کے بنیادی عقیدہ کی اہمیت سے عام مسلمانوں کو

روشناس کرائیں، قرآن وسنت میں مرزائیوں کی لفظی ومعنوی تحریفات کو بے نقاب کریں اور واضح طور پر سمجھادیں کہ ملت اسلامیہ کے تمام مکاتب فکر ان کے کفر پر متفق ہیں اور یہ کوئی وقتی اور سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ خالص دینی اور مذہبی مسئلہ ہے۔

۳:۔ ارباب مدارس اپنی لائبریریوں میں ردقادیانیت پر کتابیں مہیا کریں اور اصل قادیانی لٹریچر کے حصول کی بھی کوشش کرتے رہیں۔

۴:۔ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کی رہنمائی میں قادیانیت سے متاثرہ علاقوں میں علاقائی یا ضلعی مجلس تحفظ ختم نبوت قائم کرکے منظم طور پر کام کیا جائے۔

۵۔ پسماندہ اور دور دراز علاقوں میں چونکہ ان کی سرگرمیاں زیادہ ہوتی ہیں، اس لئے ایسے علاقوں کا خاص طور پر دورہ کیا جائے، اور ان کی دسیسہ کاریوں اور پُرفریب چالوں سے عام مسلمانوں کو آگاہ رکھا جائے اور ان علاقوں میں فتنوں کی مؤثر روک تھام کے لئے مکاتب قائم کئے جائیں۔

۶:۔ ایسے علاقوں کا سروے کرکے قادیانیوں کی خفیہ ارتداد کی سرگرمیوں کا پتہ لگایا جائے اور ان کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی جائیں، اور اس کی رپورٹ پابندی کے ساتھ دفتر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کو بھی ارسال کی جائیں۔

۷:۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں وقتاً فوقتاً پروگرام کرکے عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت سے ان کو روشناس کرایا جائے۔

۸:۔ ائمہ مساجد اپنے خطبات میں عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت اور اس کی بنیادی عقیدہ کو متزلزل کرنے کی ناپاک کوششوں کا پردہ چاک کرتے رہیں۔

۹:۔ علاقائی یا ضلعی مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے ردقادیانیت پر چھوٹے چھوٹے کتابچے اور پمفلٹ علاقائی زبانوں میں شائع کئے جائیں۔

۱۰:۔ خاص طور پر متاثرہ علاقوں کے مدارس اپنے بحث میں اس فتنہ ارتداد کے دفاع کے لئے حسب ضرورت متعین کریں اور اپنے رمضان وعیدین وغیرہ کے اشتہارات میں ختم نبوت کے عنوان سے ضروری معلومات بھی شائع کیا کریں

۱۱ ۔ قادیانیوں کا سماجی و معاشرتی بائیکاٹ کرایا جائے اور مسلم قبرستان میں ان کے مردوں کو دفن نہ ہونے دیا جائے

۱۲ ۔ ارباب مدارس اپنے اساتذہ میں سے جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں ہینہ دو مہینہ کے لئے اپنے مصارف پر چھٹی دے کر تربیت کے لئے مرکزی دفتر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند بھیجیں اور دفتر سے بذریعہ مراسلت وقت کی تعیین کریں ۔

۱۳ ۔ قادیانی سرگرمیوں سے آگاہ ہونے اور رد قادیانیت کے سلسلہ میں کی جانے والی مساعی سے باخبر ہونے کے لئے مرکزی مجلس کا ایک مستقل خبرنامہ جاری کیا جائے جو کم از کم سہ ماہی ہو ۔

تجویز شکریہ

مدارس عربیہ کا یہ عظیم اجلاس مادر علمی دارالعلوم دیوبند اور اس کے سربراہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب و اراکین مجلس شوریٰ، اساتذۂ کرام، طلبۂ عزیز اور جملہ کارکنان دارالعلوم کا تہ دل سے شکر گذار ہے کہ اپنے قیمتی اوقات صرف کر کے اور زحمت برداشت کر کے یہ کل ہند مدارس عربیہ کا اجتماع بلایا اور اس کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے وابستگان دارالعلوم کی ایک اہم علمی و دینی ضرورت کی تکمیل کا سامان بہم پہونچایا ۔

حالات اور وقت کے تقاضے کا بہانہ بنا کر مدارس اسلامیہ کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کی جو مہم چلائی جا رہی ہے اس کے مقابلہ کے لئے ہمارے اندر ایک نئی توانائی پیدا کی، ساتھ ہی ساتھ گردش زمانہ سے مدارس دینیہ کے نظام تعلیم و تربیت میں جو ضعف و اضمحلال پیدا ہو گیا تھا اس کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے ازالہ کی تدبیروں سے روشناس کرایا ہے اور اب ہم یہ جذبے کر یہاں سے لوٹ رہے ہیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ ان ہدایات اور تجاویز کی روشنی میں نئے حوصلہ اور نئی لگن کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں گے ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارا یہ مرکز علمی آئندہ بھی اسی طرح ہماری رہنمائی کرتا رہے گا ۔

اللہ تعالیٰ کا بے حد و حساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے اسی طرح بلند ہمتی و [illegible] کے ساتھ دست تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے۔ اسلئے اپنی جانب سے و نیز گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

پتہ

ڈرافٹ و چیک بنام: دارالعلوم دیوبند — اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کرنے کے پتے: حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند — پن کوڈ نمبر 247554

Regd. No. SHN-L. 13-NP-739-90

DARUL ULOOM MONTHLY

DEOBAND - 247554 (U.P.)

Printed by: IMMI ENTERPRISES, Tel.: 2929790